

نوبھوت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اپریل 2014

نگران اعلیٰ
معراج رسول

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پس زنداں

طاہر جاوید میٹل کے فساد خیز اور تیراگیر قلم سے
ایک طویل کہانی ----- اندرونی صفحات پر

www.paksociety.com

www.paksociety.com

7 جون ایلینا

دنیا میں خسارہ ہی خسارہ ہے اگر کوئی نفع ہے تو صرف حسن عمل..... ماضی سے انتخاب

8 مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت وقت تارین کی توجہ شیریں باتیں گلے شکوے اور چٹوڑے مشورے

16 الیاس سینا پوری

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

68 طاہر جاوید مغل

دیباغی میں بہنوں سے دور کی اپنے کی تلاش میں سرگرداں محبتوں کی کرم فرمائیاں اور قیول کی عنایتوں کی داستان

120 ملک صفدر حیات

قدرت کے امتداد کا عبرت اثر طریقہ کار..... ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب



49 کاشف زبیر

معاشیات کے اوزان سے نفسیات کو پرکھنے والی ایک دو شیزہ کے کارنامے

111 تنویر ریاض

اندھی محبت کی روتابست اور عشق کی روتابستوں کا فتنہ

147 بابر نعیم

ماضی کی ڈوری سے کھلنے والی گرہوں کا ماحبرا

156 قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

159 امجد رئیس

کاروبار حیات میں معاشیات کی فریب کاریوں میں ابھی ایک مفرد کہانی

166 محی الدین نواب

ایک چہرہ کی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ

205 منظر امام

بے چسپین طبیعت کے ہاتھوں محسوس ایک دلچسپ تماشا

221 ثمر عباس

جذبات و احساسات اور رشتوں کے لٹ پھیر کا دلچسپ گورکھ دھندا



209 ضیاء نسیم بلگرامی

باطن کی روشنی سے منور ایک صاحب کشف کا قصہ

228 رویہ رشید

برقی موسم کے دھندلے منظر میں بچپن گڑیا اور گھر تلاش کرنے والی دو شیزہ کی آئینہ پائی کی روداد

000 ادارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف، چٹکے، اقتباسات، مسکرائش اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

انشائیہ

جون ایلیا

خسارہ

راستی، راستانی اور راستی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک پُر آشوب زمانہ ہے۔ دلوں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ دیلوں پر درہمی کی افتاد پڑی ہے اور دانش پر دیوانگی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی اس طرح کبھی غلط ملط نہ ہوئی تھیں۔ ادھر یا اُدھر، جدھر بھی دیکھو، ایک ہی ساحال ہے۔ تیرہ درونی نے اپنی دستاویز درست کی ہے اور کبھی، کج رائی اور کج روی کا دستور جاری کیا گیا ہے، جو سمجھانے والے تھے، وہ اپنے افادات کی مجلسوں میں برائی سمجھا رہے ہیں۔ برائی سوچی جارہی ہے اور برا چاہا جا رہا ہے۔ خیال اور مقال کی فضا اس قدر زہر ناک کبھی نہ ہوئی تھی۔ انسانی رشتے اتنے کمزور، کبھی نہ پڑے تھے۔

ایک اور قتنہ برپا ہوا ہے، وہ ادھوری سچائیوں کا قتنہ ہے۔ اس نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ ایک آنکھ، ایک کان، ایک ہاتھ اور ایک ٹانگی کی انسانیت زندگی کے حسن تناسب کا نادر نمونہ ٹھہری ہے۔ یہی وہ انسانیت ہے جس کے باعث اس دور میں ہماری تاریخ کے سب سے بدترین واقعات ظہور میں آئے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ یہ انسانوں کی نہیں، ہنسناسوں کی دنیا ہے اور ہم سب ہنسناس ہیں جسے دیکھو غیر انسانی لہجے میں بولتا ہوا انسانی دیتا ہے۔

سماعتوں پر شیطانی شطیحات نے قبضہ جمالیا ہے۔ یہاں جو بھی کان دھر کر سن رہا ہے، وہ کانوں کے گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ سوچا ہے کہ ایسے میں نیک سماعتیں اعتراض اختیار کریں۔ اپنی نیتوں کی نیکی پر سختی سے قائم رہو اور اس کی ہر حال میں حفاظت کرو کہ تمہارے پاس یہی ایک متاع باقی رہ گئی ہے اور یہی تمہاری سب سے قیمتی متاع بھی ہے۔ نفرتوں کی گرم بازاری اور محبتوں کی اس قحط سالی میں دیکھی انسانیت کے دکھ اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ اس بیمار کے تیمارداروں اور غم گساروں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اچھائی اور برائی میں ایک عجیب معاملت ہوئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے ناموں کا آپس میں تبادلہ کر لیا ہے۔ اب ہر چیز اپنی ضد نظر آتی ہے۔ علم، جہل پر سمجھ گیا تھا اور جہل، علم کے خطاب پر بری طرح لوٹ پوٹ تھا۔ سو دونوں ہی نے ایثار سے کام لیا۔

انسان کو اس دور میں وہ وہ مفتعیں حاصل ہوئی ہیں جن پر ہر دور کا انسان رنحک کرے۔ پر اس کا خسارہ بھی اسی قدر شدید ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے اس انبوہ میں خود انسان ناپید ہو گیا ہے۔ جس حراج اور جس قماش کی دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کا حال تو یہی ہے اور یہی ہونا بھی تھا۔ کوئلے کی کمائی کا لک کے سوا اور کیا ہے؟ اندرائن کے پیڑ سے کیا کبھی انکور کے خوشے بھی توڑے گئے ہیں؟

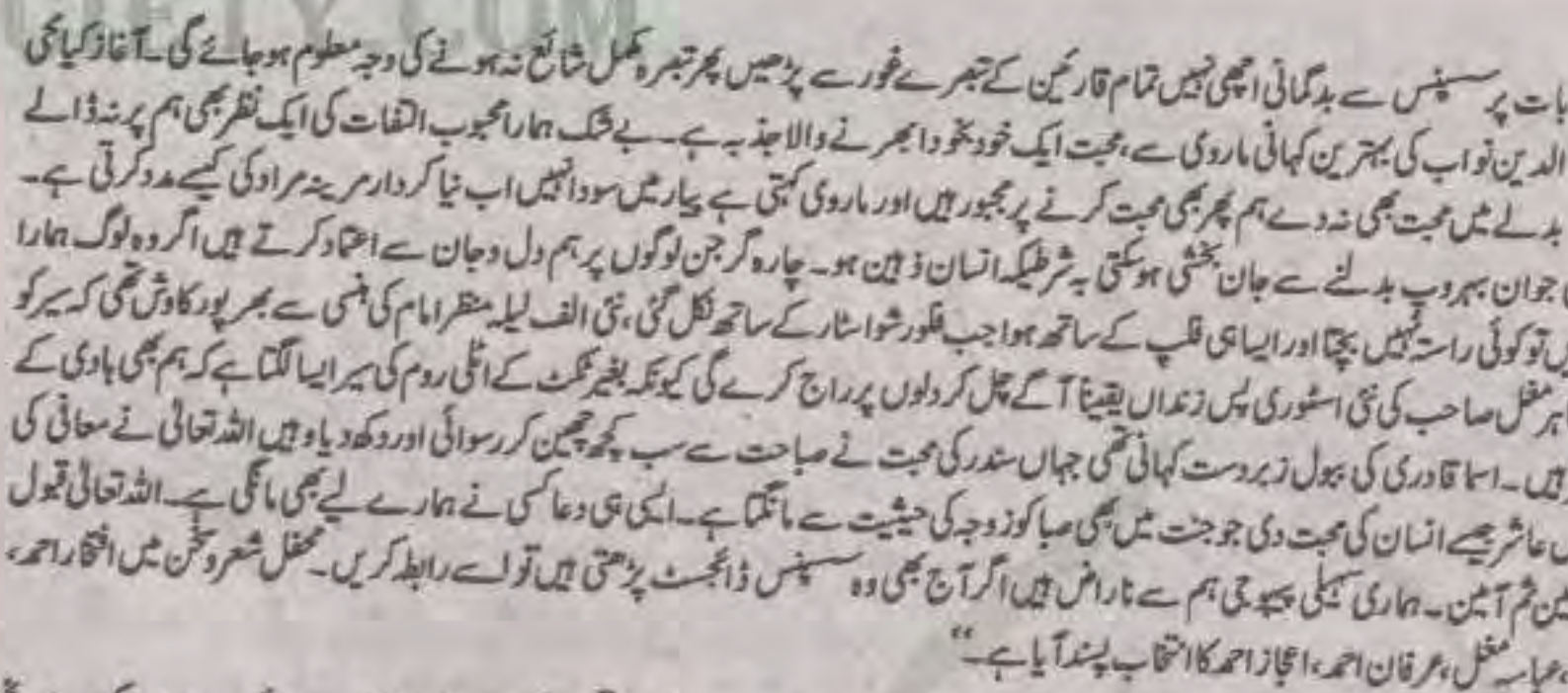
اپریل 2014ء کا

جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم پہے ہیں دس واٹوں کی اینٹیں اس میں بہاں

✽ مقصود علی، بطریقین، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "مارچ 2014ء کا شمارہ 19 فروری کو ملا، سب سے پہلے تو اس بات پر حیرانی ہوئی کہ انکل ڈاکٹر کو میری پسند کا کیسے پتا چلا جو انہوں نے اتنا خوب صورت سروق بنایا۔ ایک کیوٹر حسینہ کے ہاتھ میں اور ایک کیوٹر بلی منظر میں مکان کی منڈیر پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ایلیا صاحب سے ملاقات کے بعد اپنی محفل میں پہنچے، مگر پتا چلا کہ آپ نے میرے پچھلے ماہ کے خط پر سو سے رکھ کر کھائے اور پھر مسکراتے ہوئے روئی کی نوکری میں چھینک دیا۔ مگر بلی غیبت ہے کہ آخر میں رسید ہی دے دی۔ اس دفعہ کے شمارے میں سب سے پہلے ایچ اقبال صاحب کی تحریر "آخری بادشاہ" پڑھی۔ کہانی تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد معلوماتی اور لا جواب انداز تحریر کا شاہکار تھی۔ مگر بہادر شاہ ظفر اور اس کے بیٹوں کا افسوس ناک انجام ہمیں بھی افسردہ کر گیا۔ کاشف زہیر صاحب اصل کھیل میں کھیل کے پیچھے اصل کھیل کو بے نقاب کرتے نظر آئے۔ تاہم جارج کامیاب رہا اور جم کر شٹن کے قتل کے باوجود جان والٹر اور دوسرے مجرم پکڑے گئے۔ واہ واہ واہ..... بہت خوب..... طاہر جاوید مغل نے تو اس دفعہ "میں زندان" کی قسط میں مزہ دے دیا اور ہادی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی روم کی سیر کروادی۔ یہ قسط کافی تیز رہی اگلی قسط میں پتا چلے گا کہ ارم جلال بھائی کے ساتھ کیا گل کھلاتی ہے اور بطورہ یا حجاب اپنا گھر بچانے کے لیے کیا کرتی ہے۔ مرزا امجد بیگ اور ملک مسعود حیات کی کہانیاں تو سنسنی کی جان ہوتی ہیں۔ بیگ صاحب کی وقت کا دھارا معاشرے کے لوٹ کھسوٹ میں مصروف کرداروں کی کہانی بہت اچھی لگی۔ تاہم بیگ صاحب اپنے موکل کو رقم واپس دلانے میں کامیاب رہے۔ عبد القیوم شاد کی چارہ گر حیران کن رہی اور قلم بے چارہ بیوی سے نجات حاصل کرنے کے چکر میں اپنی جمع پونجی بھی لٹا بیٹھا۔ بہر حال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ منظر امام کی مزاحیہ تحریر "نئی الف لیلہ" ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔ اس کہانی سے یہ سبق ضرور ملا کہ اپنے معاملات خود حل کرنے چاہئیں ورنہ بہن ماموں اور بانگے دادا جیسے کردار تو ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ محی الدین نواب صاحب کے زور قلم کا نتیجہ "ماروی" کی چوتھی قسط بھی شاندار رہی۔ سیاست دانوں اور محبوب چاند پوکی چچلش نے مزہ دیا۔ دیکھیں سمیرا اپنے مقدمہ میں کہاں تک کامیاب رہتی ہے۔ مختصر کہانیاں جوان اور انصاف بھی اچھی رہیں اور سنسنی خیزی سے بھرپور رہیں۔ ضیا نسیم بلگرامی کی "شیخ محمد" بہت اچھی کاوش تھی۔ اللہ کے ولیوں کے حالات و واقعات ہمارے ایمان کو تازہ کر دیتے ہیں۔ اس دفعہ کے شمارے کے آخری صفحات پر اسما قادری کی بول زبردست لگی۔ واقعی انسان بعض اوقات اسی کے ہاتھوں ڈالیں وہ سوا ہوتا ہے اور پریشانی اٹھاتا ہے کہ جس سے وہ بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔ صبا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مگر عاشر جیسے لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں کہ جس نے صبا کو سہارا دیا۔ مجموعی طور پر بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں ویسے تو سب ہی اشعار و قطعات اچھے تھے مگر محمد عمار حسین معاویہ آف خانیوال اور سہاگل آف کراچی کے اشعار بہت اچھے لگے۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ زبردست تھا جو کہ صرف ایک ہفتے میں تمت بالآخر ہو گیا۔"

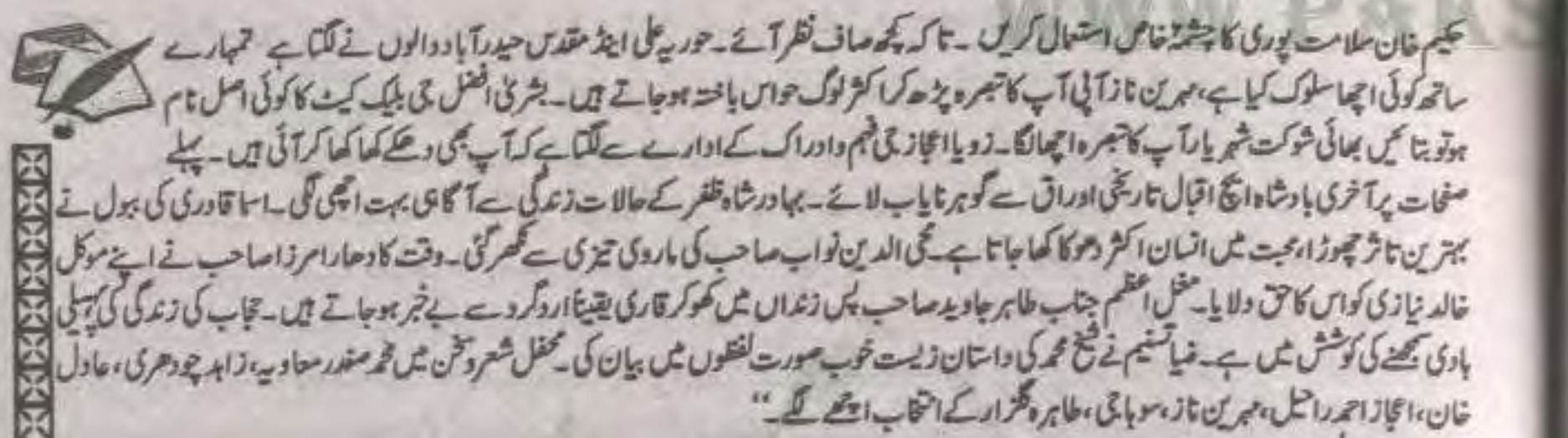
✽ اشفاق شاہین، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اس بار کا سروق تو گزرا رہے لائق بھی نہیں تھا۔ خیر جون ایلیا کے انشائیہ پر پہنچے

سواہجی، لاہور سے تشریف لائی ہیں ”ماہ مارچ کا خوب صورت شمارہ 19 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑی تو خیال آیا کہ اس بارڈاکراکل نے طاہرہ پریشان کو یہ اعزاز بخش دیا اور وہ کہوڑ کو کہہ رہی ہیں خط ناظم پر پہنچا دینا۔ انشاء ہے معنی کہ اب صرف آصوب رہ گیا انسانیت تو ختم ہوگئی، جاوید صاحب کرسی صدارت کی آدمی مبارک باد کیونکہ معلم کا پیشوا تو آسمانوں سے اتر ا ہے۔ فخر کی عزت کرتا ہم سب کا فرض ہے۔ ہمایوں صاحب اللہ تعالیٰ کا کمراد ا کریں۔ والدین کی دعائیں لگ گئیں۔ (بچ گئے) صوبہ، حوریہ، مقدس آپ صنف کرخت کو خوش کرنے کے لیے صنف نازک پر کیوں تنقید کرتی ہیں۔ محفل استعمال کریں۔ شاندہی آپ کم لکھتی ہیں لیکن بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مغل صاحب اعزاز بیان اس لیے مختلف لگا کچھ قاری مرد حضرات لڑکی بن کر لکھتے ہیں۔ جلت آبی مہرین ہمیں آپ کی بات پلوں چسپ کر آنے والی پر بہت ہنسی آئی کیونکہ آپ کبھی کبھی حقیقت پر مبنی باتیں کرتی ہیں۔ بشکلی صاحب اتنی سی



مہرین ناز، اعجاز احمد راضی، حیدر آباد سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "شمارہ ماہ مارچ اپنے مقررہ وقت پر جلوہ افروز ہوا۔ نگاہ سرورق پر مچی تو ہم یہ قاصر رہے کہ موجودہ حسینہ لگی ہے یا یہ لگی کیورتی جو سرورق کی زینت بنی۔ جون صاحب کے بے معنی میں ہر بات با معنی لگی۔ اور یہ کہ ایڈیٹر صاحبہ کی لکھل درست ہے کہ وقت اتنی تیزی سے گزر رہا ہے، چاہی نہیں چلا کہ صبح ہوئی کب شام یہ ساری حیل و حجت زندگی کے ساتھ پھر زندگی تمام۔ ادارہ راضی محفل کی تعریف بڑے خوب صورت لفظوں میں کی ہے، خیر ہو آپ کی۔ محفل کے ساتھیوں کو جشن بہاراں مبارک۔ صدر محفل محمد جاوید کے مادرِ پڑھ کر خوشی ہوئی، بے شک بھائی اپنی بہنوں کے لیے ایسے فکر مند ہوتے ہیں۔ مبارکباد۔ ابراہاد وارث لکھتا ہے تم نے جنگ والے پکوڑے کھا کر یہ لکھا ہے۔ قدرت بھائی جو تعریف کے قابل ہوتے ہیں ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ علی ڈوگر، شوکت شہر مار اور حبیب احمد آپ کا انداز تحریر اٹو کھا اور ہے، آپ بھائیوں کے لیے بہت سی دعائیں۔ شبانہ جی آپ نے دوستی کا کفن ادا کر دیا۔ بلیک کیٹ ڈیئر ٹھیکس، زویا اعجاز ویلڈن کافی بندہ شناس ہیں۔ مکمل کاظمی صاحب آپ کا احتجاج اثر کرے گا۔ انفل محمد عزیز ہم بزرگوں کی بہت قدر و احترام کرتے ہیں۔ ابتدائی صفحات میں ایچ اقبال صاحب کا یاد شاہ کے ساتھ حاضر ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت کے نشیب و فراز کو خوب صورت پیرائے میں بیان کیا۔ شہزادی زرتاج کے عشق کی روداد سنیں ہے۔ محبوں کے نقیب طاہر جاوید محفل صاحب پس زنداں عمدہ لگی۔ بلاشبہ محفل صاحب کا انداز بیان ان دیکھے درد و جھجھکاؤ ہے۔ کہانی میں مزید آگیا۔ محی الدین نواب صاحب کی ماروی کی چوتھی قسط بے مثال رہی زور قلم اور تیرا وہ، استوری میں ماروی کی بے بسی محبوب چائے یو کی دیوانگی اور ت جلالی کی سازشیں عروج پر ہیں۔ بیول اسما قادری کی بے مثال کاوش عاشر انور کا کردار اچھا لگا، صباحت کی سوچ آخر میں ثبت ہوئی۔ مرزا امجد صاحب وقت کا دھارا خوب صورت تحریر اپنا گھر ہر انسان کی ضرورت و خواہش ہوتی ہے۔ مہد حاضر میں اس خواہش کے حصول میں لوگوں کی فریب کاریاں مشکل کر دیتی ہیں۔ شمر عباس صاحب کی انصاف بہت پسند آئی۔ قلم جب حد سے بڑھ کر سامنے آئے تو قدرت اس کا انتقام لیتی ہے، بڑے کلارٹس نے انصاف کا پورا کیا۔ چارہ گر میں عبدالقیوم شاد نے ان لوگوں کو سبق دیا ہے جو اپنی شریک حیات سے چھٹکارا چاہتے ہیں، اس خواہش کی تکمیل میں الٹا نقصان ہی ہے، نئی الف لیلہ منظر امام کی دلچسپ اور عمدہ حاضر میں ہونے والی حقیقت پر مبنی استوری ہے۔ محفل شعر و سخن نے دل شاد کر دیا۔"

سینٹینس ڈائجسٹ 10 اپریل 2014ء



۱۴۰ راجا شاقب محمود جنجوعہ، پنڈا دون خان سے تشریف لائے ہیں ”مارچ کے سپنس ڈائجسٹ کے ٹائٹل کی حینہ مہ جیس ہاتھ میں کیوٹر پکڑے بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ جون ایلیا اپنے انٹائیے ”بے مٹی“ میں انسانیت سے محبت کا درس دے رہے تھے۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور کا خط بہت زبردست تھا اور واقعی انعام کا حق دار تھا۔ ایچ اقبال کی تاریخی کہانی ”آخری بادشاہ“ تجسس سے بھرپور اور بہت ہی عبرت انگیز تھی۔ کاشف زہیر کی ”مسل کھیل“ طاقت ور لوگوں کے درمیان دریافت اور ایجادات کی لڑیہ خیز رو داغی۔ مرزا احمد بیگ ”وقت کا دھارا“ میں آسان انقباض پر مشکلات کو دعوت دینے والے دعوؤں کا کچا چٹھا کھولتے ہوئے نظر آئے۔ ”میں زنداں“ اور ”ماروی“ سب پر چھا گئیں۔ ”بیول“ میں اسما قادری سازشوں اور خواہشوں کے درمیان رشتوں اور رستوں کے انتخاب کی کشمکش میں جھلا ایک مومی تیکر کے اضطراب سے آگاہ کر رہی تھیں۔ ”مغفل شعر و سخن“ کا انتخاب دل کو چھو لینے والا تھا۔“

✽ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لہ سے چلے آ رہے ہیں "ما سئل مرسل سید عکلیل حسین کاظمی کی راہ سکتے او اس تھی۔ جون ایلیا تصعب کے نتائج بیان کر رہے تھے۔ اکل بھی ایک لازوال ادارے کے ذریعے کئی قسم کے دکھوں کو بیان کر گئے۔ محج جاوید ونگ سیٹ پر تھے و یلڈن جناب۔ ابرار وارث بھی و انجسٹ کے لیٹ آنے پر پریشان نظر آئے۔ قمر سی جی اے گلاں چٹکیاں نہیں۔ مہرین ناز کافی شدید غصے کے دورے میں تھیں۔ بشری افضل اور شوکت شہریار اچھے تمبروں کے ساتھ موجود تھے۔ ماروی نہ چاہتے ہوئے بھی محبوب کی طرف متوجہ ہو رہی ہے جبکہ نواب صاحب کی ولایت پلٹ جیلر کی بیٹی مرینہ مراد کو اپنی طرف لارہی ہے۔ "پس زنداں" میں مغل صاحب کے قلم نے روایتی انداز اپنایا۔ یعنی شادی شدہ ہیروئن پہ کچھ عجیب سی ممانعت ہے۔ ان کی ہیروئن کی برداشت بھی حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہادی کے ساتھ "حجاب" حجاب میں گھومنے کے باوجود بھی گلزار کی نظروں میں آگئی ہے۔ لگتا ہے اب اس

کے شکی شوہر کو اس پر مزید ظلم توڑنے کا موقع ملے گا۔ مرزا احمد بیگ کے ساتھ طویل عرصے بعد ملاقات اچھی لگی۔

طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے محفل میں حاضر ہیں۔ مارچ کا سہنس آخری مغل بادشاہ کی سوانح عمری لے کر آیا پڑھ کر دل کی عجب سی کیفیت ہو گئی، شہزادی کا اور فیضان کا انجام دردناک تھا۔ ایچ اقبال غالباً جاسوسی ناول لکھتے رہے ہیں یہاں بھی خوب لکھا اور جہاں جہاں سے مدد حاصل کی وہ مستند کتابیں، درخواست ہے کہ باہر پر بھی تفصیل سے لکھیں۔ شکر یہ۔ کاشف زہیر صاحب اصل کھیل لے کر آئے اور بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں اپنے اپنے انداز میں تحریر ابھی تک نام صرف دلچسپ ہے بلکہ اپنے اندر ایک سبق بھی ہے۔ حجاب، بھڑار، ہادی، یہ سب کردار آخر میں کس طرح کہانی کے حسن کو بڑھاتے ہیں یا گہنا دیتے ہیں یہ سب، طاہر صاحب کے اوپر ہے کہ کہانی کو کہاں اور کس طرح ختم کرتے ہیں۔ تو ریر یا ض کی غلطی بھی خوب تھی۔ مرزا احمد بیگ صاحب کا وقت کا دھارا موجودہ حالات کے پس منظر میں پلاٹ بیچنے والی ایجنسیاں جہاں ساری ہی چور نہیں ہوتیں مگر کچھ شاہ جی جیسے بازی گر بھی ہوتے ہیں۔ سلیم انور صاحب کی جوان دلچسپ کہانی وہیں چارہ گر بھی اچھی رہی یہ سب بدیہی کہانیاں ہیں جنہیں اپنے قالب میں ڈھالنے اور سہنس کے لیے لکھی گئی بہت اچھی کوشش ہے۔ منظر نامہ بھی اپنے انداز میں خوب رہے۔ ماروی جب شروع نہیں ہوتی تھی تو ہم سمجھے تھے یہ عمر ماروی کی دلچسپ رومانوی داستان ہوگی جسے نواب صاحب اپنے انداز میں لکھ کر سہنس کے پڑھنے والوں کے لیے ایک اور شاہکار تخلیق کریں گے مگر یہ ماروی تو کچھ اور رنگ لیے ہوئے ہے۔

دلاور تاج دین، اعجاز آرمیں، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے "مارچ کا شمارہ 19 فروری کو موصول ہوا۔ سرورق پر حسینہ کی تصویر اچھی تھی ہاتھ میں کیوٹر پکڑے مسکرا رہی تھی حسینہ کے چہرے کا مکان دیہات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ صحیح کہا ہے جون صاحب نے کہ آج کے دور میں نفرت کا دور دورہ ہے۔ لسانی مذہبی گروہی اور تہذیبی نفرتیں ہیں، خاص طور پر جیل کے ماحول میں۔ محمد جاوید تحصیل علی پور کرسی صدارت پر برابر اجماع نظر آئے۔ آپ کی باتیں بہت سچ ہیں۔ ڈاکٹر نسیم اکبر شے نہاٹے نظر آئے، مہرین ناز آپ تک نظر لوگوں سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔ زویا اعجاز، لاہور کی انٹری تو کسی بادشاہ کی طرح ہوئی۔ ماروی فاروق آف کوئٹہ کہاں غائب ہیں آپ کی محفل سے اتنی لمبی غیر حاضری۔ سہنس کی قاری صائمہ سے گزارش ہے کہ سہنس میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری کریں تاکہ رابطہ ہو سکے۔ طاہر جاوید محفل کے قلم سے لکھی ہیں زنداں پڑھی۔ ہادی کو آخر علیز اہل غمی کی پر حجاب کے روپ میں جو ایک شادی شدہ عورت ہے اور حجاب کی ازدواجی زندگی مشکلات سے بھری پڑی ہے۔ نجی الدین نواب کی ماروی پڑھی۔ محبوب چانڈیو ماروی کی جان بچانے میں زخمی ہو گیا اور دوسری طرف شہمت جلالی ایڈیٹر جیلو شاہ کہیں جس میں ہیں کہ ماروی کہاں غائب ہے۔ مرزا احمد بیگ کی کہانی وقت کا دھارا پڑھی جس میں ایڈووکیٹ بیگ صاحب اپنے مسائل نیازی کو دھوکے باز بلڈ رشاد سے پیسے دلوانے میں کامیاب رہے۔ اس کا دوری کی بول پڑھی جس میں شوہر کی دنیا کی عکاسی کی گئی ہے۔ صبا یعنی صباحت پاکستان سے ہمارے اپنے تھیں جانی ہے جہاں ایک اداکار کپور کے عشق میں جیلا ہو کر شادی کر لیتی ہے۔ سبق آموز کہانی ہے خاص طور پر ان لڑکیوں کے لیے جو اپنے ماں باپ کی عزت کو داؤ پر لگاتی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں افتخار احمد تارڑ، سوباجی اور حاجی محمد زاہد اقبال زرگر کے اشعار اچھے تھے۔

فوزیہ تبسم، خانیوال سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ "مارچ کا شمارہ 21 فروری کی ایک سہانی صبح کو ہمارے خوب صورت ہاتھوں کی زینت بنا۔ بچہ کے خیالوں میں گم سرورق کی لڑکی کا کیوٹر سے باتیں کرنا اچھا لگا۔ فہرست کو ایک نظر دیکھ کر انشائیہ بے معنی میں ایک کڑواں نظر آیا۔ محفل میں قدم رکھا تو دیکھا کہ 2013ء کے ریکارڈ بلیک لسٹ، ہولڈر محمد جاوید بے عقلی کی ڈگری دکھا کر صدارت پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر نسیم بھائی، آپ کا خط ہمیشہ مثبت ہوتا ہے۔ ہمارے محفل صاحب، غلطو پر بھی کچھ لکھ دیا کریں۔ مہرین ناز کے خط میں اس دفعہ لیا پوتی کم نظر آئی۔ یہ ضرور لوہا کی خوشبو نے اپنا اثر دکھایا ہے۔ زویا ایڈیٹر، حقوڑا سا فہم و ادراک اپنے لیے بھی رکھ لیتا۔ یہ جو ہر وقت "ہر اہر" نظر آتا ہے اس سے نجات مل جائے گی۔ پس زنداں سے آغاز کیا اور ایک ہی نشست میں قسط ختم کی۔ حجاب اور جلال آگے چل کر کیا رنگ دکھائیں گے؟ ماروی بھی گزرا تو کر رہی ہے، مگر رفتا رہت سہ سہ ہے۔ اصل کھیل میں جان والٹر کا انجام ہوا۔ وقت کا دھارا میں ایک بار پھر مرزا احمد بیگ نے بے گناہ خالد نیازی کو اس کا حق دلادیا۔ فتح محمد کے کرامات اور واقعات بہت پسند آئے۔ آخری صفحات پر ببول ایک بہترین کہانی۔ ہر چمکتی چیز کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے۔ آخری بادشاہ بھی آخر کار رنگوں کی جیل میں چل بسا۔ محفل شعر و سخن اور کتریں بھی خوب رہیں۔

حور بیہ علی مروت اور مقدس، نورنگ سے محفل میں شریک ہیں۔ "کالج میں فل مصروفیت کے دن، پھر بھی سہنس کا انتظار۔ یہ سہنس سے ہماری بے پناہ محبت ہی تو ہے۔ خوب صورت سرورق اور لڑکی کے ہاتھ میں چوڑیاں پسند آئیں۔ انشائیہ بے معنی ہر درد مند دل رکھنے والے کے دل کی آواز۔ محفل میں قدم رکھا تو سب سے آگے شکوے ہاتھ میں پکڑے محمد جاوید نظر آئے۔ ہمایوں سعید تمہارے جیسے بندے کا لفظ مروت سے آگاہ ہونا عجیب لگا۔ قدرت اللہ بھائی ہمیں بھی دیکھ کر دیتے۔ منہ تو نہیں دکھ جاتا۔ آغاز پس زنداں سے، علیز عرف حجاب اور ہادی کا میل جول آگے کیا رنگ لاتا ہے۔ ماروی کا سر جو نظر آنا شروع ہو گیا ہے۔ اچھی قسط کا انتظار ہے۔ وقت کا دھارا میں بیگ صاحب کے آگے شاہ جی کا بھانڈا اچھوٹ ہی گیا۔ ببول کی صورت میں آخری صفحات پر بدلتی یاد رہنے والی کہانی دل کی آنکھوں سے پڑھی۔ ابتدائی صفحات پر آخری بادشاہ کی صورت میں بہادر شاہ ظفر کا انجام افسردہ کر گیا۔"

نادریسیال، سینٹرل جیل میانوالی سے تعریف لائے ہیں۔ "میں آپ سے بہت خفا ہوں کیونکہ میں آپ کو ہر ماہ خط لکھتا ہوں اور ہر ماہ میں سہنس خریدتا ہوں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور میرا ایک بھی خط شامل نہیں ہوا، یہ تو بہت بڑی نا انصافی ہے (نا انصافی نہیں مجبوری ہے) میں زنداں بہت اچھی ہے طاہر مغل صاحب بہت ہی اچھے لکھاری ہیں اور میرے پسندیدہ بھی اور میری بہن دعا ہے کہ اسی طرح طاہر صاحب آگے ہمیں اور

پڑھنے کو دیں۔ میں آپ کو خط نہیں لکھتا۔ یہی سوچ رکھا تھا میں نے پر کیا کروں دل جو نہیں مانتا۔ ماروی اوئے ہوئے کیا کہنے یہ تو کڑا کے دارمینی جاری ہے، میں سلیوٹ پیش کرتا ہوں نواب صاحب کو وری گڈ چائو! عمران بلوچ کی وقاات کا سنا افسوس ہوا ایک نایک دن ہم نے بھی تو جانا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ محفل کے اشعار تقریباً اچھے ہوتے ہیں۔ تاریخی کہانیاں بھی بہت پیاری ہوتی ہیں، باقی شمارہ ابھی پڑھنا ہے اور ہاں میرے لیے دعا کرنا کیونکہ میں سزائے موت کا قیدی ہوں۔" (اللہ جلد از جلد آپ کی مشکلات آسان کرے)

قیصر اقبال گپے، بکول ضلع بھکر سے تبرہ کر رہے ہیں۔ "فروری کے دوسرے عشرے میں بہار نے اپنی آمد کا اعلان یوں کیا کہ تاحدنگا و سروس کے پودوں پر ہزاروں پھول کھل اٹھے۔ سروس کے خوش رنگ پھولوں کی طرح مارچ کا سہنس بھی ہمیں ایک خوش رنگ پھول کی طرح لگا۔ سرورق کی حسینہ کے ہاتھ میں بھی اگر کیوٹر کی جگہ مٹی سمیت سروس کا پھول ہوتا تو خوشبو بھی سونگھ لیتی اور اپنی ناک بھی کھچاتی رہتی۔ انشائیہ میں بے معنی کی صورت میں جون ایلیا نے ہمارے سامنے ایک کھلی حقیقت بیان کی۔ محفل میں حاضر ہوئے تو دور سے ہی پتا چل گیا کہ شیروں کی چوکیداری گیدڑ کر رہا ہے۔ بشری افضل 11 ابھی تک گنتی کے چکر میں ہوئے زویا بی بی! ہمیں پتا تھا کہ آپ کی مٹی سے ملنے والا فہم و ادراک ہمارے جیسوں کے لیے نہیں ہے کیونکہ آپ نے بورڈ جو لگا رکھا ہے فہم و ادراک سبیل فارمکس کے ہونے لاء ٹیک زویا ایڈیٹر جاوید۔ کہانیوں کا آغاز پس زنداں سے کیا۔ حجاب کے دل میں اٹھنے والی بغاوت کی چنگاری ضرور شعلہ بنے گی۔ نواب صاحب کی ماروی کوئی الحال تو دل پر جبر کر کے پڑھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ کہانی آگے چل کر اپنی گرفت میں ضرور لے گی۔ اس کا دوری شاید پہلی بار سہنس کے آخری صفحات پر آئی ہیں اور ببول کی صورت میں ایک بہترین کہانی پڑھنے کو ملی۔ صباحت کا کردار عاشق کی محبت اور ساتھ میں اسلام کا بول بالا سب کچھ بہترین۔ وقت کا دھارا میں بیگ صاحب نے اپنے پتے شوکر کے شاہ جی کو چاروں طرف سے خوب گھیرا۔ عبد القیوم شاد کا نام ایک عرصے کے بعد سہنس کے صفحات پر چارہ گر کی صورت میں نظر آیا۔ آخری بادشاہ ابتدائی صفحات کی کہانی، بہادر شاہ ظفر کی موت کے بعد برصغیر پر مسلمانوں کے عروج کا سورج ڈھل گیا۔ کاشف زہیر کی اصل کھیل میں جان والٹر اپنے انجام سے دو چار ہوا تو جارج یاب ٹھہرا۔ سراغ رسانی سے پھر پور خیر ریاض کی غلطی بھی خوب رہی۔ ضیا نسیم بلکرا کی فتح محمد کی زندگی کے ایمان افروز واقعات لے کر آئیں۔ منظر نامہ کی نئی الف لیلہ بھی خوب رہی۔ کتریں بہت خوب رہیں اور محفل شعر و سخن میں نوشہہ گھڑا کا انتخاب پسند آیا۔ مارچ کا شمارہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ لگا۔"

مارون رشید، مردان سے چلے آ رہے ہیں۔ "مارچ 2014ء کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑی تو بچپن کا وہ زمانہ یاد آیا جب ہم بھی کیوٹر اڑا کرتے تھے۔ محفل کی طرف بڑھے تو سب سے پہلے محمد جاوید تحصیل علی پور سے ملاقات ہو گئی۔ یار جاوید! بچوں کو تنگ نہیں کرتے نا، خاص کر قیصر اقبال اور مہرین ناز۔ ڈاکٹر نسیم اکبر ایک بار پھر طویل تبرہ کے ساتھ نظر آئے۔ اس خوش فہمی میں کس شاید پھر Chance لگ جائے۔ یار اب تمہارا خط تو شائع ہو گیا، اس خوشی میں مٹھائی کھلاؤ گے؟ ابرار وارث! یار مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے سخت سردی کا موسم ہو اور آپ نے وضو کرنے کے لیے بار صاحب سے گرم پانی مانگا ہو اور اس نے آپ کو لوٹے میں فریج کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیا ہو، جب ہی تو آپ بار صاحب کے خلاف عروہ جی کو آکسٹے ہو۔ ہمایوں بہت بہت مبارک ہو یار۔ مہرین ناز! اب آپ نے کئی پتے کی بات۔ اکبر تو بڑا ہی دار بند ہے۔ اس بار بیگ صاحب بہت آسان اور پر مزاح کیس لے کر آئے تھے۔ قربان شاہ جیسے باریش فراڈیے آج کے زمانے میں بھی ہیں، میں نے دیکھے ہیں۔ سلیم انور صاحب کی جوان بھی خوب رہی۔ زندگی بہت پیاری چیز ہے، جان بچانے کے لیے انسان کیا کیا نہیں کرتا۔ محفل شعر و سخن میں محمد عمار اور منزہ بصیر کے اشعار بہت پسند آئے۔ باقی سر کوئی تبرہ نہیں کر سکا ہوں۔ رات کے 12:35 بج چکے ہیں، چھوٹی چھوٹی راتیں ہیں۔ صبح سویرے کو بات ڈیوٹی بھی جانا ہے۔ اپنا خط بھی پوسٹ کروانا ہے۔"

عاطف شاہین، اردوٹی، سندھیلیا نوالی سے تبرہ کر رہے ہیں۔ "دوسری بار حاضر ہوئے ہیں، پہلی بار جانے معراج صاحب کو ہم سے کون سی رنجش تھی جس کے سبب ہمیں ردی کی نوکری کا منہ دیکھنا پڑا۔ ابرار وارث کا خط دیکھ کر ہمیں بھی حسرت ہوئی کہ ہم بھی سہنس کا حصہ نہیں اور خط لکھتی ڈالا۔ ابرار وارث میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اللہ ان کو لمبی عمر دے۔ سہنس کی دنیا میں حاضر ہوئے تو ہمیں یہ معلوم پڑا کہ یہ ایک جہان ہے۔ مختلف جذبات کے مالک لوگ، افسانوی کرداروں کی طرح چلتی پھرتی سطر ہیں، درپچوں میں رکھے ہوئے خوب صورت پھولوں جیسے اشعار، غرض ہم جیسے سادہ دل قاریوں کے لٹ جانے کا خطرہ حرف حرف پر موجود۔ سہنس کی ترقی چڑھتے سورج کے مانند ہے جس کی روشنی تیز اور آنکھوں کو چند عیادینے والی ہے۔ اللہ سہنس کو بہت زیادہ ترقی دے۔ آمین۔ محمد جاوید صاحب کو صدارت کی کرسی پر بیٹھا دیکھا تو خوشی ہوئی۔ مبارک جناب! ڈاکٹر نسیم اکبر صاحب واقعی آپ کو بہت جیتیں آتی ہیں۔ سامعین مستان بے پرواہ کا نام واقعی ہی سوا گز لہا ہے۔ مہرین کا تبرہ قابل غور تھا۔ سب سے پہلے ببول پڑھی، کیا کہانی تھی اس کا دوری کی۔ سندر کپور جیسے لوگ ہمیشہ ایسے ہی کرتے ہیں اور ان کو سزا بھی ایسے ہی ملتی ہے۔ نجی الدین نواب کی ماروی پڑھی، کچھ سمجھ نہیں آ رہا ایک ماروی اور اتنے چاہنے والے۔ بعد ازاں طاہر جاوید کی دل جیت لینے والی تحریر پڑھی۔ پس زنداں اگلی قسط کے لیے قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کے برابر لگ رہا ہے کہ آئے گا۔ اشعار اچھے تھے۔ Overall سہنس Good رہا۔"

محمد جاوید شبیر بربر، علی پور مظفر گڑھ سے محفل میں تعریف لائے ہیں۔ "مارچ کا شمارہ ملا۔ سرورق خوب صورت تھا لیکن پرانے دور کی یاد تازہ کر گیا حسینہ کیوٹر کو ہاتھ میں لے کر اور محبوب کی یاد میں کھو کر جیسے کہہ رہی ہو کیوٹر جا جا کیوٹر جا۔ جون ایلیا کی کھری کھری باتیں دل کو بہت بھائی ادارہ میں انٹل کی باتیں اداس کر گئیں۔ آنے والے دور میں ہمارے ملک کا کیا ہوگا۔ اب تو روزانہ شہدا کی لاشیں ہم گن نہیں پاتے۔ ہم سب کو چاہیے کہ اب صرف اللہ کی اطاعت اور سنت نبوی پر عمل کر کے پروردگار کو راضی کرنا چاہیے۔ اس سے ہمارے بھی اور ہمارے ملک کے حالات بھی بدل جائیں گے۔ میرے شہر علی پور کے لکھاری محمد جاوید کا تبرہ شاندار تھا اور واقعی صدارت کا اہل تھا۔ جاوید صاحب آپ کا لگ کر نا واقعی صحیح ہے آئندہ شکایت کا موقع نہیں ہوگا۔ کھیل کا غلطی اس



دفعہ خفا سے لگ رہے تھے۔ بہر حال خود پرستی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ وہاں آئے آپ کے بغیر محفل سو فی سو فی سے لگے گی۔ کاشف زہیر کی سہنس سے بھر پور تحریر اصلی مکمل نے متاثر کیا۔ پس زنداں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، باقی تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

سید اکبر شاہ، اوگی نامبرہ سے چلے آ رہے ہیں۔ سہنس کے انتظار سے جان لبوں پر آگئی تھی۔ میر کا یار اندر نہ رہا اور ہم نے حسب معمول سرورق کا تقصیراً جائزہ لینا شروع کیا۔ دوشیزہ سرورق طاؤس طناری عملی تفسیر بنی تھی۔ ہاتھ پر بیٹھے کیوتر کی قسمت پر اش کر اٹھا۔ سر سے سر ملاتے بے معنی کے انشائیہ پر سرگم شروع کی کہ ”انسان گھر بدلتا ہے، رشتے بدلتا ہے، دوست بدلتا ہے مگر پھر بھی پریشان رہتا ہے؟ کیونکہ وہ خود کو نہیں بدلتا۔“ ونگ پوسٹ پر محمد جاوید موجود تھے۔ آبشار احمد، نام بہت چارہ ہے۔ سہنس ڈائجسٹ میں بھی سہنس بھری کہانیاں نہیں ہوں گی پھر تو..... ڈاکٹر نعیم اکبر قلم سے خوب گل کاریاں کرتے نظر آئے۔ مفصل تبصرہ پڑھ کر نکتہ آفریں دماغ کی داد دینی پڑی۔ ہمایوں سعید سمجھا کر دیار۔ اسنے صاحب محفل ہونے کے باوجود بھی۔ نیازی بھائی، آپ ننھے میاں کہہ کر ڈھکے چپے انداز میں کیا کہنا چاہتے ہیں، وہ میں خوب سمجھتا ہوں۔ مہرین ناز صاحب، آپ کی بات سے دل کو فرحت ملی۔ شوکت شہر یار، آپ کے شور سے پر عمل چلا ہونے کے لیے، نیون لاز اپانی کرنا شروع کر رہا ہوں۔ زویا بانی کی بیدار بخشی پسند آئی۔ کلید بھائی اسی طبع آزمائی ہوتی رہتی ہے۔ دل کو چھوٹا نہیں کرو۔ مجھے اپنے الفاظ کا سب سے بڑا قدردان سمجھ کر آجائیں۔ حسب سابق پس زنداں سے کہانیوں کا مطالعہ شروع کیا۔ ہمارا شک یقین میں بدل گیا کہ حجاب ہی علیہا ہے۔ علیہا کے شادی شدہ ہونے سے کچھ بچنے کا احساس ہوا۔ لکاکر کی ثروت کے برخلاف علیہا کا آزاد خیال ہونا پسند آیا۔ کہانی خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہے۔ ماروی میں وہی محبت کا رونا۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی آخری بادشاہ پڑھی۔ ماضی کی تلخ حقیقتوں کو پڑھ کر ایسا لگا کہ دھکیں رگوں کو پھر سے پھیرا گیا۔ انگریزی پلٹارے مثل دور حکومت کا زوال اور بالآخر تخت الٹ گیا تھا۔ اینڈ میں زرتاج کی بے بسی دہی کر گئی۔ اصل مکمل کاشف زہیر کی عمدہ تحریر تھی۔ جارج کی ایمانداری قابل ستائش تھی۔ ایسے ہی فرض شناس پولیس والوں کی قلت ہے پاکستان میں۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی وقت کا دھار سے کافی محفوظ ہوئے۔ خوب پنجہ آزمائی کے بعد کیس جیتا گیا۔ منظر امام غنی الف لیلہ لیے حاضر تھے۔ اردو ادب کا یہ کلاسک بھی زبردست رہا۔ سبق آموز کہانی تھی لیکن مستفید ہونا شرط ہے۔ جو ان پڑھ کر یقین کرنا مشکل ہوا کہ منصف نازک کی اتنی حاضر دماغی؟ بہر حال کہانی اچھی تھی۔ انصاف کچھ خاص نہیں تھی۔ اساقادری کی انمول تحریر بول کا مطالعہ کیا۔ ”ایک ایک کی چار لگانا“ یہاں بھی یہی فارمولہ اپنایا کیا مصنف نے۔ بے راہ روی کا شکار لڑکی جب صباحت کے مانند خواب دیکھنے لگے، صہبائے سیم وزر کی رعنائیاں اور دلبری کے انداز اپناتے تو اس کا حاصل یہی ہوتا ہے۔ اشعار معیاری تھے۔“

بشری افضل، بہادر پور سے محفل کی زینت ہیں۔ 20 فروری کو سہنس ملا۔ ٹائٹل اچھا تھا کیوتر اس کی نشانی ہے مگر منصف نازک کی آنکھیں بھی لگ رہی ہیں اور کچی محفل کی منصف نازک! مگر پورے ٹائٹل پر براجمان ہے۔ جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ بے معنی پڑھا آپ کے خط میں پچھنے اکل کی باتیں سنیں کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ محمد جاوید کا تبصرہ جاندار تھا۔ اسی لیے کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ مبارک ہو۔ جاوید شہر اپنے قلم کو زبان دے ہی ڈالیں ان کا نگہ دور کر دیں۔ سہنس کے ساتھ کیوں زیادتی کی جا رہی ہے بھی اس محفل میں لکھنے سے پتا چلتا ہے کہ کتنی بے بسی شوق سے اس محفل کو جو ان کرتی ہیں۔ مہرین ناز آپ کو لوگوں کی بڑی پرکھ ہے اور مزاج آشنا ہیں۔ حبیب احمد دیکھ لیں اگلے نے آپ کا تبصرہ لگا دیا۔ سالگرہ مبارک ہو۔ کلید حسین کاظمی، طاہرہ یا سنین، سید اکبر شاہ مختصر تبصرہ کے ساتھ ساتھ موجود تھے۔ چارہ گر قلم نے بیوی کے ساتھ بے وفائی کی مگر اس کی مزا اس کو یہ ملی کہ قلمورائے قلم کو اپنے بوائے فریڈ کے ساتھ مل کر ایسا سبق دیا کہ تمام عمر یاد رکھے گا۔ شیخ محمد، ضیا نسیم بلگرامی کے ایمان افروز واقعات پڑھے، معلومات سے علمی خزانے میں اضافہ ہوا۔ غنی الف لیلہ میں منظر امام نے بہت خوب صورت پیرائے میں ہر بات مدلل انداز میں بھائی ہے۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار اچھے اور معیاری تھے۔ محمد صفدر، صفدر معاویہ و کثری اسٹیڈ پر ہیں، شعر و آقی اچھا تھا، انعامی قرار پایا مبارک ہو۔ انصاف کہانی کا ٹیپو خاصا سیر تھا۔ آخر میں ایسا دھماکا کہ باپ نے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ بول بہترین کہانی تھی اور ان لڑکیوں کے لیے صحت آموز بھی جو محبت کو ماں باپ اور خونی رشتوں پر ترجیح دیتی ہیں وہ بھی ایک غیر مذہب کے ساتھ محبت کر کے۔ دنیا میں ہی انجام دیکھ لیتی ہیں خدا ایسی لڑکیوں کو صاف فرمائے۔“

انور یوسف زئی، اسلام آباد سے تعریف لائے ہیں۔ سہنس اس ماہ جلد ہی یعنی 18 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق بچوں کو ڈرانے کے لیے رکھ لیا ہے۔ آپ کے خط کی محفل کے سردار اس ماہ ملی پور کے جاوید صاحب ٹھہرے۔ مبارک باد قبول کریں۔ اپنے ہم شہری کلید کاظمی صاحب کے شکوے میں ان کا ہم نوا ہوں کہ میرے ہر ماہ تبصرہ لکھنے کے باوجود بلیک لسٹ تک میں نام نہیں آتا۔ کاظمی صاحب مایوس نہ ہوں بلکہ ”بیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ“ ہم برسوں کے سہنس کے قاری ہیں کبھی الوداع نہیں کہیں گے۔ پہلی کہانی ایچ اقبال کی آخری بادشاہ ایک جامع اور پراثر کہانی تھی مگر کافی اختصار سے کام لیا گیا۔ پس زنداں میں حجاب اب ہادی کوئل تو گئی ہے مگر ایک نا آسودہ شادی شدہ کے روپ میں جو کچھ بچا نہیں۔ دوسری قسط وار کہانی نو اب صاحب کی ماروی پر نوکستس۔ شہرے کی آخری طویل کہانی اساقادری کی بول البتہ ایک شاندار تحریر تھی۔ صباحت ایک ہندو گھوکا سندھ کے ہاتھوں برباد ہوئی اپنی سادگی اور بے وقوفی کی وجہ سے، آخر کار عاشق انور نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ بدلی کہانیوں میں کاشف زہیر کی اصل مکمل سب سے بہتر رہی۔ دلی کہانیوں میں منظر امام کی غنی الف لیلہ ایک اچھوتی تحریر تھی جو لطف دے گئی۔ کتر نہیں بھی اس بار مناسب تعداد میں اور اچھی رہیں۔“

رمضان پاشا، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ پھر سے اس عالیشان محفل میں حاضر ہو رہا ہوں، بشرطیکہ سہنس والوں کی طرف سے پذیرائی ملے (کیونکہ نہیں جناب، پھر سے خوش آمدید) محفل بادشاہوں کی تاریخ تو پڑھی ہوئی ہے لیکن کہانی کا کارکی لکھی ہوئی تحریر میں جو لطف ہے وہ تاریخ دانوں کی تحریر میں کہاں؟ اس بار غیر ملکی کہانیوں میں اصل مکمل سب سے بہترین کہانی تھی، غلطی بھی کافی دلچسپ کہانی تھی، مزہ آ گیا۔ انصاف بھی بہت پراثر



کہانی تھی، لطف آ گیا۔ طبع زاد کہانیوں میں بول اچھی نہیں لگی، ماضی میں اساقادری نے کافی اچھی کہانیاں تحریر کی تھیں۔ اس بار ماروی سرفہرست رہی میری نظر میں۔ غنی الف لیلہ یہ تو سرے سے کوئی کہانی ہی نہ تھی، یہ ایک طویل ترین لطیفہ تھا۔“

شوکت شہر یار، اوکاڑہ سے چلے آ رہے ہیں۔ ”جب موسم سرما کی بارش ہو، گرم بستر ہو، تو گرم گرم گاجر کا حلوہ کھاتے ہوئے سہنس پڑھنے کا مزہ ہی اور ہے۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی جو کہ حسب معمول خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ محفل کی کرسی صدارت پر فائز محمد جاوید آپ نے قیصر اقبال کے بارے میں جو بھی لکھا ہے وہ آپ کی اپنی سوچ۔ اوہ جناب مسٹر ہمایوں سعید، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو نوکر کی مل گئی۔ لوہی مہرین ناز صاحبہ نے صوبہ اقبال کو ایسا متہ توڑ جواب دیا کہ وہ اپنا سامنے کر رہ گئی ہوگی۔ قدرت اللہ نیازی صاحب، یہ لمبی لمبی چھوڑنا تو میں نے آپ سے ہی سیکھا ہے۔ محفل میں سہنس بخاری کی کمی کم از کم مجھے تو بہت محسوس ہوئی۔ شہانہ صاحب آپ گل مروت کو ایسی چیز کا مشورہ مت دو جو اس کی دھڑکن میں نہ ہو۔ حبیب چنائے آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ سید کلید کاظمی صاحب سہنس ہمارا اپنا ہے اور اپنوں سے روٹھا نہیں کرتے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری بادشاہ پڑھی، بہادر شاہ ظفر کے انجام پر بہت افسوس ہوا۔ کاشف زہیر کی اصل مکمل ایک بہت اچھی ہوئی کہانی تھی۔ پس زنداں اب آہستہ آہستہ اپنے عروج کی جانب گامزن ہے۔ مرزا امجد بیگ کی وقت کا دھار میں ریحانہ کی جلد بازی نے خالد نیازی کو پریشان کر دیا۔ چارہ گر میں قلمور اور شواستار نے بڑی کامیابی سے قلم کو بے وقوف بنایا۔ منظر امام کی غنی الف لیلہ واقعی موجودہ دور کے حالات کی عکاسی کرتی تحریر تھی۔ جن میاں نے چاروں بھائیوں کے ساتھ فراد کیا اور بائیں بھائی کو ایک کروڑ دے کر اپنی جان بچانی اور باقی رقم خود کار گئے۔ ماروی میں مرید کی انٹری نے کہانی کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ غلطی میں کوئل نے بہرین کو ڈھونڈ کر واقعی غلطی کی اور بے چارہ اپنے سر کے ہاتھوں مارا گیا۔ آخری صفحات پر کہانی بول میں صباحت نے ایک انتہائی غلط قدم اٹھایا اور سندھ اور کلید کی محبت ریت کا مکمل ثابت ہوئی۔ آخر میں عاشق انور نے صباحت کے ساتھ محبت کا حق ادا کر دیا۔ محفل شعر و سخن میں بلیک ناٹیکر، افتخار حسین اعوان، سوہاجی، قدرت اللہ نیازی، عادل خان، عباسہ محفل کے اشعار اچھے تھے۔“

مارویہ فاروق، جن سے ملی آ رہی ہیں۔ ”امید ہے آپ سب ٹھیک ٹھاک ہوں گے دسمبر 2013ء کے بعد پھر میں خط نہ بھجوا سکی اصل وجہ مصروفیت ہے نومبر میں بہن کی شادی ہو گئی اور اب میں گھر میں اکیلی رہ گئی ہوں اور مارچ میں دو بھائیوں کی منگنیاں انجام ہوئی ہیں لہذا مہمانوں کو سرور کرنے میں اور سردیوں کے کم وقت کے دنوں میں مجھے تاہم نہ مل پایا کہ خط لکھتی البتہ ہر ماہ کا شمارہ پڑھتی رہی اب اگر قلم اٹھایا ہے تو مارچ کے شمارے کی وجہ سے۔ سب سے پہلے جون ایلیا کا ”بے معنی“ پڑھا۔ واقعی بہت ہی زبردست اور قابل یقین باتیں ہیں جو نہ ماننے والے دل بھی ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جون ایلیا کو پڑھ کر صرف یہی دعا لگتی ہے کہ اب فقط اللہ ہی ہمیں راہ راست پر لے آئے۔ آپ کے خط میں معراج رسول صاحب نے جس بچی کا ذکر کیا ہے وہ واقعی دردناک ہے ہمیں اس طرح سے اپنے بچوں کو تشدد کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے کہ ان کی ناک کی ہڈی تک ٹوٹ جائے۔ سب سے پہلے اسلامی کہانی شیخ محمد پڑھی بہت قابل فخر ہے ضیا نسیم بلگرامی بہت اچھی اسلامی داستانیں پیش کرتی ہیں جس سے اسلامی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ماروی بھی اچھی تحریر ہے اسے مزید بہتر بنایا جائے۔ غنی الدین نواب ویسے تو بہت اچھے رائٹر ہیں ان کے نام کو پڑھ کے ہی ہم نے ماروی شروع کی ہے اگر اسے پور کیا گیا تو یہ سہنس کے لائق نہیں رہے گی جس طرح کنگول دن یہ دن پور ہوئی گئی..... کاشف زہیر صاحب تو ہمیشہ بہت ہی اچھے رائٹر ہیں فروری کے شمارے میں ان کی تحریر خاص حاشا کرن نہ بھی مگر مارچ کی تحریر ”اصل مکمل“ پھر بھی اچھی رہی ہے۔ کتر نہیں ہمیشہ کی طرح دلچسپ رہیں کم سے کم انسان کچھ وقت کے لیے مسکراتو دیتا ہے دنیا کے کام تو ویسے بھی ختم نہیں ہونے والے..... شہر عباس کی تحریر انصاف بہت اچھی کہانی ہے۔ منظر امام صاحب تو منفرد اور اچھوتے انداز لاتے رہتے ہیں دیری ویل اسٹوری غنی الف لیلہ، مرزا امجد بیگ صاحب کے کس پڑھ پڑھ کے دکالت کا شوق پیدا ہو جاتا ہے، اتنی ایمانداری سے کہیں بھی مل ہو جاتا ہے اور مجرم بھی پکڑے جاتے ہیں ان کی تحریر مارچ کی اچھی تحریر لگی۔ میرے لیے دعا کریں کہ میں Qta جا کے Entrytest میں پاس ہو جاؤں۔“

ابراہیم وارث، سندھیلانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”دیہاتی پس منظر اور کیوتر دوشیزہ کے ہاتھ میں بیٹھا ہوا دوشیزہ بالکل چٹکی نہیں لگی۔ ڈاکٹر اکل پلیر تھوڑی اور محنت کریں۔ جون ایلیا کی ”بے معنی“ یا معنی لفظوں سے بھر پور تھی جلدی سے خطوط کی محفل میں پہنچنے اپنا خط ڈھونڈا اور مل گیا، شکر ہے۔ کرسی صدارت پر محمد جاوید براجمان تھے۔ جاوید اکل مبارک ہو، ہم بھی دہلپٹان والی بات سے متفق ہیں کہ ہر دن مجھوں کا ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر نعیم صاحب کتنی خواتین میں اب تک ہیر وئن والی خوبیاں ڈھونڈ چکے ہو؟ ہمایوں سعید کو جواب ملے پر مبارکباد۔ قدرت اللہ نیازی کی بات اپنے حلق پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ حبیب احمد چنائے آپ کو ابھی تک میری تو تو میں میں یاد ہے؟ بلیک کیٹ کی دھواں دھار حاضری، زویا اعجاز، احمد خان توحیدی اور شوکت شہر یار کے تبصرے اچھے تھے۔ سب سے پہلے ”پس زنداں“ پڑھی۔ حجاب کو علیزہ کے روپ میں دیکھا اور گزرا کوئل کی طرح۔ ہادی شادی شدہ عورت کے پیچھے اب کیوں پڑ گیا ہے شاید نہیں یقیناً اسے عشق ہو چکا ہے حجاب سے اور حجاب کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوئی۔ اچھی غلطی بہر حال۔ ماروی کی اس قسط میں بہت مزہ آیا، پچھلی تین قسطوں کی بوریتم ختم ہوئی۔ اساقادری کی بول سب سے بہترین لگی۔ صباحت کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا، کتنے دل توڑے تھے اس نے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔ طاہرہ بگزار، پشاور۔ بشیر احمد بھٹی، بہادر پور۔ رضوان تھوکی کرپڑی، اورنگی ٹاؤن، کراچی۔ حکیم خان سلامت پوری، لاہور۔ عامل سامیں مستانہ بے پرواہ، تحصیل لیاقت پور۔ احسان سحر، میانوالی۔ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جنیل سرگودھا۔ ملک سعید، پچوال۔ گل مروت، لکی مروت۔ محمد ہمایوں سعید، بنوں۔ صوبہ اقبال، راولپنڈی۔ زویا اعجاز، لاہور۔ دشت خیال، خواب گھر۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال۔

زیر وزیر

ایسا سیتا پوری

دور کوئی بھی ہو جب لکھاری کے نوکِ قلم پر آجائے تو تمام زیر وزیر کے ساتھ ذہنوں میں جاگر ہو جاتا ہے... تاریخ کی یہی خاصیت دلچسپ ہے کہ سطر سطر تمام تر جزئیات کے ساتھ ہر منظر گویا زندہ ہو جائے۔ محلاتی سازشیں ہوں یا اسائنمنٹیں... ہمیشہ تخت یا تختے کے درمیان ہونے والی رساکشی نے بے شمار کہانیوں کو رقم کیا اور کتنے ہی کرداروں کو بے نقاب کیا... جہاں دولت ہو... جاہ و جلال اور حشمت کے چراغ روشن ہوں وہاں محبت کی قندیلیں کیسے ماند پڑ سکتی تھیں... وہ بھی حسن کا ایسا ہی مجسمہ تھی جس کے ہاتھوں میں دولت اور قدموں میں محبت کتنے ہی دلوں کی دھڑکن بن کر اسے محورِ قص کر دیتی... جذبات کے سازوں اور چاہت کے گیتوں نے اسے ایسی بلند پروازی عطا کی تھی کہ اب اسے اپنے قد سے اونچا کوئی اور دکھائی نہ دیتا تھا... حتیٰ کہ بلندی دینے والا بھی اسے چھوٹا نظر آنے لگا لیکن جب... قدرت کی ایک ہی سرزنش نے اسے خاک پر گرا دیا تو احساس ہوا کہ قد سے باہر صرف سائے نکلتے ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا... جو بڑھنے اور گھٹنے کے لیے بھی روشنی کے محتاج ہیں... اگرچہ اس چھوٹے سے فلسفے میں پوری حیات قید تھی لیکن حیات کی قید میں بچے کھچے دنوں میں وہ اس پر عمل کرنے سے قاصر تھی... اور قصر شاہی فقط عبرت گاہ بن کر آنے والے لوگوں کے لیے ایک داستان سے زیادہ کچھ نہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

”ویلیم کے سرکش امیر و! ذرا اس نقشے کو تو دیکھو۔ یہ ویلیم کا نقشہ ہے جسے میں نے ویلی محل وقوع کے ماہرین سے تیار کروایا ہے۔ اب تم لوگ کہیں بھی چھو، میں ایک ایک کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

ایک ویلی امیر نے پوچھا۔ ”اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ ہم تیری باتوں کا مفہوم نہیں پارہے ہیں۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”میں تو پہلے ہی یہ جانتا تھا کہ تم ویلی بہادر تو ضرور ہو لیکن عقل مند ہرگز نہیں۔“ پھر زوردار آواز میں کہا۔ ”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ویلیم میں کہیں بھی چھپ جاؤ میں اس نقشے کی مدد سے چوہے کے بل تک سے سچ لاؤں گا۔“

ایک ویلی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”حجاج! یہ نقشہ ناقص ہے۔“

حجاج نے تمل کر دریافت کیا۔ ”یہ نقشہ ناقص ہے مگر کیوں، کس طرح اور کس حیثیت سے؟“

ایران کے شہر ویلیم کو اپنے پہاڑی محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ عربوں نے ایران کو فتح کیا مگر ویلی اس کے بعد بھی ایک عرصے تک اپنی خود مختاری برقرار رکھے رہے۔ یہاں تک کہ عرب، ویلیم کی حدود میں داخل ہو گئے اور قزوین اور چالوس میں اپنی چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ جب حالات اور اموی قوت نے انہیں اطاعت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تو یہ وقتی طور پر مطیع بھی ہو گئے لیکن موقع پاتے ہی انہوں نے پھر سرکش اختیار کی اور آس پاس کے پہاڑوں میں چھپ کر عربوں سے جنگ کرنے لگے۔ آخر کار حجاج بن یوسف نے ویلیم کے امرا کو جذبہ خیر سگالی کے ساتھ دعوت دی۔ ویلیم امرانے اپنے چند نمائندے حجاج بن یوسف کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

حجاج نے نہایت حکمت اور رعوت سے ان امرائی دعوت کی اور جب یہ کھانے سے فارغ ہو گئے تو اس نے ایک بڑی میز پر ایک نقشہ پھیلا دیا اور ویلیم امراکو مخاطب کیا۔

وہابی نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اس نقشے میں اور تو سب کچھ موجود ہے لیکن اس میں وہ جنگ جو اور صف شکن سوار نہیں نظر آ رہے ہیں جو ولیم کی حفاظت کرتے ہیں۔“

اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ اموی دور ختم ہوا اور عباسی عہد بھی رو بہ زوال نظر آنے لگا اور خلافت عباسیہ کے باغی بھی انہی پہاڑیوں میں پناہ لینے لگے۔ باغی علویوں نے بھی یہیں پناہ لی اور یہاں کی مقامی آبادی کو تبلیغ کے ذریعے ہم عقائد بنالیا۔ انہی لوگوں میں ایک شخص ابوشجاع بھی تھا۔ ابوشجاع نہایت عسرت اور جنگ دستی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ ابوشجاع کی بیوی اپنے شوہر کے مستقبل سے مایوس رہتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی۔ ”تمہیں گوشہ گمنامی سے نکل کر بغداد میں قسمت آزمائی کرنا چاہیے۔“

ابوشجاع کہتا۔ ”کیا تو میرے شجرہ نسب سے واقف نہیں ہے۔ میں آل ساسان سے تعلق رکھتا ہوں اور ایران کا نامی فرماں روا بہرام گور میرا جدِ اعلیٰ تھا۔“

پریشان حال بیوی جبرج ہو کر جواب دیتی۔ ”اگر تمہارا جدِ اعلیٰ بہرام گور تھا تو اس سے تمہیں فائدہ کیا پہنچ رہا ہے یا تو تمہیں خود بھی اپنے جدِ اعلیٰ کے نقش قدم پر چل کر کہیں کا حکمران بن جانا چاہیے یا پھر یہ کہ تم آئندہ اپنے جدِ اعلیٰ کا نام اپنی زبان سے نہیں لو گے۔“

ابوشجاع نے بے بسی اور قہر کی نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ ”اگر تو مجھے طعنہ دے رہی ہے تو یہ تیری زیادتی ہے۔ تجھے خود بھی یہ سوچنا چاہیے کہ جس کے آباؤ اجداد آقا رہے ہوں وہ کسی کی غلامی پر کس طرح رضامند ہو سکتا ہے۔“

بیوی نفرت سے منہ پھیر لیتی، کہتی۔ ”تقدیر کے فیصلوں پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیے مگر ان فیصلوں کے خلاف تنگ و دو ضرور کرنا چاہیے۔ قناعت تو بس دریشوں ہی کو زیب دیتی ہے۔“

ابوشجاع خاموشی سے بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ بیوی کی تنقید اور صاف گوئی نے ابوشجاع کے دل کو چیر کر رکھ دیا تھا پھر وہ اٹھا اور آہستہ سے کہا۔

”اچھا اگر تو یہ چاہتی ہے کہ میں ولیم سے نکل کر غلامی کے لیے قسمت آزمائی کروں تو میں تیری یہ خوشی بھی پوری کر دوں گا لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، عاقلوں نے کہا ہے کہ آدمی چاروں سمتوں میں سے کسی طرف بھی جائے

اس کی قسمت، اس کی ہمسفر رہتی ہے۔ اگر میں کبھی ناکام واپس آؤں تو تو میری ناکامی پر فخر کی نہیں بلکہ اسے میری قسمت تصور کرے گی۔“

بیوی نے کہا۔ ”میدان جنگ میں بہادر فاتح کے ساتھ بہادر مفتوح کی بھی عزت کی جاتی ہے۔ کوشش جاری رکھو، میں ہمیشہ تمہاری ہمت افزائی کروں گی۔“

لیکن ابوشجاع نے ابھی ولیم سے قدم بھی نہ نکالا تھا کہ اس کی بیوی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ابوشجاع پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عزیزوں اور دوستوں نے اس کی ہمت بندھائی اور تسلیاں دیں یہاں تک کہ اس کا ایک دوست شہریار اس کے پاس آیا اور کہا۔

”ابوشجاع! جب تک تو اس گھر میں رہے گا تجھے اپنی بیوی یاد آتی رہے گی اس لیے میرے خیال میں یہ بہتر ہے کہ تو اپنے لڑکوں کے ساتھ میرے گھر چلا چل اور غم غلط کرنے کی کوشش کر۔“

ابوشجاع میں انکار کی سکت نہیں تھی۔ اسی وقت اپنے دوست شہریار کے گھر چلا گیا۔

دو پہر کا کھانا کھا کے ابوشجاع اپنے دوست شہریار سے باتوں میں مشغول تھا کہ باہر سے ایک آواز سنائی دی۔ ”نجوم سے مستقبل کا حال بتانے والا، خوابوں کی تعبیر دینے والا، علوم سحری کا ماہر، قسمت کا حال جاننے والا۔“

ابوشجاع نے دوست سے کہا۔ ”شہریار! ذرا اسے بلانا تو، کیا واقعی ایسے علوم موجود ہیں جن سے اپنا ماضی یا مستقبل معلوم کیا جاسکتا ہے؟“

شہریار باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”کیا مضائقہ ہے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔“

کچھ دیر بعد شہریار اس منجم کے ساتھ واپس آ گیا۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا، اس نے چہرے اور سر کو رومال میں چھپا رکھا تھا۔ ابوشجاع نے اسے اپنے برابر بٹھالیا۔ نجومی نے اپنے

چہرے سے رومال ہٹایا۔ اس کی عمر بہ مشکل پچیس سال رہی ہوگی۔ ابوشجاع نے نجومی سے پوچھا۔ ”کیا اس نوجوانی میں بھی تو اپنے علم کی پختہ کاری کا دعویٰ کر سکتا ہے؟“

نجومی نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ علم ہندوستانیوں سے حاصل کیا ہے جنہیں ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کا اتنا وسیع علم ہوتا ہے کہ وہ ایک پیدا ہونے والے بچے کی پوری

زندگی کے حالات پیشگی لکھ کر دے دیتے ہیں۔ جنہیں وہ جنم پتری کہتے ہیں اور یہ جنم پتری ایک آئینے کی طرح زندگی بھر انہی حالات اور واقعات کی عکاس رہتی ہے جو اس میں پہلے

ہی سے لکھا جا چکا ہوتا ہے۔“

ابوشجاع نے ہنس کر کہا۔ ”میں ابھی اسی وقت تیرے علم کا امتحان لیے لیتا ہوں۔ پہلے تو، تو یہ بتا کہ میں خاندانی حیثیت سے کون ہوں؟“

نجومی نے ابوشجاع کا ہاتھ دیکھا اور کچھ دیر لکیروں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ جیسے جیسے اس کا ہاتھاک بڑھ رہا تھا۔ اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

”اگر ہاتھ اور اس کی لکیریں جھوٹ نہیں بول رہی ہیں تو میں اس وقت ایک ایسے شخص کا ہاتھ دیکھ رہا ہوں جس کے آباؤ اجداد حکومت کر چکے ہیں۔“ پھر ابوشجاع سے سوال کیا۔ ”کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

ابوشجاع کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ وہ نجومی کی بات سے متفق ہے لیکن اس نے اس کا اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا، بولا۔ ”ہاں ہاں اور کچھ بتا، چپ کیوں ہو گیا؟ کچھ میرے مستقبل کے بارے میں؟“

نجومی نے پوچھا۔ ”تمہاری اولاد کہاں ہے؟“ ابوشجاع نے اپنے تینوں بیٹوں کو پاس بلا لیا، بولا۔ ”یہ ہیں میرے بیٹے۔“

نجومی نے کہا۔ ”کیا ان تینوں کی تاریخ اور ساعت پیداؤں بھی بتا سکو گے؟“

ابوشجاع نے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں، وہ تو مجھے زبانی یاد ہیں۔“

اس کے بعد اس نے اپنے بیٹوں کی تاریخ اور ساعت پیدائش سے نجومی کو آگاہ کیا۔ نجومی نے اصطرباب کی مدد سے باری باری ان تینوں کا زائچہ نکالا پھر ان زائچوں کو چھپا کر بیٹھ گیا اور ابوشجاع سے پوچھا۔ ”کیا تم نے پچھلے سات آٹھ دنوں میں کوئی غیر معمولی خواب دیکھا ہے؟“

ابوشجاع نے ذہن پر زور دے بغیر جواب دیا۔

”ہاں، تین دن پہلے میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ میں اپنی باتوں کے آخر میں اپنا یہ خواب ضرور بیان کرتا لیکن اب جبکہ تو یہ خواب پہلے ہی سننا چاہتا ہے تو میں بیان کے دیتا ہوں لیکن تجھے اس کی تعبیر ضرور بتانا ہوگی۔“

نجومی نے کہا۔ ”پہلے اپنا خواب بیان کرو۔ میں اس کی تعبیر کے علاوہ بھی بہت کچھ بتاؤں گا۔“

ابوشجاع نے سکوت اختیار کیا، وہ خواب بیان کرنے کا ہمدانہ اور الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ شہریار ان کی باتیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا اور ابوشجاع کے تینوں بیٹے حیرت اور

حسرت کے ملے جلے انداز میں اس بڑبڑے اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے نجومی کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

ابوشجاع نے کہنا شروع کیا۔ ”میں نے خواب میں دیکھا..... میں نے دیکھا.....“ پھر شرما کر بیٹوں کو حکم دیا۔ ”تم تینوں کچھ دیر کے لیے یہاں سے چلے جاؤ میں آواز دے کر دوبارہ بلاؤں گا۔“

تینوں بیٹے چلے گئے۔ ابوشجاع نے کہا۔ ”میں نے خواب میں دیکھا۔ میرے پیشاب کی دھار سے ایک آگ نکلی اور اوپر اٹھتی چلی گئی یہاں تک کہ آسمان سے باتیں کرنے لگی پھر یہ آگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس کے ہر حصے سے کئی کئی شاخیں پھوٹنے لگیں۔ ان حصوں کی روشنی سے دنیا روشن ہو گئی۔“

نجومی جیسے جیسے یہ خواب سن رہا تھا اس کے چہرے پر ہلاکت اور تازگی سی دوڑتی جا رہی تھی۔ اس نے بڑے زور سے اپنی ران پر ہاتھ مارا، بولا۔ ”خدا کی قسم، بڑا زبردست خواب ہے اور اس کی تعبیر بھی میں اسی وقت بتاؤں گا جب تم مجھے ایک قیمتی جوڑا اور گھوڑا نذر کرو گے۔“

ابوشجاع نے کہا۔ ”اب تو کاروبار پر اتر آیا ہے۔ بخدا تو یقین کر کہ میرے جسم پر تجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے بس یہی میری ملکیت ہیں اور کچھ نہیں۔“

نجومی نے کہا۔ ”میں نے جو کچھ مانگا ہے یہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، جو اس خواب کی تعبیر کے مطابق تمہیں اور تمہاری نسل کو ملنے والا ہے۔“

ابوشجاع نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میرے جسم پر جو لباس ہے اس کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں اور اگر میں اپنا لباس اتار کر تجھے دے دوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں خود برہنہ ہو جاؤں۔“

نجومی نے کہا۔ ”اچھا لباس اور گھوڑے کی بات جانے دو، دس دینار تو دے سکتے ہو؟“

ابوشجاع نے جواب دیا۔ ”میرے پاس دس دینار تو نہیں، دو دینار البتہ ہیں۔ اگر تو چاہے تو انہیں تیری نذر کر سکتا ہوں۔“

شہریار نے کان میں کہا۔ ”ابوشجاع! واللہ یہ نجومی تو مجھے بڑا جھوٹا اور ٹھگ دکھائی دیتا ہے یہ تو دو دینار بھی نہیں چھوڑے گا۔“

نجومی نے شہریار کی باتیں سن لی تھیں، ہنسنے ہوئے بولا۔

”ہاں، میں یہ دو دینار بھی نہیں چھوڑوں گا کیونکہ اس کے بدلے میں جو خوش خبری سنانے والا ہوں وہ بے حد قیمتی ہے۔“

ابوشجاع نے دونوں دینار نجوی کے حوالے کر دیے، بولا۔ ”دیکھ یہ دونوں دینار تجھے دے تو رہا ہوں لیکن یاد رکھ کہ اگر مجھے بعد میں شبہ بھی ہو گیا کہ تو مجھے ٹھگ رہا ہے تو میں تیری گت بنا دوں گا۔“

نجوی نے کہا۔ ”اب تم اپنے تینوں بیٹوں کو بھی بلا لو کیونکہ خواب کی تعبیر میں ان تینوں کا مستقبل شامل ہے۔“ ابوشجاع نے اپنے تینوں بیٹوں کو بھی بلا لیا۔ نجوی نے ان تینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تیری یہ تینوں اولادیں دنیا میں بڑا نام پیدا کریں گی۔ ملک کے بڑے حصے پر ان کی حکومت ہوگی اور مسلمانوں کا سب سے بڑا حکمران ان کا تابع ہوگا۔“

ابوشجاع نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تو ایسی باتیں نہیں کرے گا جن میں شک و شبہ موجود ہو۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ تو ہمیں مستقبل کی بے سروپا اچھی باتیں بتا کر بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تو ہماری مفلسی کا مذاق تو نہیں اڑا رہا؟“

نجوی نے جواب دیا۔ ”تیرے یہ بیٹے ایک نہ ایک دن صاحب اقتدار ضرور ہوں گے۔“

ابوشجاع کو غصہ آ گیا۔ ”اوجھو نے نجوی، تو نے بھی خوب اندازہ لگا لیا ہے کہ میں ایک پریشان حال اور محتاج انسان ہوں، اسی طرح میرے بیٹے بھی فقیر و مسکین پھر یہ بادشاہی یا حکمرانی چہ معنی؟“

نجوی نے ابوشجاع کے بڑے لڑکے ابوالحسن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے کچھ دیر دیکھتا رہا اس کے بعد ابوالحسن کے ہاتھ کو بوسہ دے کر بولا۔ ”خدا کی قسم یہ ملکوں پر قبضہ کرے گا۔“

اس کے بعد اس نے منجھلے لڑکے بوعلی حسن کا ہاتھ دیکھا اور خوش ہو کے پیش گوئی کی۔ ”اس کے بعد یہ قابض ہو جائے گا۔“

ابوشجاع غصے میں پاگل ہو گیا، اپنے تینوں بیٹوں کو حکم دیا۔ ”اس نے ہمارا مذاق اڑانے میں حد کر دی، تم تینوں لگاؤ تو اسے تھپڑ۔ اب بات برداشت کی نہیں رہی۔“

تینوں لڑکوں نے نجوی کی مرمت شروع کر دی۔ اس غریب نے مدافعت کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر ابوشجاع کا دوست شہر یار آڑے آیا، اس نے درمیان میں پڑ کر نجوی کی جان چھڑوائی، بولا۔ ”بابا اب اسے معاف بھی کر دو۔ اس کی کہاں تک ٹھکانی کرو گے۔“

تو نہیں؟“

ابوشجاع نے جواب دیا۔ ”میں نے دودینار دیے ہیں۔“ بیٹے نے پوچھا۔ ”کیا انہیں واپس لے لوں؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتا۔“

نجوی نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”تم سب نے متفقہ طور پر مجھے اس وقت تو جھٹلادیا ہے اور مجھے زد و کوب کر کے میرا مذاق اڑایا ہے لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ غلط نہیں ہے اور وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے کہ تم لوگ فرماں روا بن جاؤ۔ اس وقت تم مجھے ضرور یاد کرو گے۔“

ابوشجاع نے کہا۔ ”جا جا اپنا راستہ لے، ہم اتنے خوش فہم نہیں ہیں کہ تیری چکنی چڑی خوشامداندہ پیش گوئی پر خواہ مخواہ یقین کر لیں۔“

شہر یار نے نجوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہاں سے لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے نجوی دوست، موقع محل سمجھنے کی کوشش بھی کیا کرو۔ تم اگر یہاں کچھ دیر اور رہے تو مجھے یقین ہے کہ یہ باپ بیٹے مل کر تیرا کام تمام کر دیں گے لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔“

نجوی بھی ایک ہی ڈھیٹ نکلا۔ اس نے چلتے چلاتے ابوشجاع اور اس کے بیٹوں کو ایک بار پھر مخاطب کیا، بولا۔ ”اے مستقبل کے فرماں رواؤ! تم میں ایک ایسا حکمران بھی پیدا ہوگا جس پر تمہارے خاندان کی شوکت و عظمت ختم ہو جائے گی۔“ پھر اس نے ابوشجاع کے منجھلے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ تیری اولاد میں ہوگا۔ جس دن تیرا وہ بیٹا بغداد کے ایک برج میں پناہ گزین ہو جائے گا تو سمجھ لینا کہ وہ ایام، حساب کتاب کے دن ہوں گے اور پھر ایک دن اسی صاحب اقتدار بیٹے کے ہاتھوں، اس کا اقتدار دریائے دجلہ میں ڈوب جائے گا۔ جب یہ دن آجائے تو پھر سمجھ لینا کہ اقتدار حاصل کرنے یا برقرار رکھنے کی مزید کوششیں بے کار اور فضول ہیں۔“

نجوی تو یہ سب کچھ کہہ کر چلا گیا لیکن ابوشجاع کو فکر میں ڈال گیا۔ وہ کئی دن اور کئی راتیں معلوم نہیں کن فکروں میں پڑا سوچتا رہا۔ اسے اب بھی اس کے جدِ اعلیٰ بہرام گور کی عظمت اور بڑائی فرماں رواؤں کی ملازمت اختیار کرنے سے روک رہی تھی لیکن ایک دن، سہ پہر کو اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا اور رک رک کر یہ مشکل تمام وہ فیصلہ سنایا جس کی وہ تینوں اپنے باپ سے امید نہ کر سکتے تھے۔

ابوشجاع نے کہا۔ ”میرے بیٹو! میں نہیں جانتا کہ اس وقت تمہیں جو حکم دینے والا ہوں اس میں کس کا ہاتھ زیادہ ہے۔ اس نجوی کا، جس نے ہمارے دلوں کو خوش فہمی میں مبتلا کر دینے کے لیے بڑی خوب صورت پیش گوئیاں کی تھیں یا پھر واقعی اس خوش بختی کا جو مستقبل کے جھروکوں میں بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔“

بڑے بیٹے نے کہا۔ ”آپ حکم دیجیے، ہم اس کی تعمیل کریں گے۔“

ابوشجاع نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”خاندانی عزت و ناموس کا جتنا خیال مجھے رہا ہے تم تینوں میں سے کسی ایک کے دل میں اس کی رمت تک نہیں پائی جاتی، اس لیے میں تم تینوں کو اجازت دیتا ہوں کہ جاؤ اور برسرِ اقتدار لوگوں کی سپاہ میں بھرتی ہو جاؤ۔ معلوم نہیں کیوں، مجھے اس نجوی کی باتوں پر کچھ کچھ اعتبار سا آچلا ہے۔“

تینوں بیٹوں نے باپ کو حیرت سے دیکھ کر آپس میں نظروں ہی نظروں میں سوال جواب کیے اور بیک آواز جواب دیا۔ ”بہتر ہے، ہم تو آپ کی اجازت کے منتظر تھے۔“

ان تینوں نے فوجی ملازمت اختیار کی اور غیر عرب فرماں رواں کی خدمت میں لگے رہے، پھر بڑے بیٹے ابوالحسن نے کرخ کی گورنری حاصل کر لی اور عماد الدولہ کے لقب سے سرفراز ہوا۔ منجھلا بھائی رکن الدولہ بن گیا اور سب سے چھوٹے نے معز الدولہ کا خطاب پایا۔

بوڑھا ابوشجاع رخصت ہو چکا تھا۔ اس کے تینوں بیٹے صاحبِ اولاد ہو چکے تھے۔ ان اولادوں نے بڑے ہو کر سیاست اور حکومت میں وہ فیصلہ کن کردار ادا کرنا شروع کیا کہ جس طرف جاتے، اقبال اور فتح مندی بھی اسی کا ساتھ دیتی۔ ابوشجاع کا بڑا بیٹا عماد الدولہ بھی چل بسا اور عباسی خلافت کی تولیت اس کے بڑے بیٹے بختیار کو منتقل ہوئی لیکن ابوشجاع کا منجھلا بیٹا رکن الدولہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا اپنا بیٹا عماد الدولہ اپنے چچا زاد بھائی بختیار کو اپنی راہ سے ہٹانے کی فکر میں ہے اور خلافت کا متولی خود بن جانا چاہتا ہے۔ اس نفاق میں بوڑھے رکن الدولہ کی آنکھیں اپنے بیٹوں اور بھتیجیوں کو زوال اور تباہی کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ انہیں کس طرح سمجھائے۔

عماد الدولہ بغداد پر فوج کشی کرنے والا تھا۔ رکن الدولہ نے اسے روکا اور کہا۔ ”بیٹے! تو بغداد جا رہا ہے وہاں تو اپنے چچا زاد بھائی بختیار سے جنگ کرے گا لیکن میں تجھے منع

کروں گا کہ ایسا نہ کر۔“ اس کے بعد اس نے نجوی کی داستان سنا کر اسے متنبہ کیا۔ ”عماد الدولہ! میں تیری صلاحیتوں کے پیش نظر یہ کہہ سکتا ہوں کہ بغداد میری اولادوں کو اس نہیں آئے گا اور خاص کر تجھے۔ اگر تو بغداد پر قابض بھی ہو گیا تب بھی اس نجوی کے بقول اس میں ہمارے خاندان کے زوال کی علامت پنہاں ہوگی۔ میں تجھے اور اپنی دوسری اولادوں کو بغداد سے دور ہی رکھنا چاہتا ہوں۔“

عماد الدولہ نے جواب دیا۔ ”آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ہوا میں تیر چھوڑنے والے نجوی کی باتوں پر آپ یقین کیوں کر رہے ہیں؟“

رکن الدولہ نے کہا۔ ”میں نجوی کی باتوں پر یوں یقین کر رہا ہوں کہ اب تک اس کی ساری باتیں درست ہوتی جا رہی ہیں۔“

عماد الدولہ نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے لیکن میں کس طرح یقین کر لوں؟“

بوڑھے باپ نے جواب دیا۔ ”اس طرح یقین کر لو کہ جب اس نے ہمارے بارے میں پیش گوئیاں کی تھیں ہم سب مفلوک الحال تھے اور عمرت میں زندگی گزار رہے تھے، ہم امارات و حکومت کا اپنے دل میں خیال تک نہ لاسکتے تھے لیکن آج میرے باپ کی ساری اولادیں حکومت کر رہی ہیں۔“

عماد الدولہ نے اس وقت باپ سے زیادہ بحث نہیں کی لیکن یہ وعدہ کر لیا کہ وہ بغداد نہیں جائے گا اور اپنے چچا کے بیٹے بختیار سے جنگ نہیں کرے گا لیکن اس کا اقدام اس کے برعکس تھا۔ اس نے بغداد پر فوج کشی کی اور بختیار کو قید کر لیا اور خود خلیفہ کا متولی بن گیا۔ جب اس کے باپ کو بیٹے کی کارگزاریوں کا علم ہوا تو وہ غش کھا کے گر پڑا۔ اس وقت اس کی زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے اپنے بیٹے کو بڑا سخت خط لکھا اور دھمکی دی کہ وہ اس معاملے میں اپنے بھتیجے کا ساتھ دے گا۔

باپ کی دھمکی نے عماد الدولہ کو خوف زدہ کر دیا لیکن اس جھگڑے کو چکانے کے لیے اس کا باپ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہا۔ وہ اسی غم میں مر گیا اور عماد الدولہ نے نہایت آزادی اور بے باکی سے خلیفہ کی تولیت کا منصب سنبھال لیا۔ اس نے ایک معرکہ میں اپنے چچا زاد بھائی بختیار کو قتل کروادیا اور خطبے میں خلیفہ کے نام کے ساتھ اپنا نام بھی شامل کر دیا۔ تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ خطبے میں خلیفہ کے

علاوہ کسی اور کا نام بھی شامل کیا گیا تھا۔

☆☆☆

عضد الدولہ کو اقتدار اور اطمینان نصیب ہوا تو اس نے نہایت عقل مندی اور فیاضی سے کام لے کر زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینا شروع کیے۔ علمی میدان میں لوگوں سے کام لیے اور ان کی جی بھر کے سرپرستی کی۔ بغداد میں ایک شفا خانہ قائم کیا جس کا نام اس کے نام پر بیمارستان عضدی رکھا گیا۔

جب عضد الدولہ سیاست اور حکمرانی کی بساط پر دل و دماغ کی متحدہ قوتوں سے کام لے کر خلافت اور عوام کو ایک ساتھ مطمئن اور خوش کر رہا تھا۔ اس کے آس پاس خوشامدیوں کا مجمع رہنے لگا تھا۔ یہ چالاک اور ہوشیار خوشامدی نہایت ہوشیاری سے عضد الدولہ پر کندیں پھینکنے میں مشغول تھے۔ کوئی اس کے دشمنوں اور دوستوں کی خبری کر کے اس کا دل موہ رہا تھا، کوئی اس کے اشارہ ابرو پر جان قربان کرنے کو تیار نظر آتا تھا کسی نے شب و روز اس کے ورد کی چاکری و نگہبانی کو اپنا طرہ امتیاز بنا رکھا تھا۔ کوئی اس کے لیے ہر روز انواع و اقسام کے تحفے اور نذرانے پیش کر کے اس کے مزاج میں رسوخ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک وہ لوگ تھے جو اس کے لیے دور دراز ملکوں سے پری پیکروں اور مہ و شوں کو لاکر اس کے حرم میں جمع کر رہے تھے۔ شروع شروع میں تو عضد الدولہ نے ان سے بہت بچنے کی کوشش کی لیکن آخر کار یہ شکار بھی زیر دام آنے لگا۔

عضد الدولہ جس محل میں رہتا تھا۔ اس کے تین حصے تھے۔ پہلا مقاصر حرم (زنان خانہ) تھا دوسرا مجالس السلام (دیوان خانہ) جس میں مہمانوں، دوستوں سے ملاقاتیں کی جاتی تھیں۔ تیسرا حصہ شاگرد پیشہ لوگوں کے لیے تھا۔ محل کے پیچھے پائیں باغ تھا جس میں میووں اور پھولوں کے درختوں اور پودوں کی بہتات تھی۔ پائیں باغ کے تین طرف دیواریں تھیں اور اس کا ایک حصہ زنان خانے سے ملا ہوا تھا۔

اس دن شمالی اور مغربی ایران اور ماوراء النہر سے منتخب لڑکیوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد عضد الدولہ کے ملاحقے اور پسند کے لیے لائی گئی۔ عضد الدولہ نے انہیں اشتیاق و ہوس کی نظروں سے دیکھا، ان میں بے قد و الیاں بھی تھیں اور کوتاہ قامت بھی لیکن ان سب میں ایک خصوصیت مشترک تھی۔ ان کے اعضا کا تناسب ان کی کوتاہ

قامتی اور دراز قدی کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا تھا۔ ان میں ایسی لڑکیاں بھی شامل تھیں جو رقص و موسیقی میں کمال رکھتی تھیں۔ جو تاجر یا خوشامدی انہیں لے کر آئے تھے، وہ ان کے عوض خلافت بغداد کی طرف سے کسی نہ کسی علاقے کی جاگیر یا حکومت کا پروانہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہ پروانہ خلافت عباسی کا متولی عضد الدولہ ہی عطا کر سکتا تھا۔ ایک ادیب عمر، مجددے جسم والا خراسانی عضد الدولہ کے قدموں میں بیٹھ گیا اور لاف و گزاف ہانکتے ہوئے بولا۔ ”ویلی امیر، یہ زندگی کیا ہے؟ کھانا پینا، ملکوں پر حکومت کرنا اور عیش و عشرت سے سیر ہو کر زندگی گزار جانا۔ بس یہی کچھ زندگی ہے۔“

اصفہانی مصاحب اس سے نمبر لے گیا، بولا۔ ”خلافت کا متولی ہو جانا کوئی معمولی بات ہے۔ ویلی میرے اصل بادشاہ تو آپ ہیں، پوری خلافت عباسیہ میں آپ ہی کا حکم چلتا ہے لیکن جب میں آپ کی ذاتی اور نجی زندگی پر غور کرتا ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔ خلافت کا حرم یگانہ روزگار حسن سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں دنیا بھر کا حسن موجود ہے لیکن خود آپ اس سے کسی حد تک محروم ہیں۔ امارات اور حکمرانی کی بڑی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی بادشاہ یا حکمران کے حرم میں کتنی عورتیں پائی جاتی ہیں اور اس اعتبار سے حضور والا کا کیا مرتبہ ہے خود ہی غور فرمائیں۔“

عضد الدولہ نے دونوں کو جواب دیا۔ ”جس حکومت اور اقتدار کے لیے میں نے اتنی زیادہ جدوجہد کی ہے، میں نہیں چاہتا کہ اسے عورتوں میں گنوا دوں۔“

کسی نئے مصاحب نے عرض کیا۔ ”نائب خلافت! جس حکومت اور اقتدار کے لیے آپ نے اتنی جدوجہد کی ہے، آخر اس کا مقصد کیا ہے؟“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”اس کا مقصد یہ تھا کہ میں لوگوں کے کام آؤں اور دنیا میں علوم و فنون کو ترقی دوں، چنانچہ میں نے ان ہر دوستوں میں جو کام کیے ہیں انہیں تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔“

خراسانی تاجر بولا۔ ”لیکن اے ویلی امیر! جو لوگ خدا سے لو لگنا چاہتے ہیں اور اس دنیا کو لات مار دیتے ہیں، میں نے انہیں بھی عورتوں کی طرف مائل دیکھا ہے اور وہ اس میں عملاً دلچسپی بھی لیتے ہیں اور حصہ بھی، شاید اس لیے کہ اپنے دل اور دماغ کو یکسو رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے عورت پر فتح حاصل کی جائے کیونکہ اس کا پر کیف تصور اور ملکوتی حظ کسی بھی انسان کو بھٹکانے کے لیے کافی ہے۔“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”میں کوئی زاہد یا گوشہ نشین انسان نہیں ہوں پھر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم لوگ بار بار میرے سامنے عورتوں اور لڑکیوں کا ذکر کیوں کر رہے ہو؟“

اصفہانی مصاحب نے عرض کیا۔ ”حضور والا! بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ جیسا لائق و فائق حکمران زیادہ اطمینان اور یکسوئی سے ملک و قوم کی خدمت کرے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب آپ کے آرام اور سکون کا خیال رکھیں اور یکسوئی کا سامان مہیا کریں۔“

عضد الدولہ کے مصاحبوں اور درباریوں وغیرہ نے تاجروں کے تعاون اور اشتراک سے رات کو ایک محفل طرب کا اہتمام کیا۔ یہ محفل طرب عضد الدولہ کے پائیں باغ ہی میں منعقد ہوئی۔ اس محفل میں عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ درمیانی سبزہ زار پر چاندنیوں کا فرش بچھا دیا گیا اور ان پر ترتیب سے گاؤں کیے اور دوسرے مختلف وضع قطع اور ساز کے چھوٹے بڑے نیکی بھی رکھ دیے گئے۔ ایک طرف مشروبات کے برتن اور آلات رکھے ہوئے تھے اور ان کے آس پاس حسین و مہ جبین ساقین عضد الدولہ کے حکم کی منتظر صف بستہ کھڑی تھیں۔ اس محفل میں عضد الدولہ کا مذاق یوں ظاہر ہوا کہ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی کے علاوہ ہر چیز گلابی رنگ کی تھی۔ کینیزوں کی رنگت اور لباس تک میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ شرکائے محفل کو گلابی رنگ کی چادریں پیش کی گئیں، جن سے انہوں نے اپنے مختلف رنگوں کو چھپالیا۔ ان پر عضدی خدمت گاروں نے گلاب کا محلول چھڑک کر پائیں باغ کی پوری فضا کو مہکا کر رکھ دیا۔

اس محفل میں عضد الدولہ کے لیے ایک مخصوص نشست تھی۔ اس نشست کے داہنی طرف عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا لیکن ابھی تک یہ جگہ خالی پڑی تھی۔ عضد الدولہ کے بائیں طرف ان عورتوں اور لڑکیوں کو جگہ دی گئی تھی جنہیں خراسانی اور اصفہانی تاجر ملکوں کے طول و عرض سے تلاش کر کے عضد الدولہ کی خدمت میں لائے تھے۔

محفل کو اس شاندار طریقے سے چراغاں کیا گیا تھا کہ پائیں باغ پر دن کا گمان ہوتا تھا۔ عضد الدولہ نے اپنے محفل میں محفل طرب کو اشارہ کیا اور اس اشارے کے فوراً بعد محفل میں ہلچل مچ گئی۔ اہالیان محفل نے نہایت ادب سے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ ان کی پشتیں گاؤں کیوں سے نکلیں۔ زانوؤں تلے دھیرے نیکیے دب گئے۔ اصفہانی

اور خراسانی تاجروں نے باری باری اپنے مختلف مہ پاروں کو عضد الدولہ کے روبرو پیش کرنا شروع کر دیا۔ عضد الدولہ کی چالاک اور تیز نظریں ایک ہی مرتبہ میں یہ فیصلہ کر دیتیں کہ وہ اسے پسند آئی کہ نا پسند ہوئی۔ اسے جو پسند آ جاتی اسے اپنی داہنی طرف بٹھادیتا اور جو نا پسند ہوتی اسے بائیں طرف واپس بھیج دیتا۔

اس دوران خراسانی تاجر نے عضد الدولہ کے روبرو ایک ایسی کینیز پیش کی جس کا قد سرو کی طرح لمبا اور سیدھا، گول چہرہ، شانوں پر بکھرے ہوئے سیاہ بال، گلاب جیسے رخساروں پر دائیں طرف ایک خال، آہو جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، جن میں نیند کا خمار محسوس ہوتا تھا، چھوٹا سا دہانہ، موتی جیسے دانت، سر پر قبہ نما ٹوپی، جس کے نچلے سرے پر ایک پٹی لگی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی عضد الدولہ بے چین ہو گیا۔ اسے کچھ دیر دیکھتا رہا۔ لڑکی کو اس کے اٹھناک پر ہنسی آگئی۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”لڑکی! تیرا نام؟“

لڑکی کے بجائے خراسانی تاجر نے جواب دیا۔ ”رمان..... بالکل رمان کی طرح۔ حضور والا! اس کے دونوں رخسار تو ملاحظہ فرمائیں۔ بالکل ایسے ہی لگتے ہیں جیسے رمان (انار) کو بیج سے کاٹ کر لڑکی کے دونوں جبرؤں پر اٹے جڑ دیے گئے ہوں۔“ خراسانی تاجر کا چہرہ خوشی سے دھک رہا تھا کیونکہ اب وہ اس لڑکی کی بہت بڑی قیمت حاصل کر سکتا تھا۔

عضد الدولہ نے خراسانی تاجر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس شرمیلی لڑکی کو ذرا میرے قریب لاؤ۔“

خراسانی تاجر نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر عضد الدولہ کے روبرو لا کر کھڑا کر دیا۔ عضد الدولہ بے تابی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، وارفتگی میں لڑکی کے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”اے قدرت کے عدیم النظیر شاہکار! تو اپنی کس کس چیز کو چھپائے گی، اپنی حسین شکل چھپائے گی تو تیری آنکھوں پر جمی ہوئی خردی انگلیاں اپنے عاشق کے دل کو مسلے لگیں گی۔“

عضد الدولہ نے دونوں ہاتھ ہٹائے تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی لمبی لمبی پلکوں نے تیروں کی طرح اس کی آنکھوں کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ عضد الدولہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھالیا اور خراسانی تاجر کو حکم دیا۔

”بقیہ کوکل ملاحظہ سے گزارا جائے۔“

اصفہانی تاجر کو بڑا ملال ہوا کہ آج کے کاروبار میں خراسانی تاجر اس پر سبقت لے گیا تھا۔

عضد الدولہ نے رمان سے پوچھا۔ ”کیا تجھے رقص بھی آتا ہے؟“

”ہاں، خوب اچھی طرح۔“ رمان نے جواب دیا۔

”اور گانا؟“

”گانا بھی، میں نے یہ دونوں فن چار سال کی عمر سے سیکھے ہیں۔“

عضد الدولہ نے خوش ہو کر اہالیانِ محفل کو حکم دیا۔ ”آغازِ رقص و طرب کا آغاز کیا جائے۔“

ماہرِ رقاصائیں اور گانے والیاں کھڑی ہو گئیں۔ سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال لیے۔ عضد الدولہ نے

ایک جام بکف کنیز سے جام لیا اور نبیذ کو منہ سے لگالیا۔ یہ ایک اشارہ تھا، جس کا مطلب تھا، محفل کا ہر شخص نبیذ نوش کر سکتا

ہے۔ گاؤ تکیوں سے ٹکی ہوئی پشتیں حرکت میں آئیں اور لوگ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے زانوتے سے

چھوٹے چھوٹے تکیوں کو کھسکا کر ایک طرف کر دیا۔ ان کے سامنے جام بکف دوشیزائیں کھڑی تھیں۔ ان جاموں میں نبیذ

بھری ہوئی تھی جسے مسلمانوں کا ایک طبقہ جائز قرار دیتا تھا۔ فوجیوں جیسی مستعدی اور تیزی سے نبیذ کے جام ان

کے ہونٹوں سے ایک ساتھ لگ گئے۔ سازوں سے آوازیں نکلیں، ناچنے والیوں نے تھرکنا شروع کر دیا۔ گانے

والیوں نے منہ کھولا اور پوری محفل ایک دم ساز و آواز میں ڈوب گئی۔ عضد الدولہ کے دائیں طرف بیٹھی ہوئی کنیزیں

حسد و نفرت سے اس تماشے کو دیکھ رہی تھیں کیونکہ وہ خود کو ان سے بڑا فنکار سمجھتی تھیں۔ عضد الدولہ نے ازراہ مذاق رمان

سے پوچھا۔ ”کیا تجھے ان سے اچھا یہ فن آتا ہے؟“ رمان نے جواب دیا۔ ”میں زبان سے نہیں اپنے ہنر

سے آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔“ عضد الدولہ نے کہا۔ ”اچھا یہ بات ہے لیکن میرا

خیال ہے کہ ایک ہی ہنر یا پیشے سے تعلق رکھنے والے دو فنکار ہمیشہ حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور وہ ایک دوسرے

کے فن سے کبھی متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہی معترف۔“ رمان نے جواب دیا۔ ”میں حضور والا کو جھٹلاتی نہیں سکتی

لیکن ایک ذرا اختلاف ضرور کروں گی۔ دو فنکار ایک دوسرے کے فن سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور معترف بھی، ہاں آپ یہ

ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے تاثر یا

اعتراف کا اپنی زبان سے اعلان یا اظہار نہیں کرتا۔“

عضد الدولہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”اس کے یہ معنی ہوئے کہ تو ذہین اور حاضر جواب بھی ہے، خوب۔“

رقاصائیں اور مطربائیں نہایت جوش اور وارفتگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ پوری محفل پر ایک نشہ سا

طاری تھا۔ ان کی نظریں اپنے سامنے تھرتھکتی، مل کھاتی، دشمن ایمان و آگہی کے پرشباب، کیف آور جسموں کا حریصانہ

جائزہ لے رہی تھیں، بوڑھے شریکِ محفل ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر انہیں ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اگر

عضد الدولہ کا ادب اور رعب مانع نہ ہوتا تو وہ سارے تکلف اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر وہ کچھ کر گزرتے، جن کی ان

سے عام حالات میں توقع تک نہ کی جاسکتی۔ نوجوانوں نے عضد الدولہ کے رعب و داب کی پروا کیے بغیر جسارت

وجہات کا مظاہرہ کیا۔ وہ عضد الدولہ کے روبرو گانے اور ناچنے والیوں تک تو نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن مشروبات پیش

کرنے والی کنیزیں تو ان کے سامنے ہی موجود تھیں۔ کئی نے دل میں برپا طوفان سے مغلوب ہو کر، ان کے ہاتھ

پکڑ کر اپنی اپنی آغوش میں گرا لیا اور بوسوں کی ایسی گرم بازاری دکھائی کہ گھٹکھروؤں کی چھنک اور پیروں کی دھمک

میں بھی یہ آوازیں صاف سن لی گئیں۔ ان میں جو رکھ رکھاؤ تھا

تھے وہ پتھر کی مورتی کی طرح ضبط و احتیاط کا دامن پکڑے چپ چاپ بیٹھے تو ضرور رہے لیکن ان کی نظروں کی ہوسناکی

ان کے رکھ رکھاؤ اور ضبط و احتیاط کی منافقت کا پردہ چاک کر دیتی تھی اور یہاں کچھ بزدل بھی موجود تھے اور وہ اس کے

سوا کچھ بھی نہ کر سکتے تھے کہ کسی دوشیزہ کے ہاتھ سے نبیذ کا جام لیتے ہوئے ڈرتے ڈرتے جام کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی

پکڑ لیتے لیکن پھر ڈر کر فوراً ہی چھوڑ بھی دیتے۔ جب محفل اپنے پورے شباب پر تھی تو ایک گوشے

سے ناخوشگوار بحث و تکرار کی آوازیں سن گئیں۔ عضد الدولہ کے سامنے دور، جہاں چند چھوٹے چھوٹے درختوں نے

سایہ کر رکھا تھا اور محفل کی روشنی کے مقابلے میں جہاں تاریکی کا گمان ہوتا تھا، چند آدمیوں میں تو، تو میں، میں

ہو رہی تھی۔ یہ تو، تو میں، میں مار پیٹ میں تبدیل ہو گئی۔ عضد الدولہ نے حکم دیا۔ ”ان گستاخوں اور بے

ادبوں کو پکڑ کر میرے روبرو پیش کیا جائے۔ کیا انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ محفل رقص و طرب ہے اور یہاں غلط کیا

جاتا ہے۔ یہ کیسے بد مذاق لوگ ہیں جو یہاں غلط کرنے کے بجائے تازہ کر رہے ہیں اور تشدد پر اتر آئے۔“

عضد الدولہ کی آواز نے رقا صاؤں اور مطرباؤں کو ایک دم روک دیا۔ محفل کی نظریں جھکڑے والے گوشے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ عضد الدولہ کے آدمیوں نے فوراً ہی ان جھکڑالو آدمیوں کو حراست میں لے لیا اور انہیں عضد الدولہ کے روبرو پیش کر دیا۔ یہ کل چھ آدمی تھے جن میں سے ایک تو اس کا بوڑھا ندیم تھا اور بقیہ پانچ نوجوان امیر زادے تھے۔ عضد الدولہ اپنے ندیم کی بے حد عزت کرتا تھا اور اس کی حکمت آمیز باتوں سے اس کے دل و دماغ میں ایک روشنی سی پیدا ہو جاتی تھی۔

عضد الدولہ نے اپنے ندیم سے پوچھا۔ ”ابو جعفر! کیا بات ہے، تم تو ہمیشہ علم و دانش اور ادب و تہذیب کی باتیں کرتے ہو پھر آج میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ اس محفل رقص و طرب میں بد مزگی اور فساد پیدا کرنے والوں میں تم بھی شامل ہو؟“

بوڑھے ابو جعفر نے اپنے سر سے اور ڈاڑھی کے بالوں کو دوسے کے خضاب سے سیاہ کر رکھا تھا لیکن ان سیاہ بالوں کے نیچے کی کھال کو بڑھاپے کی زور آور انگلیوں نے چن کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویلی! امیر! میں یہ کس طرح دیکھ سکتا ہوں کہ لوگ آپ کی محفل میں بھی بے جا جساتوں اور نامعقول جراتوں کا مظاہرہ کریں۔ اس لیے عین اس وقت پر جبکہ پوری محفل ساز و سامان اور بساط و انداز میں محوگی میں ہوشیار اور مستعد محفل اور ماحول کی نگرانی میں لگا ہوا تھا۔“ پھر اس نے اپنے برابر کھڑے ہوئے پانچوں امیر زادوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کافی دیر سے ان کی غیر معمولی گستاخیوں کو محسوس کر رہا تھا۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”ان کی گستاخیاں بیان کرو۔“

ابو جعفر نے ان تو مند آدمیوں سے جو پانچوں امیر زادوں کو حراست میں لے ہوئے تھے، پوچھا۔ ”وہ لڑکیاں کہاں ہیں جن سے یہ پانچوں خوش فطریاں کر رہے تھے؟“

ایک تیز طرار امیر زادے نے کہا۔ ”ابو جعفر! ہم آپ کی اس لیے عزت کرتے ہیں کہ آپ بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ ویلی امیر کے ندیم بھی ہیں۔ آپ کو اپنے بڑھاپے کے حسد میں ہم نوجوانوں سے نہیں الجھنا چاہیے۔“

ابو جعفر نے غصے میں اپنا سوال پھر دہرایا۔ ”میں پوچھتا ہوں وہ لڑکیاں کہاں ہیں جنہیں یہ نوجوان درختوں کے سائے میں لے گئے تھے؟“

کسی نے مذاق کیا۔ ”کون سی لڑکیاں ابو جعفر؟ آپ

کی بیٹائی تو صحیح ہے؟“

ابو جعفر نے جل کر جواب دیا۔ ”میری بیٹائی ہی۔۔۔ نہیں ہر چیز تم نوجوانوں سے اچھی ہے۔“ پھر تو مند محافلوں سے سوال کیا۔ ”آخر تم لوگ بتاتے کیوں نہیں کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔“

عضد الدولہ نے خشکی سے کہا۔ ”آخر بات کیا ہے؟“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”ان سب کو قید کر دیا جائے اور کل دن کی روشنی میں انہیں دربار میں طلب کیا جائے۔ وہیں اس مقدمے کی سماعت اور مجرموں کو سزائیں دی جا سکیں گی۔“

امیر زادوں نے شور کیا۔ ”یہ ظلم ہوگا، ہم پر زیادتی ہوگی۔“

عضد الدولہ نے فی الفور اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”ان امیر زادوں کو تاہر خاست محفل میں رکھا جائے مگر حراست میں۔ اس کے بعد انہیں قید کر دیا جائے اور صبح جب میں انہیں دوبارہ طلب کروں تو میرے روبرو پیش کیا جائے۔“

اس حکم پر فوراً ہی عمل درآمد ہوا اور ان امیر زادوں کو عضد الدولہ کے محافظین نے اپنی حراست میں لے کر ایک گوشے میں بٹھا دیا۔

ابو جعفر عضد الدولہ کے پاس سے جانے لگا تو ویلی امیر نے اس سے سوال کیا۔ ”ابو جعفر! اب کہاں جا رہے ہو؟“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”میں اپنی اس ذمہ داری کو خوب اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں کہ اس محفل رقص و طرب میں شرکا اپنے آپ سے باہر نہ ہونے پائیں، میں ان کی نگرانی کر رہا ہوں۔“

عضد الدولہ کو ہنسی آگئی، بولا۔ ”خوب خوب، مجھے یقین ہے کہ یہ کام تم سے بہتر کوئی اور۔۔۔ انجام نہیں دے سکتا۔“

جب ابو جعفر چلا گیا تو شوح و شریر رمان نے عضد الدولہ سے ہنس کر کہا۔ ”میں ویلی امیر کی اس رائے سے متفق ہوں۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”تو نے میری باتوں سے کیا سمجھا؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”یہ کہ معنی کے اس امیر کے لیے اس سے بہتر اور کوئی اور مشغلہ نہیں ہو سکتا کہ بڑھاپے کے ضعف اور احساس محرومی نے اس کے دل میں نوجوانوں کے مقابلے میں حسد کی جو آگ جلائی ہے اسے سرشور اور سرکش نوجوانوں کی نگرانی کے عمل سے بجھانے کی کوشش کرے۔ یہ بوڑھا جو کچھ کر رہا ہے اس لیے ہرگز نہیں کر رہا کہ وہ محفل میں نظم و ضبط پیدا کرنا چاہتا ہے یا وہ واقعی

نوجوانوں کی سرشوریوں کو اخلاق باختہ حرکات سمجھتا ہے بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ خود یہ سب نہیں کر سکتا۔ اس لیے دوسروں کو بھی یہ سب نہیں کرنے دے گا۔“

عضد الدولہ نے بے تابی سے رمان کو آغوش میں لے لیا اور بولا۔ ”بھدا! تو مجھے بُری طرح شکار کیے جا رہی ہے۔ تیرے حسن کے ساتھ ہی تیری زیرکی اور دانائی نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔“

پوری محفل عضد الدولہ کی وارفتگی کو رشک و حسد سے دیکھ رہی تھی۔ محفل کے زنان خانے میں عضد الدولہ کے خاندان اور حرم کی عورتیں رمان کو حسد و رقابت کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

”کچھ بھی ہو اب اس میں کوئی شے کی بات نہیں رہی کہ رمان نے ویلی امیر کو بُری طرح مسخر کر لیا ہے۔“

کسی دوسری عورت نے جذبہ حسد اور بدخواہی کے زیر اثر جواب دیا۔ ”لیکن میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ویلی امیر کل یا پرسوں تک اسی والہانہ انداز میں رمان کو پسند کرتا رہے۔ میں تو ایک مدت سے یہ محسوس کر رہی ہوں کہ ویلی امیر کے جذبات عشق و محبت اس بلبلے کی طرح ہیں جو سطح آب پر لکھوں کے لیے نمودار ہو کر ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتا ہے۔“

کسی عمر رسیدہ، ویلی امیر کی بزرگ رشتے دار خاتون نے اس عورت کو جھڑک دیا۔ ”تو کیا کہتی ہے؟ اگر میرا ویلی امیر واقعی ایسا ہوتا جیسا تو بتا رہی ہے تو آج تو اس کے حرم کے بجائے ادھر ادھر خوار ہوئی پھر رہی ہوتی۔“

انہی لکھوں میں عضد الدولہ رمان سے پوچھ رہا تھا۔

”رمان! کیا تو رقص و موسیقی سے واقعی بہرہ ور ہے؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”میں اس کا دعویٰ تو نہیں کروں گی لیکن عملاً حضور کو محظوظ کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”تب پھر شروع کر دے رقص و موسیقی، اب میں مزید صبر سے کام نہیں لے سکتا۔“

رمان نے عرض کیا۔ ”اگر حضور حکم دیں تو میں اسی وقت کھڑی ہو جاؤں گی ورنہ مناسب تو یہی ہے کہ پہلے حضور والا ہر ایک کے فن سے لطف اندوز ہو لیں۔ اس کے بعد مجھے حکم دیں اور انصاف کی نظر سے اپنا فیصلہ سنا دیں۔“

عضد الدولہ نے پھر رقص و موسیقی کا حکم دیا اور آنا فانا پوری محفل ایک بار پھر کیف و نشاط کی موجوں میں جھکولے کھانے لگی۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر تک عضد الدولہ لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس دوران اس نے پاس بیٹھی ہوئی رمان کو اس کے حال پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔ وہ جب بھی رمان کی طرف متوجہ ہوتا عضد الدولہ یہی محسوس کرتا کہ رمان زیر لب کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ اس نے ایک آدھ بار کان لگا کے اس کی بڑبڑاہٹ سننے کی کوشش کی تو یہ انکشاف ہوا کہ رمان فکر سخن میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نے حیرت سے سوال کیا۔ ”رمان! کیا تم شاعری بھی کر لیتی ہو؟“

”ہاں۔“ رمان نے جواب دیا۔ ”میں شاعری سے عشق کرتی ہوں۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”اس وقت بھی غالباً فکر سخن میں غرق ہو؟“

”ہاں ویلی امیر! آپ نے صحیح سمجھا، دراصل میں اس کوشش میں ہوں کہ اس محفل میں جو کچھ پیش آیا یا پیش آنے والا ہے میں اسے اپنے شعروں میں قید کر دوں۔“

عضد الدولہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”رمان بھدا، میں نے تیری شکل میں ایک دُر بے بہا پالیا ہے۔ میں تیری جتنی بھی قدر و منزلت کروں کم ہے۔“

اسی وقت عضد الدولہ نے ابو جعفر کی طرف دیکھا۔

اس وقت وہ کسی اور نوجوان سے الجھ رہا تھا۔

صبح سے ذرا پہلے عضد الدولہ نے رمان سے کہا۔

”رمان! چند سماعت بعد موذن اذان دے دے گا۔ کیا یہ مناسب وقت نہیں ہے کہ میں تیرے دوسرے کمالات سے بھی آگاہ ہو جاؤں۔“

رمان اس کی آغوش سے نکل کر اس حصے پر جا کھڑی ہوئی جہاں ابھی تک جسم تھرکتے اور گلے، نغے اگلتے رہے تھے پھر اس نے سازندوں کو کچھ اشارے کیے، پھر اس نے ٹہل ٹہل کر گانا شروع کر دیا۔ سازندوں میں سے اکثر کی نظریں رمان پر جمی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھ سازوں کو چھیڑ رہے تھے۔ رمان گارہی تھی۔

”دنیا میں ہر طرف حسد و رقابت کی جنگ جاری ہے کوئی امارت کے لیے لڑ رہا ہے، کوئی وزارت کے لیے اور کوئی شہرت کے لیے اسی طرح آج میں نے بڑھاپے کو جوانی سے تیرا آزما دیکھا حالانکہ اس نے اپنے سراورڈ اڑھی کی سفیدی کو خضاب سے چھپا رکھا ہے لیکن اس کے دل و دماغ پر بہ دستور بڑھاپا طاری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو غریب بوڑھا ان پانچ

نوجوانوں سے ہرگز نہ اچھتا جو کل صبح تک کے لیے مقید کر دیے گئے اسے ویلی میاں! کل صبح جب تو اس مقدمے کی کارروائی کا آغاز کرے گا تو آخر کار اس نتیجے پر پہنچے گا کہ وہ پانچوں بے قصور ہیں ان کا قصور بس اتنا ہے کہ وہ ایک ایسا کام کیوں کرنا چاہتے تھے

جس کی ان کا بوڑھا قریب قدرت اور استطاعت نہیں رکھتا نوجوانوں نے وہی کیا جو وہ کر سکتے تھے اور بوڑھے نے وہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اب منصف خود ہی سمجھ لے گا کہ ان میں مدعی خطا کا رعبے یا مدعا علیہاں؟ لیکن اگر میں منصف ہوں تو ان دونوں کو چھوڑ دیتی کیونکہ دونوں ہی بے گناہ ہیں یہ حسد و رقابت کے جھگڑے ہیں جواز سے جاری ہیں، جواب تک رہیں گے۔

ابو جعفر پہلے تو رمان کے گیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ اپنے گیت میں رمان اس کے بڑھاپے کا مذاق اڑا رہی ہے اور دوسرے دن صبح پیش ہونے والے مقدمے کا فیصلہ بھی خود ہی کر دیا ہے تو وہ مشتعل ہو گیا لیکن اس نے اپنے اشتعال کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

رمان گیت گا کر عضد الدولہ کے پاس جا بیٹھی۔ عضد الدولہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”رمان! تو کتنی ذہین ہے۔ بخدا تو نے میری مشکل آسان کر دی ہے اور اب میں ان نوجوان امیر زادوں کے ساتھ واقعی انصاف کر سکوں گا۔“ محفل کا ہر شخص رمان کو رشک و حسد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ابو جعفر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ”اے نوجوان حسینہ! ٹھہر جا تجھ سے خوف ناک انتقام نہ لیا تو میرا نام بھی ابو جعفر نہیں۔“

جب محفل برخاست ہوئی تو شریک محفل لوگوں کے دلوں پر اس کی یاد کے گہرے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ابو جعفر بہت بے چمن تھا، عضد الدولہ پر رمان کا فیصلہ اثر انداز ہو چکا تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے پانچوں قیدی رہا کر دیے جائیں گے۔ وہ طلوع آفتاب کے فوراً بعد عضد الدولہ کے پاس پہنچ گیا۔ رمان اس وقت بھی اس کے پاس ہی موجود تھی۔ اس نے منافقانہ خوش اخلاقی

سے دونوں کو سلام کیا۔

عضد الدولہ نے مسکرا کر رد یافت کیا۔ ”ابو جعفر! کیا خبر لائے؟“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”ویلی میاں! امیر کا اقبال اپنے عروج پر ہے، ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہے۔“ عضد الدولہ نے رمان کی طرف کن اکھیوں سے دیکھ کر ابو جعفر کو مخاطب کیا۔ ”کیا ان نوجوان امیر زادوں کا مقدمہ شروع کیا جائے؟“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”حضور والا کی مرضی لیکن اس مقدمے کا اس وقت پیش ہونا کیا ضروری ہے؟“ عضد الدولہ نے کہا۔ ”یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس مقدمے کا ایک فریق تم خود ہو اور مقدمے کی کارروائی کے دوران تم جیسا صاحب بصیرت و حکمت ضرور موجود رہنا چاہیے۔“

ابو جعفر نے ایسے لہجے میں کہا جس میں اس کی فحالت اور حسد کی آمیزش تھی، جواب دیا۔ ”ویلی میاں! میرے کو خدا نے جو بصیرت اور تدبیر عطا فرمایا ہے اس کی موجودگی میں ابو جعفر کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن حضور والا کی علم پروری نے مجھ کو خاسار کو یہ مرتبہ بخشا ہے کہ اس دربار میں جگہ پا جاتا ہوں۔“ پھر رمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔ ”اور رات جب میں نے اس کا فکر انگیز گیت سنا تو دیر تک یہی سوچتا رہا کہ صالح حقیقی بھی کتنا ستم ظریف ہے جس نے ایک نوجوان کنیز میں وہ سب کچھ جمع کر دیا ہے جو کسی ایک ذات میں نہیں ملتا۔ حسن، شہری مذاق، حکمت، تدبیر، قوت فیصلہ اور حیرت انگیز معاملہ فہمی۔ میں حیران ہوں کہ ویلی میاں! نے اس کے ان اوصاف اور خصوصیات کو ایک نظر میں کس طرح پڑھ لیا۔“ پھر ہتھیار ڈال دینے کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ ”اس ذہین و شہزادہ کی موجودگی میں میری پہلی جیسی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔“ عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”لیکن ابو جعفر! جو جس کا کام ہے وہی انجام دے گا۔ میں تمہاری ضرورت اور اہمیت سے بدستور واقف ہوں۔“

رمان نے عرض کیا۔ ”یہ میری مجال کہ میں آپ کی فکری ہمسری کا دعویٰ کروں۔ آپ آپ ہی ہیں، میں کیا ہوں شاید کچھ بھی نہیں۔ اگر رات کے گیت نے آپ کو دکھ پہنچایا ہو تو میں شرمندگی کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔“

ابو جعفر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔ ”شریہ ماہ پیکر! تو نے میری کمزوری کو خوب پکڑا۔ بعد میں، میں نے بھی اپنے رات والے فعل پر خوب اچھی طرح غور کیا اور اس

نتیجے پر پہنچا کہ میرا خیال صحیح ہے۔ نوجوانی کی سرشوریوں کو مجلسی آداب قید نہیں کر سکتے، ان نوجوان امیر زادوں کو وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جو کیا اور مجھے بھی یہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔ اب میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور ویلی میاں! سے درخواست کروں گا کہ انہیں رہا کر دیا جائے۔“

عضد الدولہ نے رمان سے کہا۔ ”میں ابو جعفر کی اسی لیے اتنی قدر کرتا ہوں کہ اس میں انصاف پسندی بہت زیادہ پائی جاتی ہے اور اس کی خود بخوبی اس کی اصلاح کرتی رہتی ہے۔“ رمان فرط عقیدت و احترام سے ابو جعفر کے روبرو ڈہری سی ہو گئی۔

ابو جعفر نے درخواست کی۔ ”ان امیر زادوں کو اگر میرے سامنے ہی رہا کر دیا جائے، تو خوب ہوگا۔“

عضد الدولہ نے بے پس و پیش پانچواں امیر زادوں کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ انہیں سب سے پہلے عضد الدولہ کے روبرو حاضر کیا گیا۔ عضد الدولہ نے تیز تیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ سبہ ہوئے امیر زادے اس وہم میں تھے کہ شاید انہیں کوئی عبرت ناک سزا ملنے والی ہے لیکن عضد الدولہ نے کہا۔ ”اے گستاخ اور بے حیا امیر زادو! تم سب اس بوڑھے ندیم کا شکریہ ادا کرو جس نے کل رات تمہیں قید کروا دیا تھا اور یہی تمہیں رہا بھی کر دیا ہے۔“

سبہ ہوئے امیر زادوں نے کسی قدر غم ہو کر ابو جعفر کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور رمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم سب کو میں نے نہیں، اس مہ پیکر نے آزاد کر دیا ہے کیونکہ میرے دل و دماغ میں انصاف کی جو شمع پید ہوئی تھی۔ وہ اسی پری پیکر کے گیت سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے اصل شکریہ کی مستحق یہ لڑکی ہے۔“

امیر زادوں نے خود کو رمان کے روبرو بھی جھکا دیا۔ اندر یہ سب کچھ ہوتا رہا اور باہران امیر زادوں کے ورثا جمع ہو چکے تھے اور عضد الدولہ کے دربار میں حاضری کی درخواست کر رہے تھے جب عضد الدولہ کو ان کی آمد سے مطلع کیا گیا تو اس نے خدمت گاروں کو جواب دیا۔ ”امیر زادوں کے ورثا سے کہہ دو کہ جس کام سے وہ حاضر ہوئے ہیں وہ ان کی مرضی کے مطابق ہو چکا، اس لیے اب ان کی حاضری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“ پھر ابو جعفر سے کہا۔ ”ابو جعفر! ان امیر زادوں کے ساتھ تم خود جاؤ اور میرے الفاظ ڈہراؤ۔“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”بہت بہتر، میں خود بھی آپ

کے عیش میں حارج نہیں ہونا چاہتا تھا، ضرورتاً آ گیا تھا۔“ عضد الدولہ کے محل کے بڑے پھاٹک سے ابو جعفر جب پانچوں امیر زادوں کے ساتھ نمودار ہوا تو امیر زادوں کے ورثا نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ ابو جعفر ان سب کو ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت خوش قسمت ہو کہ میں ویلی میاں! کی خدمت میں بروقت پہنچ گیا۔ اگر میں ذرا تاخیر سے پہنچتا تو میرا خیال ہے کہ رمان ان سب کا کام تمام کروا دیتی۔“

امیر زادوں کے ورثا نے ابو جعفر کو گھیرے میں لے لیا اور اس کا والہانہ شکریہ ادا کرنے لگے۔

ابو جعفر نے امیر زادوں کے ورثا کو مخاطب کیا۔ ”ناصریوں میں ایک عرصے تک یہ بحث چھڑی رہی کہ وہ عورت کو بھی بشری مخلوق سمجھیں یا نہ سمجھیں اور ان کے دیوں کی بیشتر تعداد نے عورت کو جاندار مخلوق ہی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب میں نے پرانی کتابوں میں یہ سب پڑھا تھا تو ناصر دیوں پر مجھے یہی آئی تھی کہ وہ کتنے احمق یا سادہ لوح ہیں جو عورت کو بشری مخلوق یا جاندار ہی نہیں مانتے تھے لیکن اب اتنی عمر گزر دینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ناصر دیوں بہت سمجھدار تھے۔ اگر ان دیوں کے مطابق عورتوں کی نفی کر دی جائے تو اس دنیا میں تین چوتھائی ہنگامے ناپید ہو جائیں۔“

ایک عمر رسیدہ امیر نے پوچھا۔ ”آخر یہ معاملہ کیا تھا؟“ ابو جعفر نے ہنس کر جواب دیا۔ ”نوجوان اور احتیاط متضاد چیزیں ہیں۔ ان کی بے احتیاطی نے انہیں قید کر دیا تھا لیکن میں نے انہیں رہا کر دیا اور اگرچہ پوچھو تو ویلی میاں! امیر اب مصروف بھی بہت زیادہ ہو گیا ہے اور اب بیشتر مقدمے یا تو بہت جلد فیصل ہو جایا کریں گے یا پھر مدتوں تک یوں ہی التوا میں پڑے رہیں گے۔“

ایک عمر رسیدہ امیر نے سوال کیا۔ ”آخر یہ کیوں؟ ایسا کیوں ہوگا؟“

ابو جعفر نے آس پاس دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”ویلی میاں! ایک نئی کنیز کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو گیا ہے اور اسے اس کنیز کی رفاقت اور ہم نشینی سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔“ کچھ دیر بعد یہ مجمع اپنے اپنے راستوں پر چلا گیا اور ابو جعفر کے پاس بس ایک ہی امیر رہ گیا۔ یہ امیر عضد الدولہ کے چچا زاد مشغول بھائی رکن الدولہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے اس خبر میں اپنے لیے کچھ امیدیں نظر آئیں، اس نے پوچھا۔ ”ابو جعفر! کیا یہ درست ہے کہ عضد الدولہ کسی



یونانی

میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ خواہ اسے دیدہ عبرت سے بغور دیکھا جائے یا دھلے ہوئے دیدے کی سرسری نظر سے۔ ایجنٹ میں اگر پولیس کی پہاڑی پر سیاہی کا ایک گروہ کھڑا تھا۔ گانڈھی مختلف سمتوں میں اشارے کرتا اور ایک ازیر تقریر کو دہراتا جاتا۔ سامنے منرو کا مندر تھا۔ جن دنوں پیری کلیس نے اس عمارت کو تعمیر کیا، وہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارت تھی۔ آج اسے سب سے خوبصورت کھنڈر کا درجہ حاصل ہے۔ سب کی نگاہیں مندر پر جمی ہوئی تھیں اور مسافروں نے دیکھ کر ہنسی اٹھ کر رہے تھے۔ میری نگاہیں ابتر کاغذ کے پھوٹے سے پرزے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ داخلے کا محنت تھا۔ میں نے اس کی پشت پر لکھی عبارت کو بار بار پڑھا۔ اس پر لکھا تھا کہ پیری کلیس کے عہد حکومت میں ملک مالامال اور لوگ نہال ہو گئے مگر وہ اتنا پر نظر تھا کہ اس کی ذاتی ملکیت میں چھوٹی کڑی کا بھی اضافہ نہ ہوا۔ میں نے اس عبارت پر غور کرنے کے بعد سر اٹھا کر بار تھین پر نظر ڈالی تو مجھے عمارت میں اس کے حسن صورت کے ساتھ اس کے بنائے والے کھنڈر کی جھلک بھی نظر آئی عبارت کی چھت گر چکی ہے۔ مگر اس کے ستون دو ہزار برس سے ایستادہ ہیں۔ لغزش سے پیری کلیس خود بھی محفوظ رہا اور اس کے بنائے ہوئے ستون بھی۔ سورج کی روشنی میں یوں لگتا تھا کہ یہ عمارت دودھ میں نہائی ہوئی ہے۔ شفق چھوٹی تو گیا اس پر سنہرا بانی چڑھ گیا۔ پیری کلیس نے ایجنٹ میں کتنی ہی عمارتوں پر سونے کا طبع کرایا تھا۔ اب اس کی روایت کو شفق ہر روز پورا کرتی ہے۔ پیری کلیس کے عہد زریں کے بارے میں جو جملہ محکمات کی پشت پر چھپا ہوا تھا وہ پلٹارک کی کتاب سوانح سے نقل ہے۔ میں نے وہ محکمات سنبھال کر رکھ لیا اور وطن واپس لے آیا۔ پلٹارک کی ضخیم کتاب کون پڑھے گا، لیکن اس کا یہ ایک جملہ شاید کسی صاحب اختیار کی نظر سے گزرے اور دل میں گھر کر لے۔ اس خیال کو کئی برس ہو گئے ہیں اور وہ محکمات ابھی تک میرے پاس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو بھیجوں۔ ایک انار و صد ہجاری۔

ماخوذ از آواز دوست: مختار مسعود صفحہ ۶۸

اب ان کا عضد الدولہ سے ملاقات کرنا ایک مشکل کام ہو گیا تھا اور وہ تمام لوگ، جو عضد الدولہ تک رسائی نہ حاصل کر پاتے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے اور رمان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے۔ ان میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ رمان کو عضد الدولہ کے کسی زبردست حریف نے سازش کے طور پر اس کے پاس بھیجا ہے تاکہ عضد الدولہ اس کے حسن اور کمالات کا گرویدہ ہو کر کاروبار مملکت کی طرف سے غافل ہو جائے اور اس کی غفلت سے قائمہ اثاثہ اس کے حریف اس پر فیصلہ کن ضرب لگا سکیں۔

دوسری طرف محل سرا میں بھی رمان کی ذات رشک و حسد کا سبب بن گئی تھی۔ عضد الدولہ کی بیویاں اور کنیزیں اس سے بری طرح جل رہی تھیں کیونکہ عضد الدولہ، رمان پر اس بری طرح مرعنا تھا کہ دوسری عورتوں کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ وہ جب عضد الدولہ اور رمان کے پاس سے گزرتیں، ان کے لطیف تمہیدوں اور ہنسی مذاق کی باتوں کا بوجھ لیے واپس جاتیں۔ انہوں نے رمان اور عضد الدولہ کی خلوتوں میں کام کرنے والی کنیزوں کو رشوتیں دے کر رازدار اور سراغ رس بنالیا تھا۔ انہی کنیزوں سے محسوس کی

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”میں اس اعلان کو قبول کرتا ہوں۔ خدا میری مدد کرے۔“

جب یہ یہاں سے چلا گیا تو رمان نے عرض کیا۔ ”وہیلی امیر! میں ایک بار پھر یہی عرض کروں گی کہ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔“

”اوں ہوں۔“ عضد الدولہ نے اسے چٹالیا۔ ”رمان، میری جان! ان فضول اندیشوں کو اپنے دل سے نکال دے اور دل پر یقین رکھ کہ کسی شخص کا تجھ پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا غلطی سے تو سمجھ بیٹھی ہے۔“

رمان نے کہا۔ ”اگر آپ یقین دلاتے ہیں تو یقین کے لیتی ہوں ورنہ میرا دل اندر سے سہا ہوا ہے۔“

عضد الدولہ نے ہنس کر کہا۔ ”اچھا اب فضول باتیں نہیں ہوں گی، میں تیرے تازہ اشعار سننا چاہتا ہوں اور رقص دیکھنا چاہتا ہوں۔“

رمان نے اسی وقت بے چون و چرا اپنے تازہ اشعار سنانے شروع کر دیے اور اس کے بعد اپنے رقص سے عضد الدولہ کو محفوظ کر دیا۔

☆☆☆

عضد الدولہ کے دربار سے بڑے بڑے علما و اہل

کنیز کے چکر میں آ گیا ہے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔“ ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا درست ہے لیکن اس سے تم اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں بھی نہ مبتلا ہو جانا کہ وہ نرم چارہ ہے جسے تم سب بہ آسانی ہضم کر سکو گے۔“

ابو جعفر دوبارہ پھر عضد الدولہ کے پاس پہنچ گیا۔ عضد الدولہ اس وقت بھی رمان سے دل بہلا رہا تھا۔ اسے جیسے ہی کسی کنیز نے ابو جعفر کی آمد کی خبر دی، بے نیازی سے بولا۔ ”یہ بوڑھا تو بلائے بے درماں بن گیا ہے۔ آخر یہ اپنے گھر کیوں نہیں بیٹھتا۔“

رمان نے ہنس کر شوخی سے جواب دیا۔ ”یہ حسد کا شکار ہے اور یہ کسی بھی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس کی طرح ضعیف اور ناتواں نہ ہو، مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔“

عضد الدولہ نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت رسید کر دی اور بولا۔ ”کیسی الٹی بات کر رہی ہے شری لڑکی، ڈرنا تو ابو جعفر کو چاہیے۔“

ایک کنیز نے عرض کیا۔ ”ابو جعفر پوچھ رہا ہے کہ اگر حضور والا کو اس سے کوئی خاص کام نہ ہو تو وہ گھر چلا جائے؟“

عضد الدولہ نے رمان سے پوچھا۔ ”رمان! تیرا کیا خیال ہے کیا ابو جعفر سے تھوڑی سی تفریح لی جائے؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی تائید نہیں کروں گی کیونکہ ایک ذہین اور زیرک شخص سے تفریح حاصل کرنا بہت دشوار ہے، ابو جعفر بے وقوف نہیں بن سکتا۔“

عضد الدولہ نے کنیز کو حکم دیا۔ ”ابو جعفر کو حاضر کیا جائے۔“

تھوڑی دیر بعد ابو جعفر حاضر کر دیا گیا۔ عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”نوجوان امیر زادوں کے ورثا کیا کہہ رہے تھے؟“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”وہیلی امیر کو دعائیں دے رہے تھے۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”ابو جعفر! تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں انتہائی نوجوانی سے ملوکیت اور سیاست میں اپنی جان کھپا رہا ہوں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب سے میں خلافت عباسیہ کا متولی بنا ہوں میری ذمہ داریوں میں ہزار گناہ زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، میں پوری تن دہی اور مستعدی سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتا رہا ہوں لیکن اب کچھ محکمات محسوس کرنے لگا ہوں اور اتفاق سے اس محکم کے زمانے میں مجھے رمان جیسی رفیق میسر آ گئی۔“

ابو جعفر نے بات کاٹ کر عرض کیا۔ ”حضور والا! اصل بات کہہ گزریں، تمہید کا طول باتوں کو کرنا کر دیتا ہے۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اب میں چند دنوں کے لیے روپوش ہو جانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری پیشتر ذمہ داریاں تم سنبھال لو۔“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں لیکن آپ کی باتوں کے جواب میں کچھ عرض ضرور کروں گا۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اجازت ہے۔“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”آپ کی کامیابی کا راز اسی میں چھپا ہے کہ آپ اپنا کام خود انجام دیتے ہیں رہا محکم اور بے زاری کا سوال تو میں یہ مونی سی بات جانتا ہوں کہ اگر کسی طرح کسی نظام اور ضابطے میں فرق آ جائے تو وہ نظام یا ضابطہ زیادہ دن تک نہیں چل سکے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان حالات میں وہ پہلے سے زیادہ چل سکے لیکن ہمیں اس کے تاریک پہلو پر ضرور نظر رکھنی چاہیے۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”تم اس طرح سچ در سچ انداز میں بات کیوں کر رہے ہو؟ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”یہ سورج روز اول سے اسی طرح طلوع ہو رہا ہے اور یہ چاند ہر ماہ ایک ہی ترتیب سے نکلتا گھٹتا رہتا ہے اور جس دن بھی ان دونوں میں سے کسی ایک نے محکم کا عذر کر دیا اور آرام کرنے لگا تو اس دن قیامت ہی تو آ جائے گی اس زمین پر لیکن ان کی کامیابی کا راز ہی یہ ہے کہ یہ جھکتے نہیں، اسی طرح آپ جس دن بھی محکم اور سستی کا شکار ہوئے دوست نما دشمن آپ کو گھیر کر آپ کا کام تمام کر دیں گے۔“

عضد الدولہ نے کھسیا ہٹ میں جواب دیا۔ ”جس محکم کا تم ذکر کر رہے ہو وہ مجھ پر موت ہی طاری کر سکتی ہے ورنہ میں جس محکم کا ذکر کر رہا ہوں وہ ذرا دم لینے کا نام ہے۔“

رمان بھی ہوئی تھی کہ چالاک ابو جعفر برابر وار کے جارہا تھا، اس کے اندیشوں کے مطابق ابو جعفر کے حملوں میں سے کوئی ایک بھی اگر کارگر ہو گیا تو اس کا اپنا حشر کیا ہوگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”وہیلی امیر! مجھے اس شخص سے ڈر لگتا ہے کیونکہ یہ ہم دونوں سے شاید خوش نہیں اس لیے یہ یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمیں اس کے شر کا مقابلہ ضرور کرنا پڑے گا۔“

عضد الدولہ نے ابو جعفر سے کہا۔ ”اچھا اب تم جا سکتے ہو لیکن تم اس طرح رہو گویا میں کہیں اور چلا گیا ہوں اور میری عدم موجودگی میں حکومت کا نظم و نسق تمہارے ذمہ ہوگا۔ اب یہی دیکھنا ہے کہ تم اس میں کتنے پورے آؤ گے۔“

طاقت کی فوقیت

قوت اور امانت دونوں کسی ایک آدمی میں جمع ہوں ایسے لوگ آج کل بہت کم ہیں۔ پس جب امام کسی اقلیم کے لیے والی اور حاکم مقرر کرنا چاہتا ہو اور وہ آدمی بڑے پیمانے پر طاقت ور ہے اور دوسرا طاقت ور ہے تو امام کا فرض ہے کہ اسے مقام رکھے۔ جو اس اقلیم اور ولایت کے لیے زیادہ مفید اور زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔ چنانچہ امارت عرب اور جہاد کے لیے ایسا آدمی مقرر کرے جو قوی، دلیر، شجاع اور بہادر ہو، اگرچہ وہ فاجر ہی کیوں نہ ہو اور ضعیف و عاجز کے مقابلے میں اس کو ترجیح دے خواہ وہ امین ہو۔ امام احمد حنبل سے کسی نے پوچھا، دو آدمی ہیں۔ دونوں کے دونوں عرب و جہاد کے امیر و سردار ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک فاجر مگر قوی ہے۔ دوسرا صالح اور نیک ہے مگر ضعیف و کمزور ہے۔ تو دونوں میں سے کس کے ساتھ رہ کر جہاد کرنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا، ”فاجر قوی کی قوت مسلمانوں کے لیے ہے، اور اس کا فخر اس کی جان کے لیے ہے۔ اور صالح اور نیک اگر ضعیف و کمزور ہے تو اس کی صلاح اور نیک بختی اس کی جان کے لیے ہے، اور اس کا ضعف مسلمانوں کے ضعف کا موجب ہے۔ تو جہاد قوی فاجر کے ساتھ رہ کر کرنا چاہیے۔“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ”اللہ تعالیٰ فاجر آدمی سے بھی اس دین کی مدد کر دیتا ہے۔“ ہاں، جب امیر و سالار کے منصب کے لیے قوی القلب، شجاع اور دلیر میسر نہ آئے اور اس جگہ کو پر کرنے کیلئے کوئی موزوں آدمی نہ مل سکے، تو اس وقت اس صلح فی الدین کو مقرر کرنا چاہیے۔

(سیاست شرعیہ از امام ابن تیمیہ)

محسوسات کا تعلق ہے میں یہی سمجھتی ہوں۔“
”اور عضد الدولہ کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا وہ بھی تجھ سے محبت کرتا ہے؟“
”ہاں، میرا خیال تو یہی ہے۔“
”اچھا اب یہ بتا کیا وہ تیری ذات سے محبت کرتا ہے؟“
”میری ذات سے بھی اور میری صفات اور ہنر سے بھی کیونکہ میں حسین ہونے کے باوجود اگر شاعرہ، رقاصہ، مہر بہ حاضر جواب، زود فہم اور زود فیصلہ نہ ہوتی تو شاید ویلی امیر مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں کرتا۔“
ابو جعفر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، بولا۔ ”اچھا اب اتنا اور بتا دے کہ عضد الدولہ اگر بادشاہ اور خلافت عباسیہ کا متولی نہ ہوتا تو کیا پھر بھی تو اس سے محبت کرتی یعنی کیا تو اس کی ذات سے محبت کرتی ہے یا اس کی صفات سے بھی؟“
رمان نے جواب دیا۔ ”میں بھی اس کی ذات کے ساتھ ساتھ صفات سے بھی محبت کرتی ہوں۔“
ابو جعفر نے ہنس کر کہا۔ ”رمان! میرا خیال ہے کہ تو خود بھی صاف گو ہے اور دوسروں کی صاف گوئی بھی پسند کرتی ہے؟“
”ہاں۔“ رمان نے جواب دیا۔ ”میں منافقت پر صاف گوئی کو ترجیح دیتی ہوں۔“

ابو جعفر کے جواب نے رمان کو عضد الدولہ کی نظر میں اور زیادہ قیمتی کر دیا۔
عضد الدولہ کے چلے جانے کے بعد ابو جعفر اور رمان کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے کو کن انکھوں سے دیکھ لیتے۔ آخر ابو جعفر نے بات کرنے میں پہل کی، پوچھا۔ ”رمان! تیرا اس محل میں دل لگ گیا یا ابھی اجنبیت کا احساس باقی ہے؟“
رمان نے جواب دیا۔ ”ویلی امیر مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ مجھ سے والہانہ محبت کرتا ہے اور اب میں بھی اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔“
ابو جعفر نے ہنس کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور رمان کے بالکل مقابل جا بیٹھا، بولا۔ ”اچھا، آج ہم دونوں کچھ محبت پر بات کر لیں، اس کے بعد کوئی اور بات ہوگی۔“
رمان نے بے بسی اور بے بضاعتی کا اعتراف کیا۔ ”اس مشکل اور دقیق بحث پر میں زیادہ بات نہیں کر سکتی گی۔“
ابو جعفر نے سوال کیا۔ ”اچھا یہ بتا کیا تو واقعی عضد الدولہ سے محبت کرتی ہے؟“
رمان نے جواب دیا۔ ”ہاں، جہاں تک میرے

ابو جعفر نے کہا۔ ”اس مسئلے پر تو کسی وقت بھی بات ہو سکتی ہے لیکن حضور والا کا اس وقت ان وفود سے مل لینا بہت ضروری ہے جو ہمدان، رے اور ابواز سے آئے ہوئے ایک ہفتے سے شامی دارالضیافت میں پڑے پریشان ہو رہے ہیں۔“ پھر راز داری سے عرض کیا۔ ”میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ یہ سن گئے ہیں کہ آپ واقعی کسی کنیز کے عشق میں مبتلا ہو کر کاروبار مملکت و سیاست کی طرف سے بے پروا اور غافل ہو گئے ہیں۔ اگر میری یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف علاقوں کے یہ وفود یہاں خاص غرض سے بھیجے گئے ہیں اور جب یہ لوگ اپنے اپنے علاقے میں یہ خبر لے کر واپس جائیں گے کہ ویلی امیر حقیقتاً ایک کنیز میں محو ہو کر غافل اور گوشہ نشین ہو گیا ہے تو پھر ایسی بغاوتوں کا آغاز ہو جائے گا، جن کا کم از کم میری ناقص رائے میں دبانہ محال ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“
عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”آپ کو ان وفود سے اسی وقت مل لینا چاہیے۔“
عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”تنہا یا تم بھی میرے ساتھ موجود رہو گے؟“
”تنہا، اس وقت یہی بہتر ہے کہ حضور والا تنہا ملاقات کریں، جس کا ان پر یہ رعب پڑے گا کہ ویلی امیر آج بھی اتنا ہی چاق و چوبند اور مستعد ہے جتنا کبھی پہلے ہوا کرتا تھا اور کسی کی مدد کے بغیر سب کچھ کر سکتا ہے۔“
عضد الدولہ نے کہا۔ ”بہتر ہے میں اسی وقت ان وفود کو بلاتا ہوں اور ان سے باتیں کر کے رخصت کرتا ہوں۔“
ابو جعفر نے نصیحت کی۔ ”حضور والا! ان سے جس لہجے میں گفتگو فرمائیں گے اس میں تمکنت اور بدبہ ضرورت ہونا چاہیے کیونکہ یہ وفود حضور والا میں جو کچھ دیکھیں اور محسوس کریں گے من و عن و ہی بیان کر دیں گے۔“
عضد الدولہ نے کہا۔ ”اچھا، میں ان وفود سے ملاقات کرتا ہوں لیکن جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم یہیں رمان کے پاس موجود رہو گے اور میری خواہش ہے کہ تم رمان کو بھی اپنی حکمت آمیز باتوں سے محفوظ اور لطف اندوز کرتے رہو۔“
ابو جعفر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں اسے حکمت آمیز باتوں سے کیا محفوظ کروں گا یہ تو خود ہی سرتاپا حکمت و تدبیر ہے، میں تو اس پر رشک کرنے لگا ہوں۔“

معزز خواتین اور عضد الدولہ کی محبوب کنیزوں کو یہ معلوم ہوا کہ عضد الدولہ کا ندیم ابو جعفر بھی رمان سے خوش نہیں ہے اور وہ اس کی اکھاڑ میں لگا ہوا ہے۔ انہوں نے نہایت ہوشیاری اور راز داری سے ابو جعفر کو یہ پیشکش کی کہ اگر وہ کسی طرح رمان کے زور کو توڑ دے تو وہ اسے گرانقدر انعام و اکرام سے نوازیں گی۔ اس پیشکش کے بعد ابو جعفر نے یہ دستور بنالیا کہ وہ ہر روز چند معاملات کے ساتھ عضد الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور نہایت ہوشیاری اور عقل مندی سے یہ کوشش کرتا کہ کوئی ایسا شوشہ ضرور چھوڑ جائے جس کا اثر رمان کے خلاف رونما ہو۔
عضد الدولہ کے شفا خانے بیمارستان عضدی میں ان دنوں بیماروں کی زیادتی تھی اور ان پر جو معالجہ تعینات تھے ان کی تعداد کم تھی۔ جس کے نتیجے میں بیماروں کے علاج میں دشواریاں اور کوتاہیاں پیش آرہی تھیں۔ بیمارستان کے منتظم نے عضد الدولہ کو درخواست بھیجی کہ اس وقت کم از کم چوبیس طبیبوں کی ضرورت ہے جبکہ پورے بیمارستان میں تقریباً بیس طبیب کام کر رہے ہیں۔ یہ درخواست رمان کے سامنے پڑھی گئی اور عضد الدولہ نے اس سے رائے لی کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے۔
رمان نے جواب دیا۔ ”اس معاملے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اس لیے آپ کو ابو جعفر سے مشورہ کرنا چاہیے۔“
اسی وقت ابو جعفر کو طلب کر لیا گیا۔ اس نے آتے ہی زہریلی مسکراہٹ سے رمان کو دیکھا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی عضد الدولہ نے کوئی بات بھی نہ کی تھی کہ ابو جعفر نے اسے مطلع کیا۔ ”ابواز، رے اور ہمدان کے وفود آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے ایک ہفتے سے شامی دارالضیافت میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“
عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”اچھا اچھا، میں ان سے مل لوں گا لیکن اس وقت میں نے تمہیں جس کام سے بلایا ہے پہلے اس پر بات ہو جائے تو بہتر ہے۔“
ابو جعفر نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ویلی امیر مجھ سے کس موضوع پر بات کرے گا۔ غالباً بیمارستان میں معالجین کی کمی کا مسئلہ درپیش ہے۔ شاید وہاں چار معالجین کی کمی محسوس کی جا رہی ہے اور بیمارستان کے منتظم اعلیٰ نے اس کی کوپورا کرنے کی درخواست کی ہے۔“
عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”بھدا! تم نے جو کچھ کہا، وہی مسئلہ درپیش ہے اور میں نے اسی مسئلے پر بات کرنے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔“

ابوجعفر نے کہا۔ ”تب پھر اپنے عضد الدولہ کے بارے میں میری رائے سن لے، غلطی سے تم دونوں جس جذبے کو محبت کا نام دے رہے ہو، وہ محبت نہیں تجارت ہے۔ تو اپنی حسین صورت اور ذاتی اور فنی صفات خلافت عباسیہ کے متحمل متولی اور بادشاہ کے ہاتھ بیچ رہی ہے اور عضد الدولہ اپنے عہد کی منتخب حسینہ اور فنکارہ کو اپنے اقتدار اور زوال کے بل پر خرید رہا ہے۔ اب تو یہ بتا کہ تم دونوں کے درمیان وہ شے کہاں ہے جسے محبت کہا جاتا ہے؟“

رمان نے کہا۔ ”جواب دینے سے پہلے میں آپ سے بھی ایک سوال کروں گی۔“

”شوق سے کر، میں اس کا جواب دوں گا۔“

رمان نے پوچھا۔ ”ابوجعفر! کبھی آپ بھی جوان رہے ہوں گے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”ہاں، کبھی میں بھی جوان ہوا کرتا تھا۔“

اس سوال نے ابوجعفر کو پریشان کر دیا تھا۔

رمان نے پوچھا۔ ”کبھی آپ نے بھی کسی سے محبت کی؟“

ابوجعفر نے ناگواری سے کہا۔ ”تو ایک سوال پہلے ہی کر چکی ہے وعدے کے مطابق میں اس کا جواب دے چکا ہوں لہذا اس دوسرے سوال کا میں کوئی جواب نہ دوں گا۔“

رمان نے کہا۔ ”سوال تو میں ایک ہی کروں گی، یہ اس بڑے سوال کے ضمنی سوالات ہیں اور ان سب کے جوابات کے بغیر وہ ایک سوال نہیں کیا جاسکتا۔“

ابوجعفر بھی اسے زیر کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اگر اس نے رمان کے سوالات کے جوابات نہیں دیے تو رمان بھی اس کی باتوں کے جوابات نہیں دے گی، بولا۔ ”اچھا کر سوالات، میں جوابات دوں گا۔“

رمان نے کہا۔ ”میں یہ جانتا چاہتی ہوں کہ کیا کبھی آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میں نے پہلے شادی کی اس کے بعد اس سے محبت کی۔“

رمان اس چالاک آدمی کے جواب پر حیران رہ گئی اور دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہی لیکن اس نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ابوجعفر کو سوال جواب سے تنگ اور شرمندہ ضرور کرے گی، بولی۔ ”آپ نے اپنی بیوی سے محبت کی ہے یا اس کے ساتھ رہتے رہتے جو لگاؤ ہو گیا ہے آپ اسے محبت کا نام دے رہے ہیں؟“

ابوجعفر نے کہا۔ ”جو چاہے سمجھ لے لیکن میں اسے

محبت ہی کہوں گا۔“

رمان نے پوچھا۔ ”آپ کی ایک ہی بیوی رہی یا کئی بیویاں اور کنیزیں بھی رکھتے رہے ہیں؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”کئی کئی بیویاں اور کنیزیں رکھنا اگر امارت کی شان میں داخل نہ ہوتا تو میں ہمیشہ ان سے مجتنب رہتا۔“

رمان نے کہا۔ ”اب ایک بات اور بتا دیجیے، اگر خوش قسمتی سے عضد الدولہ کی جگہ آپ ہوتے اور میں آپ کو مل جاتی تو آپ کیا کرتے؟“

ابوجعفر گھر چکا تھا، بولا۔ ”شان امارت کی نمود و نمائش کے لیے میں بھی یہی کرتا جو ویلی امیر کر رہا ہے۔“

رمان نے پوچھا۔ ”پھر آپ بے جا اور فضول سوال جواب سے مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں، کیا آپ کے سوال جواب میں آپ کے بڑھاپے کا احساس محرومی اور حسد شامل نہیں ہے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میں تم دونوں کی محبت سے حسد میں مبتلا نہیں ہوا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ تم دونوں اپنے کاروباری معاملے کو محبت کا نام مت دو، یہ محبت نہیں تجارت ہے اور میں انسانوں کی اس منافقت پر سخت مشتعل ہو جاتا ہوں کہ یہ تجارت کو محبت کہنے لگے۔“

رمان نے کہا۔ ”میرے پاس آپ کی اس بات کا جواب بھی ہے۔“ پھر اس نے سوال کیا۔ ”آپ خود کو اندر سے کیا محسوس کرتے ہیں جوان یا بوڑھا؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میں ایک صاف گو شخص ہوں، جھوٹ نہیں بول سکتا میں بوڑھا انسان ہوں۔“

رمان نے اس کے خضاب زدہ سر اور ڈاڑھی کے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے کہ زبان سے تو آپ بڑھاپے کا اعلان فرما رہے ہیں اور سفید بالوں پر خضاب چڑھا کر دیکھنے والوں کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

ابوجعفر چپ ہو چکا تھا۔ بات بناتے ہوئے بولا۔

”میں تجھ سے جو کچھ کہنے والا تھا وہ ابھی تک نہیں کہہ سکا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تو اس ویلی امیر کے پاس سے کہیں اور چلی بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اتنی قربت نہ اختیار کر۔ کچھ دور رہنے کی کوشش کر۔ ورنہ ہوگا یہ کہ عضد الدولہ کا دل تجھ سے بہت جلدی سیر ہو جائے گا اور تو اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے گی۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”ایسا کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، میں عضد الدولہ کے حکم اور مرضی کی تابع ہوں۔“

”پھر بھی۔“ ابوجعفر کے کس بل نکل چکے تھے۔ ”تو ایک عقل مند لڑکی ہے، تیرے لیے کوئی بات ناممکن نہیں۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”ابوجعفر! میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ عقل و دانش پر بھی مال و زر اور اقتدار کی حکومت رہتی ہے، میں ایک بار دوری اختیار کر لوں گی، دوبار کر لوں گی لیکن مستقل دور نہ رہ سکوں گی۔“

ابوجعفر نے بے پروائی سے کہا۔ ”تو نہیں جانتی کہ اس وقت تیری ذات پورے محل سرا میں رشک و حسد کا باعث بنی ہوئی ہے۔ محسوس ہونا حاسد ہونے سے بہتر ہے لیکن تیرے جتنا محسوس ہونا بھی اچھی بات نہیں۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”میں نقدیر کی قائل ہوں اگر اس عروج کے بعد اتنے ہی بڑے زوال کا منہ بھی دیکھنا پڑے تو میں اس زوال کا بھی اس خندہ پیشانی سے استقبال کروں گی۔“

”تیری مرضی۔“ ابوجعفر بے زاری سے بولا۔ ”لیکن تیرے زوال پر جسے سب سے زیادہ دکھ ہوگا وہ ابوجعفر ہوگا۔“

رمان چپ ہو گئی لیکن ابوجعفر کو اب رمان سے کہیں زیادہ نفرت ہو چکی تھی۔ اس نے ابوجعفر کو لا جواب کر دیا تھا اور اسے منافق تک کہہ دیا تھا۔ اس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو رمان کو اس کی ذہانت، حاضر جوابی اور صاف گوئی کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔

☆☆☆

عضد الدولہ نے مختلف علاقوں کے وفود کو بہت جلد نمٹا دیا۔ جب وہ واپس آیا تو ابوجعفر اور رمان خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم دونوں ایک دوسرے سے بے زاری کیوں نظر آ رہے ہو؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”یہ مجھ سے چند ایسے مباحث پر بات کر رہی تھی جن پر اسے چپ رہنا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ میری صاف گوئی اسے ناگوار گزری ہے۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”مگر تم ملول کیوں ہو؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے ملول ہو گیا کہ میں نے اس سے ناحق بحث کی۔ میں نہ اس سے بحث کرتا اور نہ یہ ملول ہوتی۔“

عضد الدولہ، رمان کو اس دیکھ کر خود بھی اداس ہو گیا تھا۔ ذرا جھنجھلاہٹ سے ابوجعفر کو تنبیہ کی۔ ”تمہیں ہر جگہ دقیق علمی یا معاشرتی مباحث پر بات نہیں کرنا چاہیے اور آئندہ اس کا خیال رہے۔“

ابوجعفر نے پوچھا۔ ”کیا سارے وفود آپ سے ملنے، باتیں کرنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”اور میں یہاں سے گیا کس لیے تھا؟“

ابوجعفر بڑبڑایا۔ ”ابھی تو میری باتیں ویلی امیر کی طبع نازک پر گراں گزر رہی ہوں گی لیکن اللہ نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا جب میری باتوں کی صداقت ظاہر ہو کر رہے گی۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو۔“

ابوجعفر نے کمال دلیری سے کہا۔ ”ظاہر ہے کہ میں یہاں مزید نہیں ٹھہروں گا لیکن میں اس پر احتجاج تو ضرور کروں گا کہ حضور والا نے امواز، رے اور اصفہان کے وفود کو مطمئن کیے بغیر ہی رخصت کر دیا اور اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔“

”ابوجعفر! تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ میں نے ان وفود کو مطمئن نہیں کر دیا۔ وہ تو رخصت ہوتے وقت مجھ سے بے پایاں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، ان میں کا ہر وفد معاملات اور مسائل کا جنگل لے کر آیا تھا اور ان میں کا ایک ایک وفد اپنے مسائل اور معاملات پر بات کرتا تو تین تین چار چار دن لگ جاتے، چہ جائیکہ آپ نے ذرا سی دیر میں ان تینوں وفود کو مطمئن کر دیا۔“

عضد الدولہ کھسیا تو ضرور گیا لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ ابوجعفر جو کچھ کہہ سن رہا ہے، اپنے لیے نہیں خود اس کے لیے کہہ سن رہا ہے۔ اس نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔ ”ابوجعفر! میں نہیں چاہتا کہ اس ضغنی میں تم سے بھی وہی مشقت لوں جو عام طور پر باغی یا سرکش لوگوں سے لیا کرتا ہوں لیکن مجھے تم پر رحم آتا ہے۔“

ابوجعفر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”ویلی امیر! میں جارہا ہوں لیکن آپ اس وقت چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور آپ کو اس وقت صحیح معنی میں میری ضرورت ہے۔“

ابوجعفر چلا گیا۔ رمان نے، جو ابھی تک چپ تھی ہنس کر عضد الدولہ کو ساری روداد سنا ڈالی۔ جب عضد الدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ رمان کے ہاتھوں اس چڑچڑے اور حاسد ندیم کی بڑی گت بن چکی ہے تو خوب ہنس۔ اس ہنسی میں رمان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ دونوں ایک ساتھ اٹھے اور دسترخوان پر جا بیٹھے۔ سامنے دور تک کھانا پھیلا ہوا تھا اور برتنوں کی کثرت سے ایسا لگتا تھا گویا ان کی دکان کھلی ہوئی ہے۔ اس موقع پر رمان نے ایک عجیب سی بات کہی۔ اس نے عضد الدولہ سے کہا۔ ”میں چاروں طرف سے حاسدوں میں گھری ہوئی ہوں۔ اس لیے جانے بغیر میں ایک لقمہ بھی نہ کھاؤں گی۔“

عضد الدولہ نے چونک کر سوال کیا۔ ”کیوں خیریت تو ہے، کوئی خاص بات؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”میں خوف زدہ ہو گئی ہوں اور ہر وقت یہ اندیشہ پریشان کرتا رہتا ہے کہ میں کسی بھی لمحے کسی بھی طرح ہلاک کی جاسکتی ہوں۔“

عضد الدولہ نے اسی وقت دسترخوان پر موجود کھانے کا ذرا ذرا سا حصہ نکال نکال کر مویشیوں اور پرندوں کو کھلا دیا اور ان میں سے کسی ایک کی حالت بھی خراب نہ ہوئی تو اس نے ہنس کر رمان سے مذاق کیا۔ ”تو مایہ نوا میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ٹھہر جا، میں آج ہی تجھے بیمارستان کے طبیبوں کی مجلس مشاورت کے سپرد کرتا ہوں۔ مایہ نوا بڑا موذی اور پریشان کن مرض ہے۔“

رمان شرمندہ ہو کر کھسپائی ہنسی ہنسنے لگی۔ عضد الدولہ نے کہا۔ ”ہونہ ہو یہ شبہ بھی ابوجعفر نے ہی تیرے دل میں ڈالا ہوگا؟“

رمان نے تائید میں گردن ہلا دی۔ عضد الدولہ نے دسترخوان کے گرد و پیش موجود خدمت گاروں اور کنزوں کی پروا کیے بغیر رمان کو چند لقمے اپنے ہاتھ سے کھلائے اور اسے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جن میں رمان کے لیے پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔ عضد الدولہ کا رواں رواں رمان کا گھائل اور مفتوح تھا۔ اس نے نہایت گہری اور جذباتی آواز میں کہا۔ ”رمان! میں نے آج تک کسی لڑکی یا عورت کے سامنے اس طرح اظہار عشق نہیں کیا جس طرح تیرے روبرو کئی بار کر چکا ہوں۔ تو یقین کر کہ میں اس خیال ہی سے کانپ جاتا ہوں جس میں تیری جدائی کا ذرا سا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ تو خود دیکھ رہی ہے کہ میں حکومت اور نظام حکومت تک سے غفلت برت رہا ہوں۔ آخر کیوں؟ اس کا سبب؟ اس لیے کہ میں تجھ سے والہانہ عشق کرتا ہوں، اس کی وجہ تو ہے۔“ پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں تیری محبت کی بے اختیاری میں تیرے سوا اپنا سب کچھ کھو بیٹھوں اور آخر میں تو خود بھی کج ادائی کر بیٹھے لیکن میں دل کے ہاتھوں

مجبور ہوں۔ میں تیرے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ حکومت اقتدار، جان سب کچھ تیرے لیے چھوڑ سکتا ہوں۔“

رمان بے اختیار ہو کے اس کی آغوش میں گر کر زارہ قطار رونے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اگر میں اس قسم کی باتیں آپ سے پہلے کہہ چکی ہوتی تو شاید جی کہلاتی لیکن اب میرے لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔ کم سے کم لفظوں میں، میں جو کچھ کہہ سکتی ہوں یہ ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتی تھی آپ پہل کر چکے ہیں۔ یہ محل، آسائشیں، مال و زر، نوکر چاکر، اقتدار و اختیار، آپ کے بغیر بے کار، فضول اور غیر دلکش ہیں۔ اگر آپ میرا امتحان لینا چاہیں تو میں آج اس وقت آپ کے ساتھ اسی جگہ چلتے اور رہنے پر آمادہ ہوں جہاں آپ کے سوا اور کچھ نہ ہو۔“

خدام اور کنیزیں اپنا اپنا منہ پھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ عضد الدولہ کھانے سے فارغ ہو کر پھر خلوت میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

بیمارستان عضدی میں چار طبیبوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ عضد الدولہ نے بیمارستان کی انتظامیہ کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی مرضی سے چار طبیب ملازم رکھ سکتی ہے۔ انتظامیہ نے تین طبیب تو رکھ لیے لیکن ایک طبیب کا مسئلہ مصیبت بن گیا۔ یہ جو تھا طبیب کس طرح امیدواروں میں شامل ہو گیا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا ہاں اس کے لیے انتظامیہ سے ابوجعفر نے یہ ضرور کہا تھا کہ اس چوتھے طبیب کو ہر قیمت پر ملازم رکھنا ہے کیونکہ اسے عضد الدولہ کی محبوبہ خاص رمان کی سفارش حاصل ہے۔

ایک دن فجر کے فوراً بعد رمان کی خدمت میں ابوجعفر نے حاضری دی۔ رمان کے پاس اس وقت بھی عضد الدولہ موجود تھا۔ ابوجعفر نے شکایت کیا۔ ”افسوس کہ میں اکثر و بیشتر تیرے پاس یوں نہیں آتا کہ لوگ یا تم لوگ خود یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ میری تجھ سے کوئی غرض وابستہ ہے۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”ابوجعفر! کوئی خاص کام، کیسے آتا ہوا؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حضور والا نے ایک عرصے سے بیمارستان کا معائنہ نہیں فرمایا۔ میں نے سوچا کہ اگر آپ خود تشریف نہیں لاتے تو بیمارستان کے لوگ حضور سے ملاقات کر سکتے ہیں۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”کیا بیمارستان کے لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حضور والا! بیمارستان میں

جن تین سے طبیبوں کا اضافہ ہوا ہے، میں نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ حضور والا کا شرف دیدار حاصل کر لیں۔ وہ باہر موجود ہیں کیا آپ ان سے ملنا گوارا فرمائیں گے؟“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”ابوجعفر! میں نے تمہیں جو اختیارات دے رکھے ہیں وہ کافی ہیں۔ میں کس کس سے ملوں گا۔“

ابوجعفر نے عرض کیا۔ ”حضور کی ذرہ نوازی، کرم فرمائی لیکن ان تینوں سے آپ کا ملنا یوں ضروری ہے کہ محل سرا کے باہر حضور کے سلسلے میں جس قسم کی سرگوشیاں ہو رہی ہیں ان کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ آپ ان معاملات میں عملاً دلچسپی لیں۔“

”تمہارا غالباً یہ مطلب ہے کہ باہر ہمارے خلاف یہ سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ میں کسی خوب صورت عورت پر عاشق ہو کر امور جہانبانی اور کار جہانگیری سے غافل ہو گیا ہوں۔“

ابوجعفر نے ادب سے عرض کیا۔ ”میں ان سرگوشیوں کو دہرا بھی نہیں سکتا کیونکہ حضور والا کی روشن ضمیری نے انہیں پہلے ہی مطلع کر رکھا ہے۔“

عضد الدولہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کسی فکر میں ڈوبا آخر رمان نے سکوت توڑا۔ ”میں بدنامی سے خوف زدہ رہتی ہوں کیونکہ ویلی امیر کی بے نیازی کا سبب میں قرار دی جا رہی ہوں۔“

عضد الدولہ نے اعلان کیا۔ ”میں تینوں طبیبوں سے ضرور ملوں گا اور اسی وقت ملوں گا۔“

ابوجعفر بے حد خوش ہو گیا اور عضد الدولہ کو لے کر طبیبوں کے پاس پہنچ گیا جو دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ طبیبوں کے ساتھ بیمارستان کا منتظم بھی آیا تھا۔ ابوجعفر، عضد الدولہ کو ان کے پاس چھوڑ کر پھر اندر چلا گیا۔ اس نے رمان کے روبرو پہنچتے ہی نہایت لجاجت سے کہا۔ ”رمان! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے میں اسی وقت واپس جاؤں گا۔ آج تجھے میرا ایک کام ضرور کرنا پڑے گا۔“

رمان نے پوچھا۔ ”کون سا کام؟ حالانکہ آپ خود اتنے صاحب اختیار ہیں کہ آپ کو میری سفارش کی ضرورت ہی نہیں ہونا چاہیے۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”نہیں یہ بات نہیں، شاید تو اپنے مرتبے اور مقام سے ابھی تک واقف نہیں ہوئی۔ حقیقتاً تو خود عضد الدولہ ہے اور اس وقت تو جو چاہے کر دے سکتی ہے۔“

رمان نے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”تجھے تو یہ معلوم ہی ہوگا کہ بیمارستان کو چار نئے طبیبوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے تین کا تقریباً عمل میں آ گیا ہے یہ بد قسمتی سے چوتھا امیدوار تقریری سے محروم رہ گیا ہے۔ اگر تو چاہے تو وہ بھی رکھا جاسکتا ہے۔“

رمان نے پوچھا۔ ”اس کی تقریری میں قباحت کیا ہے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”چوتھا امیدوار بد قسمتی سے باقاعدہ طبیب بھی نہیں رہا۔ اس کا ماضی یہ بتاتا ہے کہ اس کے پاس طبابت کا تجربہ ضرور ہے لیکن باقاعدہ علم نہیں ہے۔“

رمان نے پوچھا۔ ”وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”خراسان کا۔“

رمان چونک سی پڑی، پوچھا۔ ”اس کا نام کیا ہے؟“

ابوجعفر نے اس کے چونکنے کو محسوس تو کر لیا تھا لیکن بظاہر وہ انجان بنا رہا۔ ”مجھے اس کا صحیح نام تو معلوم نہیں لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کچھ احمد یوسف یا علی یوسف نام ہے اس کا۔ احمد یا علی میں تو گزریا بھول چوک ہو سکتی ہے لیکن اس کے نام میں یوسف ضرور ہے۔“

رمان کی حالت غیر ہونے لگی، بولی۔ ”جب اسے طبابت کا باقاعدہ علم حاصل نہیں ہے تو اسے بیمارستان میں جگہ نہیں ملنی چاہیے۔ اسے رخصت کر دیجیے اور کہہ دیجیے کہ وہ کہیں اور چلا جائے ایک بغداد پر ہی کیا موقوف ہے۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”رمان تو نہیں جانتی کہ وہ کتنا مستحق ہے۔ میں اس سے اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا اور پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کا تعلق تیرے خراسان سے ہے تو میں نے اپنا یہ فرض محسوس کیا کہ اسے بیمارستان میں طبیب کی جگہ ضرور ملنی چاہیے۔“

رمان دودلی سی ہو رہی تھی۔ اس نے جذباتی انداز میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے، بولی۔ ”ابوجعفر! اسے چلا کر دیجیے اور صاف صاف کہہ دیجیے کہ اسے بیمارستان میں ملازمت نہیں مل سکتی۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”اول تو میں یہ سب نہیں کہہ سکتا۔ دوسرے یہ کہ اسے تیری مجلسرا میں موجودگی کا علم ہے۔ اس نے اشارتاً یہ بات بھی کہی کہ اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا تو وہ کوئی سفارش حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ یہ کام جب میں خود کر سکتا ہوں تو اسے تجھے زحمت نہیں دینی چاہیے۔ پھر کومارنے کے لیے مخفی استعمال کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

رمان نے پوچھا۔ ”پھر آپ نے اس کے لیے کیا کیا؟“
ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ویلی
امیر سے تو اس کی سفارش کر دے کیونکہ بیمارستان کا منتظم
اب سفارش کے بغیر کام نہیں کرے گا اور میں یہ بھی نہیں
چاہتا کہ وہ اس سفارش کے لیے تجھ سے رابطہ قائم کرنے کی
کوشش کرے۔“

رمان نے کسی جذباتی دباؤ کی وجہ سے کچھ سوچتے
ہوئے کہا۔ ”آپ چاہیں اور اسے مطمئن کر دیں کہ اس کا یہ
کام ہو جائے گا اور یہ کہ وہ مجھ سے براہ راست سفارش
حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔“

ابوجعفر نے خوش ہو کر عرض کیا۔ ”بس، اب میں چلا۔
میں اسی کام سے یہاں حاضر ہوا تھا۔“

رمان نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے یاوری نہیں کی۔
ابوجعفر کے چلے جانے کے کافی دیر بعد عضد الدولہ
واپس آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے رمان سے
کہا۔ ”رمان! بخدا کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ
تو تجھے معلوم ہی ہے کہ میرے بیمارستان میں ابھی تک تیس
طیب کام کرتے تھے لیکن اب وہاں چار کی مزید ضرورت
پیش آگئی ہے۔ بیمارستان کے منتظم اعلیٰ نے تین طیب ملازم
رکھ لیے ہیں، ایک کی تقرری کا مسئلہ زیر غور ہے۔ یہ چوتھا
طیب تیرے خراسان سے تعلق رکھتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ
وہ طباعت کا شاندار تجربہ تو ضرور رکھتا ہے لیکن اس نے اس
علم کو باقاعدہ حاصل نہیں کیا۔“

رمان نہایت دلچسپی مگر پریشانی سے یہ روداد سنتی
رہی۔ ذرا تذبذب سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی ابوجعفر نے
مجھے یہ بتایا کہ اس چوتھے طیب کی تقرری میں تو بھی دلچسپی
لے رہی ہے۔ چنانچہ میں نے بیمارستان کے منتظم اعلیٰ کو حکم دے
دیا ہے کہ وہ اس چوتھے طیب کو فی الفور ملازم رکھ لے۔“
رمان نے اطمینان کی سانس لی، بولی۔ ”تو اسے
ملازم رکھ لیا گیا؟“

”ہاں۔“ عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”اس چوتھے
طیب کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا تیرے وطن خراسان
سے تعلق تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کی تقرری میں تیری
دلچسپی بھی شامل ہوگئی۔“

رمان نے کہا۔ ”جب مجھے ابوجعفر کی زبانی یہ معلوم
ہوا کہ وہ پریشان بھی بہت ہے تب میں نے ازراہ ترجم اور انسانی
ہمدردی ابوجعفر سے یہ کہا کہ وہ اس کی آپ سے سفارش

کر دے۔“
عضد الدولہ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا،
بولی۔ ”رمان کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ زمانہ کسی کو بھی ایک
حال میں نہیں رہنے دیتا۔ میں نے خوش قسمتی سے تیرے
جیسے نادر روزگار، منتخب زمانہ حسین عورت پالی ہے۔ خدا نے
تجھے علم و دانش اور فنون لطیفہ سے بھی خوب نوازا ہے۔
میری یہ خوش قسمتی، بدقسمتی میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ ہم
دونوں ایک دوسرے سے جدا بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا
تو میں اس صدمے کو برداشت کس طرح کروں گا۔“
رمان نے کچھ خوف سا محسوس کیا، پوچھا۔ ”لیکن اس
وقت آپ کے دل میں ایسا خیال کیوں آیا؟“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”بس یونہی، اس وقت
میرے دل و دماغ پر تو بری طرح طاری ہے۔ جب میں
بیمارستان کے منتظم اور طبیعوں سے باتیں کر رہا تھا تو میں
وہاں تیری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہیں یہ
خیال بھی آیا اور تیرے سامنے اس کا اظہار بھی کر دیا۔“

رمان نے اطمینان کی سانس لی، بولی۔ ”میں اپنی
پوری زندگی آپ کی محبت میں گزار دینا چاہتی ہوں اور ایک
بار پھر یہ یقین دلاتی ہوں کہ آپ کا اقتدار اور مال و زر تو رہا
ایک طرف، میں ایک معمولی کنیا اور گوشہ گنہامی میں بھی آپ
کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے رمان، بالکل
یقین ہے۔“

رمان نے ہنس کر وہ بات کہہ دی جو کہنا نہیں چاہتی
تھی، بولی۔ ”ویلی امیر! میں ایک بات ضرور کہوں گی گو یہ
بات قبل از وقت ہے اور ضروری نہیں کہ وہ ہمارے ساتھ بھی
پیش آئے۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”تمہید میں وقت ضائع نہ کرو، جو
کچھ کہنا چاہتی ہے فوراً کہہ دے۔“

رمان نے عرض کیا۔ ”مرد حیرت انگیز طور پر بدل
جاتے ہیں۔ آج آپ جتنا شدت سے اظہار عشق فرما رہے
ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ جذبہ مدت العمر آپ کے سینے
میں موجزن رہے۔“

عضد الدولہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ناگواری
سے پوچھا۔ ”کیا تو میری محبت پر شبہ کر رہی ہے؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی محبت پر شبہ نہیں
کر رہی ہوں بلکہ ایک ایسی عام حقیقت بیان کر رہی ہوں
جسے رو نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں البتہ اختلاف کیا جاسکتا ہے۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں اسے
غلط ثابت کر دوں گا۔“

رمان نے کہا۔ ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

عضد الدولہ نے محسوس کیا کہ رمان کچھ زیادہ ہی
اداس ہوگئی ہے۔ اس نے رقاصوں کا ایک طائفہ طلب کیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے رمان کے سامنے رقص و موسیقی کی محفل
گرم ہوگئی۔ عضد الدولہ نے رمان کو ہنس کر مخاطب
کیا۔ ”بخدا! میں تجھے اداس نہیں دیکھ سکتا رمان! تیری اداسی
میری اداسی کا سبب بن جائے گی۔“

رمان نے فرط جذبات سے عضد الدولہ کے چہرے
پر نظر ڈالی۔ اس نے بھی رمان کو پیار بھری نظروں سے
دیکھا۔ ویلی امیر نے رمان کی آنکھوں میں آنسو محسوس
کیے۔ آنکھوں کے کنوڑے پانی سے لبریز تھے۔
عضد الدولہ نے رومال سے آنسوؤں کو خشک کرنے کی
کوشش کی، پوچھا۔ ”تو رو کیوں رہی ہے رمان، تیری
آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟“

رمان نے زبردستی مسکراتے کی کوشش کی، جواب
دیا۔ ”ویلی امیر کے بے پناہ اظہار عشق نے میری دونوں
آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز کر دی ہیں، یہ خوشی کے
آنسو ہیں۔“

لیکن عضد الدولہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ
کیسے خوشی کے آنسو ہیں جو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

☆☆☆

ان دنوں ابوجعفر کی آمدورفت زیادہ ہوگئی تھی۔
عضد الدولہ بھی اس کے خلوص اور دیانت کا قائل
تھا۔ ابوجعفر نے ویلی امیر سے کہا۔ ”حضور والا! آپ کا
امور ملکی میں دلچسپی لینا بہت ضروری ہے شاید میں یہ بات کئی
بار پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ آپ کے حریف اور حاسد آپ
کے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔ ایک مخلص، دیانت
دار اور فرض شناس ملازم کی حیثیت سے میری یہ ذمہ داری
ہے کہ میں حضور کو ان کے نیک و بد سے آگاہ کرتا رہوں۔“

عضد الدولہ نے رمان کے پاس سے ہٹ کر ابوجعفر
سے سرگوشی میں کہا۔ ”ابوجعفر! کچھ عرصے سے میں رمان کو
اداس اور محفل سا محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے بڑی کوشش
کی کہ یہ دل کی بات بتا دے لیکن نہیں بتاتی۔ تم کوشش
کر کے اس کی اداسی کا سبب معلوم کرو۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گا لیکن
اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں تنہائی بھی میسر ہو۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”میں یہاں سے چلا جاتا ہوں،
تم اس سے باتیں کر سکتے ہو۔“ اس کے بعد رمان سے
کہا۔ ”رمان میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں
آ جاؤں گا۔ اس وقت تک تم ابوجعفر سے باتیں کرو۔“
رمان نے کہا۔ ”بہتر ہے۔“

عضد الدولہ چلا گیا۔ ابوجعفر، رمان کے قریب اس
کے مقابل جا بیٹھا، کچھ سکوت کے بعد اس نے بات شروع
کر دی۔ ”رمان! تیرا ہم وطن خراسانی طیب ملازم رکھا
جا چکا ہے اور آج کل وہ بہت خوش ہے۔“

رمان نے ابوجعفر کی طرف دیکھا تو ضرور لیکن کوئی
جواب نہیں دیا۔

ابوجعفر نے کہا۔ ”رمان! کیا اس چار دیواری میں تیرا
دم نہیں گھٹتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ تجھے یہاں سے نکل کر بغداد
کے کئی کوچوں کی سیر بھی کرنی چاہیے۔ میں کچھ عرصے سے یہ
محسوس کر رہا ہوں کہ تو بہت اداس رہنے لگی ہے۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”ابوجعفر! آپ میری مدد
کیجیے، ان دنوں میں سخت مایوسی کا شکار ہوں۔ ویلی امیر مجھ
سے بار بار محبت کا اظہار کرتا ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ
محبت کا جتنا زیادہ دعویٰ کرتا ہے میں اتنی ہی ناامید اور غیر
مطمئن ہو جاتی ہوں۔“

ابوجعفر نے پوچھا۔ ”آخر ایسا کیوں ہے؟“
رمان نے جواب دیا۔ ”میں خود بھی نہیں جانتی کہ ایسا
کیوں ہے۔ شاید میں بے بنیاد ہوں اور اندیشوں کا شکار
ہوگئی ہوں۔“

ابوجعفر نے ہلکی سی چوٹ کی۔ ”رمان! اگر تو عہد
کرے کہ میں جو کچھ کہوں گا اس کا ذکر عضد الدولہ سے نہیں
کرے گی تو میں تجھ سے کچھ ضروری باتیں کر لوں گا۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”ابوجعفر! مجھے ایک ہم راز
اور ہمدرد درکار ہے۔ آپ کی باتوں میں خلوص اور محبت کی بو
محسوس ہوتی ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی کوئی
بات بھی ویلی امیر سے نہیں کروں گی۔“

ابوجعفر نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔
”عضد الدولہ بہت زیادہ وقت تیری محبت میں گزارتا ہے۔
جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ محل سرا کے باہر اس کے مخالف اس
کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ عضد الدولہ کی غفلت، نظم
و نسق مملکت میں ابتری اور انتشار کا باعث بنی ہوئی ہے۔
جانتی ہو کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“
رمان نے نفی میں اپنی گردن ہلائی، کہا۔ ”میں نہیں

جانتی کہ باہر لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“
ابوجعفر نے کہا۔ ”اس سلسلے میں لوگ تیرا نام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک خوب صورت عورت نے عضد الدولہ کو بے کار اور بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔“
رمان نے بہت مایوسی سے پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”تو ادراک و خرد کی پیکر ہے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ تجھے کیا کرنا چاہیے لیکن یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ تو عضد الدولہ کو مملکت کے کام کرنے کا موقع ضرور دے۔“

رمان نے غمزہ آواز میں کہا۔ ”ابوجعفر! عضد الدولہ کو اپنی طرف مائل کرنے یا اسے اپنا والہ و شیدا بنالینے میں میری کوشش یا ارادے کا ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اچانک اور غیر متوقع ہوا ہے۔ اب لوگ مجھ سے حسد کرنے لگے ہیں۔ مجلسرا کے باہر میرے خلاف جو آوازیں بلند ہو رہی ہیں یا جہاں بھی میرے خلاف سرگوشیاں اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس میں بھی میرے دشمنوں کا حسد کام کر رہا ہے۔“ یہ کہتے کہتے رمان نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”جب تک میں اس مجلسرا میں موجود ہوں، لوگوں کے حسد کا شکار ہوں گی۔“

ابوجعفر نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”رمان تو مجلسرا سے نکل کر سیر و تفریح بھی کیا کر اور جب تو مجلسرا میں موجود ہی نہ ہوگی تو عضد الدولہ تیری عدم موجودگی میں اپنے فرائض اور ذمے داریاں پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔“
رمان نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ”ابوجعفر! میں آپ کے مشوروں پر عمل کروں گی۔ آپ جو بھی کہیں گے وہی کروں گی کیونکہ ان انسانوں کے جنگل میں ایک آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس میں شفقت، محبت، خلوص اور بے غرضی جمع ہو گئی ہے۔“

ابوجعفر نے ڈھارس بندھائی۔ ”تو بالکل بے فکر رہ رمان۔ تو مجھ پر اطمینان رکھ۔“

ابوجعفر، رمان کے پاس سے چلا آیا۔ راستے میں ایک خدمت گار عورت اسے نہایت رازداری اور ہوشیاری سے عضد الدولہ کی پہلی بیوی کے پاس لے گئی۔ وہ کافی دیر سے کھڑی ابوجعفر کے واپس آنے کی منتظر تھی۔ عضد الدولہ کی پہلی بیوی طویل القامت اور موٹی تھی۔ مٹاپے نے اسے بھدا کر دیا تھا۔ عضد الدولہ کی بیوی نے دریافت کیا۔ ”ابوجعفر! تم کیا خبر لائے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”میری کوششوں کا شاندار نتیجہ نکلنے والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“
ویلی امیر کی بیوی نے کہا۔ ”نتیجہ ہٹا کے مطابق نکلتا چاہیے۔“
ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”یہ وقت زیادہ دیر تک رکھنے کا نہیں ہے۔ میں پھر ملوں گا لیکن ملکہ عالیہ کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ رمان صرف آپ ہی کو نہیں، مجھے بھی ذہنی اذیت پہنچاتی ہے اور اسے آپ سب تو معاف بھی کر سکتی ہیں لیکن میں معاف نہیں کر سکتا۔ میرا سینہ، سینہ نہیں گھینہ کینہ ہے۔“

ابوجعفر واپسی کے لیے جیسے ہی مٹرا عضد الدولہ کی بیوی نے اسے چند قیمتی ہار دیے اور کہا۔ ”یہ تو ایک حقیر سا نذرانہ ہے اصل معاوضہ تو اس وقت دوں گی جب تم رمان کو عضد الدولہ سے جدا کر دوں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں ملکہ عالیہ۔ آپ بہت جلد یہ خوش خبری سن لیں گی کہ رمان عضد الدولہ کی معنوب قرار پائی۔“
”انشا اللہ!“ عضد الدولہ کی بیوی کا چہرہ کھل اٹھا۔
ابوجعفر بھی ”انشا اللہ!“ کہتے ہوئے مجلسرا کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

ابوجعفر کے مشورے پر رمان نے بیمارستان کے معائنے کا منصوبہ بنایا۔ عضد الدولہ نے بھی اجازت دے دی اور کہا۔ ”رمان! میں خوش ہوں کہ تو نے افسردگی کو خیر باد کہا اور خود کو ایسے مشاغل میں الجھنا شروع کر دیا ہے۔ جس سے تیرا دل بھی پہلے گا اور دلچسپ مشاہدے۔۔۔ بھی کر سکے گی۔“

اس وقت خاص سواری کا انتظام کیا گیا۔ رتھ نما گاڑی کو دو شاندار عربی گھوڑے بیمارستان کی طرف کھینچے لیے جارہے تھے۔ اس کے آگے آگے ابوجعفر اپنے مشکلی رنگ کے گھوڑے پر سوار ان دو سپاہیوں سے محو کلام تھا جو اس کے آس پاس گھوڑوں پر سوار ساتھ چل رہے تھے۔ رمان کی گاڑی کے پیچھے بھی دس سوار دو دو کی قطار میں تعداد میں پانچ قطاریں بنائے محافظ دستے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ رمان کے ساتھ دو خدمت گار عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔

بیمارستان عضدی ایک بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے منتظم اعلیٰ اور دوسرے عملے کو پہلے ہی سے مطلع کر دیا گیا تھا کہ عضد الدولہ کی محبوب ترین کنیز رمان بیمارستان کا معائنہ کرنے آرہی ہے۔ بیمارستان کو خوب اچھی طرح سجا دیا گیا تھا۔ جب رمان کی سواری بیمارستان کے احاطے میں داخل ہوئی تو وہاں کے لوگوں نے دور رو بہ کھڑے ہو کر رمان کا شاندار استقبال کیا۔

بیمارستان کی اندرونی ویلیز پر ابوجعفر گھوڑے سے اتر پڑا۔ مختلف دواؤں کی ملی جلی بو سے پوری فضا مہکی ہوئی تھی۔ گاڑی میں سے رمان اپنی کنیزوں کے ساتھ باہر نکلی اور بیمارستان کے منتظم اعلیٰ نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا پھر وہ ابوجعفر اور رمان کو ساتھ لے کر بیمارستان کے مختلف شعبوں کی سیر کروانے لگا۔ رمان کی خدمت گار عورتیں اور محافظ وہیں کھڑے رہ گئے جہاں یہ لوگ اپنی گاڑی سے نیچے اترے تھے۔

رمان کو بیمارستان کے معائنے نے بہت خوش کر دیا۔ اس نے مختلف عمروں کے مرد اور عورت مریضوں سے ملاقاتیں کیں۔ رمان کو اس بات نے حیرت میں ڈال دیا کہ عورتیں بھی بیمارستان میں داخل ہو کر علاج کروا سکتی ہیں لیکن جب اسے یہ بتایا گیا کہ یہ عورتیں غیر مسلم ہیں تو اسے اطمینان ہوا۔ یہ لوگ اسے گھماتے پھراتے اس حصے میں لے گئے جہاں دوا میں تیار کی جاتیں تھیں اور جسے تجربہ گاہ بھی کہہ سکتے ہیں تو وہاں دواؤں اور ان کے آلات کا ڈھیر لگا دکھائی دیا۔ ان میں بوتلیں، مرتبان، جار، قیفیں اور عمل تقطیر کے پیچیدہ ترین آلات شامل تھے۔ سب کے آخر میں ابوجعفر نے رمان سے کہا۔ ”اگر تو مناسب سمجھے تو اس طبیب سے بھی مل لے جس کی تو نے سفارش کی تھی اور تیری وجہ سے برسر کار ہو گیا۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”میں اس سے نہیں ملنا چاہتی، آپ اس کو منع کر دیجیے، وہ یہ تمنا اپنے دل سے نکال دے۔“
ابوجعفر نے کہا۔ ”وہ کہتا ہے کہ میں رمان کا شکریہ ادا کروں گا اور میری ناقص رائے میں اس کو شرف ملاقات بخشا بے حد ضروری ہے ورنہ درمیان میں غلط فہمیاں جنم لینے لگیں گی۔“

رمان نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیسی غلط فہمیاں؟“
ابوجعفر نے روکھا سامنے بنا کر جواب دیا۔ ”میں تو بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تو جو کچھ پوچھنا چاہتی ہے اس خراسانی طبیب ہی سے پوچھ لے۔ اس نے بھی تو لوگوں سے ایسی ایسی باتیں کہہ سن رکھی ہیں جن سے تیرے کردار پر داغ آ سکتا ہے۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ اس طبیب سے مل کر ہدایت کر دے کہ وہ تیرے بارے میں بے سرو پا باتیں نہ کرے تو اچھا ہے۔“

ابوجعفر کی باتوں نے رمان کی دلجوئی کی اور وہ خراسانی طبیب سے باتیں کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ بیمارستان کے ایک خاص کمرے میں رمان کو بٹھا دیا گیا۔ یہ کمرہ ان

مہمانوں کے لیے مخصوص تھا جو متمول یا صاحب اثر مریضوں کے رشتے دار ہوتے تھے۔ ابوجعفر نے خراسانی طبیب کو اس کمرے میں بلالیا۔ یہ ایک خوب صورت تیس بیٹھیس سالہ طبیب تھا۔ اس کے بھرے ہوئے رخسار خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ بڑی بڑی بادام جیسی آنکھوں میں شریقی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بھوس گہری، پلکیں بڑی بڑی متناسب اعضا، صحت مند جسم پر کسی ترشے ہوئے سنگ مرمر کے مجسمے کا گمان پیدا کرتے تھے لیکن مجسمہ تو بے حرکت ہوتا ہے اور خراسانی طبیب چل پھر رہا تھا۔ اس نے رمان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کسی قدر وارفتگی کا اظہار کیا۔ رمان کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ رمان بھی اسے دیکھتے ہی دم بخود رہ گئی۔ ابوجعفر وہاں سے ہٹ گیا۔ جاتے ہوئے کہتا گیا۔ ”رمان! تو اس طبیب سے باتیں کر لے، میں بیمارستان کے طبیبوں سے اپنے خراب ہاضمے کی دوا کی لیتا ہوں۔“

ابوجعفر کے جاتے ہی خراسانی طبیب نے کہا۔ ”رمان! مجھے جیسے ہی معلوم ہوا کہ تو بغداد میں ہے، میں یہاں چلا آیا۔ کیا اس خراسانی تاجر نے جو خود کو تیرا باپ کہتا تھا میرے ساتھ دھوکا نہیں کیا؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”علی یوسف! اب یہاں بغداد میں میری کچھ اور ہی حیثیت ہے۔ خراسانی تاجر میرا باپ نہیں محض تاجر تھا۔ اس نے میرے عوض ویلی امیر سے بہت بڑی قیمت وصول کی ہے۔ وہ خلاف عبادیہ کا متولی ہے اور جسے میں ویلی امیر کہہ رہی ہوں، وہ درحقیقت بادشاہ ہے۔ میں اس کی سب سے زیادہ چہیتی ہوں۔ ان حالات و کیفیت میں تو خود سوچ کہ تیرا یہاں آنا کتنا خطرناک ہے؟“
خرامانی طبیب نے کہا۔ ”رمان! تو انصاف سے کہہ دے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، کیا وہ ظلم نہیں ہے؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں، ظلم تو یہ ہے جو تجھ سے سرزد ہو رہا ہے۔“

خراسانی طبیب بھونچکا ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ قدرے چپ رہ کر بولا۔ ”یعنی تو بھی مجھی کو ظالم قرار دے رہی ہے۔“

رمان نے جذباتی لب و لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں تو ظالم ہے۔ مجلسرا میں رہنے والوں کی طرح تو بھی حسد کا شکار ہو گیا ہے۔ تو یہاں آیا ہی کیوں؟ اور اگر آیا بھی تھا تو تجھے بیمارستان عضدی میں ملازمت نہیں قبول کرنا تھی اور اگر یہاں ملازمت کرنا ہی تھی تو میری سفارش نہیں حاصل کرنا تھی

اور جب تجھے یہ سفارش بھی حاصل ہوگئی تو تو نے وہ ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے جس کی زد مجھ پر پڑتی تھی اور جس سے میں رسوا اور بدنام ہو سکتی تھی۔“

خراسانی طبیب نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں نے ابھی تک تجھے بدنام ہی کب کیا ہے؟ اور کس طرح بدنام کیا ہے، کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو؟“

رمان نے ضدی انداز میں کہا۔ ”تو یہاں سے چلا جا، بغداد کو چھوڑ دے۔“

خراسانی طبیب نے جواب دیا۔ ”ریان! بغداد میں داخل ہو کر میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح مجھے تیرا دیدار میسر آجائے اور اس وقت خدا کے فضل سے یہ خواہش پوری ہوگئی ہے۔ تو مجلس ادا پس جا اور اطمینان رکھ کہ میں تجھ پر کوئی ظلم نہیں کروں گا۔“

رمان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے اور بولی۔

”میں اس کا بڑے سے بڑا معاوضہ تجھے ادا کر سکتی ہوں۔“

خراسانی طبیب نے ہنس کر کہا۔ ”افسوس رمان، تو نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا۔ میں یہاں معاوضہ لینے نہیں آیا۔“

رمان کے دل کا بوجھ اتر گیا، مسکرا کر بولی۔ ”تب میں پھر جاسکتی ہوں؟“

”بالکل جاسکتی ہے لیکن جانے سے پہلے تو ایک وعدہ ضرور کرے گی۔“

”کون سا وعدہ؟“

خراسانی طبیب نے کہا۔ ”یہ کہ ایک بار اور ملاقات کرے گی۔“

رمان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گی لیکن وعدہ نہیں کر سکتی۔“

خراسانی طبیب نے فراخ دلی سے کہا۔ ”جا، میں نے یہ بھی تجھ پر ہی چھوڑا کہ تو دوبارہ مجھ سے ملے گی یا نہیں ملے گی۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”مجھ پر چھوڑا تو تو قائم رہے گا۔“

اس وقت ابو جعفر بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ ”کیا تم دونوں باتیں کر چکے؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”ہاں، اب میں واپس چل سکتی ہوں۔“

ابو جعفر نے خراسانی طبیب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کا خوب اچھی طرح اطمینان کر کے ابو جعفر نے رمان سے سوال کیا۔ ”رمان! یہ معاملہ کیا ہے، کیا

تو بتانا پسند کرے گی؟“

رمان نے کسی قدر پس و پیش کے بعد کہا۔ ”میں آپ جیسے مخلص بزرگ سے اگر کچھ چھپانا چاہوں، تب بھی نہیں چھپا سکتی قصہ دراصل یہ ہے کہ جب میں خراسان میں تھی تو خراسانی تاجر مجھے اپنی بیٹی کہا کرتا تھا۔ اس دوران میں بیمار پڑی تو یہ طبیب میرے علاج پر مامور ہوا۔ اس نے میرا علاج نہایت لگن اور تن دہی سے کیا۔ خراسانی تاجر نے اس کی آنکھوں میں محبت کی کشش جو دیکھی تو اس سے بھی کاروبار شروع کر دیا اور شاید میرا مفت علاج کرواتا رہا۔ یہ طبیب شاید اس لالچ میں میرا علاج کرتا رہا کہ میں اس سے وابستہ کر دی جاؤں گی اور میرا خیال ہے کہ خراسانی تاجر نے اس سے اس قسم کا کوئی وعدہ بھی کر لیا تھا۔“

ابو جعفر نے کہا۔ ”ایک بات اور، کیا تم دونوں نے کبھی آپس میں محبت کا اقرار بھی کیا تھا؟“

رمان شرمائی، بولی۔ ”میں آپ سے کچھ چھپاؤں گی نہیں، طبیب نے تو کوئی بار اظہار عشق کیا لیکن میں نے صرف دو بار یہ بات کہی کہ اگر ان دونوں میں میری بابت کچھ طے پا جاتا ہے تو میں اس سے اختلاف نہیں کروں گی۔“

ابو جعفر نے کہا۔ ”اب تو اطمینان رکھ، اللہ نے چاہا تو اب میں تیری سہر ثابت ہوں گا۔“

رمان مجلس میں واپس پہنچی تو بہت خوش تھی، اسے ہشاش بشاش دیکھ کر عضد الدولہ نے ابو جعفر کا شکریہ ادا کیا۔

”ابو جعفر! خدا نے تجھے کتنا سمجھدار اور مخلص بنایا ہے، میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں ورنہ مجھے یقین نہیں تھا کہ رمان کی افسردگی اتنی جلدی دور ہو جائے گی۔“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”اگر میں کچھ بھی نہ ہوتا تو مجھے حضور والا کی غلامی کا شرف و اعزاز نہ بخشا جاتا۔ اس کے علاوہ اگر آپ جیسی ہمت افزائی کرنے والا قدر شناس آقا مجھے نہ ملتا تو میری ساری صلاحیتیں اور قوتیں ابھرنے نہ پاتیں، میری خوبیاں آپ کا حسن ظن ہیں جنہوں نے میری ذات میں اعلیٰ اوصاف کی شکل اختیار کر لی ہے۔“

عضد الدولہ دیر تک ابو جعفر کی تعریفیں کرتا رہا اور ابو جعفر عاجزی اور انکساری سے ان کا جواب دیتا رہا۔

رمان مطمئن ہوگئی تھی کہ اب چونکہ اسے ابو جعفر جیسے عقل مند اور تجربہ کار ندیم کی حمایت اور ہمدردی حاصل ہوگئی ہے اس لیے اس کے حاسد اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

اب عضد الدولہ بھی اپنا کچھ وقت ملکی انتظام و انصرام میں گزارنے لگا تھا لیکن رمان سے اس کی شیفگی اور محبت پہلے

سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ عضد الدولہ اس رشتہ و حسد سے بھی اچھی طرح واقف تھا جو رمان کے خلاف کل سہرا میں چھپایا ہوا تھا۔ رمان جیسے جیسے محسوس ہو رہی تھی عضد الدولہ کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس دوران رے اور ہمدان پر فوج کشی کی ضرورت پیش آگئی۔ عضد الدولہ نے اپنے دو بھائیوں کو ان کی تسخیر پر مامور کر دیا۔ یہ تسخیر کا کام بہت جلد انجام پا گیا۔ عضد الدولہ نے ان فتوحات کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام کیا۔ اس جشن میں اعلیٰ درجے کی ناپنے والیوں کو اکٹھا کیا گیا۔ جن مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا ان کی فہرست ابو جعفر نے مرتب کی تھی۔ عضد الدولہ کی طرف سے ان میں چند ناموں کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ یہ دخت رزا اور بنت الحان (شرب و مشروب اور رقص و سرود) کی بزم آرائی تھی۔ زمانے کے دستور کے مطابق اس بزم میں شریک ہونے والوں نے اپنی ڈاڑھیوں کو مشک یا عرق گلاب سے معطر کر رکھا تھا اور ان کے لباس نہایت بھڑکیلے تھے اور جس بڑے کمرے میں یہ بزم منعقد ہوئی تھی، عود دانوں میں خوشبودار مسالے جلا کر مہکا دیا گیا تھا۔ عضد الدولہ اور ابو جعفر نے بھی وہی مہمانوں جیسے بھڑکیلے لباس زیب تن کر رکھے تھے جنہیں عرف عام میں ثیاب المنادمہ (یاران مجلس کا لباس) کہا جاتا تھا۔

عضد الدولہ کے لیے یہ محال تھا کہ وہ رمان کو اپنے پہلو میں نہ بٹھاتا۔ ابو جعفر کو اس منظر نے بڑا دکھ پہنچایا۔ اس نے دبے لفظوں میں عضد الدولہ کو سمجھایا۔

”ویلی شہنشاہ! کیا یہ بات آپ جیسی مقتدر اور عظیم الشان ذات کے لیے معیوب نہیں ہے کہ آپ کے پہلو میں کسی اعلیٰ خاتون کے بجائے خراسان کی ایک معمولی کنیز براجمان ہو۔“

ابو جعفر کے یہ الفاظ رمان نے بھی سن لیے اور اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ عضد الدولہ کا چہرہ دیکھنے لگی کہ وہ ابو جعفر کی بات کا جواب کیا دیتا ہے۔ عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”ابو جعفر! میں حقیقتاً ویلی شہنشاہ ہوں، میں تیری کچھ بوجھ کا قائل ہو گیا لیکن تمہاری دوسری بات میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ رمان کو ابھی تک تو ایک معمولی کنیز ہی سمجھ رہا ہے شاید تو نے ابھی تک اس کا مرتبہ نہیں جانا۔ یہ وہ دُرسے بہا ہے جو مجھے اتفاقاً حاصل ہو گیا۔“

رمان کی کوشش یہ تھی کہ ابو جعفر اس سے نظریں ملا لے لیکن وہ نظریں ملاتے ہوئے گھبرا یا کرتا رہا تھا۔ اس نے عضد الدولہ کو جواب دیا۔ ”حضور والا! میری طبیعت اور

مزانج سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں جھوٹے سے نفرت کرتا ہوں اور منافقت سے ہمیشہ بیزار رہتا ہوں۔ میں نے رمان کو جو خراسان کی ایک معمولی کنیز قرار دیا ہے تو اس کے کئی اسباب اور ثبوت ہیں جنہیں میں بہت جلد ظاہر کرنے والا ہوں۔“

رمان کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے ابو جعفر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی سہرا، اس کا سب سے بڑا ہمدرد اور مخلص اس وقت کسی دل آزاری کی باتیں کر رہا تھا۔ رمان حیران اور پریشان تھی۔

عضد الدولہ ایک دم پھر گیا، بولا۔ ”ابو جعفر! میں نے تیرا ہمیشہ ادب و احترام کیا ہے اور اس وقت بھی تیرا ادب و احترام ہی میرے دل و دماغ کو قابو میں کیے ہوئے ہے ورنہ تو جانتا ہے کہ تیری اس گستاخی کی کیا سزا دیتا۔“

ابو جعفر نے جواب دیا۔ ”میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ میری نمک خواری تو مجھے یہاں تک آمادہ کر چکی ہے کہ اگر حضور پسند فرمائیں تو کسی گناہ یا جرم کے بغیر ہی مجھے ہلاک فرما سکتے ہیں۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، جب تک جرم ثابت نہ ہو کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔“

ابو جعفر نے محفل کے مہمانوں پر نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا۔ ”ابھی ذرا دیر ہے، کچھ توقف فرمائیں۔ ایک ذرا اطمینان درکا ہے، جب تک شرکائے محفل آ نہیں جاتے اس کا آغاز مشکل ہے۔“

عضد الدولہ نے چو کر غصے میں کہا۔ ”آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ تو اپنی باتوں کو پیکلی کیوں بنا رہا ہے؟“

ابو جعفر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”ویلی شہنشاہ! آج میں آپ کو ایک ایسے شخص سے ملانا چاہتا ہوں جس سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گے۔“

عضد الدولہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ شخص، وہ کرتا کیا ہے، کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے؟“

ابو جعفر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”حضور والا نے شاید اپنے دادا ابو شجاع کا وہ واقعہ تو سنا ہی ہوگا جس میں انہیں ایک نجوی ملا تھا اور آپ سب کا سارا حال اس نے یوں ہی بتا دیا تھا۔“

عضد الدولہ نے یہ ساری داستان سن رکھی تھی۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کیا وہ نجوی آیا ہوا ہے؟“

”جی حضور والا! وہ اسی محفل میں موجود ہے اور حضور

سے ملنا چاہتا ہے۔“
عضد الدولہ نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میں اس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“

”تب پھر حضور تھوڑی دیر کے لیے خلوت میں تشریف لے چلیں لیکن شرط یہ ہے کہ حضور خلوت میں تنہا جائیں گے، وہاں آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں ہوگا۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟“
ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”مجھ میں کہتے ہیں کہ جس شخص کو کچھ بتانا ہو کسی اور کے سامنے مت بتاؤ کیونکہ ہر انسان کی زندگی اور قسمت میں بہت سی ایسی باتیں موجود ہوتی ہیں جنہیں دوسروں سے چھپانا ضروری ہوتا ہے۔“

عضد الدولہ نے رمان کو رحم آمیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”تو گویا رمان یہیں رہے گی۔ اچھا خیر کوئی بات نہیں۔“ پھر رمان سے شوخ و شریل لہجے میں کہا۔ ”اچھا رمان تو یہیں رہے۔ افسوس کہ میں خلوت میں تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ لیکن تو پروا نہ کر، میں خلوت کی ساری باتیں تجھے آکر بتا دوں گا اور اگر تو اس کے باوجود ناراض رہتی ہے تو تو مجھ سے اس طرح بدلہ بھی لے سکتی ہے کہ دوبارہ نجوی کے ساتھ خلوت میں تو جائے تو اپنے ساتھ مجھے نہ لے جاتا۔“

رمان نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ رہے رہے ابوجعفر کو ہو کیا گیا ہے کہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا ہے۔

ذرا دیر بعد ابوجعفر باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک ضعیف آدمی بھی تھا۔ عضد الدولہ، نجوی اور ابوجعفر کے ساتھ ایک گوشے میں چلا گیا۔ ابوجعفر نے عرض کیا۔ ”چونکہ یہاں کسی تیسرے آدمی کو نہیں ہونا چاہیے اس لیے میں خود بھی ہٹا جاتا ہوں۔“

ابوجعفر رمان کے پاس چلا گیا اور اس سے لاطلق ہو کر بیٹھ گیا۔

نجوی نے عضد الدولہ سے کہا۔ ”شاید یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ آپ کے دادا ابوشجاع کو جب میں نے ان کے خاندان کی اس اقبال مندی کی پیش گوئی کی تھی تو انہوں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا اور اپنے بیٹوں سے میری پٹائی کروادی تھی لیکن آج میں خوش ہوں کہ ان کے حکمران ہوتے کے سامنے بیٹھا اپنی شاندار پیش گوئی کی سچائی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”تو اب تک کہاں چھپا بیٹھا تھا؟“
نجوی نے جواب دیا۔ ”میں سیر و سیاحت کا آدمی

ہوں، ہندوستان چلا گیا تھا۔ کافی عرصے تک وہیں رہا۔ اب مرنے کے لیے یہاں آ گیا ہوں۔“
عضد الدولہ نے کہا۔ ”اب میں تجھ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، خوب حساب کتاب لگا کے سچ بتا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟“

نجوی نے کہا۔ ”پوچھئے، شاید میں اتنی ہی سچی پیش گوئی کر سکوں گا جتنی سچی آپ کے دادا کے سامنے کر چکا ہوں۔“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”میں اپنی ایک کنیز سے عشق کی حد تک محبت کرتا ہوں، لوگ اس کنیز سے حسد کرنے لگے ہیں اور مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں اس کی وجہ سے ملکی انتظام و انصرام میں غفلت برتنے لگا ہوں۔ کیا تیرا علم نجوم یہ بتائے گا کہ میں واقعی کوئی ایسی غلطی کر رہا ہوں جس کا خمیازہ مجھے یا میری اولاد کو بھگتنا پڑے؟“

نجوی نے اصطرلاب کی مدد سے زائچہ بنانا شروع کیا اور آخر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”ویلی شہنشاہ! آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہوں کو عشق راس نہیں آتا۔ جس شخص کو اقتدار اور حکومت کی آقا کی میسر آگئی ہو، وہ خود ایک کنیز کا غلام ہو جائے بڑے تعجب کی بات ہے۔ آپ کا اقبال کنیز کی محبت کی وجہ سے گہنا سکتا ہے۔“

عضد الدولہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

نجوی نے جواب دیا۔ ”آپ کو کیا کرنا چاہیے، یہ فیصلہ تو آپ خود کریں گے۔ میں نے تو ایک طبیب کی طرح مرض کی تشخیص کر دی ہے۔“

عضد الدولہ نے دل پر جبر کر کے سوال کیا۔ ”کیا میں اس کنیز سے نجات حاصل کر سکتا ہوں؟“

نجوی نے جواب دیا۔ ”بالکل کر سکتے ہیں لیکن میرا علم مجھے یہ بھی بتا رہا ہے کہ آپ اس سے نجات حاصل کرنے کا جو راستہ اختیار کریں گے اس میں شکست آپ ہی کو ہوگی۔“
عضد الدولہ نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ ”میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟“

نجوی نے جواب دیا۔ ”نجات حاصل کرنا تو اسے کہتے ہیں کہ آپ اسے اپنے دل و دماغ سے نکال باہر کریں لیکن آپ اس پر قدرت نہیں رکھتے کم از کم میرا علم تو مجھے یہی بتاتا ہے۔“

عضد الدولہ کو نجوی پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس کی باتوں

کا جواب گول مول دے رہا تھا۔ معاً اسے خیال گزرا کہ یہ نجوی اس کے پاس شاید اس لیے نہیں آیا ہے کہ وہ عضد الدولہ کے بارے میں چند شاندار پیشگوئیاں کرے بلکہ اس پیشگوئی کا انعام لینے آیا ہے جو بہت عرصہ پہلے اس کے دادا ابوشجاع کے سامنے کر کے، مارکھا کے انعام حاصل کیے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ اس نے نجوی سے اس کے بعد کچھ بھی نہ پوچھا۔ اسے اسی وقت انعام و اکرام سے نوازا کر رخصت کر دیا۔

رمان کا خیال تھا کہ عضد الدولہ نجوی کو رمان سے بھی ملوائے گا لیکن جب عضد الدولہ کچھ کہے سے بغیر چپ چاپ اس کے پاس جا بیٹھا تو اسے بڑا افسوس ہوا اور دل اندیشوں سے لرزنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”نجوی نے کیا بتایا؟“

عضد الدولہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”وہ اپنی سابقہ پیش گوئیوں کا انعام لینے آیا تھا۔“

ابوجعفر نے قریب آ کر ادب سے سوال کیا۔ ”کیا رقا صاؤں اور مغنیوں کو اپنے اپنے کمالات دکھانے کا حکم دیا جائے، وہ سب آپ کے اشارے کے منتظر ہیں؟“

عضد الدولہ نے بے دلی سے حکم دیا۔ ”اجازت ہے۔“
ان دونوں نے محفل میں گرمی پیدا کر دی اور محفل ساز و آواز میں ڈوب گئی۔ محل کا ہر فرد نہایت توجہ اور انہماک سے رقص و موسیقی کے کمالات سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن ان میں چار ایسے افراد بھی موجود تھے جو اس محفل میں موجود ہونے کے باوجود اپنے دل و دماغ سے کسی اور جگہ پہنچے ہوئے تھے۔

عضد الدولہ، جو نجوی کی پیش گوئی کی روشنی میں رمان کے خلاف سوچ رہا تھا۔

رمان جو ہوا کے رخ کو یکا یک اپنے خلاف ہوتے ہوئے نہایت حیرت اور پریشانی محسوس کر رہی تھی اور اس کا سبب تلاش کرنے میں محو تھی۔

ابوجعفر، جو عضد الدولہ کی خاموشی اور اس کی رمان کی طرف کم التفاتی کچھ خوش اور معنی خیز انداز میں دیکھ اور محسوس کر رہا تھا اور اس کے حسب منشا نتیجے کی امید میں رمان کے مستقبل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

علی یوسف طبیب، جو ابوجعفر کی مہربانی سے اس خاص محفل میں آ گیا تھا اور اسے یہاں رمان کا قریب بھی میسر آ گیا تھا۔ وہ رقص و موسیقی کے بجائے گاہ بگاہ رمان کو دیکھ لینے میں مشغول تھا اور اس کے کان رمان کی آواز سننے کے مشتاق تھے لیکن ابھی تک محروم ہی تھا۔

کچھ دیر بعد ابوجعفر نے عضد الدولہ سے نہایت ادب سے سوال کیا۔ ”کیا حضور والا کی طبیعت تاساز ہے؟“
”ہاں، ایک عرصہ بعد میں اپنے سر میں درد کی دھمک محسوس کر رہا ہوں۔“

ابوجعفر نے عرض کیا۔ ”حضور والا! بیمارستان کا ایک طبیب قریب ہی موجود ہے اگر اجازت ہو تو اسے اور قریب بلایا جائے؟“

عضد الدولہ نے پوچھا۔ ”کیا اس محفل خاص میں بیمارستان کے کچھ طبیب بھی موجود ہیں؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حضور والا! کچھ نہیں بس ایک طبیب آیا ہوا ہے۔ یہ وہی خراسانی طبیب ہے جس کی رمان نے سفارش کی تھی اور اسے اس محفل خاص میں بھی اس لیے باریابی حاصل ہو گئی ہے کہ اسے یہاں بھی رمان کی سفارش حاصل ہو گئی تھی۔“

رمان نے فوراً صدمے سے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”ایسا نہیں ہے ابوجعفر! آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“

ابوجعفر نے ہنس کر جواب دیا۔ ”مجھے جھوٹ اور منافقت سے ہمیشہ ہی نفرت رہی ہے اور میرے اس وصف سے حضور والا بھی خوب اچھی طرح واقف ہیں۔“ اس کے بعد وہ اٹھا اور طبیب علی یوسف کے پاس پہنچ گیا۔

رمان مشتعل ہو کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”ویلی بادشاہ! افسوس کہ آج کے جشن میں، میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکوں گی، میں جانا چاہتی ہوں۔“

عضد الدولہ نے خلاف توقع اسے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ رمان کا خیال تھا کہ عضد الدولہ اسے روک لے گا لیکن جب خلاف توقع ایسا نہ ہوا تو وہ روتی ہوئی مجلس میں داخل ہو گئی۔

ابوجعفر جب خراسانی طبیب کو عضد الدولہ کے پاس لایا اور رمان کو وہاں نہیں دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔ ”رمان کہاں چلی گئی؟“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”وہ مجلس اوراپس گئی کہتی تھی میں آج کے جشن میں زیادہ نہیں بیٹھ سکوں گی۔“

ابوجعفر نے طبیب سے کہا۔ ”خراسانی طبیب! تو اپنے آقا کو اچھی طرح دیکھ لے اور نسخہ لکھ دے۔ میں اسی وقت دوا میں بھی منگوا لوں گا۔“

علی یوسف نے اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد نسخہ لکھ دیا اور اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ ابوجعفر نے اس کے بیٹے ہی

نہایت راز داری سے کہا۔ ”حضور والا! میں جانتا تھا کہ رمان مجلس اور پس چلی جائے گی۔“

عضد الدولہ نے چونک کر پوچھا۔ ”وہ کیوں؟ تجھے کس طرح معلوم ہو گیا تھا؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حضور والا! مجھے نہایت وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خراسانی رمان کا عاشق ہے اور خراسان سے بغداد تک کا سفر اور بیمارستان میں ملازمت رمان ہی کے لیے اختیار کی ہے، خود رمان نے بھی اس کی اس لیے سفارش بھی کی تھی۔“

عضد الدولہ کے سر میں درد کی شدید لہری اٹھی، تڑپ کر پوچھا۔ ”کیا یہ جو کچھ تو کہہ رہا ہے درست ہے؟“

ابوجعفر نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ”میرے پاس اس کے چند ثبوت بھی موجود ہیں۔“

”مثلاً، ان میں سے دو ایک ثبوت پیش کر۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ یہ خراسانی طبیب خاص رمان کی سفارش پر ملازم رکھا گیا ہے دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اس محفل خاص میں یہ شخص رمان کی خواہش پر شامل کیا گیا ہے، تیسرا ثبوت یہ ہے کہ جب رمان کو یہ خدشہ محسوس ہوا کہ اس کا عشق مشک کی طرح پھلنے والا ہے، تو وہ اپنے عاشق کو چھوڑ کر مجلس اور چلی گئی اور چوتھا ثبوت یہ ہے کہ حضور والا یہ بھی ملاحظہ فرمائیں گے کہ اب خراسانی طبیب بھی یہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھے گا۔“

اور واقعی اس وقت خراسانی طبیب اٹھ کر دوبارہ عضد الدولہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ”حضور والا! میری خواہش تھی کہ میں بیمارستان جا کر آپ کی دوا خود تیار کروں۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”بڑا اچھا خیال ہے تو جاسکتا ہے۔“ اس کے بعد اس کا لکھا ہوا نسخہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”شاہی خدمت گار تھوڑی دیر بعد دوا لینے آجائے گا۔“

خراسانی طبیب نسخہ لے کر چلا گیا۔ ابوجعفر عضد الدولہ کی طرف دیکھ کر نہایت معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ عضد الدولہ نے اپنا سر پکڑ لیا اور معلوم نہیں کیا کچھ سوچنے لگا۔

ابوجعفر نے کہا۔ ”حضور والا! ابھی ایک آخری ثبوت باقی ہے لیکن اس کے لیے حضور کو میرے ساتھ زحمت کرنی ہوگی۔“

عضد الدولہ نے بے چارگی سے پوچھا۔ ”کہاں، کہاں کے لیے زحمت کرنی ہوگی؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”بیمارستان تک۔“

عضد الدولہ نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“ اور عضد الدولہ سر کے درد کا بہانہ کر کے ابوجعفر کے ساتھ محفل سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

راستے ہی میں ابوجعفر نے عضد الدولہ کو مشورہ دے دیا تھا کہ خراسانی طبیب کی دوائیں وہ نہیں کھائے گا کیونکہ ان حالات میں خراسانی طبیب پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جب عضد الدولہ اور ابوجعفر حقیقی اطلاع کے بغیر بیمارستان میں داخل ہوئے تو وہاں کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ خراسانی طبیب بھی گھبرا گیا۔ ابوجعفر نے اس سے دوائیں تولے لیں لیکن اسے فوراً ہی یہ حکم بھی دیا کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جائے۔ خراسانی طبیب فوراً باہر چلا گیا۔

ابوجعفر، عضد الدولہ کو لے کر بیمارستان کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں خراسانی طبیب ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ایک خوب صورت مسہری بچھی ہوئی تھی اور پر نرم و ملائم بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ یہیں خراسانی طبیب کا کچھ دوسرا سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ ابوجعفر، عضد الدولہ کو مسہری کے سرہانے لے گیا اور دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”حضور والا! ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں دیوار پر جگہ جگہ کونسلے سے کیا لکھا گیا ہے؟“

عضد الدولہ کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ دیوار پر کئی جگہ رمان، رمان لکھا ہوا تھا۔ ابوجعفر نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خراسانی طبیب کے دل میں رمان کا چھپا ہوا عشق ہی اسے ان حرکتوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سن رکھا ہے کہ یہ خراسانی طبیب اپنے کئی نسخوں میں بے اعتبار رمان کا نام لکھ چکا ہے چنانچہ مجھے جیسے ہی اس کا علم ہوا، میں نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی نہ کسی طرح حضور کو اس سے مطلع ضرور کر دیا جائے۔“

عضد الدولہ نے جواب دیا۔ ”ابوجعفر! تو کتنا مخلص اور نیک انسان ہے۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری غفلت کی آنکھوں کو نہایت ہوشیاری سے کھول دیا۔ میں رمان کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔“

عضد الدولہ جب اپنے آخری الفاظ ادا کر رہا تھا تو اس کی زبان میں لغزش سی آگئی تھی اور اس نے یہ چند الفاظ بہ مشکل ہی ادا کیے تھے۔

دوسرے دن عضد الدولہ نے مجلس کو چھوڑ دیا اور رمان کو لے کر ایک عالی شان مکان میں محفل ہو گیا جو دریائے دجلہ کے کنارے اس طرح کھڑا تھا کہ اس کا عکس دجلہ کے پانی میں صاف نظر آتا تھا۔ خاص کر مکان کا وہ برج جو عین

دجلہ کے رخ پر بنا ہوا تھا اور اس کا عکس دریا کی لہرائی میں کھاتی موجوں میں ٹیڑھا میڑھا ہوتا رہتا تھا۔ اس برج میں اتنی زیادہ گنجائش موجود تھی کہ عضد الدولہ اپنے خدام اور کنیزوں کے ساتھ اس میں پر لطف زندگی گزار سکتا تھا۔

رمان نے خوف زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”وہیلی بادشاہ! کیا میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“

عضد الدولہ نے پر مسرت آواز میں جواب دیا۔ ”بالکل، جو تیرے جی میں آئے پوچھ۔ آج میں بہت خوش ہوں اور تیری ہر بات کا جواب دوں گا۔“

رمان نے پوچھا۔ ”آپ مجلس کو چھوڑ کر اس برج میں کیوں چلے آئے؟“

عضد الدولہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”رمان، میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میری طرح تو بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ترے حاسدوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور لوگ مجھ پر تہمت باندھتے ہیں کہ میں نے تیری محبت میں غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم دونوں اپنے حاسدوں سے دور اس برج میں پر مسرت زندگی کا آغاز کریں۔ میں یہیں سے ملک کا نظم و نسق بھی چلاؤں گا اور یہیں سے بغداد اور اس کے محافظوں اور جان نثاروں کو بیچانے کی کوشش کروں گا۔“

رمان خاموش ہو گئی اور ایسا لگتا تھا گویا وہ عضد الدولہ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔

عضد الدولہ کے مزاج اور رویے کی اس تبدیلی نے ابوجعفر سمیت پورے مجلس کو حیرت اور پریشانی میں ڈال رکھا تھا۔ مجلس کی خواتین ابوجعفر سے پوچھتی تھیں۔

”تم تو یہ کہتے تھے کہ رمان ٹھکانے لگ جائے گی لیکن اس نے تو عضد الدولہ کو پہلے سے زیادہ قابو میں کر لیا ہے اور وہ عضد الدولہ کو لے کر علیحدہ رہنے لگی ہے۔“

ابوجعفر نے حذبذب لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ یہ کیا اور کیوں ہو گیا ورنہ میں نے جو دار کیے تھے ان میں کا ایک ایک وار اتنا کاری تھا کہ رمان کے لیے کافی تھا۔“

عضد الدولہ کی پہلی بیوی نے حکم دیا۔ ”تو عضد الدولہ کو مجلس اور پس لا ورنہ میں یہ سمجھوں گی کہ رمان سے مل کر ہم سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔“

ابوجعفر نے بے چارگی سے عرض کیا۔ ”ملکہ عالیہ خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ ابوجعفر کو جھوٹ اور منافقت سے نفرت ہے پھر یہ کس طرح گمان کیا جاسکتا ہے کہ میں

رمان سے مل گیا ہوں۔“

ملکہ عالیہ نے پھر حکم دیا۔ ”عضد الدولہ کو واپس لا ورنہ دفعتاً ہو جائے۔“

ابوجعفر دل برداشتہ تھا، اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب وہ رمان کے پاس کیا منہ لے کر جائے پھر بھی ہمت سے کام لیا اور برج میں رمان کے پاس پہنچ گیا۔ عضد الدولہ نے اس کی شکل دیکھتے ہی سوال کیا۔

”ابوجعفر! کیا خبر لایا، یہاں تجھے کس نے بھیجا ہے؟“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حضور والا کی عزت نشینی نے پورے بغداد کو پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں مجلس اور شہریوں کی جانب سے حضور والا سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ انہیں یہ سزا کب تک دی جائے گی؟“

عضد الدولہ رمان کے پاس سے ہٹ کر برج کے ایک گوشے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”ابوجعفر! لوگوں سے کہہ دے کہ میں رمان کو نہیں چھوڑ سکتا اور مجلس اور بغداد کو میں نے اسی لیے چھوڑ دیا ہے کہ میں رمان کی جدائی نہیں برداشت کر سکتا۔“

ابوجعفر نے موقع غنیمت دیکھ کر رمان کی خوشامد کی۔ ”رمان کیا تو بھی مجھ سے ناراض ہو گئی ہے کیونکہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تو مجھے برابر نظر انداز کیے جا رہی ہے۔“

رمان نے جل کر جواب دیا۔ ”ابوجعفر! کچھ عرصہ پہلے تک تو میں نے تیرا احترام کیا ہے کیونکہ اس وقت تک تو بے نقاب نہیں ہوا تھا لیکن اب میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں کیونکہ تو جھوٹ اور منافقت کا پیکر ہے۔“

ابوجعفر سہم گیا، بولا۔ ”اگر مجھ سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے میں تیری نظروں سے گر گیا تو میں اس کی معافی مانگ لوں گا۔“

رمان نے جواب دیا۔ ”معافی اپنے خدا سے مانگ اور اس سے خوب توبہ استغفار کر، اس سے دعا مانگ کہ وہ میرے دل کو تیری طرف سے صاف کر دے۔“

ابوجعفر، عضد الدولہ کو واپس آتے دیکھ کر برج سے اتر گیا لیکن اس کے لڑکھڑاتے قدم بتا رہے تھے کہ اب دنیا اس کی نظر میں تاریک ہو چکی تھی اور وہ اپنے وجود کو زبردستی گھسیٹ رہا ہے۔

ابوجعفر کے جاتے ہی عضد الدولہ نے رمان سے پوچھا۔ ”ابوجعفر کیا کہہ رہا تھا؟“

رمان نے ہستے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے اب تک مجھ سے جیسا منافقانہ سلوک روا رکھا تھا، بے نقاب



خبر

کاشف زبیر

”اگہی“ بے چینی اور ”بے خبری“ سکون کا نام سہی مگر اس کا مثبت پہلو کوئی نہیں... وہ بھی اس سچائی سے آشنا تھی تب ہی اندھیروں میں در بدر کسی روح کے مانند بھٹکتی پھر رہی تھی، جیسے اس کے ساتھ کچھ انوکھا ہو گیا ہو، جو ہوش میں تھی مگر ماحول سے بے گانہ رہی، اپنیوں کے درمیان مگر اپنایت سے محروم تھی... دوستوں کے دھوکے میں دشمنوں سے تعلقات نباہتے ہوئے جب اس پر حقیقت آشکار ہوئی تو نقابوں کے پیچھے سے جانے کتنے ہی جانے مانے چہرے سامنے آ گئے۔

معاشیات کے اوزان سے نفسیات کو پرکھنے والی

ایک دو شیزہ کا قصہ

کیونکہ کارلائل کی آنکھ حسب معمول موبائل کے الارم کی آواز سن کر کھلی۔ وہ کچھ دیر تو آنکھیں بند کیے اس موسیقی نما الارم کو سنتی رہی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے بند کر دیا۔ البتہ جب تیسری بار الارم بجا تو وہ بستر سے اٹھ گئی اور اس بار اس نے الارم کو مستقل بند کیا۔ کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور صبح کی تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لے کر جسم کی کسٹمندی دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ واش روم میں داخل ہو گئی۔ اس نے پہلے دانت صاف کیے اور پھر شاور لے کر وہ

میدان کارزار ہی کا نہیں بلکہ بساط عشق کا بھی فاتح ہوں۔ میں نے رمان کو اپنے ہاتھوں سے دریائے دجلہ میں پھینک کر اس امتحان میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔“

ابو جعفر کو کہ رمان سے خوش نہیں تھا لیکن اس کے اس عبرت ناک حشر نے اسے بھی غمزدہ کر دیا۔ اس نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار جھوٹ اور منافقت کو بالائے طاق رکھ کر عضد الدولہ کو جواب دیا۔

”وہیلی شہنشاہ! اگر آپ رمان کو نظروں کے سامنے رکھ کر اس کی محبت اور عشق پر قابو پا لیتے تو میں آپ کو قافح مان لیتا لیکن اس طرح آپ نے اپنی عبرت ناک ہی نہیں افسوس ناک شکست کا اعلان کر دیا ہے۔“

جب ابو جعفر یہ کلمات حق ادا کر رہا تھا، عضد الدولہ کے حافظے اور خیال کی سطح پر بوڑھا نجوی اپنے لب ہلاتے ہوئے ابھر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”نجات حاصل کرنا تو اسے کہتے ہیں کہ آپ اپنے دل و دماغ سے رمان کو نکال باہر کریں لیکن آپ اس پر قدرت نہیں رکھتے اور میرا علم مجھے یہ بتا رہا ہے کہ آپ اس سے نجات حاصل کرنے کا جو راستہ اختیار کریں گے اس میں شکست آپ ہی کو ہوگی۔“

ابو جعفر نے دیکھا، عضد الدولہ کے پیر لڑکھڑا رہے ہیں اور پورا جسم کانپ رہا ہے۔ اس کے بوڑھے ہاتھوں نے اس طاقتور انسان کو سہارا دے کر فرش پر لٹا دیا۔ عضد الدولہ صرع و مرگی کا پرانا مریض تھا۔ وہ فرش پر لیٹا تشنجی کیفیت میں مبتلا تھا، اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ پیروں کی ایڑیاں اس طرح رگڑ رہا تھا جس طرح ذبح کیے ہوئے جانور رگڑا کرتے ہیں۔

صبح ہو جانے پر ابو جعفر اسے برج سے نیچے مجلسرا میں لے گیا۔ خراسانی طبیب رمان کے حشر سے آگاہ ہوتے ہی کچھ کہے سے بغیر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ مجلسرا کی خواتین نے خوشیاں منایں لیکن ان خوشیوں میں ابو جعفر شریک نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی بڑھاپے کا عذر کر کے ملازمت سے سبکدوش ہو گیا اور عضد الدولہ نے اب یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ جسم کے ساتھ ہی اس کے دل و دماغ بھی صرع و مرگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ ایسے صرع و مرگی میں جو مستقلاً اس کے دل و دماغ پر طاری ہو۔

ہو جانے پر شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا لیکن نے اسے معاف نہیں کیا اور نہ مرتے دم تک معاف کروں گی۔“

عضد الدولہ برج کے کنارے کھڑا ہو کر دجلہ کا منظر دیکھنے لگا، کچھ دیر بعد اچانک چیخا۔ ”رمان ارے ادھر تو آنا۔ دیکھنا تو کہیں یہ اپنا ابو جعفر تو نہیں؟“

رمان بھاگی ہوئی عضد الدولہ کے پاس پہنچی اور برج کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے برج کی جڑ سے متصل میڑھیوں سے ابو جعفر دجلہ میں اتر رہا تھا۔

عضد الدولہ نے ہنس کر کہا۔ ”کہیں اس بوڑھے کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ کیا یہ خودکشی کرنے جا رہا ہے؟“

رمان نے جواب دیا۔ ”جو شخص سرتاپا جھوٹ ہو اور منافقت کا لباس زیب تن کر رکھا ہو وہ اتنا غیرت مند ہرگز نہیں ہو سکتا کہ انتہائے یاس میں خودکشی کر لے۔“

”شاید شاید!“ عضد الدولہ نے کہا اور ذرا پیچھے ہٹ گیا، رمان سے کہا۔ ”تو یہیں کھڑی رہ اور ابو جعفر کی نگرانی کر، میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کرنا کیا چاہتا ہے؟“

رمان، ابو جعفر کو دیکھنے کے لیے برج سے لنگ گئی، عضد الدولہ تیزی سے لپکا اور رمان کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر دجلہ میں الٹ دیا۔ رمان چیختی ہوئی ایک زوردار چھپاک سے دجلہ کی سطح پر گر کر اندر پھینکتی چلی گئی۔ پانی کے چھینٹوں نے ابو جعفر کو بھگودیا۔ ابو جعفر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ رمان ایک بار پھر سطح پر ابھری اور دجلہ کی موجوں نے اسے ہمیشہ کے لیے چھپا لیا۔

ابو جعفر کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ برج تک اوپر چڑھتا چلا گیا اور عضد الدولہ کے پاس پہنچتے ہی حیرت اور خوف کے طے جلے لہجے میں سوال کیا۔ ”وہیلی بادشاہ! رمان کو کیا ہوا؟“

عضد الدولہ نے جبرائیل کی کوشش کی، بولا۔ ”تو مجھ سے یہی کہا کرتا تھا کہ رمان کی محبت نے مجھے بے بس اور غافل کر دیا ہے، مجلسرا کی خواتین بھی یہی کہتی تھیں، بغداد والوں کا بھی یہی خیال تھا اور میرے دادا کے وقت کا وہ بوڑھا نجوی، اس نے بھی اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔ میں کافی دنوں سے خود احتسابی میں مبتلا تھا اور کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہتا تھا جس سے میرے معترضین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ میں

الفخری، ابن طعققی۔ تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی۔ تاریخ مملکت عربی، سید ہاشمی فرید آبادی۔ عرب اور اسلام، فلپ کے حتی۔ تمدن اسلام، جرجی زیدان۔ تاریخ طبری، ابن خلدون

ساختات

باہر آئی۔ اس نے کچن میں آکر کافی کا پانی رکھا اور اپنے لیے ناشتا تیار کرنے لگی۔ اس کا ناشتا بہت سادہ ہوتا تھا، ایک پیالہ کارن فلیکس، ایک عدد ابلا ہوا انڈا اور ایک کپ کافی کا۔ وہ صرف بیس منٹ میں ناشتے سے فارغ ہو جاتی تھی۔ کچن گزشتہ روز کی طرح بالکل صاف ستھرا تھا لیکن اسے عجیب نامانوس سا احساس ہوا تھا۔ ناشتا کر کے اس نے کافی پیئے ہوئے کچن میں دیوار پر لگی کلاک کی طرف دیکھا تو اس میں یکم جون دیکھ کر وہ چونکی تھی۔ اسے خیال آیا کہ آج یکم مئی کی تاریخ ہونی چاہیے۔ پھر اس نے سر جھٹکا۔ جب آج یکم جون تھی تو یکم مئی کیسے ہو سکتی تھی؟ ابھن کے عالم میں اس نے کافی ختم کی برتن دھو کر رکھے اور کمرے میں آگئی۔ ہاتھ روپ اتار کر اس نے الماری میں لنکا استری شدہ لباس نکال کر پہنا۔ وہ ایک بینک میں اچھے عہدے پر کام کرتی تھی۔ اس لیے وہ لباس کا خاص خیال رکھتی تھی۔ وہ عام طور سے گھنٹوں تک آتا ہوا اسکرٹ اور کسی قدر فنگ کا بلاؤز یا شرٹ پہنتی تھی لیکن یہ اتنا فٹ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس سے جسمانی پیچ و خم بہت زیادہ نمایاں ہو۔ اوپر اسکرٹ کا ہم رنگ کوٹ ہوتا تھا۔

کیتھی خوب صورت عورت تھی، عمر بتیس سال تھی۔ متناسب ترین جسم کے ساتھ سنہری دھاتی رنگت اور سونے کے تاروں جیسے بال تھے۔ سر مئی آنکھیں اور جاذب نظر نقوش اسے حسین ترین عورت بناتے تھے۔ اسے اپنی خوب صورتی کا احساس تھا۔ لیکن اس کا اصل اثاثہ اس کی ذہانت تھی۔ اس مقام تک وہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کی وجہ سے پہنچی تھی۔ اس کی شخصیت کے پیش نظر اسے بگ کلائنٹ کا شعبہ دیا گیا تھا۔ اس کا کام ان بڑے گاہکوں کو بینک کی مختلف اسکیموں میں سرمایہ کاری پر راغب کرنا اور اس حوالے سے انہیں مشورے دینا تھا۔ کیونکہ معاملہ بڑے لوگوں کا تھا اس لیے کیتھی کا شعبہ ٹاپ سیکریٹ میں آتا تھا اور بینک کے ڈائریکٹر زحتی کہ صدر تک ان گاہکوں کی سرمایہ کاری کی تفصیلات سے لاعلم ہوتے تھے صرف کیتھی اس بارے میں جانتی تھی۔

تیار ہو کر اس نے اپنا ہاتھ روپ اپنی جگہ لنکایا اور دوسری تمام چیزیں سمیٹ کر دفتر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اسے سلیقہ اور صفائی جنون کی حد تک پسند تھی۔ وہ جب دفتر سے آتی تو گھر اور اس کی ہر چیز اپنی جگہ پر ہوتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے شادی نہیں کی تھی کہ نہ جانے اسے کیسا شوہر ملے جو اتنی صفائی ستھرائی کا قائل ہو یا نہ ہو۔ اپارٹمنٹ سے نکلنے سے پہلے اس نے برقی حفاظتی سسٹم

ریموٹ کنٹرول کی مدد سے آن کیا۔ اب کوئی اس کے اپارٹمنٹ میں گھسنے کی کوشش کرتا تو اس سسٹم کو لگانے والی سکیورٹی کمپنی کے دفتر میں الارم بج جاتا اور وہ پولیس کو اطلاع کرتے اور ان کے گارڈز خود بھی کیتھی کے اپارٹمنٹ تک آجاتے۔ تیز رفتار لفٹ نے اسے دو منٹ میں ستر حویں فلور سے نیچے پارکنگ میں پہنچا دیا جہاں اس کی نئی چمکتی دھاتی کار کھڑی تھی۔ اس نے ریموٹ سے اس کا دروازہ ان لاک کیا اور اندر بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگی۔

یہ سب معمول کے مطابق تھا اس نے بلاشبہ ہزاروں بار یہ سب کیا تھا لیکن اس کی ابھن دور نہیں ہوئی تھی اسے بہ دستور سب اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے باہر آئی اور دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کا اپارٹمنٹ مین ٹین میں تھا جب کہ بینک وال اسٹریٹ پر تھا۔ صبح کے وقت معمول کے مطابق رش تھا۔ پارکنگ میں کار سے اتر کر وہ لفٹ سے بائیسویں فلور پر واقع دفتر تک آئی۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا آفس کارڈ گےٹ میں ڈال لیا تھا۔ بائیسواں فلور مکمل طور پر بینک کے پاس تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی اسے بینک برانچ کا نائب منیجر سام باپ نظر آیا۔ وہ کافی مشین سے کافی نکال کر لا رہا تھا۔ کیتھی کو دیکھ کر وہ رک گیا۔ کیتھی اسے دیکھ کر دل کش انداز میں مسکرائی۔

”ہیلو سام کیسے ہو؟“
”کیتھی تم؟“ سام نے ہڑبڑا کر کہا۔ اس کی کافی جھلکتے جھلکتے بگی تھی۔
”ہاں میں ہوں۔“ کیتھی نے حیرت سے کہا۔ ”کیا تمہیں شبہ ہے کہ میں کیتھی نہیں ہوں؟“
سام اس کے پاس آیا اور اضطرابی انداز میں بولا۔
”میرے خدائے... تم ایک مہینے سے کہاں تھیں؟“
کیتھی نے گہری سانس لی۔ ”سام کیا تم آج پھر پنی کر دفتر آئے ہو؟“

”ایک قطرہ بھی نہیں۔“ اس نے تردید کی۔ ”تم جانتی ہو میں نے بہت عرصہ ہوا پینا چھوڑ دیا ہے۔“
”تب تم کیا بکواس کر رہے ہو میں کل بھی بینک آئی تھی۔“
سام نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم پورے ایک مہینے بعد آئی ہو۔ آخری بار تم تیس اپریل کو دفتر آئی تھیں۔“

کیتھی کے تاثرات بتا رہے تھے اسے سام کی بات بالکل یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ اسے بکواس سمجھ رہی تھی۔ سام نے اس کا بازو تھاما۔ ”تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو

آؤ میرے ساتھ۔“
سام اسے برانچ منیجر مک براؤن کے پاس لے گیا۔ مک کا رد عمل بھی سام والا تھا۔ ”کیتھی... میرے خدائے ایک مہینے سے کہاں تھیں۔ ہم نے اور پھر پولیس نے تمہاری تلاش میں سارا شہر چھان مارا۔“
اب کیتھی بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ مک براؤن نہایت سنجیدہ اور ہر وقت ہوش میں رہنے والا شخص تھا۔ وہ مذاق کا قائل نہیں تھا اور خاص طور سے اپنے ماتحتوں سے لگی بندھی گفتگو کرتا تھا۔ کیتھی کو دیکھ کر اس نے جو کہا تھا وہ اس کی حیرت کی دلیل تھی۔ یہ طویل ترین جملہ تھا جو کیتھی نے اس کے منہ سے سنا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا مذاق ہے، میں معمول کے مطابق اپنے بستر سے اٹھ کر بینک آ رہی ہوں۔ جیسے کل آئی تھی۔“

مک براؤن نے سام کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”مسئلہ یہی ہے، کیتھی تم کل نہیں آئیں۔ بلکہ ایک مہینے سے تم کہاں تھیں کسی کو نہیں معلوم۔“
سام نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کل تک تم کہاں تھیں؟“

”یہ سب بکواس ہے۔“ کیتھی برہم ہو گئی۔ ”تم دونوں کیا تجھے پاگل ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

دس منٹ کی بحث کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرح یہ معاملہ نہیں ہوگا۔ مک براؤن نے بینک کے اعلیٰ افسران کو اطلاع دی اور پھر کیتھی کی پراسرار گرم شدگی کیس کی تفتیش کرنے والے پولیس افسر پال کارمن کو بھی بلا لیا۔ ایک گھنٹے بعد بینک کے میننگ ہال میں کیتھی سمیت سب افراد موجود تھے۔ اب کیتھی کو یقین آنے لگا کہ اس کے ساتھ کچھ ہوا ضرور ہے لیکن اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔ گزشتہ ایک غائب ہونے والے مہینے کے بارے میں ایک جھلک بھی نہیں تھی۔ اسے بس یہ یاد تھا کہ وہ کل دفتر سے آ کر جلد سو گئی تھی کیونکہ اسے ٹھنکی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ پورے ایک مہینے کہاں رہی تھی اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ پیر والے دن آئی تھی اور اس کے بعد وہ لگا تار تین دن تک بینک نہیں آئی۔ اس کا سیل فون بند پایا گیا اور گھر کا فون کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا تو مجبوراً بینک انتظامیہ نے یہ معاملہ پولیس کے سپرد کر دیا تھا۔

میننگ میں مک براؤن کے ساتھ بینک کا ایک ڈائریکٹر جیمرن مائٹ بھی شریک تھا۔ جیمرن سرمایہ کاری

کے شعبے کا نگران تھا اور اس نے بینک کے لیے کئی بہت اچھی اسکیمیں بنائی تھیں۔ وہ ایک طرح سے کیتھی کا پاس بھی تھا۔ چوتھا فرد لیفٹیننٹ پال تھا۔ کیونکہ اسے تفتیش کا ذہنی آتا تھا اس لیے سوالات کا شعبہ اس نے لے لیا۔ وہ کیتھی سے سوالات کر رہا تھا۔ اس نے اس کی جسمانی اور ذہنی صحت سے لے کر اس کے مشاغل اور دل چسپیوں کے بارے میں ہر ممکن زاویے سے سوالات کیے تھے۔ ان میں سے بعض سوالات جو جنس اور منشیات کے بارے میں تھے۔ کیتھی کو اشتعال انگیز لگے تھے لیکن اس نے نکل سے ان کے جوابات دیے۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور اب اس کا سراغ لگانا ہے۔ اس کے لیے اسے مشکل مراحل سے گزرنا پڑ سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کی میننگ کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ پال نے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اس پر مزید بات کرنا ہو گی۔“ اس نے کیتھی کی طرف دیکھا۔ ”اگر میں تمہارا مزید وقت لوں تو امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“
”میں تم سے مکمل تعاون کروں گی آفیسر۔“ کیتھی نے جواب دیا۔ ”لیکن ابھی میرا ذہن الجھا ہوا ہے۔ کیا مجھے ایک دو دن کی رخصت مل سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں۔“ ڈائریکٹر جیمرن نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے تم ایک مہینے کی چھٹی لے لو۔“

”میں شکر گزار ہوں۔“ کیتھی نے کہا اور میننگ روم سے نکل آئی۔ لیفٹیننٹ پال اس کے پیچھے آیا تھا۔ بینک کی عمارت سے باہر آنے کے بعد پال نے اس سے کہا۔

”مس کارلائل میں دو دن بعد تم سے رابطہ کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے غائب دماغی سے کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے اپنی سب سے قریبی دوست مارٹینا کو کال کی۔ اس کی آواز سنتے ہی مارٹینا چلا اٹھی تھی۔

”میرے خدائے... کیتھی تم کہاں تھیں؟ ایک مہینے سے تمہارا کچھ پتا نہیں تھا۔“

”میں خود بھی نہیں جانتی۔“ کیتھی نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس نے کچھ دیر مارٹینا سے بات کر کے کال کاٹ دی پھر دوسرے جاننے والوں کو کال کی اور ہر جگہ اس سے یہی سوال کیا گیا کہ وہ ایک مہینے سے کہاں تھی؟ اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں پہنچ کر وہ اسٹیرنگ سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہ بھلا کیسے کہیں غائب ہو سکتی ہے؟ وہ بھی اس طرح کہ اسے بالکل

یاد نہ ہو کہ اس کے ساتھ ایک مہینے میں کیا ہوا تھا؟ وہ معمول کے مطابق اپنے بستر پر بیدار ہوتی تھی۔ دنیا میں اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ اس کی ماں اس وقت اس کے باپ کو چھوڑ کر چلی گئی جب وہ دس سال کی تھی اور اس نے ماں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ماں کو نہیں دیکھا۔ باپ اس وقت چل بسا جب وہ یونیورسٹی میں تھی۔ وہ تنہا کوٹوٹی بہت زیادہ کرتا تھا اور یہی علت دل کے شدید دورے کا سبب بنی تھی۔

دور کے چند رشتے دار تھے جن سے خود کیتھی نے بھی تعلق نہیں رکھا تھا۔ وہ تنہائی پسند تھی اور اپنے محدود حلقہ احباب کے ساتھ خوش تھی۔ مہینے میں ایک دو بار وہ سب کہیں ملتے، کھاتے پیتے اور گپ شپ کرتے اور پھر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے تھے۔ کیتھی کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا اور نہ ہی اس نے شادی کا سوچا تھا۔ عجیب بات تھی حسین ترین عورت ہونے کے باوجود آج تک کسی نے اسے شادی کی پیشکش بھی نہیں کی تھی۔ شاید اگر کوئی سنجیدگی سے اس کی طرف بڑھتا تو وہ بھی اس بارے میں سوچتی۔ وہ دفتری مصروفیات کی عادی تھی۔ صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک دفتر میں وقت گزرتا تھا۔ اس کے بعد آدھا گھنٹا رانیو کر کے گھر پہنچنے میں لگتا تھا۔ کبھی اس کا موڈ ہوتا تو اپنے پسندیدہ بار میں ایک آدھ جام پینے کے لیے رک جاتی تھی۔ اسے وہاں کا ماحول اچھا لگتا تھا۔ وہاں آنے والے مہذب اور رکھ رکھاؤ والے لوگ ہوتے تھے عام بارز کی طرح وہاں ہلا گلا اور شور شرابا نہیں ہوتا تھا۔ چھ بجے تک وہ لازمی گھر پہنچ جاتی تھی۔ وہ دفتر میں بچ نہیں کرتی تھی۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن وہ کوئی ٹیک لے لیا کرتی تھی۔ شام کا کھانا وہ خود تیار کرتی تھی۔

کیتھی کو تیار کھانے پسند نہیں تھے اس لیے وہ خود سارا سامان لا کر ڈشز بناتی تھی۔ اسے رکھا ہوا کھانا بھی پسند نہیں تھا اس لیے روز کا ڈنر روز تیار کرتی تھی۔ اتوار کا دن سب سے زیادہ مصروف گزرتا تھا۔ وہ ہفتے بھر کے سامان کی خریداری کرتی تھی۔ اس دن جم جاتی تھی اور شام کو سوئمنگ کرتی تھی۔ ہفتے میں ایک دن کی بھرپور ورزش اسے فٹ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ اتوار والے دن وہ صرف چکی سبزیاں یا پھل یا جوس لیتی تھی۔ گزشتہ آٹھ سال سے وہ اسی مصروفیت پر عمل پیرا تھی اور اس میں شاید ہی کبھی کوئی ناخدا آیا ہو اس لیے جب اس نے اگلا دن گھر میں گزارا تو چند گھنٹوں میں وہ بوکھلا گئی تھی۔ فراغت اسے کائنات کو دوڑ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دوپہر کے

بعد وہ گاڑی لے کر باہر نکل گئی اور سڑکوں پر گھومنے لگی۔ اس نے دوپہر کا کھانا ایک ریسٹوران میں کھایا اور بہت طویل عرصے بعد دوپہر کا باقاعدہ کھانا کھایا۔ پھر وہ سمندر کے کنارے گئی اور شام تک وہیں رہی تھی واپس آئی تو اسے ڈاک کے بکس سے بجلی کا بل ملا تھا۔ اس نے سوچا کہ بل ادا کر دے۔ وہ آن لائن بل ادا کرتی تھی۔ اس نے اپارٹمنٹ میں آکر اپنا کمپیوٹر آن کیا اور بل کی ادائیگی کے لیے اپنا آن لائن اکاؤنٹ کھولا۔ اس کا بیلنس سامنے آیا تو وہ اچھل پڑی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں کل سات ہزار دو سو اور کچھ ڈالرز تھے لیکن اس وقت اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ سات ہزار دو سو بارہ ڈالرز تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر رقم چند ہزار اور نیچے ہوتی تو وہ اسے اپنی یادداشت کی غلطی سمجھ سکتی تھی لیکن تین لاکھ ڈالرز کے بارے میں غلطی ممکن ہی نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی اسٹیٹ منٹ نکالی اور اسے پتا چلا کہ کسی نے تیس اپریل کی دوپہر چارج کر پینتالیس منٹ پر اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالرز کی نقد رقم جمع کرائی تھی۔ یہ رقم ٹریسٹن شہر میں اسی بینک کی ایک شاخ میں جمع کرائی گئی تھی۔ ٹریسٹن نیویارک سے تقریباً ڈیڑھ سو میل دور نیوجرسی میں تھا۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے سر تھام لیا۔ ”پہلے میری زندگی کا ایک مہینا غائب ہو گیا اور اب میرے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالرز کی رقم ہے۔“ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس طرح رقم جمع کرانے والے کا سراغ لگانا ناممکن ہے کیونکہ اس نے کوئی اکاؤنٹ بھی استعمال نہیں کیا تھا اور براہ راست نقد رقم جمع کرائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بینک کے عملے کو اس شخص کی صورت بھی یاد نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس واقعے کو ایک مہینے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور صرف صورت سے اسے پکڑنا ممکن بھی نہیں تھا جب کہ اس کا نام و پتا بھی نہیں تھا۔ کیتھی نے اٹھ کر اپنے لیے کافی بنائی اور کافی پیتے ہوئے اس معاملے پر غور کرنے لگی۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اس نے ایک مہینہ کہاں گزارا تھا اور اس دوران میں اس پر کیا گزری تھی۔ پھر کسی نے اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالرز بھی جمع کرا دیے آخر کیوں؟ کوئی پاگل نہیں ہوتا ہے کہ بلاوجہ کچھ کرے۔ گزشتہ صبح جاگنے کے بعد اس نے اپنی جسمانی حالت میں کوئی تغیر محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جیسی تھی ویسی ہی رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس ایک مہینے کے دوران اس کی صحت کا باقاعدگی سے خیال رکھا

گیا تھا۔ ایک مہینے بعد اسے جون کا توں اس کی زندگی میں واپس کر دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شاید یہ طور ملائی اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالرز بھی جمع کرا دیے گئے تھے۔ آخر کسی نے ایسا کیوں کیا تھا؟

قدرت نے اسے حسن کے ساتھ ذہن بھی دیا تھا اور وہ اسے استعمال کرتا بھی جانتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے پر شروع سے غور کرے گی۔ اپریل کے آخری دنوں میں اس کی زندگی میں کون سی چیز معمول سے ہٹ کر تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ سٹنگ روم میں آئی اور کھڑکی کھول کر اس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نوٹ پیڑ اور بین اور بین ساتھ رکھ لیا تھا۔ دائیں طرف مین بین کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سڑکوں پر روشنی کی لکیریں سفر کر رہی تھیں۔ وہ یہ سب دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ اپریل کے آخری دنوں میں اس کا وقت معمول کے مطابق گزرا تھا۔ وہ ہر گھنٹے کے حساب سے اپنی یادداشت کھنگالنے لگی۔ اس نے آخری تین دنوں پر فوکس کیا تھا۔ اسے جو یاد آتا وہ اسے وقت کے ساتھ نوٹ پیڈ پر اتار لیتی۔ رفتہ رفتہ اس کے آخری تین دن کی مصروفیات سامنے آنے لگیں۔ اسے ایک ایک کر کے تمام باتیں یاد آ رہی تھیں لیکن ان میں ایک مسئلہ تھا کہ کوئی بھی چیز معمول سے ہٹ کر یا ایسی نہیں تھی جسے وہ موجودہ صورت حال سے جوڑ سکتی۔ ہوتے ہوتے وہ آخری دن میں دفتر سے روانگی تک آگئی تھی۔ دفتر سے نکل کر اس نے سیدھا گھر آنے کے بجائے اپنے مخصوص بار میں کچھ وقت گزارا تھا۔ یہاں اس نے ایک جام پیا تھا۔ وہ عام طور سے الگ تھلگ بوتھ میں بیٹھتی تھی۔ اچانک وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ جس ویئر نے اسے جام لا کر دیا تھا کیتھی نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے نوٹ پیڈ پر لکھا۔

”پانچ بج کر تقریباً پینتالیس منٹ پر ایک شیری کا جام اجنبی ویئر کے ہاتھ سے۔“

وہ بار سے چھ بجے نکلی تھی۔ اس نے جام کی ادائیگی کاؤنٹر پر کی تھی کیونکہ وہ ویئر اسے نظر نہیں آیا تھا اور اس نے نصف ڈالر کی ٹپ ویئر کے لیے چھوڑ دی تھی۔ وہ سوا چھ بجے گھر پہنچی اور اس نے کھانا تیار کیا۔ غسل کر کے اس نے کھانا کھایا اور پھر اسے جلد ہی نیند آگئی تھی۔ کیتھی کو وقت یاد نہیں تھا لیکن اس نے جو کام کیے تھے ان کے حساب سے وہ رات ساڑھے آٹھ یا پونے نو کے درمیان سو گئی تھی۔ عام طور سے وہ رات گیارہ بجے تک سونے کے لیے لیٹتی تھی اور

صبح چھ بجے اس کے موبائل کا الارم بجنا شروع ہو جاتا اور وہ ساڑھے چھ بجے حتی طور پر اٹھ جاتی تھی۔ اس نے تمام یادداشتیں لکھنے کے بعد نوٹ پیڈ چیک کیا تو صرف دو باتیں غیر معمولی محسوس ہوئی تھیں، ایک بار میں اجنبی ویئر اور دوسرا پونے نو بجے سو جانا۔ یہ اس کے معمول کے وقت سے کوئی سوا دو گھنٹے پیچھے تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ان دونوں باتوں میں کیا ربط ہو سکتا تھا؟

وہ وقت سے پہلے سونے کی وجہ معلوم نہیں کر سکتی تھی لیکن اس ویئر کے بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کر سکتی تھی۔ وہ اسے جام دے کر چلا گیا تھا کیونکہ واپسی کے وقت وہ اسے بار میں نہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلے دن بار جائے گی۔ یہ فیصلہ کر کے وہ سونے لے لیے اٹھی تھی کہ لیفٹیننٹ پال کی کال آگئی۔ ”مس کارلائل میں کل صبح دس بجے تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں دس بجے آؤں گا۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگلے روز ٹھیک دس بجے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجی۔ دروازے پر لیفٹیننٹ پال ہی تھا۔ کیتھی نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اس نے جو غیر معمولی باتیں تلاش کی تھیں نیز اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالرز کا جو اضافہ ہوا تھا وہ اس بارے میں پال کو کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ پہلے اس بارے میں خود چھان بین کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سٹنگ روم میں لے آئی اور کافی کے بارے میں پوچھا۔ پال اس کے اپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے اور تم نے اسے سجایا بھی خوب ہے اور ہاں کافی کے لیے میں تمہارا شکریہ گزار ہوں گا۔“

کیتھی کافی اور اس کے لوازمات تیار کر کے لے آئی۔ پال کو گگن تھا کہ اس نے پوچھا۔ ”جب میری گم شدگی کی اطلاع ملی تو پولیس نے کن زاویوں سے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی؟“

پال نے کافی کی چسکی لی۔ ”سب سے پہلے پولیس نے تمہارا اپارٹمنٹ چیک کیا۔ پارکنگ میں تمہاری کار موجود تھی اور اپارٹمنٹ بند تھا۔ تم اندر نہیں تھیں اور ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ اس کے بعد تمہیں اسپتالوں اور ایسی جگہوں پر تلاش کیا جہاں انسان ہنگامی حالات میں پہنچتا ہے۔“

”مثلاً نفسیاتی اراضی کی اسپتالوں میں؟“

پال نے سر ہلایا۔ ”مردہ گھروں میں بھی... تم کافی

بہت اچھی بناتی ہو۔“ کیتھی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم لوگ مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔“

”ہاں ہم اس معاملے میں ناکام رہے۔“ پال نے جواب دیا۔ ”جب تم واپس اپنے گھر آئیں، یعنی جب صبح جاگیں تو تم نے اپنی زندگی میں کوئی تغیر محسوس کیا؟“

”بالکل بھی نہیں۔۔۔ میں معمول کے مطابق جاگی اور اپنے سارے کام معمول کے مطابق کیے۔ حد یہ کہ کوئی جسمانی تغیر یا کمزوری بھی محسوس نہیں کی، صرف کچن میں لگی گھڑی میں یکم جون دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا تھا میرے خیال میں اس میں یکم مئی کی تاریخ ہونی چاہیے تھی۔“

”اس وقت تمہیں یاد آیا کہ گزشتہ دن اپریل کی آخری تاریخ تھی؟“

”نہیں، مجھے یاد نہیں آیا تھا لیکن میں الجھن میں پڑ گئی تھی۔“

”اصل مسئلہ کا اندازہ تمہیں بینک میں آنے کے بعد ہوا؟“

”ہاں جب سامی اور مک نے مجھے بتایا کہ میں ایک مہینے سے غائب تھی۔“ کیتھی نے سر ہلایا۔

”تمہاری یادداشت اس معاملے میں بالکل بلیک ہے۔ کیا تم نے کوئی رائے قائم کی کہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“

”بد قسمتی سے کئی دن سے سوچنے کے باوجود میں ایسا کوئی نظریہ نہیں قائم کر سکی۔“

”تمہاری زندگی کے کسی اور پہلو میں تبدیلی آئی؟“

کیتھی کو اپنے بینک اکاؤنٹ کا خیال آیا لیکن وہ اس بارے میں پہلے ہی پولیس کو نہ بتانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ پہلے خود جاننا چاہتی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں کسی بھی معاملے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“

لیفٹنٹ پال اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”کیا تم نے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کے بارے میں سوچا ہے؟“

کیتھی نے ٹھوس لہجے میں اس سوال کا جواب دیا۔ ”قطعی نہیں میرے خیال میں یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے۔“

”کوئی مجرمانہ سازش ہے؟“

اس بار جواب دیتے ہوئے وہ ہچکچائی۔ ”ممکن ہے لیکن یہ معلوم کرنا پولیس کا کام ہے۔“

پال مسکرایا اور خالی کپ میز پر رکھ دیا۔ ”میں یہ کام کر رہا ہوں۔ کافی کا شکریہ۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”آج کے لیے اتنا کافی ہے لیکن ممکن ہے کوئی نئی بات سامنے آئے تو میں

تمہیں زحمت دوں۔“

”مجھے تم سے تعاون کر کے خوشی ہوگی۔ میں خود بھی جاننا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ اصل میں ہوا کیا ہے۔“

پال اپارٹمنٹ کے دروازے تک آیا، اس نے باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا پھر رک گیا۔ ”اگر تمہیں کسی بات کا علم ہو جس سے کیس کی تفتیش میں آسانی ہو تو مجھے امید ہے تم ضرور مجھے بتاؤ گی۔“

”میں ضرور بتاؤں گی۔“ کیتھی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پال کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا جیسے اس کے لہجے کی سچائی جانچ رہا ہو پھر سر کو جنبش دے کر رخصت ہو گیا۔ کیتھی نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور سکون کا سانس لیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی پولیس کا سامنا نہیں کیا تھا، اس لیے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ شام کو وہ تیار ہو کر گھر سے روانہ ہوئی لیکن آج اس نے دفتر کے فارمل ڈریس کے بجائے ذرا مختلف لباس پہنا تھا۔ منی اسکرٹ کے ساتھ سیلوئیس ٹی شرٹ تھی۔ وہ مختلف نظر آنا چاہتی تھی۔ نکلنے سے پہلے اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو اپنا سراپا اسے اجنبی لگا۔ وہ اپنے مخصوص بار میں داخل ہوئی لیکن ہوتھ کی طرف جانے کے بجائے اس نے کاؤنٹر کا رخ کیا اور ایک ایسے اسٹول پر جگہ بنالی جہاں سے وہ باقی بار دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ اسے زیادہ دیر بیٹھنا تھا اس لیے اس نے شیریں کے بجائے لائٹ بیر ماگی جو بارٹینڈر نے اسے مہیا کر دی۔

اسے اس ویٹر کی صورت یاد تھی لیکن وہ ویٹر یہاں نظر نہیں آیا۔ آدھے گھنٹے میں کیتھی نے یقین کر لیا کہ وہ ویٹر اس وقت یہاں نہیں ہے۔ کاؤنٹر پر دو بارٹینڈر تھے۔ کیتھی نے ان کا جائزہ لیا اور لڑکی کے بجائے مرد کا انتخاب کیا۔ اس کی بیئر ختم ہو چکی تھی اس نے اشارے سے دوبارہ گلاس بھرنے کو کہا۔ جب وہ گلاس بھرنے آیا تو کیتھی نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”مجھے یاد ہے میں تیس اپریل کو آخری بار یہاں آئی تھی تو میری میز پر ایک نئے ویٹر نے سرو کی تھی۔ وہ مجھے اب نظر نہیں آ رہا ہے۔“

بارٹینڈر یک دم محتاط ہو گیا۔ ”کیا آپ کو اس سے کوئی شکایت ہے؟“

کیتھی ہلکے سے ہنسی۔ ”شکایت ہوتی تو میں بار کے مالک سے نہ کہتی، اصل میں وہ مجھے سرو کر کے واپس نہیں آیا تھا اور اس کی ٹپ رہ گئی تھی۔“

بارٹینڈر نے گہری سانس لی۔ ”اوہ۔۔۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف ایک دن کے لیے آیا تھا۔ کلاؤرک کی طبیعت

خراب تھی اس نے اپنی جگہ اسے بھیج دیا تھا وہ کلاؤرک کا دوست تھا۔“

”کلاؤرک کون ہے؟“

بارٹینڈر نے ایک نوجوان ویٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ ہے۔“ پھر اسے آواز دی۔ ”اے کلاؤرک۔“

نوجوان ان کی طرف آیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”یہ خاتون تمہارے اس دوست کے بارے میں پوچھ رہی ہیں جو تیس اپریل کو تمہاری جگہ کام کرنے آیا تھا۔ اس دن تمہاری طبیعت خراب تھی۔“

کیتھی نے محسوس کیا کہ دوست کا ذکر آتے ہی وہ یک دم محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے بھی بارٹینڈر والا سوال کیا۔ ”کیا تمہیں اس سے کوئی شکایت ہے؟“

کیتھی نے اسے بھی وہی جواب دیا۔ اس نے گویا سکون کا سانس لیا اور بولا۔ ”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے ویسے بھی یہ کام اس کا پیشہ نہیں ہے میری درخواست پر وہ ایک دن کے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔“

”بہر حال میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا۔“ کیتھی نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ گلاس ختم کر کے وہ رقم کاؤنٹر پر رکھ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ باہر نکل کر وہ کار میں بیٹھ گئی لیکن گئی نہیں وہیں موجود رہی۔ رات ہو چکی تھی مگر ابھی بار بند ہونے میں بہت وقت تھا۔ کیتھی نے سوچا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے گھر پہنچ کر کھانا تیار کیا اور کھا کر کچھ وقت گھر میں گزارنے کے بعد دوبارہ بار کی طرف روانہ ہوئی۔ اس بار اس نے پینٹ شرٹ پہن لی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بار کب تک بند ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ رات بارہ کے آس پاس میں بند ہو جاتا ہوگا۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے وہاں پہنچی اور بروقت پہنچی کیونکہ کلاؤرک نامی نوجوان چھٹی کر کے وہاں سے نکل رہا تھا۔ بار سے نکل کر وہ پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ شاید اس کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ کیتھی نے کار اس کے پیچھے لگا دی۔ ایک سنان جگہ دیکھ کر اس نے کار سڑک کے ساتھ روکی اور نوجوان کو آواز دی۔

”کلاؤرک۔“

وہ اپنا نام سن کر چونکا اور کار کی طرف آیا۔ پھر وہ کیتھی کو دیکھ کر چونکا۔ ”مس تم وہی ہونا جو شام کو۔۔۔“

”بار میں تم سے ملی تھی۔“ کیتھی نے اس کی بات مکمل کی۔

”میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم کار میں آؤ گے؟“

کلاؤرک ہچکچایا لیکن کیتھی نے اصرار کیا تو وہ مان گیا۔

اس کے فرنٹ سیٹ پر آتے ہی کیتھی نے کار آگے بڑھا دی۔ کلاؤرک نے کہا۔ ”تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہو؟“

کیتھی نے سوچا اور صاف گوئی سے بولی۔ ”میں تمہارے اس دوست کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں جو یہ قول تمہارے صرف ایک دن کے لیے تمہاری جگہ کام کرنے آیا تھا، کیا یہ حقیقت ہے؟“

”ہاں یہ حقیقت ہے۔“ کلاؤرک نے کمزور لہجے میں کہا، وہ واضح طور پر جھوٹ بول رہا تھا۔ کیتھی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”کلاؤرک میں یہ سوال دوبارہ کروں گی لیکن پہلے تمہیں یہ بتا دوں جس دن تمہارا دوست اس بار میں آیا تھا اس دن کے بعد میں پورا ایک مہینہ غائب رہی ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں رہی ہوں۔ پولیس اس کیس کی تفتیش کر رہی ہے۔ تم سمجھ رہے ہونا یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔ کسی کو اغوا کرنا اور اسے یوں غائب رکھنا بہت بڑا جرم ہے۔“

کلاؤرک کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو اب میں تمہیں سچ سچ بتا رہا ہوں۔ میں بزنس کا اسٹوڈنٹ ہوں اور صرف اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے یہ ملازمت کر رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں اسے بالکل نہیں جانتا ہوں۔ ایک رات وہ اسی طرح مجھے بار سے باہر ملا اور اس نے مجھے کہا کہ اگر میں ایک دن کے لیے بار میں اپنی جگہ اسے کام کرنے دوں تو وہ اس کے لیے مجھے منہ ماگی رقم ادا کرنے کو تیار ہے۔“

”تم نے اس کی پیش کش مان لی؟“ کیتھی نے تیز لہجے میں کہا۔

کلاؤرک ہچکچایا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں مجبور تھا مجھے فیس ادا کرنی تھی اور میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی اس لیے جب میں نے پانچ ہزار ڈالر رکھے تو وہ مان گیا۔“

کیتھی حیران رہ گئی۔ ”اس نے تم سے کسی خاص دن کام کرنے کو کہا تھا؟“

”ہاں اس کا کہنا تھا کہ ایک مخصوص دن وہ مجھے چھٹی کرنے کو کہے گا اور میں باس کو کال کر کے بتاؤں گا کہ میری طبیعت خراب ہے اور میں اپنے ایک دوست کو بھیج رہا ہوں۔“

کیتھی کو یاد تھا کہ وہ پیر تھا اور اس دن رش بہت زیادہ تھا۔ ٹریفک میں پھنس کر اس نے بار پر رکنے کے بارے میں سوچا۔ اس طرح وہ ایک آدھ جام پی کر تازہ دم ہو جاتی اور ٹریفک کا دباؤ کم ہو جاتا تو وہ سکون سے گھر پہنچ جاتی۔ ”اس نے تم سے پیر کا دن مانگا ہوگا؟“

”ہاں اس نے پھر کا کہا تھا لیکن یہ بات اس نے صبح
کہی تھی۔“ کلارک نے جواب دیا۔ ”باردفاتر کے راستے
میں ہے اس لیے اس دن رٹ زیادہ ہوتا ہے اور باس چھٹی
دینے کو تیار نہیں ہوتا اس لیے جب میں نے بیماری کا بتا کر
دوست کو بھیجنے کی بات کی تو وہ مان گیا۔“
”اس شخص نے اپنا کوئی نام بتایا؟“
”نہیں۔“

”وہ کہاں ملتا تھا؟“
”ایک بار یہاں ملا پھر میرے فلیٹ پر آ گیا۔ اس
کے پاس میرا سیل نمبر تھا اور وہ مجھے روز کال کرتا تھا۔“
”اس نے تمہیں رقم دی؟“

کلارک نے سر ہلایا۔ ”پیشگی ادا کر دی تھی۔“ اس کا
لہجہ ملتتی ہو گیا۔ ”پلیز میڈم اس میں میرا کوئی قصور نہیں
ہے۔ تم اس معاملے میں مجھے شامل مت کرو۔ اگر بات
پولیس تک گئی تو مجھے کالج سے نکال دیا جائے گا اور میں کہیں
داخلہ نہیں لے سکوں گا میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔“
”قصورتو ہے۔“ کیتھی نے سوچ کر کہا۔ ”کیونکہ مجھے
شبہ ہے میں ایک مہینہ جو غائب رہی ہوں اس میں اسی شخص کا
ہاتھ ہے۔ اسے تم نے اپنی جگہ دی تھی اور یوں تمہارا قصور
بھی ہوا۔“

”پلیز میڈم۔“ کلارک رونے والا ہو گیا۔ وہ یوں تو
مضبوط جسامت کا صحت مند نوجوان تھا لیکن دل کا بہت چھوٹا
لگ رہا تھا۔ کیتھی کا دل نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا۔
”ٹھیک ہے میں پولیس کو اس بارے میں نہیں بتاؤں
گی لیکن تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔“
کلارک سمجھا نہیں۔ ”تمہارا ساتھ دینا ہوگا لیکن کس

معاملے میں؟“
”اس شخص کو تلاش کرنے میں، اگر وہ شخص مجھے مل گیا
تب ہی تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے۔“
”لیکن میں اس کے بارے میں بالکل نہیں جانتا کہ
وہ کہاں مل سکتا ہے؟“

”وہ تمہیں کسی نمبر سے کال کرتا ہوگا۔ اس کا نمبر
تمہارے پاس ہوگا۔“
کلارک ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میرے
پاس وہ نمبر محفوظ ہے۔“
”مجھے دو۔“

کلارک نے فوراً انکار کر دیا۔ ”نہیں تم اس سے رابطہ
کرو گی اور اسے پتا چل جائے گا۔“

”دوسری صورت میں، میں پولیس سے رابطہ کروں
گی اور تم نہ صرف کالج سے نکالے جاؤ گے بلکہ اس جرم میں
مدد پر جیل بھی جاؤ گے۔“
”پلیز مجھے وہ آدمی بہت خطرناک لگا ہے۔“ کلارک
رو دینے والا ہو گیا۔ ”یقین کرو جب وہ مجھ سے ملتا تھا تو میر
بہت خوف محسوس کرتا تھا۔“

”اوکے۔“ کیتھی نے اپنا سیل فون نکالا تھا کہ کلارک
نے ہار مان لی۔ اس نے کیتھی کو وہ نمبر دیدیا۔ کیتھی نے اس
سیل فون لے کر تصدیق کی کہ واقعی یہی نمبر ہے جس سے اسے
ایک مہینے پہلے کال کی گئی تھی اس کے باوجود اس نے کلارک کا
خبردار کیا۔ ”اگر تم نے کسی قسم کی غلط بیانی کی تو جھگڑو گے۔“
”میں نے سچ بتایا ہے۔“ کلارک نے اسے یقین
دلایا۔ ”پلیز اسے مت بتانا کہ اس کا نمبر میں نے دیا
ہے۔ اب مجھے جانے دو۔“

کیتھی نے اسے جانے کی اجازت دیدی۔ وہ سوچ
رہی تھی کہ اب اس نمبر کا کیسے استعمال کرے کہ اس شخص تک
پہنچ سکے۔ وہ واپس اپنے اپارٹمنٹ آ گئی۔ رات بہت ہو گئی
تھی اور وہ تھکن محسوس کر رہی تھی اس لیے بستر پر دراز ہو گئی
اور زندگی میں شاید پہلی بار وہ شب خوابی کے لباس کے بغیر
گئی۔ اگلی صبح وہ دیر سے جاگی اور خلاف معمول مکمل ناشتہ
کے بجائے اس نے صرف کافی لی اور ٹیبلٹ پر آ گئی۔ اس کی
زندگی اور سارے معاملات الٹ پلٹ کر رہ گئے تھے۔ وہ
سوچ رہی تھی کہ کاش اس کا کوئی قریبی دوست ہوتا جس سے
وہ مدد طلب کر سکتی مگر اس کا کوئی ایسا دوست نہیں تھا۔ وہ
دوست بنانے میں محتاط تھی۔ اسی لیے وہ اس معاملے میں خود
کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اگر اسے حقیقت تک پہنچنا تھا تو
وہ کسی کی مدد نہیں لے سکتی تھی۔ یہ کام اسے خود کر
نا تھا۔ سوچتے ہوئے اسے ویٹر بننے والے شخص کا خیال آیا۔ وہ
شخص جوان اور ہنڈسم تھا۔ کسی قدر طویل قامت اور خوش
شکل تھا۔ چہرے پر ہلکی سی شیو تھی اور جسامت اچھی تھی۔

کیتھی کے ذہن میں اس شخص تک رسائی کا ایک
پلان آرہا تھا۔ وہ سارا دن اس کی ٹوک پلک سنوارتی رہی۔
پھر شام کے وقت تیار ہوئی۔ اس نے نکلنے سے پہلے اپنا چھوٹا
سا اسمتھ اینڈ ولسن پستول پرس میں رکھا اور روانہ ہوئی۔ اس
کے ساتھ جو ہو چکا تھا اس کے بعد وہ اپنی حفاظت کے
معاملے میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا رٹا
نیویارک کے اس علاقے کی طرف تھا جہاں سر شام ہی ٹی
سنوری عورتیں اور لڑکیاں نظر آنے لگتی تھیں اور وہ گا کہ

تلاش کرتی تھیں۔ اسے ایک فٹ پانچ پر کئی لڑکیاں اور عورتیں شہتی نظر آئیں۔ کیتھی نے کاررو کی اور نیچے اتر آئی۔ اس کی چستی دیکتی شاندار کار دیکھ کر وہ خود اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایک نوجوان اور کسی قدر طویل قامت یوریشین لڑکی لپکتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ اس کے خدوخال میں مشرق بعید کی جھلک واضح تھی۔ مگر اس کا لہجہ خالص امریکن تھا۔

”ہیلو سوئی... کیا تمہیں کسی پارٹنر کی تلاش ہے؟“

کیتھی کسی قدر نزوس ہوئی کیونکہ اس کا واسطہ بھی اس مخلوق سے نہیں پڑا تھا جسے عرف عام میں کال گرل کہا جاتا ہے۔ ”ہاں... وہ مجھے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔“

لڑکی نے خود کو نمایاں کر کے دکھایا۔ ”کیا وہ میں ہو سکتی ہوں... وہ بے تم ہم جس پرست ہو؟“

”نہیں... کیتھی مزید نزوس ہو گئی تھی پھر وہ سنبھل کر بولی۔ ”دراصل مجھے تم سے ایک کام لینا ہے میں اس کا معقول معاوضہ دوں گی۔“

”معقول معاوضے کے لیے میں سب کر سکتی ہوں۔“ لڑکی نے اسے کار کی طرف دھکیلا کیونکہ دوسری لڑکیاں اور عورتیں ان کی طرف آرہی تھیں اور اسے خطرہ محسوس ہوا کہ کیتھی کسی اور سے بات نہ کر لے۔ وہ آگے بڑھے تو لڑکی نے پوچھا۔ ”کام کیا ہے اور اس میں کوئی تیسرا فرد بھی ملوث ہے؟“

اب کیتھی پر اعتماد تھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے ایک شخص کی تلاش ہے اور میرے پاس صرف اس کا سیل نمبر ہے۔“

لڑکی سیدھی ہو گئی۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں، کیا تمہیں اس سے کوئی نقصان ہوا ہے؟“

کیتھی نے اس کی بات نظر انداز کی اور بولی۔ ”غور سے میری بات سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، اگر تم کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں اسی جگہ اتار دوں گی جہاں سے بٹھایا ہے۔“

”میں صرف ساتھ چلنے کے دو سو ڈالر لیتی ہوں۔“ لڑکی اپنے گلے میں موجود لمبی سی مالا سے کھیلے ہوئے بولی۔ کیتھی نے اپنا پرس کھولا اور دو سو ڈالر اس کے حوالے کر دیے جو اس نے اپنی چھوٹی سی ٹیکر کی منی سی جیب میں رکھ لیے۔ ”ٹھیک ہے اب بولو۔“

کیتھی اسے بتانے لگی کہ اسے کیا کرنا ہے؟ وہ غور سے سن رہی تھی جب کیتھی نے بات مکمل کی تو وہ بولی۔ ”میں سمجھ گئی... اگر میں نے یہ کر لیا تو مجھے کیا ملے گا؟“

”تمہارا ایک دن کا معاوضہ۔“

”میں سات سو ڈالر لیتی ہوں لیکن تم سے ڈبل لوں گی۔“

”منظور ہے میں چودہ سو ڈالر دوں گی۔“ کیتھی نے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”گریٹا۔“ وہ بولی۔ ”اور تمہارا؟“

کیتھی نے اس کی بات نظر انداز کی۔ اس نے کہا۔ ”نمبر نوٹ کر لو اور ابھی اسے کال کرو۔“

”نمبر دو لیکن کسی ایسی جگہ چلو جہاں شور نہ ہو۔“

کیتھی نے اسے نمبر دیا اور کچھ دیر بعد وہ ایک ریسٹوران کے سامنے خاموش پارکنگ میں تھے۔ گریٹا نے نمبر ملایا اور نہایت سنسنی خیز انداز میں بولی۔ ”ہائے ہونڈم... میں کون ہوں... میں ایک خوب صورت لڑکی ہوں... تمہارا نمبر مجھے نیٹ سے ملا ہے... مجھے نہیں معلوم کس نے دیا ہے... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“ بات کرتے ہوئے اس نے سیل دیکھا اور کیتھی سے بولی۔ ”بہت روڈ آدی ہے ذرا جو متاثر ہوا ہوا چانک کال کاٹ دی۔“

”پھر ملاؤ۔“ کیتھی بولی۔ وہ ایک طرف گفتگوں رہی تھی۔

گریٹا نے کچھ رک کر پھر ملایا۔ ”اے میری بات سنو... میں ہر کسی سے بات نہیں کرتی لیکن تم مجھے اچھے لگے ہو... ہاں نمبر کے ساتھ تمہاری تصویر بھی ہے... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں... تم نہ آؤ تم جہاں کہو گے میں آ جاؤں گی... اوکے... ایک منٹ۔“ گریٹا نے نوٹ پیڈ کھینچا اور اس پر لکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ”میں آؤ ہے گھنٹے میں وہاں ہوں گی۔“ اس نے کال کاٹ کر کیتھی کی طرف نوٹ پیڈ بڑھا دیا۔ ”وہ یہاں ہے۔“

کانغز پر کنگ بار براڈوے لکھا تھا۔ کیتھی نے سر ہلایا اور کار پارکنگ سے نکالنے لگی۔ گریٹا نے کہا۔ ”میں نے کام کر دیا ہے اب معاوضہ دو میں جاؤں گی۔“

”اتنی جلدی کیا ہے ڈیر میں ذرا اسے دیکھ لوں اگر وہ وہاں ہوا تو تمہیں چودہ سو ڈالر مل جائیں گے۔“

گریٹا نے برا سامنہ بنایا لیکن پھر مطالبہ نہیں کیا۔ وہ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے کنگ بار پہنچ گئی۔ یہ بار اور ٹائٹ کلب کا کچھ تھا اور وہاں وہ سب ہو رہا تھا جو ان دونوں جگہوں پر ہو سکتا ہے۔ بار بہت بڑا تھا اور ابھی صبح سے رات شروع نہیں ہوئی تھی لیکن وہاں خاصا ہجوم تھا۔ کیتھی کے خیال میں یہ اچھی بات تھی۔ اس ہجوم میں خود کو چھپانا آسان تھا۔ جس طرح وہ اس شخص کی صورت آشنا تھی اسی طرح وہ بھی اسے پہچانتا تھا۔ اندر جانے سے پہلے کیتھی نے اپنے گولڈن بال بکسیر لیے تھے اور سن گلاسز لگ لیے تھے۔ اس نے گریٹا

پوچھا۔ ”کیا اس نے بتایا تھا وہ کہاں ملے گا؟“

”نہیں اس نے بس جگہ کا بتایا تھا۔“

کیتھی نے پہلے بار والے حصے میں دیکھا۔ وہاں اسے وہ شخص نظر نہیں آیا پھر وہ ٹائٹ کلب والے حصے کی طرف بڑھی وہاں بے پناہ شور تھا۔ مگر وہ شخص نظر آ گیا۔ وہ ایک چھوٹی میز پر تھا۔ اسے دیکھتے ہی کیتھی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ گریٹا کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے پھر رقم کا مطالبہ کیا اس بار کیتھی نے رقم ادا کر دی لیکن اس کا واپس چھوڑنے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ ”یہاں بہت ٹیکسیاں ہیں تم کسی میں بھی واپس جا سکتی ہو۔“

گریٹا اسے زیر لب سناتی چلی گئی۔ کیتھی نے ٹائٹ کلب کا جائزہ لیا۔ وہاں آمد و رفت کا بس ایک ہی دروازہ تھا۔ اس نے اپنی کار مخالف سمت میں سڑک کے ساتھ روک دی اور سیٹ کسی قدر پیچھے کر کے دروازے کی نگرانی کرنے لگی۔ ابھی وہ اس کے لیے صرف ایک شخص تھا، وہ جانتا چاہتی تھی کہ وہ کون تھا اور کہاں رہتا تھا؟ ایک بار یہ معلوم ہو جاتا تو اس کا کام آسان ہو جاتا۔ خوش قسمتی سے بار کے مخالف سمت سناٹا اور کسی قدر تاریکی تھی اس لیے صرف پاس سے گزرنے والے ہی اسے دیکھ سکتے تھے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ شخص اندر سے نمودار ہوا اور سڑک پار کر کے ایک کار میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کیتھی کا راسٹارٹ کر رہی تھی کہ ایک ڈبل کیبن وین جو دو گاڑی آگے پارک تھی وہ بھی قطار سے نکلی اور وہ کار کے پیچھے روانہ ہوئی۔ اس کے پیچھے کیتھی کی کار تھی۔ براڈوے کی مصروف سڑکوں سے نکل کر وہ ہائی وے پچانوے کی طرف جانے لگے۔ ایک میل سے خلیج عبور کی اور پھر وہ اینگل ووڈ کلف کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ یہ زیادہ مصروف سڑک نہیں تھی۔

اچانک ڈبل کیبن وین کی رفتار تیز ہوئی اور وہ اگلی کار کے برابر جا پہنچی۔ اس کی عقبی کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا اور اچانک ہی کیتھی نے کسی خود کار رانڈل کی آواز سنی۔ بے اختیار اس کی کار لہرائی۔ ساتھ ہی اس شخص کی کار بھی لہرائی اور پھر مڑ کر جنگل میں مٹی اور ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ وین اس پر گولیاں برسائی گزرتی تھی۔ یہ سب چند لمحوں میں ہو گیا۔ اس وقت وہاں دور تک کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ کیتھی نے اپنی کار کچھ فاصلے پر روکی اور اتر کر بھاگی۔ کار جب درخت سے ٹکرائی تو اس کی رفتار زیادہ نہیں مگر اس کے انجن اور بونٹ کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ کیتھی نے ڈرتے ڈرتے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھا تو آدی کو زندہ پا کر

اسے حیرت ہوئی ورنہ وین سے پورا برسٹ چلایا گیا تھا۔ کیتھی نے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے کراہ کر کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس کا دامن شانے سے نچلا حصہ خون میں تر ہو رہا تھا۔

”تم زخمی ہو خون بہہ رہا ہے۔“ کیتھی نے کہا۔ ”تمہیں اسپتال چلنا ہوگا۔“

”تم نے مجھے کیسے تلاش کیا؟“ اس نے کیتھی کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ وہ یقیناً اسے پہچان گیا تھا۔

”بس کر لیا۔“ کیتھی نے کہا اور اسے سہارا دیا۔ ”یہاں سے چلو۔ ایسا نہ ہو وہ پھر پلٹ کر آئیں۔“

وہ اسے اپنی کار تک لائی اور بیٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اگلے انٹر چینج سے اس نے اپنا رخ واپس مین ہٹن کی طرف کر لیا تھا۔ زخمی شخص کا نام ٹام لین تھا۔ اس نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ کیتھی نے اصرار کیا۔ ”تمہیں علاج کی ضرورت ہے گولی...“

”وہ نکل گئی ہے میں خود مرہم پٹی کر لوں گا۔ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”مین ہٹن... وہاں میرا پارٹنمنٹ ہے۔“

”نہیں ڈائٹ اسٹون چلو... اگر یہ وہی ہیں تو وہ تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”وہ کون؟“

”وہی جنہوں نے تمہیں اغوا کیا تھا۔“

کیتھی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ ”تم جانتے ہو؟“

”ہاں لیکن ابھی مجھے مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔“

سوال جواب بعد میں کرنا۔ ”ٹام کراہا۔ اس نے اپنے زخم کو دوبار کھا تھا۔ کیتھی کا اندازہ تھا کہ کوئی عضو یا اہم رگ متاثر نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ اب تک ہوش میں نہ ہوتا۔ اس نے کار کا رخ وائٹ اسٹون کی طرف موڑ دیا۔ مین ہٹن خلیج کے قریب یہ علاقہ بہت گنجان آباد تھا مگر ٹام نے جس ساحلی مکان کے پاس کار روکائی وہ ذرا الگ تھلک تھا۔ اس کے آس پاس درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ مکان کی حالت سے لگ رہا تھا وہ خالی رہتا تھا۔ ٹام نیچے اتر اور اس نے کیتھی سے کہا۔ ”اپنی کار پیچھے لے جاؤ ایک گیراج ہے اس میں کار کھڑی کر دو۔ اگر کوئی اس طرف آئے تو اسے تمہاری کار نظر نہیں آنی چاہیے۔ تم عقبی دروازے سے اندر آؤ گی۔“

کیتھی کار کھڑی کر کے اندر آئی تو ٹام اپنی شرٹ اتار چکا تھا۔ گولی عقب سے بغل کے نیچے لگی تھی اور پسلی کی

طرف سے نکل گئی تھی۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مگر تکلیف دے ضرور تھا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور ایک منزلہ تھا۔ سامنے لاؤنج اور ایک کچن تھا عقبی دروازہ کچن میں کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ بیڈروم تھا اور باتھ روم بیڈروم کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ کیتھی نے دیکھا اور بولی۔ ”میں ڈریسنگ کرتی ہوں، سامان کہاں ہے؟“

”باتھ روم میں۔“ ٹام نے کہا۔ وہ بوتل سے دھسکی بی رہا تھا اور شاید اپنی تکلیف کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیتھی سامان لے آئی، پہلے اس نے روٹی سے زخم صاف کیا اور پھر اس پر دونوں طرف پٹی رکھ کر اوپر سے ٹپ کر دیا۔ دواؤں کے بکس میں اینٹی بائیوٹک اور پین کلرز تھیں۔ ٹام نے کئی گولیاں دھسکی کے ساتھ حلق سے اتار لیں۔ اس نے بوتل کیتھی کی طرف بڑھائی اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں منتظر ہوں تم اپنی بات مکمل کرو۔“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ ”مجھے نہیں معلوم بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میں تیس اپریل کی شام گھر آئی۔ کھانا کھایا اور قبل از وقت سو گئی تھی۔“ ”اس کے بعد کیا ہوا تمہیں یاد نہیں ہے؟“ ”ذرا بھی نہیں... مجھے لگ رہا ہے میں پورے ایک مہینے سونے کے بعد بیدار ہوئی۔“

ٹام نے گہری سانس لی۔ وہ لاؤنج کے صوفے پر آگیا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے بہت سے کام کیے ہیں لیکن ایسا کام زندگی میں پہلی بار کیا۔“ کیتھی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے تم نے اور بھی غیر قانونی کام کیے ہیں لیکن یہ پہلی بار کیا؟“ ”بالکل... مجھ سے کہا گیا کہ تم کو شیریں میں ایک دوا دوں۔“ ”دوا... کس قسم کی دوا؟“

”میں نہیں جانتا۔ وہ سیال صورت میں تھی اور تمہیں صرف دو قطرے دینی تھے۔“ ”تم نے یہ کام کر دیا۔“ کیتھی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”اگر یہ زہر لگتا تو؟“ ”نہیں میرے سامنے اسے ایک کتے پر آزمایا گیا اور اسے کچھ نہیں ہوا۔“

”اوکے تم نے مجھے دوا دیدی۔ اس کے بعد؟“ ٹام نے اپنے بال سہلائے۔ ”اس کے بعد جو ہوا وہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ مجھے کہا گیا کہ میں رات بارہ بجے تمہارے اپارٹمنٹ تک جاؤں اور عقبی ایمرجنسی کے لیے مخصوص سیزمی استعمال کروں۔ میں اس سے اوپر آیا اور

میں نے ہدایت کے مطابق تمہارے بیڈروم کی کھڑکی کھلی اور تم نے اسے کھول دیا۔“ ”ایک منٹ، ٹام کیا تھا؟“ ”رات کے گیارہ بج رہے تھے۔“ ”ناممکن میں نو بجے سے پہلے سو گئی تھی۔“ ”تم سو فیصد جاگ رہی تھیں لیکن تمہارا رویہ عجیب سا تھا میں نے تم سے کہا کہ لباس تبدیل کر کے میرے ساتھ چلو اور تم نے بلا حجت لباس تبدیل کیا اور میرے ساتھ ایمرجنسی کی سیزمیوں سے نکل آئیں۔“ ”میں جاگ رہی تھی؟“ ”ہاں لیکن میں نے کہا تھا تمہارا رویہ عجیب سا تھا مگر بالکل خاموش اور یوں لگ رہی تھیں جیسے کسی ٹرانس میں ہو تم سے جو کہا جا رہا تھا تم بلا جوں چرا کر رہی تھیں یہ بتاؤ تم کسی کے سامنے لباس تبدیل کر سکتی ہو؟“

”میرے گز نہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”لیکن تم نے میرے سامنے تبدیل کیا تھا۔“ کیتھی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”تم مجھے کہاں لے گئے تھے؟“ ”میں تمہیں بروکس کی ایک عمارت میں لے گیا تھا۔ یہ ذرا الگ تھلگ اور کسی قدر پراسرار عمارت تھی۔ چاروں طرف سے بند اور جیسے ویران ہو۔ لیکن اس کے اندر کئی لوگ تھے۔“

”تم مجھے وہاں چھوڑ کر چلے آئے؟“ ٹام نے سر ہلایا۔ ”وہاں کئی لوگ تھے۔ ان سب کے چہرے میں نے دیکھے لیکن ایک شخص تھا جس نے چہرہ نقاب تلے چھپایا ہوا تھا۔ وہ وہاں موجود لوگوں پر برہم ہوا تھا کہ مجھے یہاں تک کیوں آنے دیا گیا اور تمہیں لینے ان میں سے کوئی کیوں نہیں گیا؟“

”باقی لوگ کون تھے؟“ ”میں انہیں ناموں سے نہیں جانتا لیکن اپنے چہروں اور انداز سے وہ جرائم پیشہ یا نچلے طبقے کے نہیں لگ رہے تھے۔“ ٹام نے سوچ کر کہا۔ ”وہ سب معزز اور اوپری طبقے کے لگ رہے تھے۔“

”جو شخص نقاب تلے تھا اس کے بارے میں بتاؤ۔“ ”وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ بہت بے تہ انداز میں۔“ ”اس کے علاوہ کتنے لوگ تھے؟“ ”تین افراد اور تھے۔“ ٹام نے کہا۔ ”تمہیں یہ کام کس نے دیا تھا؟“ ”ان میں سے ایک تھا۔ گول چہرے اور گول فریم کی

عینک والا۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے پاس پورے کارڈ تھے۔“ ”تم نے نمبر نوٹ کیا تھا؟“ ”نہیں وہ مجھ سے رات میں ملا اور نمبر پلیٹ کی لائٹ بند تھی۔“

”تمہیں اس کام کا معاوضہ کیا ملا؟“ ”وہ ہچکچایا پھر اس نے کہا۔“ پچاس ہزار ڈالر۔ مجھے آج تک کسی کام کا اتنا معاوضہ نہیں ملا۔“ ”تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے اگر تم پکڑے جاتے تو کم سے کم چھ سال کے لیے جیل جاتے۔ کیا تمہارے لیے پچاس ہزار ڈالر تمہارے چھ سال سے زیادہ قیمتی ہیں؟“ ٹام نے سرد آہ بھری۔ ”اگر میں ایسا سوچتا تو جرم کیوں کرتا۔ میں نے آج تک کسی عورت کو اغوا نہیں کیا اور نہ ہی کسی عورت کو نقصان پہنچایا۔ یہ پہلا موقع تھا اور یہی بات میرے ذہن پر بوجھ بن گئی۔“

”تم مجھے چھوڑ کر آگئے اس کے بعد کیا ہوا؟“ ”انکس مئی کی شام مجھے پھر طلب کیا گیا اور میں نے تمہیں اس عمارت سے لیا اور اسی طرح تمہیں ایمرجنسی سیزمی سے واپس تمہارے اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا۔“ کیتھی چونکی۔ ”کیا کھڑکی لاک نہیں تھی؟“ ”حیران کن طور پر وہ کھلی ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں اندر پہنچایا اور تمہیں لباس تبدیل کرنے کو کہا، تم نے اسی طرح لباس تبدیل کیا اور شب خوانی کا سوٹ پہن لیا۔“

”میں نے وہی لباس پہن رکھا تھا؟“ ”ہاں وہی تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے تم نے ابھی پہنا ہو۔ پھر میں نے باہر جانے سے پہلے تمہیں کہا کہ تم کھڑکی بند کر لو اور تم نے بند کر لی تھی۔“ کیتھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس کی معلومات میں اضافہ ہوا تھا لیکن بات سلبنے کے بجائے مزید الجھ گئی تھی۔ اسے اس عمارت میں کیوں لے جایا گیا تھا اور وہاں ایک مہینے کیوں رکھا گیا تھا؟ ٹام پین کلر کے زیر اثر ست ہو رہا تھا۔ کیتھی نے اس سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”مجھے گول چہرے والے نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس بارے میں کسی سے کچھ کہا تو مجھے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”جیسا کہ آج ہوا... انہوں نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مجھے حیرت ہے تم بچ کیسے گئے؟“ ”مجھے بھی حیرت ہے میرے آس پاس سے ساری

گولیاں گزری ہیں بس یہی ایک گولی مجھے لگی۔“ ”وہ تمہیں مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے تاکہ یہ راز ہمیشہ راز رہے۔“ ٹام نے سر ہلایا۔ وہ اس دوران میں نصف بوتل پی چکا تھا اور اس کی آنکھوں سے نشہ جھلکنے لگا تھا۔ اس نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر تمہارا ارکانے کا ارادہ ہے تو وہاں سو جاؤ۔“

”نہیں میں اپنے گھر جاؤں گی۔“ ”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ایسا لگتا ہے انہوں نے سب صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور تم بھی اس میں شامل ہو۔ اگر جانا ہے تو کسی ایسی جگہ جاؤ جہاں وہ نہ پہنچ سکیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے وہ تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں۔“

کیتھی سہم گئی۔ ”میرے پیچھے کیوں ہوں گے؟“ ”کیونکہ جو ہوا ہے وہ تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ میں صرف ایک مہرہ تھا لیکن انہوں نے مجھے بھی صاف کرنے کی کوشش کی۔“ ٹام نے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ تمہیں اس طرح ایک مہینے غائب رکھ کر کیا کر سکتے ہیں؟“

کیتھی سوچ میں پڑ گئی۔ اسے خیال آیا تھا کہ شاید یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ ایک بہت خوب صورت عورت ہے۔ اسے جسمانی استحصال کے لیے یوں اغوا کیا گیا تھا مگر یہ خیال اسے بچا نہیں تھا۔ اول تو وہ اپنی جسمانی حالت میں کوئی تغیر نہیں پا رہی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک اور پوری طرح فٹ تھی۔ دوسرے کسی کو اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالر جمع کرانے کی ضرورت نہیں تھی وہ بھی اس کے غائب ہونے سے پہلے۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا جوئی الحال اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ سوچتے ہوئے اس نے ٹام کی طرف دیکھا تو وہ سوچا تھا۔ کیتھی نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اور رقم کے لیے غیر قانونی کام کرتا رہا تھا، اس نے صرف کیتھی کو اغوا کرنے پر ندامت ظاہر کی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے کسی کام پر ندامت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ کیتھی کو اچھا لگا تھا۔ اس نے ٹام پر ہلکی چادر ڈال دی اور خود بیڈ روم میں آگئی۔ وہ بیڈ پر لیٹی اور کب سو گئی اسے پتا نہیں چلا۔ پھر اس کی آنکھ کھلی تو کچن سے کھٹ پٹ کی آواز آرہی تھی۔ وہ باہر آئی۔ ٹام کچن میں مصروف تھا۔

”گڈ مارننگ۔“ ٹام اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”کیسے ہو تم؟“ کیتھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بہت بہتر ہوں۔“ اس نے کافی کام کیتھی کے سامنے رکھا اور زندگی میں پہلی بار اس نے برش کیے بغیر کوئی چیز پی۔ ٹام اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تم نے کیا سوچا؟“

”کس بارے میں؟“

”یہی کہ اب تم کیا کرو گی؟ پولیس کے پاس جاؤ گی یا اپنے طور پر جانے کی کوشش کرو گی جیسا کہ تم نے میرے بارے میں کیا۔“

کیتھی نے گہری سانس لی اور اسے بتا دیا کہ اس کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ ڈالر اسی دن جمع کرائے گئے تھے جب وہ غائب ہوئی تھی۔ ٹام نے سر ہلایا۔ ”یہ بھی ان کی پلاننگ ہوگی تاکہ تم پولیس سے رابطہ نہ کرو۔“

”مگر کیوں؟“

ٹام نے شانے ہلائے۔ ”شاید وہ کسی کام کے لیے مہلت چاہ رہے ہوں۔ تمہیں صحیح سلامت واپس کرنا ان کی مجبوری ہوگی اور جب ان کا کام ہو جائے گا تو وہ تمہیں ختم کر دیں گے جیسے انہوں نے مجھے ختم کرنے کی کوشش کی۔“

کیتھی کا دماغ الجھنے لگا۔ آخر وہ چاہتے کیا تھے؟ وہ ایک عام سی عورت تھی۔ اس میں ایسی کوئی خوبی نہیں تھی۔ ٹام اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم اس طرح سے غائب اور پھر واپس کی جاؤ۔ لیکن کوئی بھی کام بلا وجہ نہیں کیا جاتا اور اتنی احتیاط سے تو خفیہ ایجنسیاں بھی کام نہیں کرتی ہیں۔“

”میں سوچوں گی کہ اب کیا کرنا ہے۔“ کیتھی نے کہا۔ اس نے کافی پی کر ناشا بنایا۔ انہوں نے ناشا کیا اور پھر اس نے ٹام کی ڈریسنگ تبدیل کی۔ اس کے زخم کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس نے تازہ پٹی رکھ کر کہا۔

”تمہارا زخم دو تین دن میں بھر جائے گا۔“

”یہ جگہ محفوظ ہے۔“ ٹام نے کہا۔ ”ورنہ وہ اب تک یہاں آچکے ہوتے۔“

”لیکن مجھے جانا ہوگا۔“ کیتھی نے کہا۔

”کہاں جانا ہے؟“

کیتھی تیار ہوئی اس نے منہ ہاتھ دھو کر بال برش کیے اور بیگ شانے سے لٹکا لیا۔ ”اپنے دفتر... شاید میں نہ آؤں، اگر نہ آئی تو تمہیں کال کر کے بتا دوں گی۔“

ٹام اسے عقبی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ جانے سے پہلے کیتھی نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے

اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ بائیں بازو سے اسے سمیٹ کر اس پر جھک گیا تھا۔ پھر اس نے کیتھی کو چھوڑا تو اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ ٹام نے آہستہ سے کہا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

کیتھی نے سر ہلایا اور باہر نکل آئی۔ اس نے گیراج سے کار نکالی اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس کا رخ وال

اسٹریٹ کی طرف تھا۔ پر ہجوم سڑکوں کی وجہ سے اسے تاخیر ہوئی اور وہ بینک کی عمارت میں داخل ہوئی تو دس بج رہے تھے۔ اوپر آکر وہ بینک میں داخل ہوئی تو سب اپنے

اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کچھ نے اسے دیکھا مگر توجہ نہیں دی۔ وہ خود بھی دوسروں کی نظروں میں آنے سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے کیمین تک آئی۔ رازداری کے

نقطہ نظر سے ساؤنڈ پروف کیمین شیشے سے بنا ہوا تھا اور اس کی دیواریں چھٹ تک غیر شفاف تھیں یعنی باہر سے اندر

دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے کارڈ شیج کر کے دروازہ کھولا اور اندر آئی۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور اسے بینک کے

مرکزی ڈیٹا سرور سے منسلک کیا۔ اس نے اپنا پاس ورڈ ڈالا تو سرور نے مسٹر درکار دیا اور اسے اطلاع دی کہ اس کا

اکاؤنٹ عارضی طور پر ڈی ایکٹیو کر دیا گیا ہے۔ کیتھی کی پیشانی پر شکن ہو گئی تھی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی اور

اس بار بھی وہی جواب ملا۔

کیتھی نے فون اٹھا کر بینک کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ کیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”میں اپنے

اکاؤنٹ تک ایکسیس نہیں کر پا رہی۔ اکاؤنٹ ڈی ایکٹیو کر دیا گیا ہے۔“

”ایک منٹ میڈم میں چیک کرتا ہوں۔“ آئی ٹی ماہر نے کہا اور ایک منٹ بعد اسے مطلع کیا۔ ”منجھٹ کی

جانب سے آپ کا اکاؤنٹ عارضی طور پر ڈی ایکٹیو کر دیا گیا ہے۔“

”مگر مجھے اس معاملے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی ہے۔“ کیتھی نے غصے سے کہا۔ ”کیا میرا سیل نمبر تم لوگوں کے پاس رجسٹرڈ نہیں ہے؟“

”ہے میڈم۔“ ماہر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن مطلع کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، یہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ ہیڈ کا کام ہے۔“

کیتھی نے سوچا، اپنے پرس سے یو ایس بی نکال کر کمپیوٹر سے منسلک کی اور کی بورڈ پر انگلیاں چلانے کے بعد اس نے فون سے جیمرن کا نمبر ملا یا۔ ”کیتھی بات کر رہی ہوں۔“

”کیتھی... کیسی ہو تم؟“

”کیا میرا اکاؤنٹ ڈی ایکٹیو کر دیا گیا ہے؟“

”ہاں... لیکن تمہیں... کیسے پتا چلا؟“

”میں اس وقت دفتر میں موجود ہوں۔“

جیمرن کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ”تم ایک مینیجنگ کی چھٹی پر ہو۔“

”میں چھٹی منسوخ کر رہی ہوں۔“ کیتھی نے کہا۔

”میں اسی وقت سے ڈیوٹی پر ہوں، میرا اکاؤنٹ ایکٹو کراؤ۔“

”کیتھی۔“ جیمرن نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے... اعلیٰ حکام... تمہاری پر اسرار کم

شدگی... کا معاملہ ہونے تک... تمہیں چھٹی پر دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”کیا میرے خلاف کوئی چارج شیڈ تیار ہو رہی ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“ جیمرن نے کہا۔ ”دراصل ایک نئی بات سامنے آئی ہے... تمہارے بینک اکاؤنٹ

میں... تین لاکھ ڈالر کی رقم آئی ہے۔“

”جس طرح میں یہ نہیں جانتی کہ میں کیسے غائب ہوئی اور ایک مہینہ کہاں رہی اسی طرح میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میرے اکاؤنٹ میں یہ رقم کس نے جمع کرائی۔“

”واقعی؟“ جیمرن کا لہجہ سناٹ تھا۔ ”یہ تو تمہارا بیان ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ...“ کیتھی کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس کے کیمین کا دروازہ کھلا۔ سامنے

بینک کی سکیورٹی انچارج روپی کے ساتھ دو گارڈز کھڑے تھے۔ روپی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”سوری مس کارلائل لیکن تمہیں فوری یہ آفس چھوڑنا ہوگا ابھی تم یہاں آنے کی مجاز نہیں ہو۔“

کیتھی نے ریسیور شیج دیا اور مصنوعی حیرت سے بولی۔ ”ایسی کیا بات ہوئی ہے؟“

”آرڈر ہے۔“ روپی اندر آئی۔ اس نے اپنے کارڈ سے دروازہ کھول لیا تھا۔ اس کے آگے آنے سے پہلے کیتھی نے غیر محسوس انداز میں یو ایس بی نکال کر مٹھی میں دبا

لی اور مٹن دبا کر کمپیوٹر آف کر دیا۔ اس پر پاس ورڈ تھا اور فوری طور پر اس کے سوا کوئی اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ ”مجھے

حکم ملا ہے تمہیں بینک کی حدود سے باہر پہنچا دوں۔“

کیتھی نے گہری سانس لی اور کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا پرس اٹھا کر شانے سے لٹکا یا اور اسی دوران میں یو ایس بی اس میں ڈال لی۔ روپی اسے باہر تک لائی۔ لابی

میں آتے ہی اس کے تاثرات بدل گئے اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں اس رویے پر معذرت خواہ ہوں، حکم کی تعمیل تو

کرتی ہوتی ہے۔“

کیتھی نے سر ہلایا۔ ”میں تمہاری مجبوری سمجھتی ہوں۔ جیمرن نے تمہیں جو کہا وہ تمہیں کرنا ہے۔“

”وہ باس ہے۔“ روپی نے تصدیق کی کہ جیمرن نے ہی یہ حکم دیا تھا۔

باہر آتے ہی کیتھی نے نزدیکی اے ٹی ایم کارخ کیا اور اس سے اپنا اکاؤنٹ چیک کیا۔ اس کی توقع کے عین

مطابق اس کا بینک اکاؤنٹ بھی سیز کیا جا چکا تھا۔ اگرچہ عدالتی حکم کے بغیر کسی کا اکاؤنٹ سیز نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن

بینک کے پاس اس بارے میں کچھ اختیارات ہوتے ہیں جن کی مدد سے اکاؤنٹ سیز کیا جاسکتا ہے۔ وہ وہاں سے

روانہ ہوئی مگر اس نے گھر جانے کے بجائے ایک نیٹ کیفے کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک الگ تھلگ میز لی یہاں

لیپ ٹاپس تھے جن پر بغیر سرور کے نیٹ دستیاب تھا اور لوگ اپنی پرائیویسی برقرار رکھتے ہوئے نیٹ استعمال کر

سکتے تھے۔ اس نے پرس سے یو ایس بی نکال کر لیپ ٹاپ کے ساتھ لگائی۔ اس میں کچھ ورڈز اور ایکسل فائلیں تھیں۔

اس نے انہیں اوپن کیا اور پھر ان میں سے کچھ اپنے آئی فون کے پیڈ پر نوٹ کرنے لگی۔ یہ کام نمٹا کر اس نے یو

ایس بی نکالی اور باہر آگئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے لیفٹیننٹ پال کو کال کی۔

”ہائے آفیسر... کیا کوئی پروگریس ہوئی ہے؟“

”نی الحال تو نہیں۔“

”آفیسر میرے لباس سے ایک کارڈ نکلا ہے۔ اس پر

ایک عمارت کا پتا لکھا ہے۔ یہ کارڈ میں نے بھی نہیں دیکھا اور یہ اسی لباس میں تھا جو میں نے غائب ہونے

والے دن پہنا ہوا تھا۔“

”پتا بتاؤ۔“ پال نے کہا تو کیتھی نے اسے بروئکس کی اس عمارت کا پتا بتا دیا جہاں ٹام اسے لے گیا

تھا۔ کال بند کر کے کیتھی نے ایک ریٹائٹ اے کار پر اپنی کاررو کی اور اپنی کار وہیں پارکنگ میں چھوڑ کر اس نے

ایک چھوٹی کنورٹبل کرائے پر لی اور اس میں بروئکس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے عمارت تلاش کرنے میں

دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گرے رنگ کی سیلپس سے بنی یہ عمارت واقعی کچھ پر اسرار سی تھی۔ اس میں اوپر منزل پر

دو کھڑکیاں تھیں اور نیچے بڑا سالوے کا دروازہ تھا۔ مگر اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ کیتھی عمارت کے سامنے سے گزر گئی

اور اس نے کار کچھ دور لے جا کر روکی اور عقبی آئینہ اس

طرح سیٹ کیا کہ اسے عمارت کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا پھر اس نے نام کو کال کی۔

”میں اس عمارت کے پاس ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ مضطرب ہو گیا۔ ”وہاں جانا خطرناک

ہوگا۔“

”نام میں جانا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ان لوگوں نے مجھے کس طرح سے استعمال کیا ہے۔ اگرچہ مجھے کسی قدر اندازہ ہو رہا ہے لیکن میں اس کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے لیفٹیننٹ پال کو بھی اس عمارت کے بارے میں بتایا ہے شاید وہ یہاں آئے۔“

”میرا نہیں خیال کہ اسے یہاں سے کچھ ملے گا۔ انہوں نے سب صاف کر دیا ہوگا۔ کیتھی تم وہاں سے نکل آؤ۔“

”او کے لیکن میں کچھ دیر یہاں رکوں گی۔“ کیتھی نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ لیفٹیننٹ پال کچھ کرتا ہے یا نہیں؟ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس بات کو اہمیت دیتا لیکن اگر وہ یہاں آتا تو کچھ نہ کچھ ہوتا۔ کیتھی کے ذہن میں رہ رہ کر اس گول چہرے والے شخص کا خیال آ رہا تھا جو گول فریم والی عینک لگاتا تھا۔ کیتھی کو لگ رہا تھا کہ وہ شخص اس کا جانا پہچانا ہے۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اسے یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک گھنٹہ کے گزرنے کے بعد یہاں سے چلی جائے گی۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا، نہ پال آیا تھا اور نہ ہی عمارت میں کسی کی آمد و رفت ہوئی تھی۔ اس نے روانگی کے ارادے سے ہاتھ اکٹیشن پر بڑھایا تھا کہ ایک کار آ کر عمارت کے سامنے رکی اور اس سے دو افراد اترے۔ ایک نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور دوسرے نے صرف ڈریس شرت اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ کیتھی نے پلٹ کر دیکھا۔ ان میں سے ایک شخص اسے جانا پہچانا لگا جس نے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ تالا کھول کر وہ دونوں اندر چلے گئے۔

کیتھی کچھ دیر ہچکچاتی رہی۔ پھر وہ گاڑی سے اتری اور عمارت کی طرف بڑھی۔ دیوار کے ساتھ چلتی وہ دروازے تک آئی۔ یہ دوپٹ والا دروازہ تھا جس پر بہت موٹا فولادی کنڈا تھا اور اس میں فکس ہو جانے والا تالا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا تھا۔ کیتھی نے اندر جھانکا تو اسے تاریکی دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو اس نے دیکھا یہ بڑا

ساہل تھا۔ وہ اندر آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ ایک طرف قطار میں کمرے تھے اور آخری حصے میں لکڑی اور لوہے سے بنی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ یہ ظاہر یہ جگہ کوئی گودام لگ رہی تھی۔ ایک طرف گتے کے کھلے کارٹنوں کا ڈھیر تھا۔ کیتھی دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف آئی۔ اوپر روشنی جھلک رہی تھی پھر اس نے بات کرنے کی آواز سنی مگر الفاظ واضح نہیں تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ اس نے پرس سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

اوپر سیڑھیاں ایک چھوٹے ہال میں نکلی تھیں اور اس کے چاروں طرف کمرے بنے تھے۔ یہاں فرش نہایت سفید تھا اور دیواروں پر سفید چمکتا رنگ تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور آواز اسی سے آرہی تھی۔ کیتھی نے دبے قدموں آ کر اندر جھانکا تو وہ دونوں کچھ سامان گتے کے کارٹنوں میں ڈال رہے تھے۔ کمرے کا ظاہر کسی اسپتال کا لگ رہا تھا وہاں مخصوص طبی مشینری، ایک بیڈ، دواؤں کے خانی ڈبے اور شیشیاں، ڈرپ اسٹینڈ اور دوسری اشیا۔ کے ڈھیر تھے ان میں سرنجیں بھی شامل تھیں۔ مگر یہ جدید ترین بغیر سوئی کی سرنجیں تھیں جو دباؤ سے دوا جسم میں انجیکٹ کرتی تھیں اور ان سے جسم پر کوئی نشان نہیں آتا تھا۔ سوٹ پوش ایک طرف کھڑا تھا اور دوسرا کام کر رہا تھا۔ ایک بار پھر کیتھی کو احساس ہوا کہ وہ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔ اس نے پستول آگے کیا اور اچانک دروازے سے اندر آئی۔

”خبردار... حرکت مت کرنا دونوں ہاتھ اوپر کرلو۔“ ان دونوں نے ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔ سوٹ پوش بولا۔ ”کیتھی تم...؟“

اس بار کیتھی نے اسے پہچان لیا۔ ”نک کلین یہ تم ہو۔“ نک کلین بینک کے ری کوری ڈیپارٹمنٹ کا اتھارٹ تھا اور کیتھی کی دو تین بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آرام سے کیتھی، پستول نیچے کرلو۔“

”بکو اس مت کرو۔“ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”مجھے بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟“

”بے بی میں بتاتا ہوں۔“ عقب سے ایک آواز آئی اور کوئی سرد چیز اس کی گردن سے لگی۔ ”حرکت مت کرنا یہ زیادہ خطرناک پستول ہے۔“

”کیونکہ یہ سرکاری ہے۔“ کیتھی نے تلخی سے کہا۔

”ہاں۔“ لیفٹیننٹ پال نے کہتے ہوئے اس سے پستول چھین لیا۔

نک اور اس کے ساتھی نے سکون کا سانس لیا۔

بولے۔ ”آفسیر تم بروقت آئے۔“
 ”ہاں تم لوگوں نے اب تک یہ سب صاف نہیں کیا تھا؟“ پال نے کہا اس کے لہجے میں کھٹکتی تھی۔
 دس منٹ بعد کیتھی چھوٹے ہال میں ایک کرسی سے بندھی بیٹھی تھی۔

”تم ان مجرموں کے ساتھی ہو۔“ کیتھی نے پال کی طرف دیکھا۔ ”تم قانون کے محافظ ہو کرو۔۔۔“
 ”خیالی باتیں مت کرو۔“ پال نے نرمی سے کہا۔ ”حکومت مجھے جو تنخواہ دیتی ہے اس سے دس گنا زیادہ مجھے یہ لوگ دے رہے ہیں۔“

کیتھی نے گہری سانس لی۔ یہ بحث فضول تھی اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ ”اب میرے ساتھ کیا ہوگا اور اس سے پہلے میرے ساتھ یہاں کیا ہو چکا ہے؟“
 ”نک نے اسے گھور کے دیکھا۔“ کیا تم کو کچھ یاد نہیں ہے؟“

”نہیں اگر مجھے یاد ہوتا تو میں پولیس کو بتا نہ چکی ہوتی۔“
 ”تم نے تو تین لاکھ ڈالر کی بھاپ بھی نہیں نکالی۔“ پال مسکرایا۔

”یہ بھی میرے خلاف سازش ہے۔“ کیتھی نے کسماتے ہوئے کہا اور نک سے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر ہے کیا اس میں بینک کے لوگ بھی ملوث ہیں۔“
 ”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ پال نے کہا۔ ”جو شخص اس سارے قصے کے پیچھے ہے وہ جلد یہاں آنے والا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“
 ”میں نے کہا نا وہ جلد آنے والا ہے تم اسے دیکھ لو گی۔“ کیتھی کو احساس ہو رہا تھا وہ بہت بری طرح پھنس چکی ہے۔ اس نے جلد بازی سے کام لیا اور خود اس چوہے دان میں چلی آئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ سوائے ٹام کے، لیکن وہ خود زخمی تھا۔ یہ لوگ اسے ٹھکانے لگانے والے تھے۔ اس نے پال کی طرف دیکھا۔ ”مجھے مار دیا جائے گا؟“

”اس کا فیصلہ پاس کرے گا۔“ نک نے کہا۔
 کیتھی سوچنے لگی کہ پاس کون ہو سکتا تھا؟ اسے رہ رہ کر گول چہرے والے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا جو اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد نیچے تیل بجنے کی آواز آئی اور نک کا سامھی نیچے چلا گیا۔ چند منٹ بعد کوئی اس کے ساتھ آیا اور جب وہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا تو کیتھی گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ سام باب تھا۔ ڈیٹی براؤن

نیچر، گول چہرے والا شخص وہی تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ریم کیس بینک لگاتا تھا جب کہ ٹام کو ہار کرتے ہوئے اس نے حلیہ بدلنے کے لیے گول فریم کی بینک لگائی تھی اور اس کی شخصیت یقیناً بدل گئی ہوگی۔ کیتھی نے طنزیہ انداز میں پال کی طرف دیکھا۔ ”بس تم ہی باہر کے آدمی ہو باقی سب تو بینک کے لوگ ہی نکل رہے ہیں۔ کیا یہی پاس ہے؟“

”پاس آنے والا ہے۔“ سام نے اسے آگاہ کیا۔
 ”کیا تم مجھے بتانے کی زحمت کرو گے کہ یہ چکر کیا ہے؟“ کیتھی نے سام سے پوچھا۔

”چکر بہت سادہ ہے۔“ سام نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں بہت پاپڑیلے پڑے۔ تم جانتی ہو تمہارے پاس آنے والے لوگ کروڑ پتی ہوتے ہیں۔“

کیتھی نے گہری سانس لی۔ ”تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ سارا چکر ان اکاؤنٹس کا ہے۔“
 ”بالکل، کیونکہ ان میں موجود رقم دس بلین ڈالر کے لگ بھگ تھی اور یہ بہت بڑی رقم ہے۔“

کیتھی چونکی۔ ”تھی... کیا مطلب؟“
 ”مطلب واضح ہے اب یہ رقم ان اکاؤنٹس میں نہیں ہے لیکن اس کا پتا اس وقت چلے گا جب سرمایہ کاروں کو نوٹ دینے کا وقت آئے گا۔“

”تم لوگوں نے یہ رقم کہاں اور منتقل کر دی؟“ کیتھی نے بے یقینی سے کہا۔ ”لیکن یہ ناممکن ہے۔“
 ”اسی ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے ہم نے یہ سب کیا ہے۔“ اکاؤنٹس تک رسائی صرف تمہارے پاس تھی۔ بینک کا کوئی اور شخص ان اکاؤنٹس تک رسائی نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے تمہیں اغوا کر کے یہاں لایا گیا۔ ایک خاص دوا کے زیر اثر جس کے تحت تم دیئے جانے والے ہر حکم کی تعمیل کرتی اور تم نے کی اور اب تم یہاں چلی آئیں۔“

”اس دوران میں دوا کے زیر اثر رہی؟“
 ”صرف چوبیس گھنٹے، اس کے بعد اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔“ سام نے سر ہلایا۔ ”بہر حال اکاؤنٹ ایکسیر کا کام تم ہوش میں رہ کر ہی کر سکتی تھیں۔“

”تمہارا مطلب ہے میں جاگ گئی تھی؟“
 ”بالکل... ورنہ تم اکاؤنٹس تک رسائی کیسے دیتیں؟“

”میں نے ایسا کیا؟“
 ”بالکل کیا۔“ سام بولا وہ کسی قدر اضطراب سے اس

سے اس پاس شل رہا تھا۔
 ”میں نہیں مان سکتی۔“

سام اس کے پاس آیا اور کسی قدر جھک کر بولا۔ ”اگر چار پانچ وحشی قسم کے مرد تم سے مسلسل زیادتی کریں، ساتھ ہی وہ تم پر ناقابل برداشت تشدد کریں، تمہیں کاٹیں، جھینیں، داغیں، تمہاری کھال اتاریں، تمہارے بال جلا دیں، تمہاری آنکھیں نکال دیں تمہارا چہرہ بگاڑ دیں تو کیا تم بات ماننے سے انکار کرو گی؟“

کیتھی سن کر لرز اٹھی تھی۔ ”ہرگز نہیں۔“
 ”اس وقت بھی تم نے یہی کہا تھا۔“ سام مسکرایا۔
 کیتھی نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے رقم ٹرانسفر کی جا چکی ہے اور وہ یقیناً آف شور بینک اکاؤنٹس میں جا چکی ہو گی لیکن مجھے کیوں پکڑا گیا ہے۔“

”تمہیں پکڑنا تھا کیونکہ تم ان اکاؤنٹس کی نشان دہی کر سکتی ہو، اب تم غائب ہو جاؤ گی اور سارا الزام تم پر آئے گا کیونکہ تمہارے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا ہے۔“

کیتھی کا جسم سن ہو گیا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ رہی تھی ہمیشہ کے لیے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ اسے مار کر اس کی لاش کہیں چھپا دی جائے گی یا ضائع کر دی جائے گی تاکہ پولیس کے ریکارڈ میں وہ ہمیشہ مفرد رہے۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے... پولیس یا ایف بی آئی لازمی تفتیش کرے گی اور چوری شدہ رقم کا سراغ لگا لیا جائے گا۔“

”میں نے کہا نا فی الحال تو رقم کی کم شدگی کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ وہ بینک کے کھاتوں میں درج نہیں ہے دوسرے تفتیش کے تمام سرے تمہاری طرف جائیں گے اور تم کسی کے ہاتھ نہیں آؤ گی۔ جب تک یہ بات کھلے گی رقم ان اکاؤنٹس سے نکالی جا چکی ہوگی۔“

کیتھی نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ ان کا سرغندہ جبرسن ہے۔ ایک تو سرمایہ کاری کی یہ ساری اسکیم اور اس کا سیٹ اپ اس کا بنایا ہوا تھا دوسرے وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا عادی تھا جیسا کہ ٹام نے نقاب پوش پاس کے بارے میں بتایا تھا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ تیل بجی اور وہ سب الرٹ ہو گئے۔ نک کا آدمی نیچے گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے پیچھے ایک نقاب پوش تھا لیکن نقاب پوش کے پیچھے ٹام کو دیکھ کر سب کے ہتھیار نکل آئے تھے۔ مگر نشانے پر ان کا پاس تھا، ٹام اس کے پیچھے تھا۔ اس نے خبردار کیا۔ ”اگر کسی نے گولی چلائی تو

پہلے یہ میرے گا۔“
 سب کے ہاتھ رک گئے تھے۔ پال نے پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”سب سے پہلے تو تم سب اپنے ہتھیار چھینک دو، کوئی چالاکی مت دکھانا میں تم میں سے کسی کی آنکھ کا نشانہ بھی لے سکتا ہوں۔“ ٹام نے کہا تو کیتھی کا دل خوشی سے بھر گیا تھا، اس کی آنکھ بھی بھر آئی تھی کیونکہ اسے سب دھندلا نظر آ رہا تھا۔ نک کا سامھی پہلے ہی نہبتا تھا۔ نک نے بہادری دکھانے کی کوشش کی جو اسے مہلتی پڑی تھی۔ ٹام کے پستول سے نکلی گولی نے اس کی کلائی توڑ دی تھی۔ یہ دیکھ کر پال اور سام نے فوراً اپنے ہتھیار چھینک دیے تھے۔ پال نے کہا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“
 ”سب اس کمرے میں چلے جائیں اور ہاں تم اسے کھولو۔“ اس نے نک کے سامھی کو حکم دیا۔ اس نے کیتھی کو آزاد کیا تو اس نے سب سے پہلے ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کیا، اس کا پستول پال کے پاس تھا۔ اس نے وہ بھی نکلوا لیا۔ ٹام نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔ ”پولیس کو کال کرو۔“

”نہیں۔“ پال کرہا اور سام کا چہرہ سفید پڑ گیا البتہ پاس کے تاثرات نقاب تلے چھپے تھے۔ پولیس کو کال کر کے کیتھی پاس کی طرف بڑھی اور اس نے نقاب نوج لیا مگر خلاف توقع نیچے سے جبرسن کے بجائے مک براؤن نکلا۔ اس بینک کا منیجر۔ کیتھی نے گہری سانس لی۔

”یہ تو سارے میرے ہی سامھی نکلے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنے مجرم ذہن کے ہوں گے۔“
 ”دولت چیز ہی ایسی ہے۔ اچھے اچھوں کو بے ایمان کر دیتی ہے۔ مگر اب یہ سب جیل جائیں گے۔“ ٹام نے کہا تو مک براؤن زہرے لہجے میں بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے تم بچ جاؤ گے۔“
 ”ہاں یہ بچ جائے گا جب میں پولیس کو بتاؤں گی کہ میری جان اسی نے بچائی اور اسی کی وجہ سے تم سب جیل جاؤ گے۔ اگر اسے سزا بھی ہوئی تو بہت معمولی سی ہوگی۔ یہ زیادہ عرصے جیل میں نہیں رہے گا لیکن تم سب کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ تم لوگ جیتے جی جیل سے باہر نہیں آؤ گے۔“

پولیس سائرن کی آواز سے ان کے چہروں کا رہاسہا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔

2014 اپریل 67

سپینس ڈائجسٹ

2014 اپریل 66

سپینس ڈائجسٹ

2014 اپریل 66

سپینس ڈائجسٹ

بسی رندار

طاہر جاوید نسل

تیرا حصہ

عکس منظر کا ہویا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سناٹے کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی اذیتوں میں کمی آتی ہے۔ ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور پل پل دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو برباد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا جتن تھا جیک کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پہیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کر کے لفظ بہ لفظ اسے کھوجتے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زندان میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترنا چاہتا تھا مگر... حدود و قیود کا حامی آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں بے بسی تے اسے آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گہیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کریں رہ عمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کر دیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

دیار غیر میں اپنوں سے دور کی اپنے کی

تلاش میں سرگرداں محبتوں کی کرم

فرمائیاں اور رقیبوں کی

عنایتوں کی

داستان



نیووی لکڑی کی ایندھن کی سہولت موجود ہے
ماؤنڈ سسٹم اور جلد مارکیٹ کی سہولت موجود ہے
تجربہ کارانہ فرسٹ کی جانی ہے
دور دراز ہرنی پور

”میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید مسز حجاب کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ ہے جس کی وجہ سے ارم یہ بات مجھ سے کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ دیکھیں یہ بات بھی غلط ہے کہ میں ارم سے رقم لے کر یہ کام کر رہا ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے ہمارے درمیان۔۔۔“

گلزار کی آنکھوں میں عیاری تھی۔ اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا اور ہادی کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ آدھا سچ بول رہا ہے بلکہ شاید چوتھائی سچ۔ وہ حجاب کو پھنسانے میں ارم کا ساتھی بنا ہوا تھا اور کرائے کے کارندے والا کردار ادا کر رہا تھا۔ بہر حال ہادی اس حوالے سے گلزار کے ساتھ کسی لفظی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا اولین مقصد یہی تھا کہ گلزار اپنا منہ بند رکھے اور حجاب کے خلاف کوئی ایسی ویسی بات ارم کے کانوں تک نہ پہنچائے۔ اس نے سافٹ ڈرنک کے دو گلاس بھرے۔ ایک گلزار عرف گلزاری کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو، میں تم سے سچ بولنے کی توقع کر رہا ہوں، کیونکہ ”تمہارا سچ“ ہی ہمارے تعلق کو آگے بڑھائے گا۔ جھوٹ بولو گے تو وہ چھپا نہیں رہے گا اور تم اس مصیبت سے نکل نہیں سکو گے۔ میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم ارم چودھری کو کیا بتا چکے ہو؟“

”کس بارے میں؟“

”میرے اور حجاب کے بارے میں۔“ ہادی نے صاف سیدھے الفاظ میں کہا۔

وہ ڈرنک کا گھونٹ لے کر بولا۔ ”ابھی تک تو کچھ نہیں کیونکہ ابھی مجھے آپ کے پورے کوائف نہیں ملے تھے۔ لیکن آج رات کسی وقت میں نے اسے فون کرنا تھا۔“

ہادی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اسے اندازہ ہوا کہ اس بار گلزار شاید سچ بول رہا ہے۔ اس نے گلزار سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کوائف سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

وہ بولا۔ ”آپ کا نام تو مجھے معلوم ہو گیا تھا اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ آپ پاکستانی ہیں لیکن مجھے مزید تفصیل چاہیے تھی۔ ممکن ہے کہ جس طرح آپ نے لابی میں آکر مجھ سے بات کی، میں بھی کوئی ایسی ہی کوشش کرتا۔“

ہادی نے اس سے دو چار سوالات مزید کیے اور اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک گلزار نے واقعی ارم کو اپنی کارکردگی سے آگاہ نہیں کیا۔ یہ خوش آئند تھا۔ گلزار سے سودے بازی ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔ اور ہادی سودے بازی کی بہترین پوزیشن میں بھی تھا۔ گلزار اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈپٹی ہاشم ایرک

کمرے سے باہر موجود ہے اور ہادی کے ایک اشارے پر دوبارہ کمرے میں آجائے گا۔ اس کے بعد وہی جھکڑی کی کھڑکھڑاہٹ اور پولیس کار کا پُر خطر سائرن۔۔۔۔۔ اگلے بیس پچیس منٹ میں ہادی اور گلزار کے درمیان کافی کچھ طے ہو گیا۔ گلزار نے ہادی کو یقین دلایا کہ وہ حجاب اور ہادی کے میل ملاقات کے سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھے گا۔ دوسری طرف ہادی نے گلزار کو گارنٹی دی کہ ڈپٹی ہاشم اس کی جان چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی کارروائی کو یہیں روک دے گا۔ اس کے علاوہ ہادی نے گلزار کو یہ بھی یقین دلایا کہ ارم کو یہاں ہونے والی ڈیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ گلزار اپنا پستول واپس حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جب ہادی نے فون پر ہاشم سے رابطہ کیا تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ گلزار کو پستول کے حوالے سے کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا۔

ہادی اب تک یہ بات بڑی اچھی طرح جان چکا تھا کہ گلزار ہر لحاظ سے ایک حریص اور مطلب پرست شخص ہے۔ کرایے کا ایک ایسا ٹھو جو رقم کے عوض کسی کے پیچھے بھی دم ہلا سکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک عورت یا شخص تھا اور اپنی دلپسند ضروریات کے لیے اسے دافر رقم کی ضرورت رہتی تھی۔ ہادی نے اس کی اس دکھتی رگ پر بھی ہاتھ رکھا۔ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”گلزار! میں یاروں کا یار ہوں۔ دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔“

وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ ”ابھی تک تو نقصان ہی نظر آ رہا ہے ہادی صاحب۔“

”کیا مطلب؟“

”یار! اگر پستول نہیں تو وہ میرا فون اور کیش ہی ہاشم صاحب سے واپس لے دیں۔ وہ اپنے ان 270 یورو کی بات کر رہا تھا جو تلاشی کے دوران میں شہادت اور ثبوت کے طور پر ڈپٹی ہاشم کے پاس گئے تھے۔“

ہادی نے کہا۔ ”موبائل فون تمہیں واپس لے دیتا ہوں لیکن ان 270 یورو پر خاک ڈالو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے دراز سے چند سوئس فرانک کے نوٹ نکالے اور گلزار کے حوالے کر دیے۔ اس نے سوئس فرانک دیکھے اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ قریباً 1500 یورو کے تھے، ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے قریب۔

”لیکن ہادی صاحب۔۔۔۔۔“

”لیکن کچھ نہیں یار، رکھو انہیں۔۔۔۔۔ ملتے رہو گے تو

جیب فل گرم ہو جائے گی تمہاری۔“

گلزار کے چہرے پر تشکر کے جذبات ابھرے لیکن اس تشکر میں ایک طرح کا کمینہ پن بھی شامل تھا۔ اس نے بس تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد فرانک اپنی جیب میں رکھ لیے۔ ان کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہو گیا۔ ہادی نے اسے بتا دیا کہ وہ اس ہونٹ میں مزید آٹھ دس دن قیام کا ارادہ رکھتا ہے۔

بھاری رقم نے گلزار کی بولتی بند کردی تھی۔ وہ ہادی کی باتوں کے جواب میں بس جی جی کہتا جا رہا تھا، ایک دم مرعوب نظر آ رہا تھا۔ اس ملاقات کا اختتام ہادی کی مرضی کے عین مطابق ہوا۔

☆☆☆

ارم بہت بے چین ہو رہی تھی۔ وعدے کے مطابق آج رات گلزار اسے بہت خاص اطلاع دینے والا تھا۔ اس نے پرسوں بتایا تھا کہ حجاب ہونٹ واسکوڈے میں گئی تھی اور کافی دیر وہاں رہی تھی۔ پھر کل بھی گلزار کی مختصر سی کال آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کارروائی خاصی آگے بڑھی ہے، وہ چوبیس گھنٹے میں تفصیلی اطلاع دے گا۔ اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ وہ بڑا لالچی تھا۔ اگر واقعی کوئی اہم اطلاع تھی تو اس نے اطلاع سے پہلے اپنی تنگ دستی کا رونا رونا تھا۔ بہر حال کوئی اچھی اطلاع ارم کے لیے نعمت ثابت ہو سکتی تھی۔ شام ہی سے ارم بہت ”ایکسائٹڈ“ تھی۔ وہ پہلے فلور پر جلال کے ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔ ایسا کر کے اسے گونا گوں اطمینان ہوا تھا۔ اس اطمینان میں کسی حد تک جیت کا احساس بھی شامل تھا۔ اسے پتا تھا کہ حجاب کو جب اس صورت حال کا علم ہوگا تو اس کو شدید کڑھن ہوئی ہوگی۔ یہی کڑھن ارم کے اطمینان کا باعث تھی۔ اب یہ اطمینان ایک پائیدار خوشی میں ڈھل سکتا تھا۔۔۔۔۔ اگر گلزار واقعی اچھی خبر سنا دیتا تو۔

گلزار کا فون دس بجے کے لگ بھگ آیا۔ ارم ڈنر سے فارغ ہوئی ہی تھی۔ جلال کو آج کافی دیر سے لوٹا تھا۔ وہ فون سنتی ہوئی کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”ہیلو سسٹر! کیا حال ہے؟“ گلزار کی آواز سنائی دی۔ ارم کو فوراً محسوس ہوا کہ اس کی آواز میں کوئی خاص ترنگ نہیں ہے۔

”میں ٹھیک ہوں گلزاری۔ کیا نیوز ہے تمہارے پاس؟ کافی انتظار کے بعد فون آیا ہے تمہارا۔“

”نیوز۔۔۔۔۔ تو کوئی۔۔۔۔۔ بہت خاص نہیں سسٹر۔۔۔۔۔ لیکن جلد ہی کوئی نہ کوئی ملے گی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم تو کل بڑے جوش میں تھے۔ کیا پتا چلا حجاب کا؟“

گلزاری نے ایک لمبی سانس لی۔ ”وہ۔۔۔۔۔ میں نے پوری معلومات لے لی ہیں۔ دراصل حجاب صاحبہ کی ایک پرانی نیچر جو پاکستان چلی گئی تھی سیرپائے کے لیے روم آئی ہوئی ہے۔ ساتھ میں اس کامیاں اور دو بچے بھی ہیں۔ ہونٹ واسکوڈے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ حجاب پرسوں ان سے ہی ملنے گئی تھی۔ کل انہوں نے نیکی پر تھوڑی سی سیر بھی کی ہے۔ میرے خیال میں کل تک وہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔“

ارم نے مایوسی سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ عجب واہیات ہوئے۔ وہ کیا کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا جو ہا۔۔۔۔۔ یا پھر تم چالاکا دکھا رہے ہو۔ مجھ سے یورو اٹھنے کے لیے تم نے خواخواہ سسپنس کھڑا کیا۔“

”تمہارے سر کی قسم سسٹر۔۔۔۔۔ غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہی تمہیں بتایا تھا۔ جمعرات کے دن حجاب کوئی ڈیڑھ گھنٹا ہونٹ کے کمرے میں رہی۔ اس وقت پتا نہ چلا کہ کمرہ کون سا ہے۔۔۔۔۔“

”اور تم اتنے بڑے کمینے ہو کہ خبر پوری ہونے سے پہلے ہی آدھے پیسے وصول کر لیے۔۔۔۔۔ تم کسی کام کے نہیں ہو گلزاری۔ خواخواہ میرا وقت برباد کرتے ہو۔ اب دھیان سے سن لو۔ جب تک کوئی کام کی خبر نہ ہو میرے کان مت کھانا۔ کوئی ضرورت نہیں فون کرنے کی۔“

”لیکن سسٹر۔۔۔۔۔“

”بائے۔“ ارم نے کہا اور فون بند کر کے بستر پر پھینک دیا۔ یہی وقت تھا جب جلال کی والدہ آپا خانم اندر داخل ہوئیں۔ وہ بڑے ڈیل ڈول کی تھیں۔ ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ ”خلیث کو اب زبان چلانا بھی آگئی ہے۔ پتا نہیں کہ بڑوں سے کس طرح بات کرتے ہیں۔ سچ کہیں کی۔“

”کیا ہوا آپا خانم؟ کس کی بات کر رہی ہیں؟“ ارم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ابھی حجاب کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ یہ کمرہ کیوں لیا ہے ارم نے۔ کیا اتنے بڑے گھر میں کوئی اور کمرہ ہی نہیں تھا۔ مجھے الزام دے رہی تھی کہ میں نے تمہیں یہ کمرہ دیا ہے۔ میں نے بھی کھری کھری سنائی ہیں۔ بد لحاظ کہیں کی

شرم نہیں آتی۔“
آپا خانم غصے سے کانپ رہی تھیں۔ ارم نے جلدی سے انہیں پانی پیش کیا۔ ”لیس یہ پانی پئیں۔۔۔۔۔ کول ڈاؤن ہو جائیں۔ آپ کا پی پی پہلے ہی اپ سیٹ ہے۔“
آپا خانم نے پانی لیا۔ پھر ذرا ٹھہری ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ وہ باغیچے کی طرف والا کمرالے لو، بڑا بھی ہے۔ تم بھی اپنی بات پر اڑی رہیں۔“
ارم نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ”آپا خانم! آپ اس طرح کیوں سوچ رہی ہیں۔ آپ مالکن ہیں اس گھر کی۔ آپ کا اختیار ہے۔ اسے شرم آتی چاہیے کہ اتنی سی بات کا بیگنہ بنا رہی ہے۔“
”اس کی جرأت بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی جلال آتا ہے تو بات کرتی ہوں اس سے۔“ آپا خانم نے کہا۔

☆☆☆
وہ بڑی چمکیلی صبح تھی۔ چمکیلی اور خوشگوار۔۔۔۔۔ روم اپنی تمام تر شان و شوکت اور تاریخی دیدہ بے کے ساتھ حدنگاہ تک ہادی کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ ہادی ہوٹل کے دسویں فلور کی ایک بالکونی میں کھڑا محو نظارہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حجاب کا انتظار بھی کر رہا تھا۔

ایک جادو سا ہو گیا تھا اس پر۔۔۔۔۔ ونس کی وہ پہلی رات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود اس لڑکی کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہادی کے لیے صرف دوستانہ جذبات رکھتی ہے۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سراسر آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کو اس بے سمت سفر سے روک نہیں پار رہا تھا۔ بس مسکراہٹ میں لپٹے سفید موتیوں کی بے مثال قطار اس کی آنکھوں میں چمکتی رہتی تھی اور ایک حسین پیشانی جس پر چاند اور سورج اپنا عکس دکھاتے تھے۔ اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگا۔۔۔۔۔ کیا واقعی وہ محبت میں گرفتار ہو چکا ہے؟ اس کا جواب اثبات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ غور کرنے لگا۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ اپنے لیے مشکل ترین راستے ڈھونڈتی ہے۔ مستقبل کی مضبیتیں اور نا کامیاں اپنی آنکھوں کے سامنے صاف صاف دیکھتی ہے لیکن پھر بھی انسان کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ بے منزل راستے، اونچی دیواریں اور بند گلیاں اسے روک نہیں سکتیں۔ ہادی کو آج تک محبت نہیں ہوئی تھی اور جب ہوئی تو کہاں ہوئی۔ اسے اس بے ڈھنگے پن پر رونا آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔

ہادی عام شاعروں کی طرح صرف شاعر ہی نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط شخص بھی تھا۔ دنیا میں رہنا اور اس کی مشکلات سے عہدہ برا ہونا جانتا تھا۔ کل شام اس نے بڑی ہمت سے حجاب کے راستے کا ایک کاٹنا صاف کر دیا تھا۔ اس کاٹنے کا نام گلزار تھا۔ وہ مزید کاٹنے صاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ لیکن یہ پتا بھی تو چلتا کہ مستقبل میں حجاب کے ارادے کیا تھے۔ وہ اس معاملے کو کہاں تک لے جانا چاہتی تھی۔ یا کہاں تک لے جاسکتی تھی۔

ہادی صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر جو کچھ سوچ رہا ہے اور کر رہا ہے وہ غلط ہے۔ وہ میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے ایک تنازعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے ماحول کی شدید محسوس کے نتیجے میں ایک لڑکی کے اندر مزاحمت کی ایک چنگاری پیدا ہوئی تھی۔ ہادی اس چنگاری کی روشنی میں اپنا راستہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ کیا ایسا کرنا مناسب تھا یا پھر ہادی کو کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔ حجاب کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ اس چنگاری کو شعلہ نہ بننے دے۔ اپنے حالات کو سمجھانے کی کوشش کرے۔

وہ سگریٹ پھونکتا رہا اور نیچے ہوٹل کے پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھتا رہا جہاں کے دائیں کنارے سے حجاب کو نمودار ہونا تھا۔ وہ وقت کی پابند تھی۔ آج بھی اس نے یہی ثابت کیا۔ ہادی کے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔ وہ آ رہی تھی، دلکش چال متوازن قدم۔۔۔۔۔ جیسے کسی ساحل کی ہوا بڑے ہموار طریقے سے بہہ رہی ہو۔ وہ پہلے کی طرح ایک براؤن چادر میں لپٹی لپٹائی ہوئی تھی۔ نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اس چادر میں خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے گرد سازش کا ایک جال موجود ہے۔

ہادی پہلے سے تیار تھا۔ وہ لفٹ سے نیچے آیا۔ دونوں لابی میں ملے اور پھر مین روڈ کی طرف بڑھ گئے۔ ”بس آج آخری دن ہے۔“ وہ بولی۔ ”جی بھر کر گھوم پھر لیجیے۔“
”آپ شروع میں ہی مزہ کر رہی ہیں۔ کچھ اچھی اچھی باتیں بولیے۔“ ہادی نے کہا۔
”یہ اچھی بات ہی تو ہے کہ ہم آج سارا دن ساتھ رہیں گے۔“

”لیکن آپ یہ بھی تو کہہ رہی ہیں کہ پھر نہیں آئیں گی۔“
”آپ گلاس کو آدھا خالی کیوں کہہ رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہہ رہے کہ آدھا بھرا ہوا ہے۔“

”لیکن میں اس کو پورا بھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”کہیں، اپنی اس گائڈ کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دیجیے گا۔“
”فکر نہ کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اور آپ گائڈ نہیں ہیں، ہماری ہیں۔ بہت بھروسہ اور مہربان ہماری ہیں۔۔۔۔۔ میں آپ کو۔۔۔۔۔ تا دیر بھول نہیں پاؤں گا۔“
”میں بھی آپ کو یاد رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ کچھ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔“
”گزر رہا نہیں ہے۔۔۔۔۔ گزر رہا ہے۔ آپ الفاظ کے پیر پھیر سے مجھے یہ نہ سمجھائیں کہ آج آخری ملاقات ہے۔ بالکل نہیں۔“

وہ ہنسنے لگی۔ وہ میٹروٹرین میں بیٹھے۔ ہادی کی نگاہیں بار بار اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج پھر کوئی ان کے پیچھے تو نہیں ہے۔ دونوں عظیم الشان تاریخی ورثے کو یونیسکو کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ آثار قدیمہ میں حجاب کو گہری دلچسپی تھی۔ وہ جیسے ان میں کھوی جاتی تھی۔ یہ بھی اس کے اندر کی لطیف شخصیت اور اس کے سینے میں چھپی رومانیت کی طرف اشارہ تھا۔ وہ ہجوم میں چلتے کوئیسیم کے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھے۔ حجاب کے ساتھ ہجوم میں چلنا ہادی کو اچھا لگتا تھا۔ گا بے بگا ہے اس کا شانہ حجاب کے شانے سے بھڑ جاتا تھا، یا پھر اسے حجاب کا بازو تھامنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ مختصر سے لمس اس کے جسم میں ایک ایسی سنناہٹ جگاتے تھے جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

کوئیسیم سے باہر مقامی آرٹسٹوں نے زمانہ قدیم کے لشکریوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ انہوں نے آہنی خود اور زرہ بکتر وغیرہ پہن رکھی تھیں۔ ہاتھوں میں نیزے، ڈھالیں اور کمواریں تھیں۔ سیاح ان قدیم جنگجوؤں کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے۔ اس اسٹڈیم نما جگہ اٹھارے کو دنیا کے سات عجوبوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی بیرونی دیوار کا کچھ حصہ گزرتی صدیوں کے بوجھ سے منہدم ہو چکا تھا لیکن جو باقی تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یقیناً حجاب پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکی ہوگی لیکن وہ اتنی ہی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جتنی دلچسپی سے ہادی۔ اس کے پاس ایک سیاہ ڈائری بھی تھی جس میں کبھی کبھار وہ کوئی نوٹ لے لیتی تھی۔ اس بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ مقامی آثار قدیمہ کے بارے میں ایک آرکیکل لکھ رہی ہے اور شوقیہ قلم کار کی حیثیت سے ایک اخبار میں چھپوانا چاہتی ہے۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد وہ ایک طویل سرنگ نما راستے سے گزرے اور کوئیسیم کے اندر داخل

ہو گئے۔ ایک دور ہادی کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ گلیڈی ایٹر زکواریں اور نیزے سونت کر ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ ان کے جسموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ہر دو ”گلیڈی ایٹر“ کو ایک دوسرے سے لڑنا تھا یہاں تک کہ ایک ان میں سے مرجاتا۔ سیکڑوں تماشاخی زندگی اور موت کی اس لڑائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اپنے شور سے آسمان سر پر اٹھ رہے تھے۔ اور یہ۔۔۔۔۔ بھوکے شیروں کے مناظر تھے، جو بد قسمت غلاموں اور قیدیوں پر جھپٹ رہے تھے، انہیں چیر پھاڑ رہے تھے اور ان ہی جیسے انسان ٹھاٹ سے کرسیوں پر بیٹھے یہ درندگی ملاحظہ کر رہے تھے۔ شہزادے شہزادیاں، حسینائیں، رنگ برنگے لباس، شراب کے جام، نقاروں کی دھما دھم، مختلف درندوں کی چنگھاڑیں اور ان کے درمیان بے بسی سے سسکتی دم توڑتی انسانیت، یہ قہار دم کا مشہور زمانہ جتنی اکھاڑا اور زندگی موت کے کھیل کی تماش گاہ۔

”آپ کا کیا خیال ہے ہادی! ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انسان ظلم کیوں کرتا ہے؟“
”اس لیے جب! کہ کوئی دوسرا انسان ظلم سہتا ہے۔“
ہادی نے پہلی بار اسے اس کے مختصر نام سے پکارا تھا، وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی لیکن اس حوالے سے بولی کچھ نہیں۔ ہادی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مظلوم کبھی بھی ٹھنڈے بیڑوں ظلم برداشت نہیں کرتا۔ وہ ظالم سے ٹکرانے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہے، کچھ مہلت مانگتا ہے۔۔۔۔۔ مگر اکثر یہ مہلت اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ظلم سہنا مظلوم کی عادت بن جاتا ہے۔“

”اور یہ بھی تو ہوتا ہے ہادی، کہ ظالم اپنے ظلم کی کڑوی گولی کو مختلف شکر میں لپیٹ دیتا ہے۔ کبھی اس پر رسم و رواج کی شکر چڑھاتا ہے کبھی مذہب کی اور کبھی معاشرے کی۔“
”ہاں یہ تو ہے۔ اس دن ہم یہی بات کر رہے تھے نا۔ اب دوسری یا تیسری شادی کی بات ہی کو لیں۔ اتنی تو بے قصہ کیسوں میں تو مرد کو نئی عورت کی خواہش ہی ہوتی ہے نا۔ تو کبھی پہلی عورت کی بے اولادی کا بہانہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس کی بیماری یا کم صورتی کا۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دق یا نوی ہے اور زندگی میں اس کے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔“

ہادی نے ایک گہری سانس لی اور ہلکے ہلکے انداز میں بولا۔ ”جلال صاحب سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں چل رہا آپ کا؟ میرا مطلب ہے کہ آج کل آپ ہم مردوں کے

خلاف بہت بول رہی ہیں۔“
 ”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میاں بیوی میں معمولی اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔“
 ہادی نے موضوع بدلا۔ ”یہ ارم صاحبہ آپ کی دیورانی فوزیہ کی چھوٹی بہن ہے نا۔“
 ”ہاں۔“ حجاب ذرا چونک کر بولی۔
 ”میں گھر میں ایک دو بار ملا ہوں اس سے۔ کافی ہوشیار لڑکی ہے۔ اپنی بڑی بہن سے بالکل مختلف۔ یہ آپ کے ذاتی معاملات ہیں، ایک بات کہوں اگر برا نہ مانیں تو۔“
 ”جی کیسے۔“
 ”اس لڑکی کی طرف سے بہت چوس رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بالکل اور طرح کا رنگ نظر آتا ہے۔“
 ”کیوں، کوئی خاص بات دیکھی آپ نے؟“
 ”نہیں جب! مگر یوں لگتا ہے کہ وہ لڑکی کچھ نہ کچھ خاص کرنے کی تاک میں رہتی ہے۔ میں نے ایک دو بار اسے جلال سے بات کرتے دیکھا ہے۔ ان سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز میں عجیب سی لگاوٹ آ جاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی نوٹ کیا؟“
 حجاب ذرا توقف سے بولی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ میرے خیال میں بے تکلفی سے بات کرنا اس کی عادت ہے۔ وہ اپنے جیباظمیر بھائی سے بھی ایسے ہی بات کرتی ہے۔ اکثر دیکھنے والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ خیر چھوڑیے اس موضوع کو۔ اب بتائیے کیا پروگرام ہے؟“
 ”کہیں کھانا شانا کھاتے ہیں۔“ ہادی نے کہا۔
 ”تو چلیے۔“ وہ بولی۔ وہ دونوں بیڑھیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باتیں کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف چل دیے۔ تاہم ہادی نے محسوس کیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے حجاب کو جو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے وہ اس نے محسوس کیا ہے۔ وہ باہر نکلے۔ یہاں چہل پہل تھی۔ ایک طرف ایک آرٹسٹ دیوار پر ”گرافٹی“ کر رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی پورٹریٹ بنانے میں مصروف تھا۔ کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ دیواروں پر ایسی مصوری اور خطاطی یہاں کا رواج تھا۔ ہادی نے کہا۔ ”دیکھیں حب! ایسی ہی ایک پورٹریٹ آپ کے گھر میں بھی لگی ہوئی ہے نا؟“
 حجاب کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا، جیسے ایک سایا سا۔ اس نے پہلی دفعہ بھی جب پورٹریٹ کا ذکر کیا تھا حجاب کے چہرے پر ایسا ہی تاثر آیا تھا۔ اس تاثر میں گہرا

اندوہ تھا۔ جیسے کسی نے بے دھیانی میں اچانک کسی زخم کو چھیل دیا ہو۔ وہ بس ایک ”ہوں“ کر کے خاموش ہو گئی۔
 ہادی کو افسوس ہوا کہ اس نے خواستخواہ پورٹریٹ کی بات کر دی۔
 حجاب کا موڈ بحال کرنے میں ہادی کو کم و بیش آدھ گھنٹا لگ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پاکستان کی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ اس کا موڈ بہتر کرنے کے لیے اس نے پیارے پاکستان کا سہارا ہی لیا۔ پاکستان کے گلی کوچوں کی باتیں، موسموں کی باتیں، تہواروں اور میلوں ٹیلیوں کی باتیں۔ نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں پھر ایک خوش نما خوشی چمکنے لگی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ پیدل ہی چل دیے۔
 اب تک ہادی کو یقین ہو چکا تھا کہ کوئی ان کے پیچھے نہیں ہے۔ دوسری طرف حجاب کے رویے سے بھی ظاہر تھا کہ اندرون خانہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ گلزار، گل ہونے والی ”ڈیل“ پر عمل کر رہا ہے۔
 وہ ایک آبی گزرگاہ کے کنارے ایک شاندار گراہی لان میں جا بیٹھے۔ یہاں ہوا چل رہی تھی اور سہ پہر کا سورج اپنی سنہری کرنیں بکھیر رہا تھا۔ حجاب کی چادر کے نقاب میں سے اس کے شہدرنگ بالوں کی ایک لٹ باہر نکل آئی تھی اور وہ اسے بار بار اندر گھسانے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے ہاتھ دوسرے سرخ و سپید پھولوں کی طرح تھے۔ وہ سوچنے لگا، محبت کیوں وہیں پر ہوتی ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ ان لمحوں میں اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس کی اس گواہی میں سورج کی سنہری کرنیں، ٹھنڈی ہوا، آبی گزرگاہ اور نیلا آسمان سبھی شامل تھے۔ وہ سوچنے لگا اگر ان لمحوں میں اس وقت وہ حجاب پر آشکار کر دے کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے تو اس کا رد عمل کیا ہو۔ وہ شاید ایک بار پھر وہی تیز دھار، زہریلا فقرہ کہے کہ ”آپ سب مرد بس ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، عورت کو بس ایک ہی زاویے سے دیکھتے ہیں۔“ اور اٹھ کر روم کی گلیوں میں نہیں گم ہو جائے اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔
 عین ان لمحوں میں لکڑی کے اسی بیچ پر بیٹھے بیٹھے حجاب بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ہادی کے پاس راحت سی ملتی تھی۔ جیسے کوئی بہت اپنا اس کے ساتھ ہو۔ اس کے دکھ درد میں شریک ہو۔ حجاب کے ذہن میں ایک شاعر کا تصور ایک دہلے پلے شخص کا تھا۔ بکھرے بال، ہونٹوں پر پان کا رنگ، آنکھوں پر مونے شیشوں کی عینک لیکن ہادی تو یکسر مختلف تھا۔ دراز قد، روشن آنکھیں، کشادہ سینہ، وہ ہر

اعتبار سے ایک ذہین اور مضبوط شخص نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے پھرتے حجاب کو کبھی بھی عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ وہ کچھ دن پہلے وینس میں جس طرح اچانک ہادی کو حیران و پریشان چھوڑ کر روم چلی آئی تھی اس پر وہ قلق محسوس کرتی تھی۔ اس کے بعد فون پر اس نے ہادی سے جو بدھنہنہ کی تھی اس کا بھی اسے افسوس تھا۔ اب وہ اس کا مداوا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ایسا کرتی تھی تو اس کے اندر کی وہ شدید گھٹن بھی کم ہوتی تھی جس کا تعلق اس کے گھریلو حالات سے تھا۔
 ہادی محویت سے اخبار دیکھ رہا تھا۔ ایک ادبی صفحہ پڑھنے میں مشغول تھا۔ فیض احمد فیض کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون چھپا تھا۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ کن آنکھوں سے حجاب کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ جیسے اپنے خیالوں میں گم ہو گئی تھی۔ نقاب تھوڑا سا نیچے سرکا ہوا تھا۔ تاک کی دائیں جانب ننھا سا تل بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ جب بات کرتے ہوئے بھی کبھی اپنا نچلا ہونٹ نرمی سے دانتوں میں دباتی تھی تو ایک نہایت دلکش ادا بن جاتی تھی۔۔۔۔۔ ہادی کو یاد آیا جب وینس میں وہ دونوں کیمپ سے پانچ نمبر بس پر شہر کی طرف آرہے تھے، بس کی لیڈی

ڈرائیور کو اچانک بریک لگانا پڑے تھے۔ اس واقعے کی مہربانی سے حجاب پوری کی پوری اس کے ساتھ بیہوش ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی کھڑے کھڑے شدت سے بغل گیر ہو جائے۔ وہ دل فرزا وجان لیو اس ہادی آج تک بھول نہیں پایا تھا۔ اس حسین لکراؤ کے بعد بھی حجاب نے سخت کے عالم میں اسی طرح ہولے سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تھا۔ وہ مضر نا قابل فراموش تھا۔
 ہادی نے انگلیں اخبار ایک طرف رکھا اور اپنے قدرے لمبے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات میرے ذہن میں گھٹکتی رہتی ہے جب۔ سمجھیں ایک سوال ہے۔ کیا آپ جواب دینا پسند کریں گی؟“
 ”جی نہیں۔“
 ”جب آپ ”مطیر“ تھیں اور وینس میں مجھ سے ملی تھیں تو وہ ایک بڑا مختلف روپ تھا۔ اس کی سمجھ مجھے آج تک نہیں آئی۔“
 ”خود مجھے بھی نہیں آئی۔“
 ”مذاق نہیں حب! پلیز بتائیں مجھے۔ کیا آپ کو اس وقت ڈر نہیں لگا تھا کہ آپ کو اس حال میں کسی نے دیکھ لیا تو پھر؟“
 ”ڈر تو لگا تھا مگر۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم بہار کی گل کاریاں
 مارچ 2014ء کی تقریریں

اولین صفحات ● افریقا کے مراسرار جنگلات میں ہولناک واقعات اور زندگی کو اجاگر کرتا سنسنی خیز ناول **امجد رفیع** کی قابل تحسین کاوش

گرداب ● رانی میاں شریلا کی خدایاں بھانوی ڈھیلیں۔ **اسما قادری** کے قلم کی جولائیاں

جواہری ● **احمد اقبال** کے شہر بار قلم سے ایک جواہری کے کھیل کے نئے نئے انداز

مغرب کے نالے انداز ● مغرب کی تہذیب سب ماحول کی عکاسی اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں

آپ کے تہرے...
 مشورے... محبتیں... شکایتیں...
 اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

سرورق کی کہانیاں

بھلی کہانی ● جگر تھیو کی لکھنا کا دلکش لطف لہذا **احمد اقبال** کے مخصوص نگاہیں

دوسری کہانی ● جگر اور محبت کے ملاپ میں بدی کہانی **سمیرا یعقوب** کے قلم کی جولانی

توقف سے بولی۔ ”بادی آپ جانتے ہی ہوں گے۔۔۔۔۔ اصل میں ہمارے کچھ معاملات کی جڑیں ہمارے ماضی میں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ بچپن میں جب میں بہت ڈپریشن ہوتی تھی، بہت زیادہ، تو میں ایک مزیدار کام کرتی تھی فیصل کی نیکر اور شرٹ وغیرہ پہن لیتی تھی اور گھر کے لان میں خوب اڈھم مچاتی تھی۔ فیصل مجھ سے ڈیڑھ سال چھوٹا ہے مگر اس کے کپڑے مجھے پورے آجاتے تھے۔ ہم دونوں لان میں لڑتے تھے، کشتیاں کرتے تھے، سائیکل چلاتے اور پتا نہیں کیا کیا۔ دو چار گھنٹوں میں، میں نارمل محسوس کرنے لگتی تھی۔ گیارہ بارہ سال کی عمر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ امی ابو کو بھی پتا تھا کہ میں شدید ڈپریشن سے نکلنے کے لیے ایسا کرتی ہوں اور ایسا بہت سے لوگوں میں ہوتا ہے ہادی! سخت پریشانی یا مایوسی کے وقفوں میں وہ مختلف طریقوں سے اپناری ایکشن دیتے ہیں۔ کچھ بہت زیادہ کھانا پینا شروع کر دیتے ہیں، کچھ لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں یا برتن توڑتے ہیں، اگر پیسا ہو تو کچھ لوگ اندھا دھند شاپنگ کرتے ہیں۔ یہ سب ڈپریشن سے نکلنے کے راستے ہی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔“

”یعنی آپ گیارہ بارہ سال کی عمر تک اسی طرح کپڑے بدل کر اور بھاگ دوڑ کر اپنی ڈپریشن دور کرتی رہیں۔ لیکن پھر ظاہر ہے کہ آپ بڑی ہو گئیں اور یہ ”ڈپریشن بھگاؤ“ سلسلہ ختم ہو گیا۔“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد کبھی نہیں ہوا۔ آخری بار بس وہاں ویش میں تھا اور شاید یہ بالکل آخری تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ مسکرائی۔

”اس کا مطلب ہے کہ ان دنوں آپ شدید ڈپریشن کا شکار نہیں۔ مایوسی کا کوئی زبردست دورہ تھا۔“

اس نے طویل سانس لی۔ ”جی ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھ لیں، بس ایک گھریلو معاملہ تھا۔“ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کی زندگی کی بدترین گھڑیاں تھیں۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ خود کو ختم ہی کر لے۔ اسے ارم اور جلال کے رومانی تعلق کا پتا چلا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ گھٹ کر مر جائے گی اور جب واقعی اس کی کیفیت مرنے والی ہو گئی تھی تو وہ ساری مصلحتیں ایک طرف رکھ کر باہر نکلی تھی اور اس نے ایک دودن کے لیے خود کو وینس کی گہما گہماؤں میں غرق کر دیا تھا۔ ان دنوں جلال ایک بہت دور کے شہر میں تھا۔ ہادی نے اس کے تاثرات دیکھ لیے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں مزید مداخلت نہیں چاہتی۔ لہذا اس نے بھی اسے مزید نہیں کر دیا۔

حجاب بھی اب موضوع بدلنے کے لیے موسم کی صورت حال پر نگاہ ڈال رہی تھی۔ سورج کی کرنوں میں تمازت تھی لیکن ہوا کے جھونکے اسے یوں زائل کر رہے تھے جیسے کانٹہ پر پینسل کی مدھم سی لکیر کو برصاف کر دیتا ہے۔ اسی دوران میں اچانک حجاب کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے اسکرین پر نگاہ دوڑائی اور چونک گئی، یہ جلال کا نمبر تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنے ساتھ سیل فون نہیں رکھتی تھی۔ مگر جب میکے میں ہوتی تھی تو بھی کبھی جلال کی اجازت سے رکھ بھی لیتی تھی۔ وہ فون سنتے ہوئے ذرا آگے چلی گئی۔ ”ہیلو“ جلال کی بھاری بھر کم آواز حجاب کے کانوں میں پڑی اور وہ کپکپاسی گئی۔

”جی میں بول رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کہاں پر ہو؟“

”یہاں ذرا بازار آئی ہوئی تھی، تھوڑی سی شاپنگ کے لیے۔“

”ساتھ کون ہے؟“

”لگ۔۔۔۔۔ کوئی نہیں، امی نے آنا تھا مگر ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ فیصل بھی آفس گیا ہوا ہے۔“

”تو شام کو آ جاتیں۔“ ناگواری سے کہا گیا۔

”امی کی ایک دودوا میں بھی لینا تھیں۔“

”اچھا، یہ کل تم نے کیا بات کی ہے امی سے۔ وہ سخت ناراض ہو گئی ہیں۔“ جلال کی آواز میں شدید پیش تھی۔

”مم۔۔۔۔۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جلال۔“

”تو تمہارے فرشتوں نے کی ہے؟“

”میں نے تو بس کمرے کی تھوڑی سی بات کی تھی۔ اتنا کہا تھا کہ وہ کمر ارم کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ بلکہ اسے خود ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس کمرے میں آئی۔ اسے پتا بھی ہے کہ پچھلی دفعہ ہم کو یہ اچھا نہیں لگا تھا۔“

”لیکن امی کا اس میں کیا قصور ہے۔ تم نے ان کو کیوں الزام دیا؟“

”جلال! آپ جانتے ہیں امی کی مرضی کے بغیر وہ اوپر نہیں آسکتی تھی۔ امی کو بھی سب پتا تھا۔“

”اچھا، وہ آئی گئی ہے تو ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم پر۔“ جلال گرجا۔

ایسے موقعوں پر حجاب ہم جایا کرتی تھی۔ منہ نہ لگتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب بات ارم کی ہوتی تھی یا اس کی کسی پیش قدمی کی ہوتی تو حجاب کے اندر ایک عجیب سی جرات آ جاتی تھی۔ ایک دو بار وہ خود بھی ششدر رہ گئی تھی۔ کوئی نامعلوم سی توانائی تھی جو اس کے اندر بھر جاتی تھی۔ ایک ایسی توانائی

جس کا کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ خاص طور سے جلال کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ”جلال! آپ کو پتا ہے کہ اس کا یوں ہمارے قریب رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پلیز جلال۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ ایسا مت کریں۔۔۔۔۔ اسے مجھ پر مسلط نہ کریں۔“

”مسلط۔۔۔۔۔ کون مسلط کر رہا ہے۔۔۔۔۔ کون کر رہا ہے؟ تم خود اپنے اوپر مسلط کر رہی ہو چیزوں کو۔ تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں اور زبان بھی لگ گئی ہے تمہیں۔ بدتمیزی کی ہے تم نے امی جان سے۔ تمہیں ان سے معافی مانگنا پڑے گی۔ ورنہ پھر یہ بات بگڑ جائے گی۔۔۔۔۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

باتیں کرتے کرتے حجاب ایک درخت کی اوٹ میں چلی گئی تھی تاکہ ہادی اس کی آواز اور تاثرات سے دور رہے۔ جلال کے طیش کے سامنے وہ تھر تھرا کا پتا شروع ہو گئی تھی، اس نے بولنا چاہا مگر اس کا گلا خشک ہو گیا۔ جلال پھنکارا۔ ”میری بات سنی ہے تم نے۔ آج ہی گھر واپس آؤ اور معافی مانگو امی سے۔ آج ہی۔“

وہ تھوک نکل کر بولی۔ ”میں آ جاتی ہوں جلال اور۔۔۔۔۔ آپ کہتے ہیں تو معافی بھی مانگ لیتی ہوں لیکن۔۔۔۔۔ پلیز ارم کے سامنے اس طرح میری توہین نہ کریں۔ اسے کہیں کہ۔۔۔۔۔ وہ نیچے والے کمرے میں واپس چلی جائے۔“

ایک مختصر وقفے کے بعد جلال گھبرا کر آواز میں بولا۔ ”تو تم آنے کے لیے شرط رکھ رہی ہو؟“

”نہیں جلال، ایسی بات نہیں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“

”وہ جب تک وہاں ہوگی۔۔۔۔۔ مجھ سے نہیں آیا جائے گا۔“ پتا نہیں وہ آخری الفاظ کیسے کہہ گئی۔ یہ وہی جرات تھی جو اس کے اندر بھڑکنے والی چنگاری نے اسے دی تھی۔ ورنہ وہ تو جلال کے سامنے ایسی بات کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”تو یہ شرط ہے تمہاری؟“ وہ ذرا سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔

”شرط نہیں ہے۔۔۔۔۔ منت کر رہی ہوں جلال۔۔۔۔۔ پلیز۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ حجاب کو لگا کہ شاید وہ فون بند کر دے گا۔۔۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس بار وہ بولا تو اس کی آواز میں طیش کا ہیجان نہیں تھا۔ ”اچھا۔۔۔۔۔ میں دیکھتا ہوں اس معاملے کو۔۔۔۔۔ تو تم کب آرہی ہو؟“

”اگر، آپ اجازت دیں۔۔۔۔۔ تو صبح آ جاؤں؟“

”چلو ٹھیک ہے۔ گاڑی بھیج دوں یا فیصل کے ساتھ

آ جاؤ گی؟“

”گاڑی بھیج دیجیے گا۔“

رسی کلمات کے بعد یہ بات چیت ختم ہو گئی۔۔۔۔۔ قریباً تین سال میں یہ پہلا موقع تھا جب اس طرح وہ کسی بات پر اڑی تھی اور اس کی بات جلال نے مانی بھی تھی۔ ورنہ تو اس سے بہت پہلے ہی ڈانٹ ڈپٹ اور سرخ انکارہ آنکھوں تک نوبت آ جاتی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر تک وہ واپس اپنے سسرال پہنچ چکی تھی۔ اس کا دل ابھی امی ابو کے پاس رہنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر یہ نادر شاہی حکم تھا۔۔۔۔۔ اور ایسے احکامات سے سرتابی کی جرأت وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے یہی بڑی بات تھی کہ جلال نے اس کی بات مان لی تھی اور ارم کو، کمر اڈیکوریٹ کرانے کے بہانے واپس نیچے بھیج دیا تھا۔ آج صبح حجاب نے شریفان کو فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ ارم واپس نیچے جا چکی ہے۔ اس کے بعد ہی اس نے آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جلال کو آج ذرا دیر سے جانا تھا۔ وہ ابھی گھر میں ہی تھا۔ وہ نارمل طریقے سے حجاب سے ملا۔ اس کا حال احوال پوچھا اور دوا کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ باقاعدگی سے کھا رہی ہے یا نہیں۔ جلال کا موڈ قدرے بہتر لگتا تھا۔۔۔۔۔ اور یہ بہتری دیکھ کر حجاب نے اطمینان کی سانس لی۔

”کتنے بچے آئیں گے؟“

”دس تو بچ ہی جائیں گے۔ شاید زیادہ دیر ہو جائے۔ تم کھانا کھا لینا۔“

”نہیں اکٹھے ہی کھائیں گے۔“ حجاب نے کہا۔

”اوکے، میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“

جلال کے لہجے میں مفاہمت تھی۔

جلال کو آج چونکہ دیر سے جانا تھا اس لیے ارم خود ہی یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ ارم کی بڑی بہن یعنی حجاب کی دیورانی فوزیہ میکے گئی ہوئی تھی۔ جلال کے جانے کے بعد آپا خانم گھر میں اکیلی تھیں۔ حجاب نے سب سے پہلے ”معافی“ والا کام کیا۔ وہ آپا خانم کے پاس پہنچی جو بستر پر نیم دراز لی وی دیکھ رہی تھیں۔ پاؤں کمرے میں تھے۔ حجاب ان کے پاؤں دبانے لگی۔ وہ یہ دستور لی وی دیکھتی رہیں۔ اگر وہ بہت زیادہ ناراض ہوتیں تو اپنے پاؤں کھینچ لیتیں، یا کوئی سخت بات کہتیں۔ اس کا مطلب تھا کہ معافی تلافی کی گنجائش موجود ہے۔ حجاب نے وہی کیا جو جلال نے کہا تھا۔ ان سے معافی مانگ لی۔ ان کا تنا ہوا چہرہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا، بولیں۔

سسپینس ڈائجسٹ

جلال..... پلیز!“ وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ جلال نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھایا۔ گاؤں کے سہارے بٹھایا اور ایک بار پھر اسے سمجھانے بجانے میں مصروف ہو گیا۔

اس کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ سب کچھ اتنا تکلیف دہ نہیں ہوگا جتنا وہ سمجھ رہی ہے۔ وہ انصاف کرے گا..... حجاب کو کبھی کوئی ”دکھ“ نہیں پہنچے دے گا۔ ارم کو علیحدہ گھر میں رکھے گا۔ مگر وہ جو فیصلہ کر چکا ہے، اس سے پیچھے ہٹنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

حجاب خاموشی سے سنتی رہی۔ رہ رہ کر ایک بھکی اس کے جسم کو دھلا دیتی تھی۔ دھیرے دھیرے شدید غم اور صدمے کی کیفیت اس کے اندر کچھ ماند پڑنے لگی۔ اس کی جگہ ایک پیش نے لینی شروع کر دی۔ یہ پیش کہاں سے آرہی تھی..... یہ پیش ایک چنگاری سے نکل رہی تھی۔ وہ چنگاری جس نے کچھ عرصہ پہلے حجاب کے سینے میں جگہ بنائی تھی اور اب دھیرے دھیرے اپنا حجم بڑھا رہی تھی۔

جلال باتیں کر رہا تھا، مگر یہ باتیں صرف حجاب کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان سے آگے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ جلال بار بار یہ بات کہہ رہا تھا..... اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ہر راستہ تمہارے سامنے کھلا ہے..... ہر راستے سے اس کی کیا مراد تھی، یہ بھی حجاب اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ یہ ”دھلا دینے والی بات“ بتا رہا تھا کہ وہ حجاب کو طلاق دینے کی قیمت پر بھی ارم کو اپنائے گا.....

آخر میں حجاب نے بس اتنا کہا۔ ”میں کچھ دنوں کے لیے امی کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”سوچنے سمجھنے کے لیے۔“ حجاب نے مختصر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن اس طرح آنسو بہاتے ہوئے نہ جانا۔ ان لوگوں کو ابھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔“ وہ تائیدی انداز میں خاموش رہی۔

☆☆☆

وہ ابو کے گھر واپس آگئی۔ وہ خود کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے ماں باپ اور بھائی کو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی، خاص طور سے ماں کو لیکن ماں بھی عجیب شے ہوتی ہیں۔ اپنے بچے کے اندر جھانک لیتی ہیں۔ سو غلافوں میں چھپی ہوئی کیفیت کو بھی بھانپ لیتی ہیں۔ حجاب کی امی بھی جان چکی تھیں کہ سسرال میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ اتنا تو انہیں پتا چلا تھا کہ ارم نے حجاب

کے ساتھ والا کمرائے لیے کھلوایا تھا جس سے گھر میں تلخی پیدا ہوئی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ جلال نے اپنی والدہ سے معافی منگوانے کے لیے حجاب کو گھر بلایا ہے اور حجاب نے معافی مانگی ہے۔ اس کے بعد کی کوئی بات انہیں معلوم نہیں تھی۔ ان کے بہت پوچھنے پر بھی حجاب نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ امی ابو سے ہنس بول رہی تھی۔ فیصل کے ساتھ بھی نارمل انداز میں ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھی لیکن اس کے اندر جو قیامت پنا تھی وہ کچھ اسے ہی معلوم تھا۔ جلال انتہا کو چھو گیا تھا۔ اس نے اشاروں اشاروں میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ حجاب کو طلاق کی قیمت پر بھی ارم کو اپنائے گا۔ یہ بات اس نے کیوں کہی تھی۔ یہ اس لیے کہی تھی کہ وہ جانتا تھا کہ حجاب کے گھر میں طلاق کے لفظ کے بارے میں سوچنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ایک سال پہلے جب طلاق کے لفظ کی بازگشت حجاب کے والدہ خاندان میں سنائی دی تھی تو کیا ہوا تھا یہ سب لوگ جانتے تھے۔ ایک طوفان تھا جو بہت کچھ بہا کر لے گیا تھا۔ ایک لڑکی نے ذلت اور تکلیف کی انتہا کو چھوا تھا۔ پھر اس کی جان گئی تھی۔ اس کے شیرخوار بچے کی جان گئی تھی..... اس واقعے کی یادگاروں میں سے ایک یادگار وہ پورٹریٹ ابھی تک حجاب کے گھر کی ایک دیوار پر لگا تھا۔ وہ اس کی عزیز ہی نہیں اس کی گہری اور قریب ترین سہیلی بھی تھی۔ اس کا صدمہ ایک آہنی تیغ کی طرح حجاب کے سینے میں گڑا رہتا تھا، اس میں سے خون رستا رہتا تھا۔

بیتش کی موت کا جاں گسل صدمہ صرف حجاب کے سینے میں ہی نہیں تھا..... والدہ فیملی کے بہت سے لوگ اس کی پیسیں اب تک اپنے دلوں میں محسوس کرتے تھے۔ لہذا حجاب جانتی تھی کہ کل رات جلال کے منہ سے ادا ہونے والے اس لفظ کا مطلب کیا ہے..... اور اگر یہ بیتش والا واقعہ نہ ہوا ہوتا تو بھی حجاب کا گھر اتنا ان گھرانوں میں سے تھا جہاں طلاق ہی کو نہیں طلاق کے لفظ کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے، اس کے لیے فیصلہ اور علیحدگی جیسے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اگر بیتش طلاق لینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی تو شاید حجاب بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بیتش کے لیے بچے کی صورت میں ایک جکڑ بند موجود تھا جبکہ حجاب بھی ایک ”اور“ طرح کے جکڑ بند میں جکڑی ہوئی تھی۔

حجاب سوچ رہی تھی اور اس کے سینے میں گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کسی نے اس کے منہ پر ایک بھاری تکیہ رکھ دیا ہے اور پورے وزن کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ سانس لینا چاہتی ہے، تڑپ رہی ہے لیکن کچھ کر

نہیں سکتی۔ جو سلسلہ ڈیڑھ دو سال پہلے شروع ہوا تھا اب وہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا..... کیا اب والدہ فیملی میں ایک اور بیتش وجود پا رہی تھی؟ وہ بیٹے کی سہ پہر تھی۔ ہادی کو ملے آج چار روز ہو چکے تھے۔ اس دوران میں حجاب نے اپنا سیل فون بھی بالکل بند رکھا تھا۔ یقیناً ہادی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کیوں غائب ہو گئی ہے۔ بتا کچھ بتائے کیوں ایک بار پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ حجاب جانتی تھی کہ اس نے بار بار کال کی ہوگی اور سخت پریشان رہا ہوگا۔ مگر وہ خود اتنی پریشان تھی کہ ہادی کی پریشانی کا خیال اس کی اپنی پریشانی کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ وہ روم چھوڑ چکا ہو یا ایک دو دن میں چھوڑنے والا ہو۔

آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ صرف ابو اسٹڈی میں موجود تھے۔ امی اور فیصل بیٹے بھرکارا شن لینے کے لیے سٹی سینٹر گئے ہوئے تھے۔ ملازم ابو کا کوئی خط پوسٹ کرنے گیا تھا۔ اس نے ابو کے لیے چائے بنائی اور لے کر اسٹڈی کی طرف آگئی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایومیز پر جھکے ہوئے تھے۔ سامنے سیاہ جلد والی ایک ڈائری تھی۔ یہ وہی ڈائری تھی جس میں انہوں نے دو ڈھائی سال پہلے کا حساب کتاب لکھ رکھا تھا۔ اس حساب کتاب میں بیشتر حصہ ان اخراجات کا تھا جو امی کی بیماری کی تشخیص اور علاج کے سلسلے میں آئے تھے اور جنہوں نے آنا فاقا حجاب کے والدین کو ایک بھاری قرضے کے بوجھ تلے دبا دیا تھا۔ یہ ظاہر یہ ایک چھوٹی سی ڈائری تھی لیکن اس کا ”وزن“ کتنا زیادہ ہے یہ کچھ ابو ہی جانتے تھے، یہی وجہ تھی کہ اس ڈائری کو دیکھتے ہوئے ان کے چہرے پر درد جنوں اضافی سلوٹیں نظر آنے لگتی تھیں..... حجاب نے سوچا وہ اچھے وقت پر چائے لائی ہے۔ حجاب کو دیکھتے ہی فیاض صاحب نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور چائے کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

دونوں چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پچھلے تین چار دن سے امی کی طرح ابو بھی حجاب کے موڈ سے کچھ ٹھٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے حجاب کو اپنے ساتھ لیا اور بڑی محبت سے اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھنے لگے۔ جب انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بار بار کہا کہ بیٹی بتاؤ..... اس طرح تمہارا بوجھ ہلکا ہوگا..... تو نجانے کیا ہوا اچانک حجاب کے آنسو جھلک پڑے۔ اس نے ابو کے کندھے سے سر لگایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ

اسے دلاسا دینے لگے، پکڑنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اس سے رونے کی وجہ بھی پوچھ رہے تھے۔

”حب! نہیں جلال نے تم پر ہاتھ تو نہیں اٹھایا؟ تمہیں مارا تو نہیں؟“

”نہیں ابو! یہ اس سے بہت آگے کی بات ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”جلال..... جلال.....“ اس کی آواز بیٹھ گئی۔

”کہو بیٹی! بتاؤ مجھے.....“

”جلال..... دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں ابو!“ وہ ہمت کر کے کہہ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

باپ بیٹی بہت دیر ساکت سے بیٹھے رہے۔ حجاب کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو فیاض صاحب نے اسے بہ آہستگی خود سے علیحدہ کیا۔ ان کے کہنے پر حجاب انہیں اس سارے واقعے کی تفصیل بتانے میں مصروف ہو گئی۔ ارم والے معاملے کی جانکاری اس حد تک تو فیاض صاحب کو بھی تھی کہ وہ بن بلائے مہمان کی طرح حجاب کے گھر میں ٹھہر رہتی ہے اور جلال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن بات یہاں تک پہنچ جائے گی اس کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ان کے چہرے کی غم ناک سلوٹوں میں چند مزید سلوٹوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ جیسے ایک گھٹنے کے اندر ہی مزید بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

”ابھی یہ سب کچھ اپنی ماں کو نہ بتانا حب! تم جانتی ہی ہو صدمہ اس کے لیے کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اس پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہونے لگی تو یہ خطرے کی علامت ہوگی۔ ابھی ہمیں کم از کم پانچ چھ ماہ مزید احتیاط سے گزارنے ہیں۔“

”نہیں ابو! مجھ میں تو بتانے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ لیکن آخر کب تک چھپی رہے گی یہ بات؟“

”یا اللہ، کرم کر ہم پر۔“ وہ بڑبڑائے اور ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئے۔

حجاب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میری پریشانی تو بھانپ گئی ہیں مگر میں نے بتایا کچھ نہیں۔ انہیں اس صورت حال کے لیے پہلے ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا.....“

فیاض صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”اچھا، میں ذرا مسجد تک جا رہا ہوں۔“

جب کہیں کوئی صورت حال سمجھ رہی تھی، وہ اپنا تناؤ کم کرنے کے لیے اسی طرح مسجد کا راستہ اختیار کرتے

پاؤں کو بھی ہاتھ لگا دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پاؤں پختی ہوئی ڈرائنگ روم سے اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں آنسو تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے پتا نہیں چلا ہادی کب ڈرائنگ روم سے نکلا۔ کب مین گیٹ تک پہنچا اور واپس گیا۔ ہاں اتنا اندازہ اسے ضرور ہو گیا کہ وہ چلا گیا ہے۔ چند منٹ بعد وہ اٹھی، قالین پر بکھری ہوئی مٹائی اٹھائی اور اسے ڈسٹ بن میں ڈالا۔

☆☆☆

ہادی ہوٹل کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دل ہی نہیں چاہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ظہیر کا فون بھی آیا تھا۔ وہ ہادی کے چند پرستاروں کو لے کر ہوٹل آنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کا پروگرام تھا کہ وہ ہادی کو روم کے سب سے اچھے چائیز ریسٹوران میں ڈنر کرائیں مگر ہادی نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر منع کر دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ چند ہفتوں کے اندر روم کی باسی اس لڑکی میں اتنا ”انوالو“ ہو جائے گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وینس کی وہ پہلی شب اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئی ہے اور وہ اس شب کے سحر سے کبھی نکل نہیں سکے گا۔ بس ایک روشن پیشانی اور ایک جادوئی مسکراہٹ، اس کے سوا اس کی آنکھوں کو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خود کو سمجھاتا، سنبھالتا، ملامت کرتا مگر کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ کہاں سے جڑتے ہیں یہ ناتے؟ کس ہوا سے ہلکتی ہیں دل کی کلیاں..... وہ کون سی گھڑی ہوتی ہے جب دوا جینی انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور پھر ان کو یا ان میں سے کسی ایک کو لگتا ہے کہ یہاں تو صدیوں کی جان پہچان ہے۔ سوچتا رہتا تھا۔

اگر اس پہلی رات ریسٹوران میں سے نکلنے کے بعد وہ اس گلی میں داخل نہ ہوتا، ساتھ والی گلی سے نکل جاتا تو وہ نامعلوم اٹھائی گیرا کبھی، اس کے راستے میں نہ آتا۔ نہ حجاب اسے روکنے کے لیے اس کے سامنے چھتری گراتی، نہ وہ سب کچھ ہوتا جواب تک ہوا تھا اور جس نے ہادی کی زندگی کو تہہ بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ ہادی کے لیے یہ صدمہ ہی کم نہیں تھا کہ اسے چند دن بعد یا ایک دو ہفتے بعد اٹلی چھوڑ کر جانا ہے۔ اب اس میں یہ صدمہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے رویے سے حجاب کو بے طرح ناراض کر دیا ہے اور حجاب نے نہایت بے رخی سے بلکہ تقریباً دھتکار کر اسے گھر سے نکالا

مقصود شاید اس انتظار میں تھا کہ حجاب اسے اندر آنے کے لیے کہے گی۔ مگر حجاب کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ اندر ہادی موجود تھا۔ مقصود اگر ہادی کو دیکھ لیتا تو ضرور چونکتا۔ وہ اسے حجاب کے سرال کی انگلی میں کئی دن تک دیکھتا رہا تھا۔ مقصود شکی مزاج تھا اور گھر میں اکثر ارم کی سائڈ بھی لیتا تھا۔ وہ کسی طرح کا شک نہ بھی کرتا اور گھر جا کر کسی سے اتنا ذکر ہی کر دیتا کہ ہادی یہاں موجود تھا تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ حجاب کو ہادی کے حوالے سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔

مقصود بہ دستور دروازے پر کھڑا تھا۔ حجاب نے کہا۔ ”تمہیں کہیں اور بھی جانا ہے..... مٹائی دینے؟“ ”جی وڈی باجی! ارم بی بی کی دو تین سہیلیاں ہیں اور ایک ان کی کزن۔“ ”تو ٹھیک ہے تمہیں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ ویسے بھی گھر میں اور کوئی نہیں۔“

”ٹھنڈ..... ٹھیک ہے باجی! اللہ حافظ۔“ اندر سے ہادی کے کھانسنے کی مدھم آواز آئی اور حجاب مزید تلملا گئی۔ ملازم مقصود کو دروازے سے ٹال کر وہ واپس آئی۔ ہادی میگزین دیکھ رہا تھا۔ حجاب کے ہاتھ میں مٹائی دیکھ کر بولا۔ ”کوئی اچھی خبر ہے؟“

حجاب نے مٹائی کا ڈبا تپائی پر پھینکا۔ وہ ایک گلاس کو لیتا ہوا قالین پر جا گرا۔ وہ طیش آمیز لہجے میں بولی۔ ”ہادی صاحب! میں نے ابھی آپ سے ایک گزارش کی تھی، پلیز..... آپ اس طرح دخل اندازی نہ کریں۔ آپ کی وجہ سے میں کسی بڑی مصیبت میں پڑ سکتی ہوں۔ آپ چلے جائیں یہاں سے، یہی میرے اور آپ کے لیے بہتر ہے۔“ ہادی ٹھٹک گیا۔ شاید اسے حجاب سے ایسے لہجے کی توقع نہیں تھی۔ ”کوئی..... غلطی ہو گئی ہے مجھ سے؟“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”غلطی تو مجھ سے ہوئی تھی اس رات، جو آپ کے ساتھ وینس دیکھنے چل پڑی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ..... آپ نے اس طرح پیچھے پڑ جانا ہے، مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ گئے، جیسے میں کوئی جرم کر کے بھاگی ہوں۔ میرے گھر پہنچ گئے۔ یہاں امی کے گھر پہنچ گئے اور ایک دفعہ نہیں بار بار پہنچ رہے ہیں۔ آپ مجھے بتا دیجیے کہ میری غلطی کس طرح معاف کر سکتے ہیں آپ۔“ اس نے آخری الفاظ ادا کیے اور غصے سے تھر تھرا کر نپٹے گئی۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح جھنک لگا تھا۔ ہادی نے بہ غور اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”سس سوری!“ اس نے کہا۔ ”میں بھی سوری کہتی ہوں..... اور کہیں تو آپ کے

ہادی کا دل چاہا کہ کہہ دے..... ہاں، خاص بات معلوم ہوئی ہے لیکن پھر گلزار عرف گلزاری سے کیا ہوا وعدہ اسے یاد آیا۔ اس نے گلزار کو گارنٹی دی تھی کہ اپنی اور اس کی ڈیل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ حجاب سے نظریں ہٹا کر بولا۔ ”نہیں کوئی خاص بات تو نہیں لیکن میری چھٹی حس نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔“ ”پلیز ہادی! آپ میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیں..... اور..... میری ایک گزارش ہے اگر آپ مان لیں تو.....“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ مزید روکھا ہو گیا۔ ”آپ برا مان رہی ہیں؟“

وہ اس کے جملے کو نظر انداز کر کے بولی۔ ”اب ہم اس سلسلے کو یہاں ختم کر دیں۔ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیں۔“ ”مگر ہم نے تو یہ طے کیا تھا کہ میرے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم وٹنی کن (مڈ ہی شہر) میں ملیں گے اور سارا دن وہاں گزاریں گے۔“

حجاب نے جھنجھلاہٹ محسوس کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ اندرونی دروازے کی تیل پھر ہوئی۔ حجاب کے اندازے کے مطابق یہ گھریلو ملازم تھا جو خط پوسٹ کر کے آیا تھا لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو ٹھٹک گئی۔ وہاں اس کے سرالی گھر کا ملازم مقصود کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انڈین موٹی چورلڈوؤں کا ڈبا تھا۔ ”السلام علیکم وڈی باجی۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

”یہ کیا ہے بھئی؟“ ”مٹائی ہے جی۔ ارم بی بی نے بھجوائی ہے۔“ ”کس سلسلے میں؟“ حجاب نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ کو نہیں پتا..... کل ٹی وی پر ان کی تصویر بھی آئی تھی۔ انہیں کافی بڑا انعام ملا ہے جی۔“ ”کس بات کا؟“

”یونیورسٹی سے ملا ہے جی۔ کوئی مقابلہ تھا تقریروں شہریروں کا.....“ حجاب کو یاد آ گیا۔ کچھ دن پہلے کوئی ملک گیر ”کمپنیشن“ ہوا تھا جس میں یونیورسٹیز کے مقرروں نے حصہ لیا تھا، غالباً اس میں ارم نے کوئی پوزیشن لی ہوگی۔ اب اس نے حجاب کو جتانے کے لیے یہ مٹائی ارسال کی تھی۔ وہ ایسے کام کرتی رہتی تھی۔

تھے۔ واپسی پر ہمیشہ بہتر نظر آتے تھے۔

ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اندرونی دروازے کی تیل ہوئی۔ حجاب نے پہلے ملازم کو آواز دی پھر اسے یاد آیا کہ وہ ابو کا خط پوسٹ کرنے گیا ہوا ہے۔ اس نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا اور بھونچکی رہ گئی۔ سامنے ہادی کھڑا تھا۔ ایک لحظے کے لیے حجاب کا دل چاہا کہ وہ دروازہ بند کر دے، لیکن ایسا کر نہیں سکی۔ ہادی کے چہرے پر حیرت آمیز خوشی تھی۔ جیسے اسے بھی پورا یقین نہیں تھا کہ حجاب سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔ ”کیا بات ہے محترمہ! اب اندر آنے کا بھی نہیں کہیں گی۔“

”آ..... جائے۔“ وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے سامنے بیٹھے تھے۔ گھر میں اس وقت اور کوئی نہیں تھا ورنہ حجاب کو چادر کا نقاب کرنا پڑتا۔ ”یہ آپ کو اس طرح اچانک بن بتائے، غائب ہو جانے کی کوئی بیماری ہے؟“ وہ بولا۔ ”ہر بندے کے اپنے مسائل اور مجبوریوں ہوتی ہیں ہادی صاحب۔“ وہ روکھی آواز میں بولی۔

اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ یقیناً یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نے نقاب کیا ہوتا۔

”باقی لوگ کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”مختلف کاموں سے لگے ہوئے ہیں۔ آپ کیسے آئے؟“ ”بس دو چار دن میں یہاں سے چل چلاؤ ہے اپنا۔ سوچا کہ ایک بار مل آؤں۔ یہ بھی امید تھی کہ شاید آپ سے ملاقات ہو جائے۔ ویسے میرے اندیشے کے عین مطابق آپ کافی پریشان ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے پتا چل رہا ہے۔“

”بس کوئی مسئلہ تھا..... لیکن مجھے معاف کیجیے، میں آپ سے شیئر کرنا نہیں چاہتی۔“ ”آپ شیئر کریں نہ کریں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ آپ کے زیادہ تر مسئلوں کی بنیاد وہی مس ارم چودھری ہے۔“ حجاب کو ہادی کی یہ دخل اندازی ناگوار گزر رہی تھی۔ وہ ذرا تلخ لہجے میں بولی۔ ”آپ کیوں لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے آپ کو؟“

پہلے تو سکتہ زدہ کھڑا رہا پھر اس نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ اندر آگئی۔ ہادی نے دروازہ بھیڑ دیا۔ حجاب نے اندر آنے کے بعد براؤن چادر کا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا۔ اب اس کے دلکش چہرے کا قریباً تین چوتھائی حصہ نظر آنے لگا تھا۔ ”بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”بیٹھیں۔“ ہادی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

وہ کچھ دیر تک اپنی حنائی انگلیوں کو مردوڑتی رہی پھر آزرہ آواز میں بولی۔ ”ہادی کل جو کچھ ہوا..... میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یقین کریں میں ساری رات.....“ اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سینے میں جلن سی تھی۔

وہ چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر بولی۔ ”مجھے معاف کر دیجیے، میں اپنے حواس میں نہیں تھی ہادی! میں نے آپ کو اس طرح گھر سے نکالا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ تو یہاں روم میں چند دن کے مہمان ہیں۔ پکیز..... آئی ایم رینلی ویری سوری ہادی۔ میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔“

ہادی نے گہری سانس لی۔ ”میں چند دن کا نہیں شاید ایک آدھ دن کا مہمان ہوں۔ میں کل تک یہاں سے جا رہا ہوں۔“

وہ غم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ حنائی انگلیاں بے ساختہ ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ سرخ سپید کلائیوں پر ہری اور سرخ چوڑیوں کی کھن کھن تھی۔ آخر ہمت کر کے بولی۔ ”آپ نے جانا ہے تو ضرور جائیں۔ لیکن میں اس طرح نہیں جانے دوں گی.....“

”کیا مطلب؟“

”آپ کو ٹھیک ہونا ہوگا۔ بالکل پہلے کی طرح۔ جب آپ جائیں تو..... مجھے ہنستے ہوئے الوداع کہیں۔“

”ہنسنا آپ نے میرے لیے بہت مشکل کر دیا ہے حجاب! مجھے لگتا ہے کہ اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔“

”میں اپنے سارے الفاظ واپس لیتی ہوں ہادی۔ اس کے علاوہ بھی آپ جیسے کہیں Apologise کو تیار ہوں۔“

”میں صرف کل کی بات نہیں کر رہا۔“

وہ اپنایت سے بولی۔ ”تو پھر بتا دیجیے نا۔ کس کس بات پر ناراض ہیں آپ؟“

ہے۔ وہ ایک تخلیق کار تھا، بے حد حساس اور زود رنج، اس طرح کی توہین سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا اور اس نے کوئی ایسی سنگین غلطی بھی نہیں کی تھی۔ حجاب ایک بار پھر بغیر کچھ کہے یا بتائے غائب ہوئی تھی۔ چار دن میں اس نے سیکڑوں بار اسے کال کی تھی لیکن رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ انکل فیاض کے ہاں چلا گیا۔ اس کی موہوم امید پوری ہوئی تھی اور گھر کا اندرونی دروازہ خود حجاب ہی نے کھولا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی توقع ہادی کو ہرگز نہیں تھی۔ حجاب کا مٹھائی پھینکنا اور لال بھبھو کا چہرے کے ساتھ شدید غصے میں بولنا..... اس کے لہجے کی کاٹ ابھی تک ہادی کے دل پر آ رہے چلا رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں لیتا تھا لیکن اندر کی حالت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ وہ پہلے بے تحاشا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اس نے روم سروس کے ذریعے بیئر کے دوٹن منگوائے۔ بدبودار سیال اس نے کسی کڑوی دوا کی طرح گلے میں انڈیلا اور پھر بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ نجانے کب ایک روشن پیشانی کا پیچھا کرتے کرتے اسے نیند آگئی۔

وہ دن چڑھے تک سوتا رہا۔ وال کلال پر نظر ڈالی گیارہ بج رہے تھے۔ جاگتے کے ساتھ ہی احساس کی چکی پھر چل پڑی اور اس کے وزنی پاٹ ہادی کے جسم و جاں کو کچلنے لگے۔ لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ اس نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا، دور کہیں بلند عمارتوں اور درختوں کے درمیان بحیرہ روم کا پانی اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ حدنگاہ تک پھیلا ہوا شہر اپنی مصروفیات میں مگن تھا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ اب اس غافل شہر اور اس کے ”غافل“ مکینوں کو چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھا۔ کمرے میں بکھرے ہوئے اپنے سامان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سائنڈ ٹیبل کی دراز میں سے اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

یہی وقت تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے کاغذات واپس دراز میں رکھے اور سوچتے لگا کہ کون ہو سکتا ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ آہستہ سے بولا۔ ”کون؟“

جواب میں پھر ”ناک“ ہی سنائی دی۔ ایک مدہم اور شائستہ سی دستک۔

اس نے دروازہ کھولا اور بھونچکا رہ گیا۔ سامنے وہ کھڑی تھی۔ براؤن چادر میں لپٹی لپٹائی۔ نقاب میں سے بس آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا..... ہادی

”آپ خود جانتی ہیں حب! آپ نے کہاں کہاں دھکا دے کر مجھے پیچھے ہٹایا ہے، غیروں کی صف میں کھڑا کیا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ اس نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں تلے دبایا۔

”ہم اتنے روز اکٹھے ایک ساتھ رہے ہیں۔ جگہ جگہ گھومے ہیں، ہر طرح کی باتیں کی ہیں۔ میں نے اپنے بارے میں آپ کو تقریباً سبھی کچھ بتایا ہے۔ لیکن آپ کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا یہاں سے گزرنے والے کسی راہ گیر کے بارے میں۔“

”اچھا بتائیں، کیا جانتا چاہتے ہیں آپ؟“

”کوئی ایک سوال تو نہیں ہے۔ درجنوں ہیں جو میرے ذہن میں ابھرتے رہے، مجھے کچھ لگاتے رہے۔ یہ سب سوال آپ ہی نے اپنی باتوں سے پیدا کیے لیکن ان کے جواب نہیں دیے اور نہ یہ سوچا کہ میں کس طرح شدید الجھن میں رہوں گا۔۔۔۔۔ یہاں بھی اور یہاں سے جانے کے بعد بھی۔“

”چلیں ٹھیک ہے ہادی! آپ پوچھیے۔ میں آپ کو بتاؤں گی۔“ اس کا انداز مفاہمت کا تھا۔

وہ اب بھی خاموش بیٹھا رہا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ ذرا اداسے بولی۔

”رہنے دیں حجاب! بات تو وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو مجبور کر رہا ہوں۔“

”یعنی اموشن بلیک میل۔۔۔۔۔ نہیں جناب نہیں، ہرگز نہیں۔ میں دل کی گہرائیوں سے سمجھتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں میری کوئی فائدہ نکل آئے۔ آپ مجھے کوئی اچھا مشورہ دے سکیں لیکن۔۔۔۔۔ ایک بات ہے۔“ وہ تذبذب سے بولی۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ کمر مناسب نہیں، یہاں کوئی آسکتا ہے۔ ہم باہر چلتے ہیں، کہیں آرام سے بیٹھیں گے۔“

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ لوگ ویٹی کن سٹی کی خوب صورت فضا میں تھے۔ ویٹی کن کو ایک طرح سے عیسائیت کا سب سے اہم شہر کہا جاتا ہے۔ اسے علیحدہ ملک کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ اس شہر میں سات آٹھ سو کے قریب نہایت منتخب مذہبی پیشواؤں ہی کو رہائش رکھنے کی اجازت ہے۔ ان میں اہم ترین پوپ ہوتا ہے۔ ویٹی کن کا داخلی دروازہ عظیم الشان ہے اور اس کے

سامنے ایک نہایت وسیع و عریض احاطہ ہے جس کی اطراف میں اونچی فصیل پر بے شمار مجسمے ایستادہ ہیں۔ یہ مجسمے زمانہ قدیم کے مختلف پیشوں اور ہنروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ احاطے کے برآمدے میں بلند وبالا دیوہیکل سنتونوں کی قطاریں ہیں۔ حجاب بڑے اشتیاق سے ہادی کو یہاں گھمائی رہی۔ ایک ایک چیز کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے آرٹیکل کے لیے نوٹس بھی لے رہی تھی۔ حجاب کے شوہر جلال اور حجاب کے مزاج میں جو تضادات تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جلال کو سیاحت اور آثار قدیمہ وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اسی دوران میں یورپین لڑکیوں کا ایک گروپ ادھر آ نکلا۔ یہ سرخ و سپید لڑکیاں بڑے خوشگوار موڈ میں تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہادی اور حجاب کو دیکھ کر بے ساختہ اپنا کمر ان کی طرف کر دیا۔ غالباً وہ ایک خوب صورت جوڑے کے طور پر ان کی تصویر اتارنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ ”جوڑا“ نہیں تھے، اور نہ ہی تصویر اتروانے کے موڈ میں تھے۔۔۔۔۔ حجاب تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے اپنا نقاب درست کیا اور فوراً منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ خوش باش لڑکیوں نے ہادی سے درخواست کی کہ اگر اس کی ساتھی نہیں تو وہ ہی تصویر اتروالے۔ ہادی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ تصویر اتروانے لگا تو لڑکیاں ایک گروپ کی شکل میں اس کے ساتھ کھڑی ہو گئیں اور بڑی خوش خلقی کا اظہار کیا۔ ویٹی کن کے وسیع و عریض احاطے سے باہر ایک خوب صورت پارک بیٹھنے کے لیے بہت مناسب تھا۔ یہاں اشوکا کے گھنے درخت تھے اور گارڈنیا کی خوشنما باڑوں پر پھولوں کی بیللیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک تنہا فوارے کے پاس پتھر پر بیٹھ کر چائے پیتے۔

”پوچھیے ہادی! کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ وہ خود بول اٹھی۔

”حب! یہ انسانی فطرت ہے کہ جس کے ساتھ اپنائیت اور لگاؤ ہوتا ہے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے شروع سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ بھی بے حد دباؤ میں ہیں۔۔۔۔۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ جبکہ وہ بیمار بھی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق آپ اور جلال میں دوریاں بڑھانے میں اس لڑکی ارم کا بھی اہم کردار ہے۔“

”آپ نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی۔ کیا آپ نے کچھ دیکھا ہے؟“

”ہاں کچھ دیکھا بھی ہے۔۔۔۔۔ لیکن آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ مجھے کچھ بتائیں۔ آپ کی مشکلات کس نوعیت کی ہیں۔ بہت سے سوال کلبلا تے رہتے ہیں میرے ذہن میں۔ میں سوچتا ہوں آپ سب کے بارے میں۔ خالہ صوفیہ کی اصل بیماری کیا ہے؟ یہ ارم کیوں ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس معاملے میں آپ اور آپ کے گھر والے مناسب مزاحمت کیوں نہیں کر پاتے؟ اور وہ جو تصویر آپ کے گھر میں لگی ہوئی ہے اس کا کیا قصہ ہے؟ جب بھی اس تصویر کا ذکر ہوا میں نے آپ کے چہرے پر گہرے دکھ کا سایہ دیکھا۔۔۔۔۔“

تصویر کے ذکر پر واقعی ایک بار پھر حجاب کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہی۔ جیسے اپنے اندر کی کشش سے نبرد آزما ہو۔ شاید وہیں میں کشش کا یہی وہ لمحہ تھا جب ہادی اٹھ کر منزل وائرلینے چلا گیا تھا اور حجاب اٹھ کر غائب ہو گئی تھی لیکن آج وہ اٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ آج وہ حجاب کی نیم آمدگی کے ان لمحوں کو کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری پھر دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ ”میرے سرالی خاندان کو راؤ خاندان کہا جاتا ہے۔ ہمارا خاندان واپلہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک ہی برادری کی دو شاخیں ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی رشتے داری نہیں ہوتی تھی۔ پاکستان میں نہ پاکستان سے باہر۔ کوئی ایسی دشمنی نہیں تھی لیکن بس ایک طرح کا کھنچاؤ تھا جو شاید ماضی میں زمینوں کے معاملات کی وجہ سے پیدا ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ گجرات میں واپلہ اور راؤ خاندان کی زمینیں ساتھ ساتھ تھیں۔

بہر حال یہاں روم میں ان دونوں گھرانوں میں پہلا تعلق بینش کی شادی کی صورت میں پیدا ہوا۔ یہ بینش میری وہی کزن ہے جس کی تصویر آپ نے میرے کمرے میں دیکھی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو میرے شوہر جلال کا ایک بڑا بھائی فیروز بھی ہے۔ وہ میلانو میں گارمنٹس کا کاروبار کرتا ہے۔ جلال کے برعکس وہ ایک آزاد خیال اور سیلابی شخص ہے۔ بینش کی شادی تقریباً پانچ سال پہلے اس سے ہوئی تھی۔ اس شادی کے بعد ہی دونوں گھرانوں کا آپس میں ملنا جلنا ہوا۔۔۔۔۔ اور پھر میری شادی کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ جب میری شادی جلال سے ہوئی اس وقت تک بینش کا کوئی بچہ نہیں تھا اور وہ نارمل زندگی ہی گزار رہی تھی لیکن پھر بدترج

میاں بیوی میں اختلاف بڑھنے لگا۔ پتا چلا کہ فیروز کو نہ ہی عورتوں میں دلچسپی ہے۔ اس کی اکثر راتیں گھر سے باہر ٹائٹ کلبوں میں گزرتی تھیں اور وہ اٹلی سے باہر اپنے کاروباری دوروں پر بھی اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کسی بھی بیوی کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی۔ بینش میری کزن ہی نہیں میری سب سے گہری سہیلی بھی تھی۔ ہم نے ہوش سنبھالتے ہی ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا اور زندگی کے سارے گرم سرد اکٹھے دیکھے تھے۔ جب بینش کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں آئیں تو اس کا سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہی پڑا۔ یوں تو بینش میلانو میں رہتی تھی اور میں روم میں لیکن ہمارے درمیان فون پر اکثر رابطہ رہتا تھا۔ جب وہ آنسو بہاتی تو وہ میرے دل پر گرتے۔ میں اسے سمجھاتی بجاتی اور بہتری کے لیے مشورے دیتی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ فیروز کی پراپرٹی اور کاروبار اٹلی سے باہر بھی ہے۔ ”آرکن“ کے ایک دو جزیروں پر بھی اس نے چھوٹی موٹی جائیدادیں خریدی تھیں۔ وہ اکثر گھر سے باہر رہتا تھا اور اس کے رہنے کا انداز بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس کا حوصلہ بھی بڑھ چکا تھا اور وہ بینش کے ساتھ بر ملا اپنے افیروز کا اظہار بھی کرتا تھا۔ ایک روز شراب کے نشے میں اس نے بینش کو بری طرح پیٹا اور وہ والدین کے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد چار پانچ ماہ میں نوبت طلاق تک پہنچ گئی لیکن وہ طلاق بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ بینش سیکڑوں میں ایک تھی اور فیروز والدین ان مردوں میں سے تھا جو گھر کی مرغی کو دال برابر تو ضرور سمجھتے ہیں لیکن اسے دال کی طرح پھینکنا نہیں چاہتے۔ وہ ان کی مرغوب غذا ہوتی ہے اور وہ اپنے ”دستر خوان“ پر اس غذا کی ڈش کو بھی برابر سجا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ شاید وہی جاگیر دارانہ سوچ کا اثر۔ عورت ایک ملکیت اور اس ملکیت میں اضافہ۔ بینش نے برداشت کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے خاندان میں ہی کئی لوگوں نے اس کو بہت برا سمجھا۔ دانتوں میں انگلیاں دبائی گئیں۔ مگر حالات کا جائزہ لینے والوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ناجائز مطالبہ نہیں ہے۔ بینش خلع حاصل کرنے میں حق بجانب ہے۔ دوسری طرف فیروز نے صاف کہہ دیا کہ وہ بینش کو طلاق نہیں دے گا۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ وہ اسے ماں باپ کے گھر سے منا کر لے گیا اور وعدہ کیا کہ اپنی روش بدلے گا لیکن حالات میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔ بلکہ کچھ بگاڑ ہی پیدا ہوا۔ وہ شراب میں دھت ہو کر بینش سے مار پیٹ بھی کرتا تھا۔

سرداریاں

سردار۔ ”سردی کچھ زیادہ نہیں ہوئی ہے؟“
دوسرا سردار۔ ”سانس دان کہتے ہیں دنیا گھومتی ہے۔ شاید ہم مری پہنچ گئے ہوں۔“

چوری

ایک چور سردار کے گھر سے چوری کرتا ہے۔
چوری کر کے بھاگتا ہے تو سردار کی آنکھ کھل جاتی ہے
اور وہ بھی اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ بھاگتے بھاگتے
چور سے آگے ہو کر سردار بولتا ہے۔ ”تم ہمارے ساتھ
ریس نہیں لگا سکتے۔“

(مرسلہ: سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ)

کمر کے جن مہروں پر شدید ضرب آئی تھی، ان میں اوپر کے
تین چار مہرے بھی شامل تھے۔ یہی مہرے سانس کی روانی
برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی سانس اکھڑتی جا رہی تھیں۔ وہ
اب رونے چلانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی سانس
اور آواز دونوں رک رہی تھیں، مگر وہ اپنے معصوم کو بچانا
چاہتی تھی۔ موقع سے جو ثبوت ملے ان سے پتا چلا کہ وہ آخر
وقت تک اپنے بچے کو اپنے ساتھ لپٹاتی رہی، اس کو اپنا
دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے اپنے جسم سے بھی
خون رس رہا تھا لیکن وہ بچے کے زخم سے خون روکنے کی
کوشش کر رہی تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی تپائی کے پاس بہت سے
خون آلود ٹشو پیپر پڑے ملے۔“

حادثے کے قریب ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے اپنے
جاں بلب بچے سمیت بیرونی دروازے کی طرف ریٹگنے کی
کوشش بھی کی لیکن چند فٹ ملے کرنے کے بعد بے بس
ہوئی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ریڑھ کی ہڈی نے اسے بے بس کر
دیا تھا۔ ارسلان کا بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ سات ماہ کے
معصوم میں خون ہوتا ہی کتنا ہے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی
تھی۔ ماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ کس کرب سے
گزری ہوگی۔ ہادی آپ تصور کریں۔“ وہ سکنے لگی۔
ہادی نیکر خاموش تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کرب
ناک لہجے میں بولی۔ ”وہ دونوں مر گئے ہادی۔ پہلے کون
مرا ہوگا؟ پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بینش
کے چہرے پر کرب اور ماتم کی جو کیفیت تھی اس سے یہی
اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے شیرخوار ارسلان نے پہلے دم
توڑا۔ ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق بینش قریباً ڈیڑھ

بلی۔ غالباً اس کی ساڑی کا پلو اس کے پاؤں کے نیچے آیا
اور وہ انیس بیس سیزھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آگری۔ اس
کی کمر اور سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔
دوسری طرف فیروز آگ بگولا حالت میں باہر پورچ میں
آ گیا اور ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ اس
کے بعد بے ہوش ماں اور شیرخوار بچے کے لیے ایک
دردناک صورت حال شروع ہو گئی۔ ایسا واقعہ جس نے سب
کو لرزا کر رکھ دیا۔ بینش سیزھیوں کے نچلے سرے پر بے
ہوش پڑی تھی۔ شیرخوار ارسلان پہلے تو بہت دیر قالمین پر
بیٹھا رہا، پھر رونے لگا اور آنسوؤں کی زبان میں ماں کو
پکارنے لگا۔ اسے بھوک لگی تھی۔ یوں تو گھر میں ایک ملازم
اور ملازمہ ہوتے تھے مگر کمرس کی وجہ سے وہ بھی چھٹی پر
تھے۔ گھر میں ماں بیٹے کے سوا اب اور کوئی نہیں تھا۔ ننھا
ارسلان بھوک سے بے تاب ہو گیا تو ہاتھ پاؤں پر ریٹگتا ہوا
سیزھیوں کی طرف آ گیا۔ اس معصوم نے سیزھیوں کے
آخری سرے پر اپنی ماں کی جھلک دیکھی ہوگی۔ وہ اس سے
دور کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ تو اس کی ہر مصیبت کا مداوا اور ہر مسئلے
کا حل تھی۔ وہ کچھ دیر سیزھیوں کے اوپری سرے پر رکا
اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا،
اس معصوم نے آگے بڑھنا چاہا اور لڑھکتا ہوا اپنی بے ہوش
ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ سیزھیوں
کے نچلے سرے پر تانے کے گیلے میں ایک ”ان ڈور“ پودا
رکھا تھا۔ چوکور گیلے کا جھکنا کنارہ کم سن ارسلان کی پسلیوں
میں لگا تھا اور وہاں گہرا کٹ آ گیا تھا۔ اس کا کول بدن خون
اگل رہا تھا، بہر حال وہ ہوش میں تھا۔ ماں کے پہلو میں سما کر
رویا چلایا تو ماں کی بے ہوش، نیم بے ہوشی میں بدل گئی۔
کچھ دیر بعد وہ مکمل ہوش میں آ گئی مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی
میں فریکچر ہو چکے تھے۔ ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی اور ناک منہ
سے خون رس رہا تھا۔ اپنے خوچکاں بچے کو دیکھ کر وہ روئی
پکاری لیکن اس کی اور اس کے شیرخوار کی آواز سننے والا کوئی
نہیں تھا۔ باہر برف گر رہی تھی اور کھڑکیاں دروازے بند
تھے۔ باہر کے لوگوں سے رابطے کا واحد ذریعہ بس ایک سیل
فون تھا اور یہ سیل فون فیروز سیزھیوں پر شیخ کرنا کارہ کر چکا
تھا۔ مصیبت زدہ ماں کسی طرح ریٹگتی ہوئی اور اپنے پیچھے
خون کے نشان چھوڑتی ہوئی سیل فون تک پہنچی لیکن وہ اس کی
تقدیر کی طرح اسے دھوکا دے چکا تھا۔ وہ پھر ریٹگتی ہوئی
واپس اپنے بچے کے پاس آئی۔ ماں اور بچہ دونوں نازک
حالت میں تھے۔ ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بینش کی

کی زندگی کے بیس پچیس سال تو اس کے میکے میں ہی
بکھرے ہوتے ہیں۔ تا۔ اگر کوئی سخت دل شوہر یہ توقع کرے
کہ وہ چند مہینوں کے اندر زندگی کے اس حصے سے ہرنا ہوتا
لے گی اور اپنے دل و دماغ کو صرف اپنے سسرال اور وہاں
کے رہن سہن تک محدود کر لے گی تو یہ اس کی بے وقوفی ہی
ہے۔ یہ ہو بھی جاتا ہے لیکن اس میں کچھ وقت لگتا ہے
دوسری طرف فیروز چاہتا تھا کہ سب کچھ آنا قابغہ
ہو جائے۔ بینش بھی کبھار ماں اور بھائیوں سے فون پر بات
کر لیتی تھی۔ فیروز کو یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے بینش کے
فون کرنے پر بھی مکمل پابندی لگا دی۔ بینش نے فیروز کی
سب پابندیاں قبول کی تھیں مگر یہ پابندی مکمل طور پر قبول کرنا
اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ پہلی حکم عدولی تھی جو اس نے
کی۔ وہ کبھی کبھار چوری چھپے ماں اور بھائیوں سے فون پر
بات کرتی رہی۔ درحقیقت بینش کی یہی ”جسارت“ تھی جو
ایک دن اس کی موت کا سبب بن گئی۔ وہ اپنے ماں جائیوں
کی آواز سننے کی خواہش میں موت کی وادی میں اتر گئی۔ اس
کے مرنے کی کوئی عمر نہیں تھی ہادی! وہ تو جیسے ابھی زندگی
شروع کر رہی تھی۔ پھول سا بچہ تھا اس کا۔ اتنا پیار کرتی تھی
اس سے کہ میں کیا بتاؤں۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی چلے
گئے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں، ایک دوسرے کی
سسکیاں سنتے ہوئے اور ایک دوسرے کے خون میں
لتھڑے ہوئے۔“ حجاب کی آواز بند ہو گئی۔ وہ سکنے
لگی۔ آنسو نقاب کے اندر ریٹگنے لگے۔
کچھ دیر بعد ہی ہادی نے پوچھا۔ ”کس طرح ہو
یہ سب؟“

”وہ کمرس کے دن تھے۔ دو تین روزہ گئے تھے۔
سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بینش کی والدہ بیمار تھیں۔ بینش کے
پاس ایک سیل فون موجود تھا۔ فیروز آفس چلا گیا تو بینش نے
والدہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا۔ اس
دوران میں فیروز واپس آ گیا۔ وہ اپنا کوئی کاغذ بھول گیا
تھا۔ غالباً کوئی نقشہ وغیرہ۔ ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ساتھ
اور برآمدے میں کھڑا تھا۔ فیروز نے بینش کو فون کرنے
دیکھا اور شیخ پا ہو گیا۔ اس نے بینش پر تھپڑوں کی بارش
کردی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر سیزھیوں پر پڑی
دیا اور چلایا ”میں مار دوں گا۔ تمہیں جان سے مار دوں گا۔“
دونوں کو ختم کر دوں گا۔“ وہ دندناتا ہوا سیزھیاں اتر گیا۔
دہشت زدہ بینش نے سمجھا شاید وہ اسٹدی میں سے
پستول وغیرہ نکالنے گیا ہے۔ وہ روئی بلکتی اس کے پیچھے

اسی دوران میں بینش ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ اٹلی میں
قانون کچھ سخت ہیں۔ بینش عدالت سے رجوع کرتی تو اسے
بہ آسانی طلاق مل جاتی لیکن فیروز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس
نے بینش کو ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا۔ چہرہ بگاڑنے کی
دھمکیاں دیں۔ آخر یہاں تک کہہ دیا کہ وہ سات ماہ کے
بچے کو لے کر کہیں غائب ہو جائے گا اور وہ زندگی بھر اس کی
صورت کو ترستی رہے گی اور اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ
جنونی سب کچھ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بینش نے حالات
سے سمجھوتا کر لیا اور ہر طرح کا جبر سہتہ ہوئے فیروز کے ساتھ
ہی رہنے لگی۔“

ذرا توقف کر کے حجاب نے اپنی آنکھوں کے غم
گوشتے پونچھے اور چادر کا نقاب درست کرنے میں مصروف
ہو گئی۔ ہادی نے پوچھا۔ ”بینش کے گھر والوں کا اس
معاملے میں کیا کردار رہا؟“

حجاب بولی۔ ”والد تو بینش کے تھے نہیں۔ والدہ اور
دو بھائی تھے۔ ایک بڑا ایک چھوٹا۔ بڑے بھائی کے ساتھ
بھی فیروز کا سخت جھگڑا ہوا تھا اور نوبت پستول نکالنے تک پہنچ
گئی تھی۔ اس جھگڑے کے بعد فیروز نے بینش کا میکے گھر میں
آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ صرف اس کی ماں کو اجازت تھی
وہ کبھی کبھار آ کر مل جاتی تھی۔ بہت کھن حالات تھے وہ
بینش کے لیے۔ اگر..... اگر میری شادی سے پہلے اس طرح
کے حالات کی کوئی جھلک نظر آتی ہوتی تو شاید اس کی پہلی
میری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہ جاتا۔ بد قسمتی یہی
تھی کہ میری شادی ہونے تک بینش اور فیروز کے معاملات
میں بہ ظاہر کوئی خرابی دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید اختلافات
ابھی اس اسٹیج پر نہیں پہنچے تھے کہ چار دیواری سے باہر
نکلنے۔“ حجاب کی آنکھوں میں گہرا تاسف پھیل گیا جیسے وہ
تقدیر کی اس ستم ظریفی پر دل کی گہرائیوں سے دکھ محسوس
کرتی ہو۔

”جب یہ معاملات بگڑے تو آپ کو اپنی گھریلو زندگی
کے بارے میں بھی اندیشے پیدا ہوئے ہوں گے؟“ ہادی
نے پوچھا۔

”بس مجھے اتنی تسلی تھی کہ جلال کا ذہن اور طرح کا
ہے۔ ان کے گھر میں اور ان کے اپنے اندر مذہبی رنگ
نمایاں تھا۔ اور اب بھی ہے۔“ وہ مزید کچھ کہتے کہتے
خاموش ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ بینش والے موضوع پر
آتے ہوئے بولی۔ ”مہن بھائیوں کا رشتہ آسانی سے
چھوٹنے والا نہیں ہوتا۔ لڑکی سسرال میں آ جاتی ہے مگر اس

خراب تر ہو رہا ہے۔ اکثر اوقات وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کی سخت توہین بھی کر جاتا ہے۔ وہ خاص طور سے اپنی والدہ کی طرف سے پریشان ہو رہی ہے۔ وہ بولی۔ ”والدہ بیمار ہیں اور ان پر یہ حالات بہت برا اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں بیش والی بات بیٹھ گئی ہے۔ ان کے دل میں ہر وقت یہ وہم رہتا ہے کہ نہیں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی نہ ہو جائے۔ آخر تو جلال بھائی ہے تا فیروز کا۔ میرے خیال میں امی کی تکلیف بڑھانے میں ان سوچوں کا بھی بڑا دخل ہے۔“

”والدہ کی بیماری کیا ہے حب؟“ ہادی نے دریافت کیا۔ ”ان کے برین میں رسوئی تھی۔ پہلے تو یہ خدشہ تھا کہ یہ کیفر کی کوئی قسم ہے۔ ان کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور بیٹھے بیٹھے ایک دم بے ہوش بھی طاری ہو جاتی تھی مرض کو ڈائیکووز کرنے کے لیے بہت سے ٹیسٹ ہوئے۔ یقین کریں ہادی! یہ درجنوں ٹیسٹوں ٹیسٹ تھے۔ ان میں سے کئی بے حد تک تھے۔ اس سلسلے میں امی کو دوبارہ آسٹریا بھی لے جانا پڑا۔ اس کے بعد آپریشن کا مرحلہ آیا۔ دو مہینے میں ان کے ٹین آپریشن ہوئے تھے۔ یہ سارے دو سال پہلے کے واقعات ہیں۔ اس سارے علاج معالجے میں بہت زیادہ اخراجات اٹھے۔ ابو جان کو اپنا ایک مہنگا فلیٹ نبٹا کم قیمت پر بیچنا پڑا۔ یہ گھر بھی، جس میں رہ رہے ہیں مجھیں کہ گروی پڑا ہوا ہے۔ ابو کو کافی رقم قرض بھی لینا پڑی، اس قرض کے بوجھ نے ابو اور بھائی کو بری طرح دبا رکھا ہے۔“

”خالہ صوفیہ کی طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟“ ہادی نے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ اب ٹھیک ہیں۔ معمول کی دوائیاں لے رہی ہیں۔ ایک قریبی اسپتال میں ہفتہ وار معائنہ بھی کراتی ہیں۔“

ہادی کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ اسپتال کی انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہوں نے ہادی سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی اس بے ہوشی کے بارے میں ان کے گھر میں کچھ نہ بتائے۔ اس کا مطلب تھا کہ خالہ صوفیہ کی طبیعت اتنی اچھی بھی نہیں تھی جتنا حجاب بتا رہی تھی۔

وہ کافی دیر ان موضوعات پر بات کرتے رہے۔ ہادی نے کہا۔ ”حب! اس روز میں نے آپ سے کہا تھا کہ ارم کی طرف سے آپ کو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک

ہیں جو برداشت کے قابل نہیں ہوتیں۔ اس وقت میں سخت اذیت میں آ جاتی ہوں۔“

”نہیں آپ کا اشارہ ارم کی طرف تو نہیں؟“

اس نے چونک کر ہادی کو دیکھا۔ ”آپ بار بار ارم کی بات کیوں کرتے ہیں؟“

”میں آپ کو بتاتا ہوں، پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔“

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ”آپ کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ ہماری زندگی میں دخل اندازی کر رہی ہے۔“

”میرے خیال میں دخل اندازی چھوٹا لفظ ہے جب۔۔۔۔۔ وہ بہت کچھ کر رہی ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”آپ نے وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ بات اپنے تک رکھیں گی۔ ارم سے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کریں گی۔ میں نے کسی سے کٹ منٹ کر رکھی ہے کہ اس کا راز رکھوں گا۔“

اس کی آنکھوں میں گہرا انگیز تجسس ابھرا، بہر حال اس نے ہادی سے وعدہ کیا کہ وہ یہ بات صرف اپنے تک محدود رکھے گی۔ اس کی آنکھوں میں اس بات کی گواہی نظر آرہی تھی کہ وہ بات نبھانے والی لڑکی ہے۔ ہادی نے مناسب الفاظ میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو چند روز پہلے پیش آیا تھا۔ گلزاری کا مسلسل پیچھا کرنا۔۔۔۔۔ پھر ہول کے کمرے میں ہادی کا اسے گھیرنا، ڈپٹی ہاشم ایرک کا آنا، گلزار کا سب کچھ اگلا اور پھر اس کے ساتھ ہادی کی ڈیل۔ ہادی نے سب کچھ حجاب کے گوش گزار کر دیا۔ بہر حال گلزار کی شناخت اس نے چھپائی۔ وہ ہکا بکا سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت تھی۔

آخر میں وہ قدرے ہراساں نظر آنے لگی۔ ”ہادی! کہیں اب بھی تو کوئی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔“ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔ وہ بندہ بھی معاہدے کی مکمل پابندی کر رہا ہے۔“

حجاب کو مطمئن کرنے میں ہادی کو دس پندرہ منٹ لگے۔ ہادی نے جو تذکرہ کیا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حجاب کچھ اور کھل گئی۔ اب تک اس نے بے حد محتاط لہجے میں بات کی تھی مگر اب اس کا لب و لہجہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے یہ بات تسلیم کی کہ اس ارم کی وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی خطرے کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ جلال کا رویہ دن بدن

جیسے احساس ہوا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گئی ہے۔ ہادی نے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جو کہنے والی تھی وہ کسی حد تک ہادی کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ دونوں بھائی زندگی سے وہ سب کچھ حاصل کر رہے تھے جو کر سکتے تھے۔ فرق صرف طریقہ کار کا تھا۔ ایک تو تھا ہی آزاد خیال اور زندگی سے ہر طرح کی لذتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا اندیشہ تھا لیکن ہر طرح کی آسائشوں کے حصول کے لیے اس نے بھی درمیانی راہیں ڈھونڈ رکھی تھیں۔

بینش والے واقعے نے ہادی کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ واقعی یہ جھجھوڑ دینے والا حادثہ تھا (اگر اسے حادثہ کہ جائے تو) فیروز نے بڑی بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ بینش کو اتنی سی بات (یا جسارت) کی خوفناک سزا ملی کہ وہ اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ رکھنا چاہتی تھی۔ حادثے سے چند لمحے قبل وہ بینش کا سیل فون توڑ کر چلا گیا اور یہ سیل فون بینش کے پاس رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ اگر وہ ایسویکس سروس یا کسی پڑوسی کو کال کر سکتی تو ماں بیٹے کی جان بچ سکتی تھی۔ وہ خون میں لت پت قریباً چار گھنٹے تک بے یار و مددگار گر اڑا۔

فلور پر پڑے رہے اور دم توڑ گئے۔

ہادی اور حجاب کتنی ہی دیر بالکل گم صم بیٹھے رہے۔ آخر ہادی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”اب کہاں ہے یہ فیروز الدین؟“

آج کل ”نپلز“ میں رہ رہا ہے۔ وہی عیاشیاں چل رہی ہیں۔ بینش کی موت کے یہ مشکل دس ماہ بعد اس نے دوسری شادی بھی کر لی تھی۔ اس کے لیے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہوگا۔ کچھ مرد بڑے پتھر دل والے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان میں سے ایک ہے۔“

”اور جلال؟“

”کیا مطلب؟“

”یہ کس طرح کے مردوں میں سے ہے؟“ ہادی نے بے باکی سے پوچھا۔

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ وہی تذبذب، جو بینش والا واقعہ ستانے سے پہلے اس کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ ہادی نے بڑے تحمل سے اس تذبذب کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ اسے یقین سا تھا کہ اب جب حجاب نے بتانا شروع کیا ہے تو وہ اور بھی بتائے گی۔ اس کا اندازہ کافی حد تک درست نکلا۔ حجاب نے کہا۔ ”جلال بھی سخت مزاج ہیں، ایک بچی کی حیثیت سے میں اپنا فرض جانتی ہوں کہ ان کی ہر طرح کی سختی کو برداشت کروں مگر۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ایسی مانتیں بھی ہوتی

گھنٹا مزید زندہ رہی۔ اس کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی۔۔۔۔۔“ حجاب کی آواز بیٹھ گئی۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر سنبھال نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”ہاں ہادی! وہ دونوں مر گئے سبک کر۔۔۔۔۔ اور وہ دفتر میں بیٹھا اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ پراپرٹی کے نقشے دیکھتا رہا۔ اس واقعے کی نیوز میڈیا پر بھی آگئی۔ اخباروں میں بھی شور مچا۔ بہت لے دے ہوئی، ماں بچے کی اس دردناک موت نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ فیروز گرفتار ہوا لیکن اگلے ہی روز ضمانت پر رہا ہو گیا۔ اس کے خلاف کوئی شہس ثبوت نہیں تھا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ مجرمانہ غفلت کا الزام لگ سکتا تھا۔ وکیل صفائی اسے سراسر حادثہ قرار دے رہا تھا۔ جس وقت فیروز اور بینش میں جھگڑا ہوا اور فیروز نے بینش کا سیل فون سیڑھیوں پر پھینک کر توڑا، فیروز کا ڈرائیور نیچے برآمدے کے ساتھ کاسن روم میں کھڑا تھا۔ اس نے عدالت میں سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔ فیروز کو عدالت سے صرف چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ بینش اور ارسلان کی موت ہمارے دلوں پر گہرے زخم چھوڑ گئی۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ جسم روح سے خالی ہو گیا ہے اور میں بس کسی روبوٹ کی طرح چلتی پھرتی رہتی ہوں۔ وہ میرے بہت قریب تھی۔ اس کے بغیر میں نے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔ ان دنوں میں نے خود کو گھر میں قریباً بند کر لیا تھا۔ میں گھر سے باہر اور روم میں جہاں کہیں نکلتی تھی مجھے بینش کی یادیں بکھری نظر آتی تھیں۔ ہمارا اسکول، ہمارا کالج۔۔۔۔۔ وہ سڑکیں جن پر ہمارے قدم پڑے تھے، وہ ریسٹوران جہاں ہم نے کھانے کھائے تھے اور وہ تفریح گاہیں جو ہماری بے مثال دوستی کی گواہ تھیں۔“

کئی ماہ بعد، اپنے گھر اور جلال کے لیے میں خود کو یہ مشکل سنبھال پائی تھی۔ فیروز جلال کا بھائی تھا لیکن جلال سے بہت مختلف۔ وہ نت نئے فیشن کے لباس پہنتا تھا، شراب پیتا تھا، کلبوں میں جاتا تھا۔ دوسری طرف جلال ایک مذہبی شخص ہے۔ اس نے کسی غیر صاحب کی بیعت بھی کی ہوئی ہے۔ وہ بھی کافی دولت مند شخص ہیں۔ جلال ان کے ساتھ تبلیغی دوروں پر بھی جاتا ہے۔ ظاہری حیلے سے لے کر لباس اور رہن سہن تک بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ مذہبی رنگ کو نمایاں رکھتا ہے۔ لیکن دونوں بھائی میں اس بے انتہا فرق کے باوجود کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے

جاسکتی ہے۔“

”ہاں ہادی! اس بات کا تو مجھے بھی علم تھا کہ وہ دن بدن کھلتی جا رہی ہے اور نڈر بھی ہو رہی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اوجھے جھکنڈوں پر اتر آئے گی۔“

ہادی نے اس کی جھیل آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”حب! آپ نے مجھے ایک اچھے دوست کا درجہ دیا ہے۔ میں اسی پر خوش اور مطمئن ہوں۔ اگر آپ کو اپنے معاملوں میں کسی بھی طرح کا مشورہ یا مدد درکار ہو تو میں دل و جان سے حاضر ہوں، پورے اخلاص کے ساتھ۔“

”نہیں ہادی! آپ نے مجھے بتائے بغیر میرے لیے بہت کچھ کیا ہے، خطرہ مول لیا ہے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن..... میں آپ کو اپنی زندگی کے کانٹوں میں نہیں گھسیٹ سکتی۔ یہ جو کچھ بھی ہے اس کا سامنا مجھے ہی کرنا ہے۔“

”بیگانہ سمجھ رہی ہیں نا؟“
”نہیں، زیادہ اپنا سمجھ رہی ہوں۔ جو زیادہ اپنا ہوتا ہے اس کی سلامتی کا اتنا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ میرے دکھ سکھ میں شریک ہوتے رہے ہیں، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے..... اور ہادی! جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس کے بعد تو ہمیں اور محتاط ہو جانا چاہیے..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دوسرے سے اب نہ ملیں۔ جب تک آپ یہاں ہیں، ہم فون پر بات کر سکتے ہیں۔“

ہادی ایک دم گم سم ہو گیا۔ یہ وہی ناراضی والی کیفیت تھی جس کے بعد حجاب ہول پکٹی تھی اور یہاں اس کے ساتھ ویٹی کن میں آئی تھی۔ وہ فطرتاً ایک حساس لڑکی تھی۔ وہ فوراً بولی۔ ”اچھا آپ پھر خفا ہونے کی کوشش نہ کریں۔ میں وعدے کے مطابق پرسوں آؤں گی۔ شاپنگ میں آپ کی مدد کروں گی۔ اس کے بعد ہم اس دن ملیں گے جس سے اگلے دن آپ نے جانا ہوگا۔“

”اوکے۔“ ہادی لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

وہ جان چکا تھا کہ حجاب جو کچھ بتا رہی ہے حالات اس سے کہیں زیادہ برے ہیں۔ میاں بیوی میں بہت بڑی خلیج پیدا ہو چکی ہے اور اس خلیج میں چالباز ارم اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ سامنی ہے یا سامنے کی کامیاب کوشش کر رہی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا ہادی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ ہوتا یا نہ ہوتا، حجاب کے متعلق ہادی کے جذبات وہی رہتے تھے، جو تھے۔ یہ لڑکی کون تھی، اس کی ازدواجی حیثیت کیا تھی۔ اس کے مسائل اور اس کے قرب و جوار کیا

تھے؟ ان سب سے قطع نظر ہادی کو یہی لگتا تھا کہ یہ صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی ہے..... اور کوئی ہادی کے اندر صدیوں سے کسی راہ گزر پر بیٹھا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنی تمام تر ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں اتر چکی تھی، اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی..... وہ یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی دیوانگی کا اتنا لمبا سفر بھی طے کر سکتا ہے..... تو کیا پھر وہ صدیوں والی بات درست تھی۔ وہ بہت پہلے سے اسے جانتا تھا، اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا اور نقد پر اسے اس سے ملانے کے لیے نہروں کے شہر وینس میں پہنچ لائی..... اور اس جادوئی شب میں دونوں سر راہ مگر آگئے۔

اب سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ ویٹی کن کے عظیم الشان دروازے پر دو گھڑیاں لگے تھے۔ ایک درست وقت بتا رہا تھا، یعنی سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ دونوں نے وہیں پارک میں بیٹھے بیٹھے ریڈی میڈ بیچ کیا تھا۔ چکن ڈونر اور ساتھ میں کوک کے ٹھنڈے ٹن، باتوں میں وقت کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سیاحوں کی ٹولیاں پارک میں چکرار ہی تھیں، رومانی جوڑے ”چہل قدمیاں“ کر رہے تھے اور ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ سارے جوڑے میل اور فی میل نہیں تھے۔ آہ، یہ مغربی تہذیب کی اندھی پستیاں۔

مدھم سی ہوا شمالاً جنوباً چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس میں مولسری اور گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔ دور کچھ فاصلے پر سرد اور سفیدے کے بلند و بالا درخت لہلہاتے تھے اور ان سے اوپر گہرا نیلا آسمان تھا جس پر پرندے اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ حجاب بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ ایک اور ملاقات ختم ہونے جا رہی تھی۔ اب انہیں پرسوں ملنا تھا اور پھر شاید چار پانچ دن بعد۔ پتا نہیں کیوں ہادی اس دن کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

وہ میٹرو میں بیٹھ کر واپس آئے۔ اپنے ہوٹل کے قریبی اسٹیشن پر ہادی اتر گیا، حجاب بیٹھی رہی اور خدا حافظ کہہ کر آگے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر بھی ہادی کو چین نہیں آیا۔ وہ لکڑی کے فرش پر بے قراری سے ٹپکتا رہا۔ یہ دابلہ اور راؤ خاندان کی کہانی تھی۔ دابلہ خاندان کی دو لڑکیوں کو یکے بعد دیگرے راؤ خاندان میں بدترین حالات پیش آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو جان کی بازی ہار چکی تھی اور دوسری شاید دھیرے دھیرے اس طرف بڑھ رہی تھی۔ آج ہادی نے حجاب کی پرکشش آنکھوں کے گرد حلقے سے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے اندر بھی بے قرار شب

وروز کی گواہی موجود تھی۔ اس نے اب تک اس گھر میں بہت کچھ برداشت کیا تھا لیکن اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ اس کے لیے قابل برداشت نہیں تھا۔ وہ جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ چھوٹا بھائی بھی اسی راہ پر چل رہا تھا جس پر بڑا بھائی چلا تھا۔ بس دونوں کا انداز مختلف تھا۔ کیا اس حسین منکراہٹ والی لڑکی کے ساتھ بھی کچھ ہونے والا ہے۔ اس کی جبین کا چاند امداد کی کالی راتیں نگل لیں گی۔ وہ سوچتا تھا تو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خون رسنے لگتا تھا۔ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا..... ہاں، وہ ہو چکا تھا، کسی کافی کے بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ لگن لاگی..... موہے لگن لاگی۔

اس کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف فریہ اندام ظہیر کی خوش باش آواز تھی۔ ”ہادی بھی، یہ تو کوئی بات نہیں۔ تم روم میں ہو اور لگتا ہے کہ لاہور میں ہو اور جب لاہور میں پہنچ جاؤ گے تو پھر ہم کسی دوسری دنیا کے باشندے کہلا سکیں گے۔ کوئی رابطہ ہی نہیں ہے ہم سے۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ظہیر بھائی، آپ حکم کریں۔“
”ہم نے حکم کیا کرنا ہے۔ حکم تو فن کار کرتے ہیں۔ پرستار تو صرف التجا میں ہی کر سکتے ہیں۔ پلیز چند منٹ..... پلیز چند شعر..... پلیز آؤ گراف۔“

”اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ اس دن ذرا مصروف تھا۔ اب بتائیے کیا کرنا ہے مجھے؟“

”کچھ بھی نہیں بھائی میرے..... دو تین چاہنے والے ہیں تمہارے، بلکہ ایک چاہنے والی بھی ہے، گھبراؤ نہیں بڑی عمر کی ہیں۔ یہ تم سے ملیں گے۔ تھوڑی سی گپ شپ کریں گے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے شام کو آ جائیے۔“
”نہیں، کھانے کے ٹائم آئیں گے اور کھانا بھی ان ہی کی طرف سے ہوگا بہر صورت۔“

”چلیں جیسی آپ کی مرضی۔“
”مگر ایک شرط ہے۔ اپنی کوئی نئی چیز سنانا پڑے گی جنہیں اور کوئی ڈراما نہیں چلے گا۔ وہ جو محترمہ ہیں انہوں نے آپ کو سر سے پیر تک پڑھا ہوا ہے۔ جس ادبی نشست میں آپ نے شائقین کو اپنے پرانے کلام پر ٹر خایا تھا، اس میں بھی یہ موجود تھیں۔“

”اوکے ظہیر بھائی کوشش کروں گا۔“ ہادی نے کہا۔
کہنے کو تو اس نے نئی چیز کا کہہ دیا تھا، مگر وہ جانتا تھا

کہ اس کے لیے کچھ نیا لکھنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک شیخو صاحب کو ناراض نہ کرتا چلا آ رہا ہوتا۔ وہ بہت بڑے مہربان تھے اس کے۔ ہر برے بھلے وقت میں کام آنے والے۔ اس نے یونہی دراز سے ایک ڈرائنگ پیڈ نکالا اور اس پر انگلیوں سے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ وہ شعر سوچ رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ شعر لکھا نہیں جائے گا۔ لیکن پھر اچانک اس پر انکشاف ہوا۔ اسے لگا کہ وہ لکھ سکتا ہے..... زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت لکھ سکتا ہے۔ وہ کیفیت جو اس نے بہت عرصے سے کھو رکھی تھی..... آج پھر اس پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، لکڑی کے دیدہ زیب فرش پر ٹپکتے لگا۔ اس کی طرح موزوں ہو رہی تھی۔ اس نے پہلا شعر لکھا..... ایک عرصے بعد، ایک طویل وقفے کے بعد اس شعر میں اس محبت کا ذکر تھا جو سنگلاخ پتھروں میں سے ایک چشمے کی طرح پھوٹی ہے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنے من چاہے راستے پر بہنے لگتی ہے۔ اس کا تعلق جسم سے اتنا نہیں ہوتا، جتنا روح سے ہوتا ہے۔

اس شعر کو کاغذ پر اتارنے کا مرحلہ آیا تو نجانے کیوں ہادی کو اس قلم کا خیال آ گیا جو حجاب نے وینس میں اسے یہ طور تحفہ دیا تھا۔ اس نے اپنے اپنی کی پاکٹ میں سے وہ قلم نکالا۔ اس کے لمس نے اس کی پوروں کو چھوا تو جیسے انگلیوں سے ایک راستہ سیدھا اس کے دل تک پہنچ گیا۔ وہ خوش تھا اور حیران بھی۔ سوچنے لگا کیا تخلیق کے بند در پھر اس پر وا ہو رہے ہیں؟ اس لڑکی کی بدولت جو کہانیوں کے شہر روم کی انگوٹھی میں ایک بے مثال نگینے کی طرح تھی۔

☆☆☆

ہادی کے بارے میں اپنے خیالات خود حجاب کی سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ایک بہت پیارے دوست کی حیثیت سے اس کے سامنے آیا تھا اور اس نے اپنی افادیت ثابت کی تھی۔ بہر حال حجاب کے احساسات میں کسی طرح کی رومانیت کو دخل نہیں تھا۔ وہ بس اسے ایک مخلص اور محبوب ساتھی کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ اس کی قربت میں اسے سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ایک شاعر تھا لیکن ایک مضبوط اور چارہ گر شخص بھی تھا۔ نجانے کیوں حجاب کو اپنے ارد گرد ایک مضبوط مرد کی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اس کے ابو کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے بالکل اور طرح کے شخص تھے۔ اس کے ایک ماموں، جو کسی وقت دہنگ ہوا کرتے تھے۔ اب طویل عرصے سے بیمار تھے۔ بھائی فیصل ایک دبلا پتلا لڑکا تھا۔

اپنے دفتری کام میں مگن رہنے والا اور زندگی کی ہنگامہ خیزیوں سے گھبرانے والا۔ ہادی میں حجاب کو کچھ اور طرح کی جھلک نظر آتی تھی، مگر پھر بھی جو کچھ ہو رہا تھا وہ بہت ڈرانے والا تھا۔ ارم کی خباثت اب بالکل کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ اوجھے ہتھکنڈوں پر اتری ہوئی تھی۔ اس نے حجاب کے خلاف جو سازش کی وہ ہادی کی وجہ سے ناکام ہوئی لیکن اس کے خطرات پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔ اگر کسی بھی طرح جلال تک یہ بات پہنچ جاتی کہ حجاب اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلے، نہ صرف نکلے بلکہ ایک غیر مرد سے ملی ہے تو وہ اس کا بہت بڑا ہتھکنڈا بناتا اور حجاب کے لیے قیامت پیا کر دیتا۔ حجاب بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ پرسوں اگر ہادی سے ملی تو اسی ملاقات میں اسے الوداع بھی کہہ دے گی۔ کوئی ایسا محقول عذر پیش کر دے گی کہ وہ دوسری ملاقات پر اصرار نہ کرے۔

اس کے فون کی بیل ہوئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ جلال کا نمبر تھا۔ امی بچن میں تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان پر کچھ بھی آشکار ہو۔ وہ کال ریسیو کرتی ہوئی چھت پر چلی آئی۔ جلال کی آواز میں بھاری پن تھا اور وہی خشک سنجیدگی جو حجاب کے دل کی کلی کو کبھی کھلنے نہیں دیتی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ ”تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے حب؟“

”میں فیصلہ کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ فیصلے تو آپ ہی کے ہوتے ہیں۔“

”حب! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے لیے میرے دل میں جو جگہ ہے، وہاں کوئی اور نہیں آ سکتا۔“

”آپ کے دل میں پتا نہیں کتنی جگہیں ہیں۔ میرے دل میں تو بس ایک ہی ہے۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں حب..... ہم تینوں بہت خوش رہیں گے۔ میں تم دونوں کو پورا پورا حق دوں گا۔“

”حق کو آدھا تو آپ نے خود ہی کر دیا ہے جلال! اس کو پورا کیسے کریں گے؟ اور کر بھی دیں گے تو کیسے ہوگا۔ علیحدہ گھر، علیحدہ کار..... علیحدہ نوکروں سے تو یہ حق پورا نہیں ہوتا۔“

”میں تم سے لمبی بحثوں میں الجھتا نہیں چاہتا حب! میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم اپنے ہاتھوں سے کرو۔ اس میں تمہاری مرضی نظر آئے۔ مجھے پتا ہے تمہارا یہ رویہ ارم پر بھی بہت اچھا اثر ڈالے گا۔ وہ ہمیشہ تمہاری عزت کرے گی۔ فرمانبردار رہے گی تمہاری۔“

”میں نے ہمیشہ ”آپ“ سے عزت پانے کی دعائیں کی تھیں، اپنی سوکن سے نہیں۔ آپ مجھے یہ سزا کیوں دے رہے ہیں جلال؟ اگر آپ نے کوئی ایسی سزا دینا ہی تھی تو کچھ برس انتظار کر لیتے۔ شاید کوئی مناسب بہانہ آپ کو مل جاتا۔ اولاد سے محرومی، نرینہ اولاد سے محرومی، میری بیماری..... موت یا پھر کچھ اور۔ آپ اتنی جلدی مجھ پر یہ ستم ڈھانے پر کیوں آمادہ ہو گئے ہیں۔ اب مجھ سے یہ توقع کر رہے ہیں کہ میں اپنی خوشی سے آدھا حق کسی اور کو سونپ دوں گی۔ صرف اس لیے..... صرف اس لیے کہ ڈھائی تین سال میں آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہے اور آپ کو ایک نیا چہرہ اچھا لگنے لگا ہے۔ یہ تو کوئی جواز نہیں جلال! اور اگر ہے تو کیا یہ رعایتیں صرف مردوں ہی کو حاصل ہیں۔ خدا کے واسطے جلال! میرا کوئی تو گناہ بتائیے۔“

وہ توقف سے بولا۔ ”جو بات تو ڈھونڈنے سے کہی مل سکتی ہیں حب! ہماری شادی کو تین برس ہو چکے ہیں، ابھی تک تمہاری گود خالی ہے۔ مجھے جلد بچہ چاہیے، مجھے مستقبل کے سہارے کی ضرورت ہے حب! تمہاری بیٹی میں بے اولادی کا اور دیر سے اولاد ہونے کا رجحان ہے۔ تمہاری بڑی بہن کے ہاں شادی کے نو سال بعد اولاد ہوئی ہے..... اور وہ بھی دو بچیاں ہیں، لیکن..... لیکن میں ایسی باتوں کو جواز نہیں بناتا رہا ہوں حب! اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ کیا پتا تمہاری گود کھل ہی ہری ہو جائے۔ میں صرف اور صرف سچ بیان کر رہا ہوں حب! اور سچ یہی ہے کہ میں ارم سے ”کٹ مٹ“ کر چکا ہوں، ہمیں یہ شادی کرنی ہے.....“

”تو پھر آپ یہ کیوں چاہ رہے ہیں کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری چلاؤں اور وہ بھی مسکرا مسکرا کر۔ آپ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیجیے۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑ دیجیے۔“

”ایک کام جو اچھے طریقے سے ہو سکتا ہے، اسے پرے طریقے سے کرنا کیوں چاہتی ہو۔ جبکہ..... جبکہ میں تمہیں پوری گارنٹی دے رہا ہوں کہ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی پہلے سے بہت بہتر ہوگی۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ بہتر زندگی نہیں چاہیے اور اس بات پر بھی راضی ہو جاؤں کہ آپ جو تکلیفیں مجھے دے رہے ہیں وہ دیتے رہیں۔ اس سے زیادہ بھی دے لیں، مگر دوسری شادی کا ارادہ ختم کر دیں تو پھر؟“

”تم کچھ بھی کر رہی ہو حب! ہمارا مذہب ہمیں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔“

”اجازت دیتا ہے لیکن انصاف کی شرط کے ساتھ..... اور انصاف یہ نہیں ہے کہ ایک جیسی گاڑیاں اور ایک جیسی کوشیاں۔ انصاف میں سب سے اہم چیز ایک جیسی محبت اور چاہت ہے۔ کیا آپ مجھے اور ارم کو ایک جیسی محبت دے سکتے ہیں؟ اپنے دل میں جھانک کر دیکھیے، کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے کہ اس میں تھوڑا بہت فرق آجائے۔ انہیں میں کا فرق ناممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس صورت میں ایک بیوی دوسری کو تھوڑی بہت رعایت دے سکتی ہے۔“

”لیکن اگر وہ یہ تھوڑی بہت..... جی ہاں ”تھوڑی بہت“ رعایت نہ دینا چاہے تو؟“ حجاب کا لہجہ آتشیں تھا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”تو پھر..... دیکھ راتے کھلے ہیں۔ وہ علیحدہ ہو سکتی ہے۔“

”بہت خوب جلال! یعنی اگر آپ کو کسی بھی وقت کوئی حسین چہرہ پسند آ جاتا ہے تو آپ اپنی پہلی بیوی کو مجبور کریں گے کہ وہ یا تو اپنے حق میں کی کو تیار ہو جائے یا طلاق لے لے۔ کیونکہ انصاف کی اہم ترین شرط پوری کرنا یعنی ایک جیسی چاہت دینا آپ کے بس میں نہیں ہے۔“

”یہ سیدھی سیدھی بات ہے۔“

”یہ سیدھی سیدھی بات نہیں ہے۔ ہمارے مذہب میں مرد کو زیادہ شادیوں کی اجازت ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے درمیان انصاف نہیں کر سکو گے..... اور حالات میں خرابی کی نوبت آئے گی تو پھر ایک ہی بیوی کافی ہے۔“

”تم بات کو اور بحث کو بڑھا رہی ہو حب..... اور میں نے یہ وقت تمہیں اس لیے دیا تھا کہ تم بات کو اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔“

”میں کیا کوشش کروں۔ میں اپنے گھر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹا دیکھ رہی ہوں۔ وہ..... بدنیت عورت ہے جلال..... وہ نقب لگا رہی ہے ہمارے گھر میں اور آپ نقب لگا رہے ہیں۔“

”دیکھو حب!“ جلال کڑے لہجے میں بولا۔ ”میں اس کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کروں گا۔“

”تو پھر مجھے گولی مار دیجیے۔ ختم کر دیجیے مجھے۔“ وہ قریباً چلا اٹھی۔

”اس وقت تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، پھر بات کروں گا۔“ جلال نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی لرزتی رہی۔

سچ

ماں اپنے آٹھ سالہ بچے کو سمجھا رہی تھی کہ ہمیشہ اور ہر حال میں سچ بولنا چاہیے۔

بچے نے مصیبت سے کہا۔

”امی۔ آپ بھی تو سچ سچ بتا دیں کہ کل ابو جو مٹھائی کا ڈبہ لے کر آئے تھے۔ وہ آپ نے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟“

آخری الفاظ

نٹھے میاں کے ابو اچانک انتقال کر گئے۔ کچھ دن کے بعد ان کے پڑوسی نے نٹھے میاں سے پوچھا۔

”کیوں نٹھے میاں تمہارے ابو کے آخری الفاظ کیا تھے؟“ نٹھے میاں نے جواب دیا۔

”بھلا وہ کیا کہتے، آخری وقت تک امی ان کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔“

پٹاخا

کہتے ہیں ایک دن اکبر الہ آبادی سے ان کے ایک دوست ملنے آئے۔ اکبر نے پوچھا۔

”آج ادھر کیسے راستہ بھول پڑے۔“

دوست نے جواب دیا۔ ”آج شب برات ہے۔ آپ سے شہر اتنی لینے آیا ہوں۔“ اس پر اکبر الہ آبادی نے برجستہ جواب دیا۔

تحفہ شب برات تمہیں دوں کیا جان من تم تو خود پٹاخا ہو

لنگور اور انگور

پھل والا (گا ہک سے) ”جناب یہ انگور بڑے لذیذ اور تازہ ہیں لہذا آپ آدھا کلو کے بجائے ایک کلو لے لیں۔ میں رعایت کر دوں گا۔“

گا ہک۔ ”مجھے تو یہ انگور کھٹے لگتے ہیں۔“

دکاندار۔ (غصے سے) ”آپ میرے انگور کو کھنا کہہ رہے ہیں لیکن مجھے تو آپ شکل سے لنگور نہیں لگ رہے۔“

مرسلہ: ریاض ہٹ، حسن ابدال

ارم آج کل سارے گھر میں اڑتی پھر رہی تھی۔ ہر کام میں پیش پیش نظر آتی تھی۔ خاص طور سے آپا خانم کے سب کام تو وہ اپنے ہاتھ سے کرتی تھی، یا اپنی نگرانی میں کرواتی تھی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ آج اسے یونیورسٹی نہیں جانا تھا۔ سب سے پہلے تو ارم نے آپا خانم کے گھٹنوں پر زیتون کے تیل کی مالش کی۔ ملازمہ کلثوم پاس کھڑی تھی، وہ کلثوم کو سمجھاتی رہی کہ مالش اور مساج کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ مالش سے فارغ ہونے کے بعد وہ آپا خانم کے لیے پرہیزی ناشائینوانے کے لیے پکین میں چلی گئی۔ یہاں اس کی بڑی بہن فوزیہ پہلے سے موجود تھی اور آپا خانم کے لیے کھانا تیار کروا رہی تھی۔ ارم نے کہا۔ ”باجی! میرے خیال میں جیجائی کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان کی کوئی ٹائی نہیں مل رہی۔ آوازیں دے رہے ہیں آپ کو..... آپ انہیں دیکھ لیجیے میں ناشائینوانی ہوں۔“

”ناشا تو بس تیار ہی ہے۔“ فوزیہ نے کہا۔
”چلیں جی، میں بھی تھوڑا سا خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوا لیتی ہوں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

فوزیہ نے اسے گھورا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو..... تمہاری ان چستوں اور پھرتیوں کی وجہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسی دوران میں ظہیر بھی فوزیہ کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ”بھئی! وہ میری سرخ ٹائی نہیں مل رہی کہیں بھی.....“

ارم چکی۔ ”سرخ ٹائی لگا کر سویرے سویرے کہاں جائیے گا جیجائی؟“

وہ بولا۔ ”میری پیاری سالی صاحبہ! تم نے خود ہی جواب بھی دے دیا ہے۔ سویرے سویرے تو لوگ کام پر ہی جاتے ہیں۔ ہاں شام کے بعد سرخ ٹائی لگا کر کہیں جاتا تو آپ شک کا اظہار فرما سکتی تھیں۔“

”شاموں کو بھی تو آپ جناب نکلے ہی ہوتے ہیں۔ پرسوں بھی آٹھ بجے کے گئے رات بارہ بجے آئے تھے۔ میں اور باجی ٹی وی دیکھ دیکھ کر ہلکان ہو گئی تھیں، پھر میں تو سو گئی تھی جا کر۔“

”ہاں اس دن..... اس دن تو ہادی صاحب کے ساتھ ایک نشست تھی۔ ہوٹل واسکوڈے گئے تھے۔ ان کے دو چار پرستار بھی ساتھ تھے۔ خوب محفل جی۔ غیر متوقع طور پر ہادی صاحب نے اپنی دوئی نظمیں بھی سنائیں۔ بالکل فریش، تازہ بہ تازہ۔“

ہوٹل واسکوڈے کے نام پر ارم چوکی۔ یہ نام چند دن پہلے بھی اس نے سنا تھا..... کس سے سنا تھا؟ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہوٹل واسکوڈے کا ذکر تو گزرا ہی نے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ حجاب وہاں کسی سے ملنے کی تھی۔ اس کے جسم میں سسٹا ہٹ سی دوڑ گئی۔
وہ بولی۔ ”جیجائی! یہ ہادی صاحب ہوٹل واسکوڈے میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

”ہاں، کہہ رہے تھے کہ ان کا ایک پاکستانی دوست وہاں ٹھہرا تھا اور اس نے تاکید کی تھی کہ روم میں جا کر ہوٹل واسکوڈے میں ضرور ٹھہرنا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

ارم ذرا سنبھل کر بولی۔ ”ہوٹل میں کہاں قیام ہے جناب کا؟“

”سیکنڈ فلور، روم نمبر 118 ہے۔ تین چار روز میں انہوں نے چلے جانا ہے، ملنا ہے تو مل لو۔“
ظہیر بات کرتے کرتے باہر نکل گیا۔ ارم اپنی جگہ صم کھڑی رہی۔ اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے ایک توانا شک پروان چڑھ رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تیار ہوئی اور چھوٹی گاڑی لے کر خود ہی نکل گئی۔ ہوٹل واسکوڈے کا ایڈریس اسے ایک ٹورسٹ گائڈ سے مل گیا تھا۔ مناسب رفتار سے ڈرائیج کرتی ہوئی وہ ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوٹل تک پہنچ گئی۔ گاڑی پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ استقبالیہ پر آگئی۔ یہاں سے بذریعہ لفٹ سیکنڈ فلور پر پہنچی۔ کمر نمبر 118 پر دستک دینے کا ارادہ تھا مگر پھر دروازے پر ”ڈسٹرب نہ کریں“ کا بورڈ دیکھ کر واپس استقبالیہ پر آگئی اور لابی میں بیٹھ گئی۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس پر کوئی اہم انکشاف ہونے والا ہے۔ ہادی کئی روز تک گھر کی انکسی میں قیام پذیر رہا تھا۔ اب وہ ہوٹل میں شفٹ ہو چکا تھا اور اسی ہوٹل میں حجاب بھی دیکھی گئی تھی۔ ارم کو بار بار گزاری کا رویہ بھی یاد آ رہا تھا۔ ایک دن پہلے تک وہ اپنی کارکردگی کے بارے میں بڑا پر جوش تھا مگر اگلے ہی روز اس نے یابوسی کا راگ الاپ دیا تھا۔ کیا اس تبدیلی کے پیچھے کوئی وجہ تھی؟ وہ سوچتی رہی۔ اس نے ایک میگزین اپنے سامنے کھول رکھا تھا۔ تاکہ اگر ہادی اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آئے تو اس کی نظر فوراً ہی اس پر نہ پڑ سکے۔

اس کی یہ احتیاط کارگر رہی، بلکہ انتہائی کارگر رہی۔

”اسٹور پر..... کیوں خیریت ہے؟“
”میرے خیال میں ہوٹل واسکوڈے آپ کے اسٹور سے زیادہ دور نہیں ہے۔“
”ہوٹل واسکوڈے..... ہاں..... زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“
”پلیز آپ یہاں آجائیں۔ میں ہوٹل کے سامنے موجود ہوں۔ آپ کے لیے ایک بہت ضروری اطلاع ہے۔“
”لیکن.....“

”پلیز جلال! ذرا جلدی آجائیے۔“
”اچھا..... ٹھیک ہے، میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔“
ارم وہاں فٹ پاتھ پر ٹپکتی رہی۔ اس کی یونیورسٹی کی ایک دوست روبی بھی گزرتے ہوئے وہاں رک گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ ارم نے اسے بتایا کہ اس کی باجی کے جیٹھ جی اسے ”پک“ کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ ان کا افتخار کر رہی ہے۔ اسی دوران میں جلال کی ”ہمر“ گاڑی دکھائی دے گئی۔ اس نے ارم کو دیکھ لیا تھا۔ ارم کی دوست اسے خدا حافظ کہتے ہوئے آگے نکل گئی۔ جلال نے گاڑی پارکنگ لائٹ میں لگائی اور سیدھا ارم کی طرف آیا۔ ”کیا ہے ارم؟“ اس کا لہجہ گہمیر تھا۔
”آپ کی بیگم۔“
”کیا ہوا اسے؟“

”وہ کافی دنوں سے آپ کے شاعر مہمان کے ساتھ مل رہی ہے۔ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔“ ارم نے دھماکا خیز انکشاف کیا۔

”کیا اول قول بول رہی ہو۔“ جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سیاہ ڈاڑھی کے بال جیسے کھڑے ہو گئے تھے۔
”پورا ثبوت مل گیا ہے، اس کے بعد ہی آپ کو بتایا ہے..... وہ سامنے کافی شاپ میں بیٹھے ہیں دونوں۔ جا کر دیکھ لیجیے۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔ بلکہ میں ہوٹل کی لابی میں جا کر بیٹھتی ہوں۔“

جلال کے چہرے پر پہچان کی کیفیت تھی۔ وہ غیر یقینی انداز سے ارم کو دیکھتا ہوا کافی شاپ کی طرف بڑھا۔ اس نے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سڑک کراس کی۔ پہلے تو لگا کہ وہ دندناتا ہوا، اندھا دھند اندر داخل ہو جائے گا۔ لیکن پھر اس نے خود کو ذرا سنبھالا۔ شیروانی کا کاردرست کیا اور متوازن قدموں سے کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف کافی کی جھک تھی۔ ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی اور فوراً ہادی اور حجاب کو پہچان لیا۔ وہ چوکور میز پر

اسے لابی میں بیٹھے میں منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہادی لفٹ کے دروازے سے نکلتا دکھائی دیا۔ ارم نے ذرا رشک سے دیکھا۔ جوڑے شانے..... دروازہ قد، کشادہ پیشانی پر بالوں کی چند لٹکیں جھولتی ہوئی۔ وہ شاعر کم اور ہیر وزیادہ نظر آتا تھا۔ تیار ہو کر نکلتا تھا، اس نے ہاف سیلو سرخ شرٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی لگا رکھی تھی۔ پینٹ بالکل سفید تھی، ہاتھوں میں دھوپ کا چشمہ نظر آ رہا تھا۔ وہ رسٹ وایج دیکھتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اور سیڑھیاں اتر کر باہر پارکنگ لائٹ میں پہنچ گیا۔ ارم بھی اٹھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر اسے باہر جاتا دیکھنے لگی۔ وہ پندرہ بیس قدم آگے گیا ہوگا جب ارم کو بری طرح چونکنا پڑا۔ وہ سکتے زدہ سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ وہ سرتاپا براؤن چادر میں لپیٹی تھی۔ نقاب میں سے چہرے کا بہت تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا اور اس حصے میں سے بھی کچھ حصے کو دھوپ کے چشمے نے اوجھل کر رکھا تھا۔ بہر حال ارم کے لیے اسے پہچانتا قطعی دشوار نہیں تھا۔ اسے ننانوے فیصد یقین ہو گیا کہ یہ حجاب ہے..... حجاب اور ہادی کے درمیان مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا اور چند الفاظ بولے گئے پھر وہ دونوں پیدل ہی مین روڈ کی طرف بڑھے۔ ارم کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ وہ ان کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ ان میں سے کوئی اسے دیکھ لے۔ بہر حال یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ اس نے میگزین واپس لابی کی تپائی پر رکھا اور شولڈر بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ وہ دونوں پچاس ساٹھ میٹر تک سیدھے گئے پھر میٹرو کے اسٹیشن پر رک گئے۔ یہاں زمیں دوز سیڑھیوں پر بہت بھیڑ تھی۔ مسافروں کا اضافی هجوم نظر آ رہا تھا۔ لوگ یہاں وہاں بیٹھے اور کھڑے بیزارگی کا اظہار کر رہے تھے۔ ارم نے ایک پولیس والے سے پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ”کوئی ایمر جنسی ہے، اس لیے سروس کچھ دیر کے لیے معطل ہے۔“

غالباً کوئی بم وغیرہ کی افواہ تھی۔ اس طرح کی افواہیں گردش کرتی ہی رہتی تھیں۔ یقیناً ہادی اور حجاب کو بھی پتا چل گیا کہ وہ ٹرین پر نہیں بیٹھ سکیں گے۔ وہ دس پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے اور سڑک کے ساتھ ساتھ پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گئے۔ سامنے ہی ایک کافی شاپ نظر آ رہی تھی۔ وہ اس میں کھس گئے۔ یہ صورت حال ارم کے لیے زیادہ موزوں تھی۔

اس نے اپنا سیل فون نکالا۔ نمبر پر پریس کیا۔ ”ہیلو جلال! کہاں ہیں آپ؟“

آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہادی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ جلال کی رگوں میں آگ سی بھرنی۔ بہر حال اس نے خود کو نارمل رکھا۔ دھیمے قدموں سے وہ ان کی میز تک پہنچا۔ حجاب نے اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ہراس کی یلغار نظر آئی۔ دوسری طرف ہادی بھی بھونچکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بوکھلا کر اٹھا۔ ”آئیے..... آئیے جلال صاحب بیٹھے۔“ وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہادی بولا۔ ”در..... دراصل، میں پہلے سے یہاں موجود تھا..... حجاب صاحبہ شائیک کرتی ہوئی آئی ہیں۔ ذرا فریش ہونے کے لیے یہاں آئیں۔ میں نے دیکھ لیا اور ان کو انوائٹ کر لیا۔“ ”شائیک ہوئی حجاب؟“ جلال نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”جج..... ججی..... تھوڑی بہت..... ابھی امی کی دوائیاں لیتی ہیں۔ ایک دوائی تو مل ہی نہیں رہی۔“ گو د میں اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

”اگر تم یہاں بیٹھنا چاہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں میڈیسن اسٹریٹ کی طرف ہی جا رہا تھا۔ وہاں سے دوا لے لینا اور کوئی تو میں گھر بھی چھوڑ آؤں گا۔“ ”تھنٹھ..... ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں۔“ اسی دوران میں ہادی کے اشارے پر ویٹر کولڈ کافی لے آیا تھا۔ کافی کا مگ ختم کرنے میں جلال نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ یہ دورانہ ایک سمیر خاموشی میں گزرا۔ آخر میں جلال نے کافی کے لیے ہادی کا شکریہ ادا کیا اور حجاب کو لے کر وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

ہادی آگ بگولا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب گلزاری کا کیا دھرا ہے، اس نے معاہدہ توڑا ہے۔ وہ دندنا تا ہوا اس بلڈنگ میں داخل ہوا جہاں گلزاری کا اپارٹمنٹ تھا۔ یہ جگہ حجاب کے ”میکے گھر“ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اب دن کا ایک بیج چکا تھا۔ بذریعہ لفت ہادی مطلوبہ اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا۔ اس نے کال بیل دی۔ تیسری چوٹی بیل پر دروازہ کھلا اور ایک دہلی تیلی دراز قدر لڑکی نظر آئی۔ وہ خاصی کم عمر تھی۔ یہ مشکل سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ اس کے کندھے پر بیگ تھا اور وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔ ”گلزار کہاں ہے؟“ ہادی نے حیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”وہ سو رہے ہیں..... آپ کون؟“ اس نے بھی انگٹش میں پوچھا۔

اتنی دیر میں دوسری طرف والے کمرے میں روشنی ہوئی اور ہادی کی نظر گلزار پر پڑی۔ وہ بستر میں تھا۔ اس کا

بالائی دھڑیریاں تھا اور سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ بالکل جیسے کسی گوریلے کا جسم ہو۔ ہادی کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ پھر اس نے چادر کے نیچے ہی نیچے اپنے ہاتھوں کو مشکوک حرکات دیں۔ ان سے اندازہ ہوا کہ وہ سر پہ عریاں ہے اور کپڑے وغیرہ پہن رہا ہے۔ تب وہ ایک بستر سے باہر آیا۔ اس نے شارٹ پہنی تھی۔ لڑکی نے سواری نظروں سے گلزاری کی طرف دیکھا..... گلزار نے اطالوی میں اس سے کچھ کہا۔ یقیناً جانے کے لیے ہی کہا تھا۔ وہ مسکراتی اور ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئی۔ چھوٹے قد کے گلزاری کے مقابلے میں وہ کافی لمبی تھی۔

ہادی کے تاثرات دیکھ کر گلزاری کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ”گلزاری تم نے کیوں کیا ایسا؟“ ہادی نے پڑٹیش لہجے میں پوچھا۔

”مم..... میں سمجھا نہیں؟“

ہادی نے اس کا گلا پکڑ لیا اور دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا..... میں نے کہا تھا۔“

”مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ کرا رہا۔

”وہی جو تم جیسے لاپچی کتے سے امید تھی۔ تم نے ارم کو اور حجاب کے خاوند کو بتا دیا ہے سب کچھ۔ تم کسی انسان کی نہیں، یورو کی اولاد لگتے ہو مجھے۔“

”آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ سے جو کمٹ منٹ کی تھی اس پر قائم ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس سے بڑھ کر بھی آپ کے لیے کچھ کیا ہے۔ آپ الٹا مجھے ہی لتاڑ رہے ہیں۔ میں بڑی سی بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کو ایک لفظ نہیں بتایا۔“

”پھر یہ سب کیسے ہوا ہے..... ابھی ایک گھنٹا پہلے حجاب کے شوہر نے ہمارا پیچھا کیا۔ ہم ایک کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے وہ وہاں پہنچ گیا۔“

”میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں ہادی صاحب! اگر کچھ ثابت ہو جائے تو جو چوری کی سزا وہ میری۔“ ”ثبوت تو آپ ڈپٹی ہاشم ہی حاصل کرے گا۔“ ”میں سمجھ گیا ہوں تمہیں اچھی طرح۔ تم لاتوں کے جھوٹ ہو۔ مجھ سے رقم لے کر یہاں لڑکیوں سے عیاشی کر رہے ہو اور ساتھ ساتھ میری جڑیں بھی کھود رہے ہو۔“

کچھ دیر میں گلزاری منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے ہادی کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لیے کہا اور یقین دلایا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہادی کوئی ایسا چہرہ شاس

نہیں تھا لیکن لہجے کے اتار چڑھاؤ اور تاثرات سے بچ جھوٹ کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے اندازہ ہونے لگا کہ گلزاری کم از کم اس معاملے میں سچ بول رہا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جلال الدین کافی ہاؤس میں کیسے آدھکا۔ یہ بات تو ماننے والی نہیں تھی کہ ایسا اتفاق کے تحت ہوا۔ کیا کسی اور ذریعے سے اسے خبر ہو گئی تھی کہ حجاب نقاب پہن کر ہوٹل واسکوڈے میں آتی جاتی ہے۔

ہادی کے اندر شدید فکر کی کیفیت تھی۔ اسے جلال کی سخت مزاجی اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی۔ وہ جس طرح حجاب کو کافی ہاؤس سے لے کر گیا تھا وہ بھی اندیشوں کو ابھارتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟ یہ بات کہاں تک پھیلے گی؟ اس کو سینٹا حجاب کے لیے کس طرح ممکن ہوگا؟ ایسے ان گنت سوال ہادی کے ذہن میں کلبللا رہے تھے۔

گلزار نے اب پورا لباس پہن لیا تھا۔ اس نے ہادی کو کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ اس کی پیشانی پر بھی لکیریں تھیں اور وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ حجاب کے شوہر تک یہ بات کس طرح پہنچی ہے۔

ہادی نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم نے اپنی کمٹمنٹ سے بڑھ کر بھی کچھ کیا ہے۔ اس سے کیا مطلب ہے؟“

گلزاری کی آنکھوں میں ایک بار پھر عیاری کی چمک نمودار ہوئی۔ دبا دبا جوش بھی تھا، بولا۔ ”میں آج کسی وقت آپ کو فون کرنے والا تھا لیکن آپ خود ہی آگئے اور آئے بھی اس طرح کہ دل ہی توڑ کر رکھ دیا۔“

”دل تو تمہارا پھر بھی جڑ جائے گا لیکن اگر حجاب کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ اب بتاؤ، تم کیا بتاتے جا رہے تھے؟“

”دیکھیں ہادی صاحب! ہر بندے کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارم کی بھی ضرور ہوگی۔ میں آج کل اسی کی کھوج میں لگا ہوا ہوں۔ ایک تھوڑا سا اشارہ تو ملا ہے مجھے۔“

”یونیورسٹی کے جس کیمپس سے ارم نے ایف آئی اے کیا تھا وہاں کی ٹنک شاپ کے مالک سے میری جان پہچان ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ارم تین چار بار ایک اٹالین لڑکے کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی سیریس جھگڑا چل رہا ہے۔ وہ بہت بولتے تھے،

ایک مرتبہ ارم فرش پر ایک پلیٹ بیچ کر باہر بھی چلی گئی تھی۔ میں اس معاملے کی نوہ لگا رہا ہوں۔“ ہادی نے گلزار کی عیار آنکھوں میں دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ گلزار جو کچھ بتا رہا ہے، اس سے زیادہ جانتا ہے مگر وہ اپنے لفظوں کی قیمت لگانے والا بندہ تھا۔ ہادی کے لیے یہ لاپچی شخص بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا مگر شرط یہی تھی کہ اس کی بیٹری چارج رکھنے کے لیے اسے پورا پورا بلکہ پورے سے بھی زیادہ کرنٹ ملتا رہے۔

ہادی کی جیب میں کچھ رقم موجود تھی۔ اس نے کل ہی قریباً پانچ ہزار یورو شیخو صاحب سے بذریعہ ڈرافٹ منگوائے تھے۔ اس نے بلا توقف قریباً دو ہزار یورو گلزاری کی جیب میں منتقل کر دیے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سے پہلے وہ ارم سے ترلے منت کے ساتھ دو سو، تین سو یورو حاصل کرتا تھا۔

گلزاری کا چہرہ جوش سے تھما گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ صرف ایڈوائس ہے۔ کارآمد اطلاع دینے پر اسے مزید ہڈی ملے گی اور وہ کافی بڑے اور گودے سے بھر پور ہوگی۔ اس نے ہادی سے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ ٹنک شاپ والے سے اٹالین لڑکے کا اتنا پتا تو مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے ایک دو دن میں آپ کو کوئی اہم اطلاع دے سکوں گا۔“

ہادی نے کہا۔ ”اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا معاملہ اب تیزی سے بگاڑ کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے حجاب کی طرف سے بہت زیادہ فکر ہے۔ وہ بے قصور ہے پھر بھی سخت مصیبت میں پھنس سکتی ہے۔“

☆☆☆

گاڑی روم کی بھری پری سڑکوں پر چلتی جا رہی تھی۔ جلال نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیرنگ وہیل پر جمار کھے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ حجاب بھی اس کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی۔ اگر وہ کچھ کہتا، کچھ بولتا تو شاید صورت حال اتنی یوجھل اور تناؤ بھری نہ ہوتی لیکن اس نے تو کافی ہاؤس سے اٹھنے کے بعد ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ جب گاڑی حجاب کی امی کے گھر پہنچنے والی تھی، جلال نے بس اتنا کہا۔ ”ان سے کہنا کہ میں گھر واپس جا رہی ہوں۔ ابھی اسی وقت اور ان کو کسی پریشانی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔“

حجاب اندر سے لرز رہی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو جلال نے کہا تھا۔ حجاب اور جلال بے ظاہر نارمل موڈ میں ہی نظر آئے۔ جلال نے حجاب کے ابو سے بس اتنا کہا۔ ”گھر

میں کچھ مہمان آرہے ہیں۔ جب کا جانا ضروری ہے۔ میں آپ ہی کی طرف آرہا تھا۔ یہ راستے میں مل گئی۔“

اس گھر میں اتنی مجال کس کی تھی کہ جلال کی رائے سے اختلاف کرتا۔ کچھ ہی دیر بعد حجاب ایک بار پھر جلال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی جا رہی تھی۔ وہ جلال سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس کی خاموشی اتنی گہمیر تھی کہ حجاب کو ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ گھر کو جانے والے راستے پر گاڑی چلاتے چلاتے ایک جگہ جلال رک گیا۔ وہ جیسے تذبذب میں تھا۔ پھر اس نے گاڑی کو گھر کی طرف موڑنے کے بجائے دائیں جانب موڑ دیا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ حجاب بہ مشکل کہہ پائی۔

”درس والے گھر۔“ جلال نے مختصر جواب دیا۔

درس والے گھر کا نام درس والا گھر پتا نہیں کیوں پڑ گیا تھا۔ روم ویسٹ کے نسبتاً کشادہ اور مضامنی علاقے میں یہ ڈھائی تین کینال کی کوٹھی تھی۔ پرانی تعمیر تھی لیکن جگہ اندر سے بھی سنوری تھی۔ یورپ کی اکثر عمارتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ باہر سے ان کی قدامت کو برقرار رکھا جاتا ہے لیکن اندر سے جدید بنا دیا جاتا ہے۔ جب ابھی جلال الدین اور ظہیر الدین کا کاروبار پوری طرح چکا نہیں تھا وہ یہیں رہائش پذیر تھے۔ بعد ازاں انہوں نے فیشن ایبل علاقے میں شاندار گھر بنوایا تھا۔ اس پرانی کوٹھی میں کبھی جلال کے پیر طریقت صاحب محفل جمایا کرتے تھے شاید اسی لیے اسے درس والی کوٹھی کہا جانے لگا تھا۔ اب یہ محفل والا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔

حجاب کو یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے درس والی کوٹھی کیوں لے جا رہا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ کوٹھی میں تھے۔ کوٹھی رہائش کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ جلال اور ظہیر کے کاروباری مہمان بھی یہاں آکر ٹھہر جاتے تھے۔ چوکیدار، خانساماں، کام کاج والی ملازمہ سب کچھ یہاں موجود تھا۔ پچھلے سال جب نئے گھر کے رنگ و روغن ہو رہے تھے، جلال اور حجاب پندرہ بیس روز یہاں رہے تھے۔ لہذا حجاب کو کچھ اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔

انہوں نے بیڈ روم میں چائے پی۔ چائے کے فوراً بعد جلال اصل موضوع پر آگیا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

حجاب کے دل میں چونکہ کوئی چور نہیں تھا لہذا اس کے لہجے میں توانائی آگئی۔ اس نے کہا۔ ”جلال! میں آپ کے سامنے زیادہ وضاحتیں پیش نہیں کروں گی۔ ایک مرتبہ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ اگر عورت پورے پردے میں

ہو اور اس کا دل بھی پردے میں ہو تو پھر کسی کے ساتھ ملنے جلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ مجھ پر پورا بھروسہ رکھیں۔ میں پردے میں تھی اور میرا دل اس سے بھی زیادہ پردے میں تھا۔“

”کیسے ملاقات ہوئی؟“

”بس اتفاقاً ہی سمجھ لیجئے..... سرراہ۔“ وہ بولی۔

”ہادی صاحب روم میں گھومنا پھرنا چاہ رہے تھے۔ مونومینٹس کو وزٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ میں بھی آرٹیکل کو رہی ہوں۔ ہم دو تین جگہوں پر اکٹھے گئے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں..... یہ ایسے ہی تھا جیسے میں ماریہ کے ساتھ گھومنے نکلوں یا فیصل کے ساتھ نکلوں۔“

”لیکن تمہیں مجھ سے اجازت تو لینی چاہیے تھی۔“

”یہ میری غلطی ہے، میں اس کے لیے سوری کہتی ہوں۔ دراصل آپ کا موڈ اتنا خراب تھا کہ.....“

”اچھا..... چلو چھوڑو ان باتوں کو۔“ جلال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جب وہ اس طرح بات کرتے کرتے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ لیتا تھا تو اس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت خاص بات کہنے جا رہا ہے۔ وہ کبھی لہجے میں بولا۔ ”تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے حجاب؟“

وہ توقف سے بولی۔ ”مم..... میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے جلال۔“

”حب! مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔ تم ہنسی خوشی یہ کام کر رہی ہو یا نہیں؟“

حجاب کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ وہ بالکل بے رحم ہو گیا تھا۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”جلال! آپ مجھے اس طرح فیصلے کی سولی پر کیوں لٹکا رہے ہیں۔ مجھ پر ترس کھائیے۔“

”بچوں جیسی باتیں نہ کرو حجاب۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام ہونا ہے اور ہر صورت ہونا ہے۔ ہر کام کا ایک شیڈول ہوتا ہے۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ تم نے ہاں یا نہ میں جواب دے کر بتانا ہے کہ یہ کام ہنسی خوشی ہو گا یا روپیٹ کر۔“

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔ وہ یوں سانس لے رہی تھی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ آخر روہانسی ہو کر بولی۔ ”جلال! میں اپنے دل کا کیا کروں۔ یہ آپ کو کسی کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار نہیں۔ میں آپ کا ہر قسم سہہ سکتی ہوں پر..... یہ نہیں جلال۔“

”میں تمہیں ہر سہولت دینے کو تیار ہوں۔ تمہاری من چاہی پر اپنی تمہارے نام کر سکتا ہوں، یا جو تم چاہو.....“

”نہیں، جلال نہیں۔“ وہ کرب میں ڈوب کر بولی۔

”دیکھو..... تم دنیا کی کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کا شوہر دوسری شادی کر رہا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے۔ ہمارے خاندان میں، تمہارے خاندان میں۔ ہمارے ارد گرد ایسی بہت سی مثالیں ہیں جب دو بلکہ تین بیویوں والی فیملی نے بھی بڑی خوشگوار زندگی گزاری ہے۔“

”اگر ایسی پانچ مثالیں ہوں گی تو دوسری طرف پچاس مثالیں بہت بری زندگی کی بھی ہوں گی۔ لیکن مجھے کسی اور سے کیا لیتا ہے جلال! میں تو اپنی اور آپ کی بات کر رہی ہوں..... میں آپ کو تقسیم نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر؟“

وہ ایک جاں مسل وقفے کے بعد بولی۔ ”اگر کوئی اور راستہ نہیں، تو مجھے آزاد کر دیجیے۔“

ایک زوردار چھڑ جلاب کے گال پر پڑا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ کان میں سیٹیاں بچ رہی تھیں۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر جلال کی طرف دیکھا۔ تب دوسرا چھڑ دوسرے رخسار پر پڑا۔ وہ چکرا کر کرسی سمیت گری۔ جلال نے اس کی پیٹھ پر ٹھوکریں رسید کیں۔ اسے لگا جیسے کمر چٹ کر رہ گئی ہے۔

”جلال..... جلال“ وہ بس یہی پکارتی جا رہی تھی۔ اس نے خود کو گھٹری سا بنالیا اور اپنے جسم کے نازک حصوں کو اس کی ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کرنے لگی۔

اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر نہایت بے دردی سے کھینچا اور اٹھا کر صوفے پر بیٹھ دیا۔ ”اب بھی یہی کہو اس کر کہ تیری نیت میں کوئی فتور نہیں..... وہ تیرا بھائی ہے جس کے ساتھ، نقاب چڑھا کر گھومتی پھرتی ہے۔ تو نے سچ نہیں بولا لیکن تیرے ارادوں نے سچ بول دیا ہے۔ تجھے آزادی چاہیے..... طلاق چاہیے..... تاکہ تو کوئی نیا سفر شروع کر سکے۔ میں چو چائیں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں، سب جانتا ہوں۔“

”خدا کے لیے جلال، خدا کے لیے..... مجھ پر ایسا الزام نہ لگا کیوں۔“ وہ صوفے سے اٹھ کر اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اس نے ایک غصیلے جھٹکے سے اپنے پاؤں پیچھے ہٹائے اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ٹخنوں میں سر دیے بیٹھی رہی، ہچکیوں سے روئی رہی۔

وہ فیصلہ کن، پاٹ دار آواز میں بولا۔ ”مجھک ہے..... اگر تو آزادی چاہتی ہے تو میں تجھے آزادی دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بیوی چاہیے، قیدی یا کنیز نہیں۔ تیرے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور راستے بھی۔“

وہ مڑا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کی ”ہمر“ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہی تھی۔ وہ جا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے سارے دروازے کھلے چھوڑ گیا تھا اور سارے راستے بھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ جو نظر آ رہا ہے وہ ہے نہیں۔ سارے دروازے کھلے تھے اور یہ سارے راستے۔ وہ ان دیکھی زنجیروں میں بندھی ہوئی تھی اور یہ معاشرتی نہیں، معاشی زنجیریں تھیں۔ حجاب کے ابو ایک بڑے قرضے کے بوجھ تلے دبے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق قریباً دو لاکھ نوے ہزار یورو۔ اور قرض خواہ کون تھا؟ قرض خواہ ان کا داماد تھا، جلال الدین تھا۔ وہ سکتا زدہ بیٹھی تھی۔

وہ ساری رات حجاب نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ توقع کے عین مطابق جلال واپس نہیں آیا تھا۔ ملازمہ تاہید اس کی ضروریات کے لیے اس کے ارد گرد موجود رہی، حجاب کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ جلال کو وہاں کافی ہاؤس میں پہنچانے والا کون تھا؟ ہادی نے تو بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ ارم والی سازش اس نے ناکام بنا دی ہے۔ یہ بات بھی ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ یہ ایک اتفاق تھا۔

حجاب کا دل بالکل صاف تھا اس لیے اسے کوئی شرمندگی نہیں تھی لیکن جلال نے جو رد عمل دکھایا تھا اس نے اس کی روح تنگ کو شرمسار کر دیا تھا۔ اس نے دو طرح کا رد عمل دکھایا تھا۔ ایک تو اسے مارا پیٹا تھا، دوسرے فوری طور پر اس نے ”ہاں یا نہ“ میں جواب مانگ لیا تھا۔ یہ ”پوائنٹ آف نو ریٹرن“ والی بات تھی۔ حجاب کو بستر پر کروٹ لینے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ جلال کی بے رحم ٹھوکروں کے نتیجے میں اس کی پوری کمر دکھ رہی تھی۔ شادی سے پہلے یہی کمر تھی یہی جسم تھا، جس کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے تھے، کتنی جلدی ختم ہوا تھا یہ سب کچھ۔ حالانکہ وہ اسی طرح تھی بلکہ شاید جسم کی موزونیت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اس کے سینے میں دھواں بھرتا رہا، گاڑھا سیاہ دھواں۔ اس دھوئیں میں چنگاری تھی بلکہ اب یہ ایک نہیں کئی چنگاریاں تھیں۔ آگ نے جب شعلے کا روپ دھارنا ہونا ہے تو چنگاریاں بڑھ جاتی ہیں۔ زیادہ پر حرارت ہو جاتی

ہیں۔ وہ پامال ہو رہی تھی، بالکل دیوار کے ساتھ لگا کی جا رہی تھی۔ اس کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا جا رہا تھا۔ اب ایک ہی راستہ تھا، علیحدگی کا۔ لیکن کیا وہ اسے یہ راستہ اختیار کرنے دے گا؟

وہ اپنے ماں باپ کو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسے صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح جیتی رہی جس طرح جلال چاہ رہا ہے تو وہ مر جائے گی..... بہت جلد اور بڑی اذیت سے۔ اس نے شام کو ہی پروگرام بنا لیا تھا کہ گھر چلی جائے، امی ابو کے پاس..... لیکن پھر اس نے آئینہ دیکھا تھا۔ چہرے پر ٹھانچوں کے سرخ نشان تھے۔ وہ ہمیشہ ان نشانوں کو چھپاتی رہی تھی، اب بھی چھپانا چاہتی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے رات نہیں، درس والی گٹھی میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

صبح سویرے وہ کراہتی ہوئی اٹھی۔ ایک بار پھر آئینے میں چہرے کا معائنہ کیا۔ کئی بار رخساروں پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ابھی اسے کچھ اور انتظار کرنا تھا۔ اسے پتا تھا کہ امی ابو پریشان ہوں گے۔ جلال جس طرح آنا فانا اسے یہاں لے آیا تھا وہ ضرور چونکے ہوں گے۔ اس نے سوچا انہیں کال کر لے۔ اس نے شو لڈ ریگ میں سے سیل فون نکالا، مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ فون کر کے انہیں ابھی سے پریشان کر دے گی۔ پھر اسے ان کا لڑکا خیال آیا جو ہادی اور اس کے درمیان ہوتی رہی تھیں۔ اس نے ان کا لڑکا ریکارڈ Delet کیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ہادی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ کیوں جلدی واپس نہیں چلا گیا تھا۔ کیوں اس کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا۔ وہ جانتا بھی تھا کہ اس کے حالات کتنے خراب ہیں پھر بھی اس سے ملنے پر اصرار کرتا رہا اور وہ بھی اس کے اصرار کی مزاحمت نہ کر سکی۔ اسے ہادی پر غصہ آنے لگا اور اس سے زیادہ اپنے آپ پر۔ شاید یہ کافی ہاؤس والا واقعہ نہ ہوتا تو جلال اسے کچھ مزید مہلت دے دیتا۔ یوں اس سے ہاں یا نہ میں فوری جواب نہ مانگتا۔ لیکن ایسا ہو بھی جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا وہ اس صورت حال سے بچ جاتی؟ نہیں یہ تو ممکن نہیں تھا۔ آج نہیں تو کل یہ ہونا ہی تھا۔ وہ طریقہ کار طے کرنے لگی کہ امی ابو اور بھائی کو کس طرح اس صورت حال سے آگاہ کرے۔ اب کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔ شام سے پہلے ہی وہ امی کے گھر پہنچ گئی۔ فیصل کا چہرہ دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ”کیا ہوا فیصل؟“

فیصل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حجاب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”امی کی طبیعت خراب ہے، ابھی انجکشن لگایا ہے۔ سو رہی ہیں۔“

حجاب نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا اور اس کا دل ہول گیا۔ وہ سیدھی لپٹی تھیں۔ رنگ ہلدی ہو رہا تھا، منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے ہولے سے دروازہ بند کر دیا۔ فیصل اسے اسٹڈی کی طرف لے آیا۔ خلاف توقع ابو وہاں موجود نہیں تھے۔ جائے کے تین چار خالی کپ پڑے تھے۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ ”ابو کہاں ہیں؟“ حجاب نے پوچھا۔

”دوپہر سے نکلے ہوئے ہیں، بتا کر نہیں گئے۔“

”تم نے پوچھا نہیں؟“

”وہ بتاتے ہی کب ہیں باجی! بتا دیں تو اس طرح کے مسئلے بھی نہ ہوں۔ ہر بات بس اپنے پر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”کیا مطلب فیصل؟“

”چھوڑیں، آپ بھی پریشان ہوں گی۔ پہلے ہی لگ رہی ہیں۔“

حجاب نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ ”فیصل! مجھے صاف بتاؤ کیا بات ہے؟“

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”صبح نو دس بجے ایک فون آیا تھا۔ اس کے بعد بالکل گم صم ہو گئے۔ مسلسل سگریٹ پیٹے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد غالباً وہی فون دوبارہ آیا۔ اس بار دو چار باتیں میں نے بھی سنیں۔ یہ جلال بھائی کے منیجر قادر صاحب کا فون تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے ابو سے قسط کے بارے میں کہا ہے..... اور زور دے کر کہا ہے۔“

حجاب کی ریزہ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہی اندیشے تھے جو حجاب کے لیے سوہان روح بنے رہتے تھے۔ چند ماہ پہلے قرض کی ادائیگی کے لیے حجاب کے ابو اور جلال میں کچھ طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق جلال نے قرض کی ادائیگی قسطوں میں کر دی تھی۔ وہ اسے آسان قسطیں کہتا تھا لیکن وہ اتنی آسان بھی نہیں تھیں۔ ایک تہائی رقم حجاب کے گھر والوں کو چار ماہ بعد ادا کرنا تھی، باقی چار اقساط میں۔ گجرات میں ابو کی تھوڑی سی وراثتی زمین موجود تھی۔ وہ اسے بیچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امید تھی کہ وہ دو تین ماہ میں بیک جائے گی مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا۔ سستا بیچنے کی کوشش بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب تقریباً تین ماہ

اد پر ہو چکے تھے۔
صورت حال جتنی گمبیر تھی، اتنی ہی سادہ بھی تھی۔ کل دوپہر جلال اور حجاب میں جھگڑا ہوا تھا اور آج منیجر قادر کا فون آگیا تھا۔ سب کچھ واضح تھا۔

حجاب بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ فیصل بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ آزر وہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ابو ایک قرضہ چکانے کے لیے مزید قرضہ اٹھانے کی فکر میں ہیں۔ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا۔ کچھ بھی ہے۔ کچھ بھی ہے۔ جلال بھائی پھر بھی اپنے تو ہیں۔ کہہ سن کر ان سے مزید مہلت لی جاسکتی ہے۔ یہ بینکوں والے اور دوسرے سود خور تو اللہ معاف کرے ہتھکڑیاں لے کر پہنچ جاتے ہیں۔“

فیصل کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہے جلال بھائی اپنے تو ہیں۔ وہ اسے کیا بتاتی، وہ کتنے اپنے ہیں۔ مقدمہ تو یہاں بھی موجود تھا، ہتھکڑیاں تو یہاں بھی لٹک کر رکھی جا رہی تھیں، اس کے آنسو جیسے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

فیصل نے اسے یہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جلال بھائی سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے آج کل؟“

”نہیں، ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“
”چلیں شکر ہے، ورنہ کل آپ دونوں جس طرح آنا فانا آئے اور چلے گئے، مجھے ڈر تھا کہ پھر کوئی بات نہ ہوگئی ہو۔۔۔۔۔۔“

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے حجاب کی امی کے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ دونوں بہن بھائی تڑپ کر اٹھے اور کمرے کی طرف گئے۔ تاہم حجاب اندر جاتے جاتے رک گئی۔ دروازے پر کھڑی رہی۔ فیصل اندر گیا۔ والدہ انجکشن کے زیر اثر گہری غنودگی میں تھیں اور پانی مانگ رہی تھیں۔ فیصل نے ان کا سراونچا کر کے انہیں دو گھونٹ پانی پلایا اور ان کا سر دبانے لگا۔ حجاب نیم تاریکی میں کھڑی ادھ لٹے دروازے میں سے اندر جھانکتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اندر گئی تو امی کی بے چینی و پریشانی میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوگا۔

کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ سو گئیں تو فیصل اور حجاب پھر اسٹڈی میں آ بیٹھے۔ فیصل نے بتایا۔ ”ابو کی پریشانی کا جتنا اثر امی لیتی ہیں آپ کو پتا ہی ہے۔ انہیں اس بات کی خبر تو نہیں ہوئی کہ قادر کا فون آیا تھا لیکن اتنا ضرور سمجھ گئیں کہ یہ قسط والا چکر ہی ہے۔ پہلے ابو سے پوچھتی رہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں بتایا اور نال دیا۔ پھر میرے پاس آ گئیں۔۔۔۔۔۔ ابو کی

پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس دوران میں ان کے ہونٹ بالکل خشک ہو گئے اور سر پکڑ کر ایک طرف جھک گئیں۔ انہیں۔۔۔۔۔۔ چکر سا آگیا تھا۔ میں نے فوراً ڈاکٹر انکل عطا کوفون کیا وہ دس منٹ میں پہنچ گئے۔ اس دوران میں، میں نے انہیں پینے والی دوا دے دی تھی۔ انکل نے انجکشن وغیرہ دے دیا ہے۔ متعلقہ ڈاکٹر سے نام بھی لے لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ امی کے تفصیلی معائنے کی ضرورت ہے۔“

”تفصیلی معائنہ کیوں؟“ حجاب نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

”بس۔۔۔۔۔۔ وہ بہتر۔۔۔۔۔۔ سمجھتے ہوں گے۔“
وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”فیصل! تم کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو۔ پلیز ایسا مت کرو۔ مجھے سب کچھ ٹھیک بتاؤ۔ کہیں وہ۔۔۔۔۔۔ بے ہوش تو نہیں ہوئیں؟“

فیصل کے دبلے پتے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ پہلے تو چھپانے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس نے نم آنکھوں کے ساتھ بتایا کہ ایسا ہوا ہے۔ وہ چار پانچ منٹ کے لیے Sence Less ہو گئی تھیں۔

حجاب کا دل ڈوبنے لگا۔ آپریشنز کے بعد ڈاکٹرز نے یہی کہا تھا کہ ان پر پھر سے بے ہوشی کا طاری ہونا اچھی علامت نہیں ہوگی اور اگر ایسا ہو تو انہیں فوری طور پر اسپتال سے رجوع کرنا چاہیے۔

فیصل نے حجاب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”باجی! آپ فینشن نہ لیں۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر انکل کہہ رہے تھے کہ میڈیکیشن سے ہی صورت حال بہتر ہو جائے گی۔ بس ان کو خوش رہنا چاہیے اور ذہنی دباؤ نہیں لینا چاہیے۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے فیصل۔“
”باجی، آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ مجھے زیادہ ڈر اسی بات کا تھا کہ کہیں جلال بھائی اور آپ کے درمیان پھر کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ آپ بس کوشش کر کے ادھر کے حالات بہتر رکھیں۔ کوئی اچھا موقع دیکھ کر جلال بھائی سے بات بھی کر لیں۔ تین چار ماہ اور مل جائیں تو مجھے یقین ہے کہ گجرات والی زمین کا سودا ہو جائے گا۔ صرف بیعانہ بھی ہو گیا تو بھی تسلی کی بات ہوگی۔ جلال بھائی کو اطمینان ہو جائے گا کہ قسط مل جائے گی۔“

حجاب صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ فیصل کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کے اندر چپکنے والی

مزاحمت کی چنگاریاں ماند پڑتی جا رہی تھیں۔ تو اتانی کی جگہ ایک عجیب سی نقاہت رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ شاید وہی نقاہت جو ازل سے عورت کا مقدر رہی ہے۔

فیصل نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں باجی! وہاں جلال بھائی کے ہاں حالات آپ کے لیے اتنے زیادہ اچھے بھی نہیں ہیں۔ لیکن یہ ایسا موقع ہے کہ ہم کسی طرح کا کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ میں جانتا ہوں آپ کی پریشانی بردہ کی ایک شکن آتی ہے تو امی کے دل پر پتا نہیں لگتی شکلیں آ جاتی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو فیصل۔ ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔“

”آپ کچھ چھپا تو نہیں رہیں باجی؟“
”نہیں فیصل! سب ٹھیک ہے، بس تھوڑی بہت چیقلش تو چلتی ہی رہتی ہے تمہیں پتا تو ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ بس امی اور ابو کا دھیان رکھو۔“

اسے لگا کہ فیصل اسے مزید کھوجنا نہیں چاہتا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ مزید کھوجنے سے کوئی پریشان کن بات سامنے آجائے گی۔

شام سے پہلے حجاب، درس والی کوٹھی یعنی پرانے گھر واپس آ گئی۔ اس نے ابو کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ ابو کے سامنے جائے گی تو اس کے خاموش رہنے کے باوجود وہ بہت کچھ محسوس کر لیں گے۔ جیسے فیصل نے محسوس کیا تھا۔ گھر واپس آتے ہی اس نے ملازمہ ناہید سے جلال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو نہیں آئے۔ ملازم اور ڈرائیور آئے تھے اور کچن کا بہت سارا سامان دے گئے ہیں۔ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیا جائے۔

جب حجاب ملازمہ ناہید سے بات کر رہی تھی، اس کے فون کی تیل ہونے لگی۔ اسکرین پر وہی ہادی کا نمبر تھا۔ اس نمبر سے اور ہادی سے اس کی بیزاری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ کیوں چمٹ گیا تھا اس کی جان سے؟ کیوں اس کی زندگی کو مزید زہر آلود کر رہا تھا۔ اس نے فون بند کر دیا اور پھر اس کی سم نکال کر کوڑے دان میں پھینک دی۔

رات دس گیارہ بجے اس نے فون میں نئی سم ڈالی اور جلال کو فون کیا۔ تیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ (جلال کو پتا بھی تھا کہ یہ اس کا نمبر ہے) اس نے فون صوفے پر پھینک دیا اور نیکے میں مردے کر آنسو بہانے لگی۔ وہ اپنے حالات پر نوحہ کنان بھی

اور خود کو بھی ملامت کر رہی تھی۔ اس نے کیوں کیا ایسا؟ جب اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی تو کیوں اپنے اندر چپکنے والی چنگاریوں کو بجھانہ دیا۔ کیوں مزاحمت کو سر ابھارنے کا موقع دیا۔ بے شک ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے، لیکن یہ کیسا رد عمل تھا کہ ویش میں وہ اپنی حدود سے آگے نکل گئی۔ اس نے خود کو ایک آزاد ماڈرن لڑکی کا روپ دیا اور کھلی فضاؤں میں جی بھر کر سانس لینے کا سہارا پورا کیا اور صرف یہی نہیں اسی رد عمل کے نتیجے میں وہ ہادی سے بھی ملتی رہی۔ بے شک یہ ایک صاف ستھرا تعلق تھا، رومانیت سے پاک۔۔۔۔۔۔ مگر تھا تو غلط۔ اور اس کی بنیاد بھی غلط تھی۔ اس بنیاد میں ماحول سے بغاوت کی بو باس تھی۔

اچانک فون کی تیل ہوئی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف جلال ہی تھا اس نے کال ریسیو کی۔ جلال کی بھاری بو جھل آواز آئی۔ ”کیا بات ہے تم نے فون کیا تھا؟“

”اور آپ نے ریسیو ہی نہیں کیا۔“
”میں۔۔۔۔۔۔ واش روم میں تھا۔ کیا بات تھی؟“
”مجھے دوسری رات ہے یہاں۔ آپ پلٹ کر آئے ہی نہیں۔ کوئی خبر ہی نہیں لی کہ کس حالت میں ہوں۔“
”میرے آنے سے تمہاری حالت میں کیا سدھار آ سکتا ہے؟“

”اور آپ کے نہ آنے سے کیا سدھار آئے گا؟“
”جو باتیں ہمارے درمیان ہوتی ہیں وہ کئی بار ہو چکی ہیں۔ ان کا تمہیں پتا ہے اور مجھے بھی۔“
”اس کا مطلب ہے کہ اب ہمارے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوگی۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں ابھی آدھ پون گھنٹے میں آتا ہوں۔“ اس کی آواز میں ایک فاتحانہ آہنگ کی جھلک تھی۔ بین السطور وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اور یقیناً حجاب بھی۔

اس رات وہ آیا۔ دونوں نے ٹیرس میں اکٹھے چائے پی۔ باغیچے میں تھوڑی دیر چہل قدمی بھی کی۔ بہر حال کسی نازک موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بیڈ روم میں بھی جلال کا موڈ بہتر ہی رہا۔ دونوں لٹے تو جلال کی انگلیاں بے ساختہ حجاب کے بالوں میں رینگنے لگیں۔ وہ رات بھر اس کے بہت قریب رہا۔ اس کی محبت میں وہی جوش اور طلب کی پُر حرارت شدت تھی۔ بہر حال ہمیشہ کی طرح طلب کی اس شدت نے حجاب کی روح کو نہیں چھوا۔

بس اس کے جسم تک محدود رہی، اس کے بالوں کی نرمی تک، اس کے ہونٹوں اور رخساروں کی گرمی تک، اس کے پیکر کی رعنائی تک۔ جلال کی فیملی میں ناشتا کافی ”ہیوی“ ہوتا تھا۔ بالکل کسی بونے ڈنر کی طرح۔ کئی ڈشز ہوتی تھیں۔ حجاب نے بس چند لقمے لینے پر ہی اکتفا کیا۔ جلال کھاتا رہا اور اس سے بھی کھانے کے لیے اصرار کرتا رہا۔ اس نے حجاب کو اس دوا کے بارے میں بھی یاد کرایا جو وہ روزانہ ناشتے سے قبل لیتی تھی۔ اس طرح کی یاد دہانیوں سے وہ حجاب کو باور کرایا کرتا تھا کہ وہ اس کا دھیان رکھتا ہے۔

چائے کا آخری گھونٹ لینے کے بعد وہ بولا۔ ”حجاب! میں چاہتا ہوں کہ میں سارے پیسے تمہارے ہاتھ میں دوں۔ کم از کم جیولری اور کپڑوں کی شاپنگ تم خود کرو، ارم کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے نام سے ایک اکاؤنٹ کھلوادوں۔ بعد میں بھی گھر کے ماہانہ اخراجات تم خود کرو۔ ارم آئے تو گھر میں تمہیں مختار کی حیثیت حاصل ہو.....“

وہ باتیں کرتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ دل کے اندر آنسوؤں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ ایسی باتیں جلال نے عام حالات میں کہی ہوتیں تو حجاب خود کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کرتی۔ لیکن اب یہ باتیں اسے بس زخمی ہی کر رہی تھیں۔

آخر میں وہ بولا۔ ”میں تھوڑی دیر میں ڈرائیور کو بھیجوں گا، تم اس کے ساتھ گھر چلی جانا۔ امی بھی کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے دو چار دن، درس والی کوٹھی میں رہنا چاہ رہی ہے۔“

”میں اب بھی یہی چاہ رہی ہوں جلال۔ ابھی میرا دل وہاں جانے کو نہیں چاہ رہا۔ کچھ..... وقت لگے گا مجھے سنبھلنے میں۔“

”لیکن کم از کم امی اور فوزیہ سے تو مل آؤ۔ وہاں سے اپنا کچھ سامان وغیرہ بھی لانا ہے تو لے آؤ۔“

”چلیں، ایک دو دن میں چکر لگا لوں گی..... اگر ہو سکے تو آپ شریقاں کو یہاں بھجوا دیجیے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے آسانی رہتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں اسے بھجوا دیتا ہوں۔ بلکہ تمہارا کچھ سامان بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آج تو میلانو جانا ہے دو دن کے لیے۔ پرسوں سے شام کے بعد یہیں آ جایا کروں گا۔“

☆☆☆

ہادی، حجاب کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ کوشش کے باوجود حجاب سے کسی طرح کا رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے گھریلو ملازمہ شریقاں کو بھی فون کیا تھا۔ اس سے بھی اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ حجاب سسرال میں واپس نہیں آئی ہے۔ شریقاں کی زبانی یہ پتا چلا تھا کہ وہ کسی دوسرے گھر میں ہے جسے پرانا گھریلو درس والا گھر کہا جاتا ہے اور شاید دو چار روز تک یہاں آجائے گی۔ شریقاں کے مطابق گھر میں چپکے چپکے ارم کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ جلال نے ارم اور اس کی بڑی بہن فوزیہ میں بھی صلح صفائی کرا دی تھی۔ آیا خانم پہلے ہی اس شادی کی مخالف نہیں تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے بیٹے نے جلد یا بدیر دوسری شادی کرنا ہی ہے۔ تو پھر وہ کیوں ایسی لڑکی نہ لے آئیں جو ہر طرح ان کی فرمانبرداری اور اطاعت گزار تھی۔

ہادی کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ چکی ہے..... اور جلال نے دوسری شادی کی تیاری شروع کر دی ہے۔ حجاب کا مصیبت زدہ چہرہ رہ رہ کر اس کی نگاہ میں آتا اور وہ جیسے پوری جان سے ٹپ جاتا تھا۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا، ہر حال میں۔ اور اس خواہش میں اتنی شدت تھی کہ کسی وقت وہ خود حیران ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی جان کے بدلے بھی اس کی پیشانی کی چمک برقرار رکھنا چاہتا تھا اور یہ صرف لفظوں کی بات نہیں تھی، وقت پڑنے پر وہ یقیناً ایسا کر بھی سکتا تھا، وہ عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سرتاپا اس میں ڈوب گیا تھا۔ اسے اپنے جسم سے حجاب کی خوشبو آتی تھی۔ وہ تنہا ہوتے ہوئے بھی اپنے ارد گرد اس کے سانسوں کی مہک اور چوڑیوں کی کھنک محسوس کرتا تھا۔

پچھلے تین چار روز میں اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ پھر ”ایون ٹینو“ جائے اور انکل فیاض کے گھر کا چکر لگائے۔ مگر پچھلا تجربہ اسے ابھی بھولا نہیں تھا۔ حجاب بہت سیخ پا ہوئی تھی۔ اپنے مزاج کے برخلاف وہ ہادی سے بہت سیخ بولی تھی اور اب تو حالات اور بھی خراب تھے۔ شروع میں اسے اندیشہ تھا کہ شاید جلال اس سے رابطہ کرے اور ان کے درمیان کوئی نئی ترشی ہو۔ یا وہ خود نہ آئے اور ظہیر وغیرہ کے ذریعے اسے کوئی سخت قسم کی وارننگ دی جائے۔ لیکن ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ مستقبل قریب کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ بہر حال ہادی ایسے خدشات سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ وہ ہوٹل واسکوڈے میں ہی تھا اور یہاں اپنا قیام بڑھانے کے بارے میں بھی غور کر رہا تھا۔

اچانک اس کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے

سے بھی۔ وہ دونوں صرف گھومنے پھرنے کی حد تک ساتھ رہے ہیں۔ تمہیں بھی پتا ہے کہ وہ کوئی آرٹیکل لکھ رہی ہے مونو میٹس پر.....

”ہاں پتا ہے جلال، وہ لکھ رہی ہیں آرٹیکل۔“ وہ ذرا چبا کر بولی۔

جلال کے فون کی تیل ہوئی۔ وہ سنتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ارم منہ ہی میں بڑبڑائی۔ ”پتا نہیں، ابھی کیا کیا آرٹیکل لکھنے ہیں آپ کی بیگم صاحبہ نے۔“

دو گھنٹے بعد جلال میلانو روانہ ہو چکا تھا۔ جلال کی موجودگی میں گھر کا ماحول ذرا گھٹا گھٹا رہتا تھا مگر اس کے بعد فضا ذرا ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔ اہل خانہ کے ساتھ ساتھ ملازم اور ملازمائیں بھی ”ایزی“ محسوس کرتے تھے۔ گاہے بگاہے قہقہے بھی سنائی دے جاتے تھے۔ فوزیہ اور ارم کھانے کی میز پر تھیں۔ ارم کی دو کزنیں آئی ہوئی تھیں۔ ظہیر کی ایک پھوپھی زاد بھی تھی۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ کھانے کی نئی ڈشز، کپڑوں کے نئے فیشن، ٹی وی اور فلم کی تازہ خبریں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی گفتگو جلال کی موجودگی میں تو نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی دوران میں ظہیر جھومتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی..... ”یہ کون سی کتاب ہے ظہیر بھائی۔“ اس کی پھوپھی زاد آصفہ نے چپک کر پوچھا۔

”اس کا عنوان ہے، شوہر کی خدمت کیسے کی جائے۔“

”تو یہ آپ کیوں پڑھ رہے ہیں، کیا آپ کا بیوی بننے کا ارادہ ہے۔“ آصفہ نے کہا اور ہنس دی۔

”نہیں بھئی، یہ میں اپنی معلومات کے لیے پڑھ رہا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ فوزیہ میری خدمت ٹھیک سے کر رہی ہے یا نہیں۔“

”بس سب کچھ کتابوں سے ہی ڈھونڈا کریں۔ اپنی عقل سے کچھ نہ سوچیں۔“ فوزیہ نے کہا۔

”بھئی کتابیں عقل مند لوگ ہی لکھتے ہیں اور پڑھتے بھی عقل مند لوگ ہی ہیں۔ ویسے بھی ہم ادبی بندے ہیں۔“

”ادب پر اتنا مٹا پائیم ہی دیکھا ہے ہم نے۔“ فوزیہ نے شوہر پر چوٹ کی۔ سب ہنسنے لگیں۔

آصفہ بولی۔ ”ہاں، ظہیر بھائی! ادب سے یاد آیا، آپ کے وہ شاعر دوست چلے گئے کہ یہیں ہیں؟“

”بھئی آخری خبریں آنے تک تو یہیں تھے۔ میں نے ارم سے کہا بھی تھا کہ اگر ملنا ہے تو جا کر مل لو۔ بہت ٹاکس آدی ہیں۔ اور ”نام“ ہے بھئی ان کا۔ ایرے غیرے سے تو ملنے بھی نہیں۔“

کافی ہاؤس والا واقعہ ارم کے لیے بڑا اہم موڑ ثابت ہوا تھا۔ بعد ازاں جلال نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کافی ہاؤس تک کیسے پہنچی۔ ارم گلزاری کا نام تو لے نہیں سکتی تھی۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ اس کی ایک کلاس فیلو روبی نے حجاب کو دوبارہ ہونٹ اسکوڑے سے نکلنے دیکھا۔ وہ مکمل پردے میں تھی پھر بھی روبی کو شک ہو گیا کہ یہ حجاب ہے وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہادی اسی ہونٹ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ روبی نے اسے بتایا اور پھر وہ خود بھی وہاں پہنچی گئی۔

بہر حال آج شام کو جلال دو روز کے لیے میلانو جا رہا تھا۔ واپسی پر نکاح وغیرہ کی تاریخ کے بارے میں فیصلہ ہونا تھا۔ (ارم کے والدین سے ابتدائی بات چیت ہو چکی تھی۔ وہ بھی اتنا جاہلیت داماد کھونا نہیں چاہتے تھے جبکہ بیٹی بھی شادی پر تلی ہوئی تھی) ارم روانگی کے لیے جلال کے کپڑے وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ اسی دوران میں جلال لمبے ڈگ بھرتا اندر داخل ہوا۔ ارم نے شرمائے کی ایکٹنگ کی (تھوڑی بہت شرم آئی بھی) ”آپ ایک دم ہی نازل ہو جاتے ہیں۔“ وہ دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے اب گھڑیاں بجا کر آیا کروں گا۔“ وہ بولا۔

نگاہیں بدستور سیل فون کی اسکرین پر تھیں۔ پھر جیسے ایک دم چونک کر اس نے فون بند کیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ”اپنی فرینڈ کو فون کیا تم نے؟ میرا مطلب ہے روبی کو؟“

”کس لیے؟“

”بندہ خدا! کیا کہا تھا تمہیں۔“

”ہاں..... وہ تو میں نے کل رات کو ہی کر دیا تھا۔ اس سے کہہ دیا ہے کہ ادھر ادھر بات نہیں کرنی۔ وہ ایسی ہے تو نہیں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”وہ میری فرینڈ نہیں ہے جلال! صرف کلاس فیلو ہے۔ اب میں اس کے منہ پر پٹی باندھنے سے تو رہی۔ درخواست ہی کر سکتی ہوں۔ وہ کئی سوال پوچھ رہی تھی مجھ سے، ہادی کے بارے میں اور باجی حجاب کے بارے میں بھی۔ یہ کیسے ملے..... کہاں ملے؟ پہل کس کی طرف سے ہوئی؟ میں نے یہ مشکل جان چھڑائی۔“

جلال کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے شیروانی کا بالائی ہٹن کھولا، پھر کڑے لہجے میں بولا۔ ”اسے سختی سے بھی کہہ دو ارم! اگر اس کی وجہ سے بات پھیلی تو اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ باقی..... میں نے ساری پوچھ گچھ کر لی ہے حجاب

سے اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی نے اس کا نمبر ملا لیا۔ شاید کسی نائٹ کلب میں تھا۔ ڈرم کی دھما دھم تھی اور فون کی قہقہے گونج رہے تھے۔ گلزار نے قدم پر سکون جگہ پر جا کر ہادی کا فون سنا۔ ”کہاں تک پہنچا تمہارا کام؟“ ہادی نے پوچھا۔

”بس اسی کے پیچھے لگا ہوا ہوں؟“ وہ بولا۔

”اسی کے پیچھے لگے ہوئے ہو..... اسے بیذروم تک لے جانے کے لیے؟“

”نہیں ہادی صاحب! آپ کے سر کی قسم۔ اگر آپ کے یورو خرچ ہو رہے ہیں تو کام بھی آپ کا ہو رہا ہے۔ بس آپ دو چار دن کا وقت دیں۔ بڑی کڑا کے دارخیزوں کا آپ کو.....“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وقت زیادہ نہیں ہے۔“ ہادی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ان دنوں میں ارم سے رابطہ ہوا ہے تمہارا؟“

”نہیں جی، ان دنوں تو نہیں ہوا۔ وہ میرا فون ہی نہیں اٹھا رہی آج کل۔“

”چلو، اگر رابطہ ہو تو اس سے جاننے کی کوشش کرو کہ حجاب کہاں اور کس حال میں ہے۔“

اس نے فون بند کیا اور صوفے کی نشست سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ گلزاری سے کہہ رہا تھا کہ وہ ارم سے رابطہ کرے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ارم خود یہاں ہونٹ میں اس کے پاس آنے والی ہے اور یہ ملاقات اس کے لیے کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہونے والی۔ اس ملاقات سے وہ ایک نقصان اٹھائے گا۔

☆☆☆

ارم کا ستارہ آج کل عروج پر تھا۔ سب کچھ اس کے حق میں جا رہا تھا۔ جلال نے بڑی بہن فوزیہ سے اس کی صلاح کرادی تھی۔ آپا خانم ویسے ہی اس کی منشی میں تھیں۔ شادی کے راستے میں یہ ظاہر اب کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ رہی کسی کسر خود حجاب کی اپنی غلطی سے پوری ہو گئی تھی اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں تھی، ارم جانتی تھی جلال اسے آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔ وہ آج کل پرانے گھر میں تھی اور یقیناً جلال اس سے کڑی باز پرس کر رہا تھا۔ بہر حال یہ سب کچھ بھی ارم کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ بھی ہے جلال، حجاب کو مکمل طور پر کھونا نہیں چاہے گا۔ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔

یعنی ارم کو دوسری بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔ ارم کے نزدیک یہ ادھوری فتح تھی۔ مکمل فتح اسی وقت ہوتی جب جلال اسے اپنی زندگی سے یکسر نکال دیتا۔

اس سے اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی نے اس کا نمبر ملا لیا۔ شاید کسی نائٹ کلب میں تھا۔ ڈرم کی دھما دھم تھی اور فون کی قہقہے گونج رہے تھے۔ گلزار نے قدم پر سکون جگہ پر جا کر ہادی کا فون سنا۔ ”کہاں تک پہنچا تمہارا کام؟“ ہادی نے پوچھا۔

”بس اسی کے پیچھے لگا ہوا ہوں؟“ وہ بولا۔

”اسی کے پیچھے لگے ہوئے ہو..... اسے بیذروم تک لے جانے کے لیے؟“

بے تاب نظروں سے اسکرین دیکھی..... یہ حجاب کا فون نہیں تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے ریسیو کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف لاہور سے شیخو صاحب تھے۔ وہ ذرا جوتیلی آواز میں بولے۔ ”تمہارا الفاقل مل گیا ہے ہادی.....“

بھئی زبردست..... تینوں گیت کمال کے ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں تمہاری گردن میں سریانہ آجائے لیکن سچ یہی ہے کہ تینوں گیت دھوم مچانے والے ہیں، لگتا ہے کہ تمہارے دماغ کی پائپ لائن میں جو رکاوٹ تھی دور ہو گئی ہے۔ اب اگلا الفاقل کب مل رہا ہے؟“

”جلدی۔“ ہادی نے مختصر جواب دیا۔

”لیکن یہ چپکار ہوا کیسے ہے؟ کہیں کوئی عشق و شوق تو نہیں ہو گیا اس وٹس والی کڑی سے؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں شیخو بھائی۔“

”اوائے تیرا بیڑا کرے۔ وہ تو شادی شدہ ہے نا۔“

”تو عشق کیا پوچھ کے ہوتا ہے شیخو بھائی۔“

”پر تو نے بتایا تھا کہ..... اس کے گھر والے بھی بڑے ڈھاڈے ہیں۔ اس کی نگرانی شکرانی کا چکر بھی تھا۔“

”گھر والے ڈھاڈے ہیں..... پر عشق بھی تو ڈھاڈا ہی ہوتا ہے نا۔ یہ کسی کی کب سنا ہے۔“

”پر ذرا ہاتھ پیر بچا کے یار۔ تجھ پر سرمایہ کاری ہوئی ہے تیرے بچوں کی۔“

”آپ کا سرمایہ میرے عشق کرنے سے نہیں ڈوبے گا شیخو بھائی..... محنت نہ کرنے سے ڈوبے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ مسکرایا۔“ عشق ختم..... تو گیت ختم۔“

”اچھا اچھا بھئی، تو کر عشق۔ پر گیتوں کو بریک نہیں لگنی چاہیے اور اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ ڈپٹی بل شمس سے رابطہ ہے نا تیرا؟“

”ہاں بھئی بھی بات ہوئی ہے۔“

”تو بس ٹھیک ہے۔ لیکن ایک وار پھر کہوں گا کہ ذرا ہاتھ پیر بچا کے..... اپنا لاہور ہوتا تو اور بات تھی، مگر یہ پردیس ہے۔“

”عشق نہ پیچھے ذات..... تے عشق نہ دیکھے دیں پردیس۔“ ہادی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”یار! کہیں صوفی ہی نہ بن جانا۔ یہ کافیاں شافیاں ہٹ نہیں ہوتیں آج کل۔“

ہادی نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس دوران میں اسے گلزار کا خیال آ گیا۔ دو تین روز

اسٹائٹس نے چلتے چلتے رک کر اس پہاڑی نالے
کے اندر جھانکنے کی کوشش کی پھر مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ ارسل
اور ریٹالڈ کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ عین
اس کے سر کے اوپر درخت کی شاخوں میں حرکت ہوئی تھی

وہاں ایک آٹو بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان سے بے
اختیار نکلا۔
”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
آٹو نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا بس اپنی پلکیں جھپکا کر

اندھی محبت کی رقابت اور عشق کی رقاقتوں کا فتنہ

رقیب تنویر ریاض

رقابت اور حماقت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ تب ہی دامن بار
بار داغدار ہوتا رہتا ہے۔۔۔ یہ اور بات کہ حماقت کے تماشاے پھر بھی
جاری رہتے ہیں۔۔۔ اس کا شمار بھی ایسے ہی عقل کے اندھوں میں
ہوتا تھا جسے سارا منظر صاف تو نظر آتا تھا مگر منظر کی تفصیل
اس کا ذہن قبول نہیں کر پاتا تھا۔۔۔ بس اسی معرکہ آرائی نے اس
سے ایسی غلطی سرزد کرادی جس کی اس کے پاس کوئی وجہ نہ تھی



آصف نے ارم کی طرف دیکھا۔ ”تو کیا خیال ہے ارم!“
ایک نشست ہو جائے شاعر صاحب کے ساتھ؟“
ارم سے پہلے ہی اس کی کزن ماہ نور بول اٹھی۔ ”ٹھیک
ہے، چلتے ہیں بھی بلکہ ابھی چلتے ہیں۔ کون سا اتنا زیادہ وقت ہوا
ہے۔ نو ہی تو بچے ہیں۔“
ارم ذرا سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح جانے سے جلال
ناراض بھی ہو سکتا تھا۔۔۔ مگر ایک جواز تو تھا، وہ کہہ سکتی تھی کہ
آصف وغیرہ کا پروگرام بن گیا اس لیے وہ بھی ساتھ چلی گئی تاکہ
کچھ سگن لے سکے، یہ حضرت یہاں کیوں نکلے ہوئے ہیں اور
کیا ارادے رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسے یقین تھا کہ خود جلال
کے ذہن میں بھی یہ سوال ہوں گے۔
سیل فون ارم کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے جلال سے
رابطہ کرنے کے لیے فون کیا۔ دو بار کال کرنے کے باوجود کال
ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ شاید کسی میٹنگ میں تھا۔ یہ بھی اچھی بات
تھی۔ جلال سے اجازت لینے کی ”فارمیٹیٹی“ پوری ہو گئی تھی۔
وہ چاروں چپ میں سوار ہوئیں اور ڈرائیور کے ساتھ
ہومس واسکوڈے پینچ گئیں۔ انہوں نے ہادی کو فون پر اپنی آمد کی
اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ مبادا اڑچن پیدا
ہو جائے۔ وہ سیدھی سیکنڈ فلور کے کمر نمبر 118 کے سامنے پینچ
گئیں۔ ان کی خوش قسمتی سے ہادی کمرے میں ہی تھا اور اکیلا
تھا۔ وہ ارم اور دیگر لڑکیوں کو اپنے سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔
بہر حال وہ مہمان تھیں۔ خوش خلقی کا مظاہرہ تو ہادی کو کرنا ہی
پڑا۔ ارم نے صاف طور پر محسوس کیا کہ ہادی پریشان ہے، بال
بکھرے بکھرے، آنکھیں سرخ اور لباس مڑا ہوا تھا۔ اس
کیفیت کی وجہ بھی ارم اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل گواہی
دیتا تھا کہ یہ پینڈم شاعر، حجاب کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔
دوسری طرف کیا پوزیشن تھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں
کہا جاسکتا تھا۔
ماہ نور چبکی۔ ”ہادی صاحب! آپ بہت بکھرے
بکھرے ہیں۔ کیا آپ پر کوئی غزل اتر رہی تھی؟“
وہ زبردستی مسکرایا۔ ”اتر تو رہی تھی لیکن اب اکھٹی تین
چار نظمیں اتر آئی ہیں۔“
سب ہنسنے لگیں۔ ماہ نور نے کہا۔ ”تین نظمیں، ایک آزاد
نظم۔“ اس کا اشارہ اپنی طرف تھا کہ وہ ڈراموئی تھی۔
”ہادی صاحب! یہ آپ لکھ کس طرح لیتے ہیں۔ کیا اس
میں ”محبت“ کا بھی کوئی عمل دخل ہوتا ہے؟“ آصف نے پوچھا۔
ہادی سے پہلے ارم بول اٹھی۔ ”ہاں بھی، شاعری کے
لیے ”عشق“ بہت ضروری ہوتا ہے۔۔۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ

”عشق تو صرف عشق ہوتا ہے۔ کامیابی یا ناکامی کا اس
سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ بولا۔
”واہ واہ۔۔۔ کیا بات کہی ہے۔ ایک دم کلاسیکل شاعر
لگے ہیں آپ۔“ آصف نے خوش ہو کر کہا۔
مختلف موضوعات پر بات ہوئی رہی۔ اسی دوران میں
ہادی نے لڑکیوں کے لیے آکس کریم بھی منگوالی۔ جب وہ سب
آکس کریم کھا رہے تھے، ہادی کے سیل فون کی بیل ہوئی۔
کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہادی نے سیل
فون ایک کشن کے نیچے سے ڈھونڈا اور کال سنی، سگنل شاید
پورے نہیں آ رہے تھے، اس نے دو تین بار بیلو کہا، پھر بات
کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔
قریب ہی ایک تپائی پر سگریٹ کے پیکٹ اور موبائل
چارجر کے پاس ہادی کا ڈیجیٹل کیمرہ پڑا تھا۔ ارم نے بونٹی نہما
اٹھالیا۔ وہ آن تھا۔ وہ تصویریں چیک کرنے لگی۔ درجنوں تو
تصویریں تھیں۔ یہ سب روم اور اس کے گرد و پیش کے شائے
تھے۔ تفریح گاہیں، تاریخی مقامات، پارکس، کسی کسی تصویر میں
ہادی خود بھی نظر آتا تھا۔ کچھ تصویریں اس کے ادبی دوستوں کا
مخفلوں کی تھیں۔
ہادی ایک قریبی مالکونی میں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا۔
ارم تصویریں دیکھتی چلی گئی۔ روم کے بعد ویش کی تصویریں
شروع ہو گئیں۔ ویش کی آبی شاہراہیں وہاں کے تقریباً
مقامات، بازار، ایک تصویر دیکھ کر ارم بری طرح چونک گئی۔
اسے لگا کہ یہ حجاب کی تصویر ہے۔
زندگی کے نشیب و فراز گھٹن زدہ ماحول اور حدود
قیود سے نبرد آزما باہمت حسینہ کی داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

رہ گیا لیکن اس کی آواز سن کر جنگل کے مختلف چرند پرند چونکا ہو گئے اور انہوں نے مخصوص آوازیں نکال کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا کہ انسان آگئے ہیں۔ پھر اسے دور کہیں سے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ ارسلان اور رینالڈ ایک بڑی جھاڑی کے عقب سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک جیسا لباس یعنی سفید ٹی شرٹ اور تیلی جینز پہن رکھی تھی اور وہ مکمل طور پر پینک منانے کے موڈ میں نظر آ رہے تھے۔

”میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی مناسب جگہ ہے۔“ اسٹارز نے نالے کے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں زرد پتوں کا ایک بڑا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اس نے فضا میں رہی خوشبو سونگھنے کی کوشش کی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کچھ ہی دیر میں بارش شروع ہونے والی ہے۔ ایسی صورت میں یہ پہاڑی نالے بہت جلد بھر جاتے ہیں۔“

”تم بہت وہمی ہو۔“ ارسلان نے کہا۔ ”اگر تمہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے تو ہم نالے کے دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔“

اسٹارز نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”اگر بارش ہوگئی تو ہم گھنٹوں کے لیے وہاں پھنس جائیں گے۔ ہم یہاں پینک کیوں نہیں مناسکتے۔“

رینالڈ نالے کے کنارے پر گیا اور ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بادلو۔ یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ ہماری پینک خراب مت کرو۔“

وہ دونوں چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اس کی یہ... احقانہ حرکت دیکھ رہے تھے۔ رینالڈ نے انہیں آنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”ہم جتنی جلدی نالے کے پار جائیں گے۔ اتنی جلدی ہمیں شکار مل سکے گا۔“

ارسلان نے اپنے بالوں کی پونی ٹیل بنائی۔ اسٹارز کو آنے کا اشارہ کیا اور نالے کی ڈھلوان سطح پر احتیاط سے قدم رکھنے لگی۔ اسٹارز اپنی بیوی کو نالے میں اترتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ارسلان اسے پینک پر آنے کی دعوت کیوں دی تھی۔ اسٹارز ہی انہیں اپنی کار میں بروکین سے نیوجرسی لے کر آیا تھا۔ وہ دونوں سارے راستے گانے گاتے اور اپنے دوستوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ جب اسٹارز نے ریڈیو پر خبریں سننے کی کوشش کی تو رینالڈ نے نیوجرسی کے ان قصبوں کے بارے میں تبصرہ کرنا شروع کر دیا جو اسے پسند نہیں تھے پھر اس نے ڈرامائی انداز میں بتایا کہ وہ نیوجرسی میں کس طرح گرفتار ہوا تھا۔

”تم یقین نہیں کرو گی سوئی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں عہد آگ لگانے کے جرم میں گرفتار ہوا تھا۔“

رینالڈ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ ہمیشہ ایکٹنگ کیا کرتا تھا اور لوگوں کو اس کی باتیں سننا پڑتی تھیں۔ ”میں ڈرنی بلیو کلب میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور حاضرین جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ ان کی دیوانگی اور جوش و خروش دیکھ کر منتظرین نے پولیس طلب کر لی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ میں نے اپنی کارکردگی سے وہاں آگ لگا دی تھی۔“

اسٹارز کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے لیکن اس کی تنہائی بڑھتی جا رہی تھی۔ ارسلان کا زیادہ وقت رینالڈ کے ساتھ ڈراما کلاس میں گزرتا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن اب بات اس سے آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اسٹارز کو لگ رہا تھا کہ وہ اس کی زندگی کو اپنے ڈرامے کے لیے اسٹیج کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے ارسلان کے ایکٹنگ کیریئر کی کیوں حوصلہ افزائی کی۔

اسٹارز نے ایک گہری سانس لی اور نالے کے اندر اتر گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر اس کے قدم ایک مضبوط چٹان سے ٹکرائے جہاں سے پانی کا ایک ریل پچھ کر رہا تھا۔ اسٹارز کے جوتے پانی میں بھیج گئے اور اس کی رفتار دیکھ کر اسٹارز نے اندازہ لگا لیا کہ شمال میں چند میل کے فاصلے پر بارش ہو رہی ہے اور دو پہر تک یہ علاقہ بھی اس کی زد میں آجائے گا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پشت پر بندھے بیگ کا جائزہ لیا جس میں کھانے پینے کا سامان تھا اور مطمئن ہو گیا کہ پانی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ارسلان اور رینالڈ کو کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ انہیں دل لگی کرنے اور باتیں بنانے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ اسٹارز نے ہی کھانے پینے کا سامان خریدا تھا اور اب وہی اسے اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا۔

اسٹارز کو مقابلے کی سوجھی اور وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ پانی اس کی کمر تک آ گیا تھا لیکن اس کے اعصاب کو تب ہی سکون ملا جب وہ ایک لفظ کہے بغیر اپنے ساتھیوں سے آگے نکل گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اسے ایک بار پھر ڈھلوان سطح پر چڑھنا پڑا۔ اس نے ایک جھاڑی کو مضبوطی سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے اوپر آ گیا، پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ صاف کیے اور مٹی سے بھیج کر فضا میں بلند کی جیسے اپنی فتح پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔ پھر اس نے

کرتالے کی جانب دیکھا۔ ارسلان پانی میں گر گئی تھی اور رینالڈ اپنا بایاں بازو اس کی کمر کے گرد ڈالے اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسٹارز کے لیے یہ ایک ناقابل برداشت منظر تھا۔ اس کے اٹھے ہوئے بازو نیچے گر گئے۔ اسے اپنے سینے میں بھانسی سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے پورے بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ کر ان لوگوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

جب وہ دونوں نالہ پار کر کے اوپر آئے تو انہوں نے کھانے کا سامان نکالنے میں اسٹارز کی مدد کی۔ اس نے دوپہر کے کھانے کے لیے اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس میں سینڈوچ، پھل، اچار، ڈیل روٹی، جام اور پنیر شامل تھا۔ کچھ دیر تک ان میں یہ بحث ہوتی رہی کہ دسترخوان کہاں بچھایا جائے۔ رینالڈ نے درختوں کے نیچے ایک جگہ منتخب کی اور ارسلان کی مدد سے دسترخوان بچھا دیا۔ پھر ارسلان نے جھک کر کھانے پینے کی چیزیں دسترخوان پر سجائیں جبکہ رینالڈ اس کے پیچھے کھڑا نگرانی کرتا رہا۔

اسٹارز نے لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی کیونکہ ارسلان اور رینالڈ نے کھانے کے بعد شکار کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ اسی لیے اسٹارز نے پہلے سے آگ کا انتظام کر لیا تاکہ شکار کیے گئے خرگوش یا تیروں کو بھوننے میں آسانی رہے۔ اسی دوران رینالڈ نے پنیر کا پیکٹ کھول لیا اور حسب عادت اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ پھر اس نے پلاسٹک کی پلیٹ پر پنیر کا ٹکڑا رکھ کر اسٹارز کو پیش کیا لیکن وہ آگ جلانے میں مصروف رہا۔ ارسلان نے اسٹارز کا کندھا ہلایا اور بولی۔ ”جب سے ہم یہاں آئے ہیں۔ تم بالکل خاموش ہو۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟“

اسٹارز کا دل چاہا کہ وہ اپنی بیوی کو گلے لگالے اور اسے ان دنوں کی یاد دلانے جب وہ دونوں جنگل میں آگ جلا کر گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس آگ کی گرمی سے ارسلان کے دل میں رینالڈ کے لیے ہمدردی کے جذبات بھاپ بن کر اڑ جائیں اور ارسلان اپنی پوری توجہ اس پر مرکوز کر دے۔ وہ یہ سب سوچ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ بڑی مشکل سے بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کیا تم واپس جانا چاہ رہے ہو؟“ ارسلان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔

رینالڈ کچھ فاصلے پر بیٹھا پنیر کھانے میں مصروف تھا پھر اس نے سمپن کی بوتل کھولی۔ ارسلان نے اسٹارز کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ ”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ رینالڈ کو تھوڑی سی تفریح کی ضرورت ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ تنہا ہو گیا ہے اور اب میں ہی اس کی واحد دوست ہوں۔ اس کی تو کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں ہے اس لیے۔“

”میرے بارے میں کیا کہتی ہو؟“ اسٹارز نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جب بھی تم سے جنگل میں پینک منانے کے لیے کہا تو تم ٹال گئیں لیکن رینالڈ کے کہنے پر تم نے فوراً ہی پینک کا پروگرام بنالیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا لیکن اب محسوس ہو رہا ہے کہ میری حیثیت محض ایک گائیڈ جیسی ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ ارسلان اس سے دور ہٹتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں خود ہی سمجھ جانا چاہیے۔“ اسٹارز نے طنزاً کہا اور مزید کچھ لکڑیاں آگ میں جھونک دیں جس سے شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ آگ شام تک جلتی رہے جبکہ ابھی دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے۔ آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور اسٹارز کو تیز ہوا کے ساتھ طوفان کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بارش شروع ہوتے ہی یہ آگ بجھ جائے گی۔

اسٹارز نے رینالڈ کو آواز دے کر کہا۔ ”یہاں آ کر دیکھ لو۔ یہ آگ میں نے تمہارے لیے جلائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

رینالڈ نے سمپن کا ٹھونٹ بھرا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گیا اور بولا۔ ”میں نے براڈوے کے ایک ڈرامے میں بھی یہ منظر دیکھا جس میں آگ کے شعلے سات فٹ تک بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے جسے دیکھ کر سب دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔“

”کیا تم اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں آگ پسند ہے۔“ اسٹارز نے طنز یہ انداز میں کہا۔

رینالڈ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے گال پر تھپڑ مار دیا ہو۔ وہ اپنے جبرے پھینچتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری اس صلاحیت سے مرعوب ہو جاؤں گا۔ آگ

سوچ کا فرق

شاہ جہاں اور کنگ ایڈورڈ، دونوں کی بیویوں کی موت کینسر سے ہوئی۔ دونوں بادشاہ اپنی اپنی بیوی سے بہت پیار کرتے تھے لیکن سوچ کا فرق دیکھیں، شاہ جہاں نے بیوی کی یاد میں لاکھوں خرچ کر کے تاج محل بنوایا اور کنگ ایڈورڈ نے یونیورسٹی فار میڈیکل ریسرچ بنوائی تاکہ جس بیماری کی وجہ سے اس نے اپنی بیوی کھوئی۔ اس سے دوسروں کو بچایا جاسکے۔ سوچ کا فرق ہی قوموں کے عروج و زوال کا سبب بنتا ہے۔

دادا پوتے سے۔ ”تمہارے ٹچر آئے ہیں، چھپ جاؤ۔“
پوتا۔ ”پہلے تو آپ چھپ جائیں، میں نے آپ کی ڈیڑھ پر ایک ہفتے کی چھٹی لی ہے۔“

ایک شخص تقریر کر رہا تھا۔ ”لوگو! کسی کی عورتوں کو مت دیکھا کرو، ان کے بدلے تمہیں جنت میں حوریں ملیں گی۔ حور ایسی ہوگی، حور ویسی ہوگی، وہ... تھوڑا جذباتی ہو گیا پھر بولا۔ ”میں تمہیں حور کی کیا مثال دوں؟ یہ جو بھائی بشیر بیٹھے ہیں۔ ان کی بیوی کو ہی دیکھ لو، خدا کی قسم حور ہے حور۔“

قیمت

ایک عورت نے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کو ایک سائیکل کے عوض فروخت کر دیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو یہ خبر سناتے ہوئے کہا۔

ڈارلنگ۔ ”کیا تم بھی ایسا ہی کرو گے؟“
”نہیں بیگم... فکر نہ کرو۔ میں تو کار سے کم بات کرنا بھی گوارہ نہیں کروں گا۔“

مرسلہ: قیصر اقبال کچہ، کلون بھکر

پانی کی بو چھاڑ سے بچھ چکی تھی اور وہ راکھ کے ڈھیر کے پاس ایک پتھر پر بیٹھا پانی میں بھیگ رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ارسلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، جب اس نے پہلی بار ڈراما کلاس میں داخلہ لینے کی خواہش ظاہر کی تو اسٹارز نے اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ پُرکشش شخصیت کی مالک تھی اور اس میں ایک اچھی اداکارہ بننے کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ اسٹارز اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا لہذا اس نے ارسلہ کا پورا ساتھ دیا۔ وہ خود پارک رینجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور جنگلوں کے بارے میں اس کی معلومات حیران کن تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ارسلہ کوئی مختلف کام کرے تاکہ اس کے ذریعے وہ نئے لوگوں سے متعارف ہو سکے اور انہیں اپنی پیشہ وارانہ صلاحیت سے متاثر کر سکے۔

اسٹارز کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اسے گرمیوں کے موسم میں کئی کئی روز تک جنگلوں میں رہنا پڑتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارسلہ اپنے نئے دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگی۔ گزشتہ برس سیزن میں اسے مسلسل دو ہفتوں تک جنگل میں رہنا پڑا۔ جب وہ واپس آیا تو ارسلہ نے اسے رینالڈ سے متعارف کروایا جو ڈراما کلاس میں اس کا کلاس فیلو تھا۔ اسٹارز کو پہلی نظر میں ہی وہ شخص پسند نہیں آیا اور اسے لگا جیسے اس نے ارسلہ کے ذہن پر پوری طرح قبضہ کر لیا ہو۔

اسٹارز اور ارسلہ کے درمیان پہلا جھگڑا ٹیلی فون بل پر ہوا۔ اسٹارز کی غیر موجودگی میں ارسلہ نے رینالڈ کے نمبر پر گھنٹوں باتیں کی تھیں جس کی وجہ سے ٹیلی فون کے بل میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا لیکن ارسلہ نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ رینالڈ پچھلے دنوں کچھ پریشان تھا۔ لہذا وہ اس کی دلجوئی کے لیے اس سے باتیں کیا کرتی تھی، معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ بہت جلد اسٹارز کو اندازہ ہو گیا کہ رینالڈ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر آتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں وہ اپنا زیادہ وقت دفتر میں ہی گزارتا تھا۔ شام کو گھر واپس آنے کے بعد اکثر اس نے کافی کی میز پر شراب کے دو خالی گلاس اور پیکن میں دو عدد کھانے کی پلیٹیں دیکھیں۔ اسٹارز کے سینے میں ایک پھانسی چبھ کر رہ گئی۔

ارسلہ اکثر رات کو دیر سے گھر آنے لگی۔ کئی بار وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتا کیونکہ اسے دفتر جانے کے لیے صبح چھ بجے اٹھنا ہوتا تھا۔ ارسلہ رات گئے دے پاؤں ملی کی طرح چلتے ہوئے آتی اور خاموشی سے کمرے میں داخل ہو جاتی۔

ان تینوں کی توجہ بندوق پر تھی۔ اسٹارز سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی رینالڈ اسے مارنا چاہتا ہے۔ اگر اسے صرف ایک سیکنڈ کے لیے اپنے ہاتھ نیچے کرنے کی مہلت مل جاتی تو وہ اپنا پستول نکال کر اسے گولی مار دیتا۔ اس خاموشی کو پتوں کی سربراہت اور دور سے آتی ہوئی آواز نے توڑا۔

”لگتا ہے۔ یہاں قریب ہی شکار موجود ہے؟“
رینالڈ نے کہا۔
اسٹارز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ وہ جھاڑیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے ہرن کو دیکھ چکا تھا۔ رینالڈ نے ارسلہ کی طرف دیکھا جو خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے بندوق نیچے کر لی اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اسٹارز! تمہارا چہرہ کیوں پیلا پڑ گیا۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ کھلونا گن ہے جو ہم اپنے ڈراموں میں استعمال کرتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں واقعی تمہیں مار ڈالوں گا۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اب میری اداکارانہ صلاحیتوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

ارسلہ کے چہرے کی حالت کو دیکھ کر رینالڈ بہت شریک ہو گیا۔
”اسٹارز نے اپنی مٹھیاں بھیجنے لیں۔ اس کا جی چاہا کہ رینالڈ کا جیڑا توڑ دے لیکن کسی خیال کے تحت اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”اچھا ہوا اس وقت تم نے میرے بارے میں سچائی سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔“

رینالڈ فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ ”اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ اگر میں نے سچ بول دیا تو تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔“ ارسلہ نے اسٹارز کی بھینچی ہوئی مٹھیوں کو دیکھا اور رینالڈ کو کھینچتے ہوئے کھانے کے دسترخوان کی طرف لے گئی۔ اسٹارز نے دیکھا کہ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اسے پُر سکون رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ ارسلہ اس کی بیوی ہوتے ہوئے ایک غیر شخص سے اظہار ہمدردی کر رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹارز کی پیش گوئی کے مطابق کچھ دیر بعد ہی وہاں بارش شروع ہو گئی۔ ارسلہ اور رینالڈ نے بھاگ کر ایک جنگلی درخت کی چھاؤں میں پناہ لی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں لپٹے ہوئے تھے جبکہ اسٹارز کی لگائی ہوئی آگ

جلا تا کوئی فن نہیں۔ کوئی بھی شخص یہ کام کر سکتا ہے۔“
”مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم کیا سوچتے ہو۔“ اسٹارز نے کہا۔ ”لیکن اس وقت ہم ڈراما کلاس میں نہیں بلکہ جنگل میں ہیں اور تمہیں یہاں ایکٹنگ نہیں کرنی چاہیے۔“
رینالڈ نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ تمہارے ساتھ مل کر کچھ اچھا وقت گزار سکوں لیکن تم مسلسل میرے اور ارسلہ کے ساتھ نامناسب برتاؤ کر رہے ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم اس پکنک سے لطف اندوز ہو گے۔ اسی لیے میں اس پروگرام میں شریک ہو گیا تھا لیکن تم نے تو اپنے آپ کو بالکل الگ تھلک کر لیا ہے۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”رینالڈ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اضطراب کے عالم میں ناخن چبا رہا تھا۔ اسٹارز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا جو اسے یہ اداکاری کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ شاید وہ اس طرح ارسلہ کی ہمدردی حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ اسٹارز کا خیال درست ثابت ہوا۔ رینالڈ کی اداکاری نے اثر دکھایا اور ارسلہ بولی۔

”جانے دو رینالڈ۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تم اس قدر جذباتی ہو رہے ہو۔“
یہ کہہ کر اس نے رینالڈ کا بازو تھامنا چاہا لیکن وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اسٹارز جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ میں ہمیشہ سے ہی لوگوں کی دھمکیوں کا نشانہ بن رہا ہوں۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے اسٹارز کو دھکا دینے کی کوشش کی لیکن وہ بھی چوکتا تھا۔ اس نے رینالڈ کو گردن سے پکڑا اور زمین پر گرا دیا۔ رینالڈ فوراً ہی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی جیب سے بندوق نکال کر اسٹارز کے سینے پر رکھ دی۔ یہ دیکھتے ہی ارسلہ چلانے لگی۔ اسٹارز نے حیرت سے بندوق کو دیکھا۔ اس کی نال بھی رینالڈ کے چکنے بالوں کی طرح چمک رہی تھی۔

”میں یہ بندوق جانوروں کا شکار کرنے کے لیے لایا تھا لیکن اب مجھے اپنے دشمنوں کا بھی شکار کرنا ہوگا۔ تم جیسے دشمن کے ساتھ مجھے کیا سلوک کرنا چاہیے۔“ رینالڈ نے اپنی بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے گن نیچی کر کے اسٹارز کی سر کی جانب کر لی۔ اسٹارز دونوں ہاتھ اٹھائے پیچھے کی جانب ہٹے لگا۔ یہاں تک کہ وہ تالے کے کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کے عقب میں بہتے پانی کا شور سنائی دے رہا تھا۔

جاتی۔ اس نے کبھی اسٹارز کو جگانے یا اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی۔

ویلنٹائن ڈے پر اسٹارز نے شہر کے مشہور رشین ٹی روم میں اپنے اور ارسلہ کے لیے میز مخصوص کروائی لیکن ارسلہ پہلے ہی رینالڈ کی دعوت قبول کر چکی تھی۔ اسٹارز کو اپنی پیاری بیوی کی خوشی کی خاطر اس ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے جانا پڑا جو رینالڈ کے گھر کے قریب ہی تھا جہاں رینالڈ نے اس کی ملاقات ایک تندہ شخص بلیک سے کروائی جو ڈراموں کے پوسٹر بچا کرتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ رینالڈ کے اپارٹمنٹ میں چلے گئے جہاں شراب کا دور چلا۔ بلیک نے نہایت ہوشیاری سے اسٹارز کو اپنی باتوں میں الجھالیا اور اس طرح ارسلہ اور رینالڈ کو خوش گپیاں کرنے کا موقع مل گیا۔ بعد میں رینالڈ نے اسٹارز کو بتایا کہ بلیک اس کے لیے بھائیوں جیسا ہے۔ لہذا وہ بھی اس کی بے تکلفی اور گرم جوشی کا برانہ منائے۔

برف پگھلنے اور درختوں پر بہار آنے کے ساتھ ہی اسٹارز کی مصروفیت بڑھ گئی اور وہ ہفتے میں بہ مشکل ایک دن ہی گھر میں گزار پاتا۔ ایک دن وہ جنگل سے واپس آیا تو خاصا تھکا ہوا تھا اور اس کا آرام کرنے کا موڈ تھا لیکن ارسلہ زبردستی اسے اپنے ساتھ تھیر لے گئی جہاں ایک ڈرائے میں رینالڈ چھوٹا سا کردار ادا کر رہا تھا۔ ارسلہ اتنی بے جوش تھی کہ اس نے اسٹیج کے عقب میں ہی رینالڈ سے بغل گیر ہو کر اسے بوسہ دیا جو اسٹارز کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنے آپ کو اس صورت حال سے کس طرح باہر نکالے۔

ستمبر کا مہینہ آیا تو ارسلہ نے اس سے جنگل میں پکنک منانے کی فرمائش کی۔ اسٹارز کو یاد آیا کہ وہ ہنسی خوشی تیار ہو گیا لیکن اس کی خوشی اس وقت کا فور ہو گئی جب ارسلہ نے اسے بتایا کہ رینالڈ کی خواہش پر اس نے جنگل میں پکنک کا پروگرام بنایا ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ مصروفیت کا بہانہ بنا کر کے پکنک پر جانے سے انکار کر دے لیکن اپنی پیاری بیوی کی فرمائش کو نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

بارش مسلسل ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی کھاڑی میں پانی کی سطح بھی تیزی سے بلند ہو رہی تھی۔ اسٹارز اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اسے کپکپی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ طوفان کافی شدید تھا لیکن اسٹارز کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ارسلہ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ایک

کبل اٹھایا اور دوڑتی ہوئی اسٹارز کی طرف آئی۔
”ہنی پلیز!“ اس نے اسٹارز کے گرد کبل لپیٹا اور بولی۔ ”اسٹارز، درخت کے نیچے آ جاؤ مجھے اس طوفان سے ڈر لگ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ ممکن ہے بارش کے تھم جانے کے بعد ہم شکار کر سکیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر اسٹارز کے سینے پر رکھ دیا۔ اسٹارز نے کبل ایک طرف پھینک دیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیوں؟“

وہ جانتا تھا کہ یہ مختصر سا سوال اس مصنوعی پردے میں چھید کر دینے کے لیے کافی ہوگا جو گزشتہ ایک سال سے ان کے درمیان حائل تھا۔

”مجھے بتاؤ کہ رینالڈ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔“ اسٹارز نے پوچھا۔ ”وہ کون سے الفاظ ہیں جنہیں سن کر میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“

ارسلہ بارش میں کھڑی بھیکتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”اگر تم مجھے بتا دو تو بہتر ہوگا لیکن میں اس کی زبان سے وہ الفاظ نہیں سننا چاہتا۔“ اسٹارز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ارسلہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے کہ اچانک ہی رینالڈ کی بھیاںک چیخ سنائی دی جیسے کوئی بچہ سوتے میں ڈراؤنا خواب دیکھ کر چلانا شروع کر دے۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اس کی چیخیں سن کر اسٹارز اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب یہ ایکٹر کیا ڈراما کر رہا ہے۔ رینالڈ کی چیخ دوبارہ سنائی دی۔ اس نے اپنا بایاں بازو اوپر اٹھایا تو اسٹارز کو وہاں دو جگہ پر سوراخ نظر آئے جن سے خون رس رہا تھا۔ اسٹارز کی نظر ایک سانپ پر گئی جو دسترخوان کے قریب ہی کٹھلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹارز نے نزدیک ہی پڑی ہوئی ایک مضبوط لکڑی اٹھائی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ اس سے پہلے کہ سانپ اپنے جسم کو سیدھا کر کے دوبارہ حملہ کرے، اسے اس کا راستہ روکنا ہوگا۔ اسے حیرت تھی کہ اس جنگل میں یہ سانپ کہاں سے آ گیا۔ اس سے پہلے اس نے بھی سانپ کی موجودگی کے بارے میں نہیں سنا تھا وہ چھوٹی کو سیدھا کر کے سانپ کی طرف گیا اور بڑی مہارت سے اسے اوپر اٹھایا اور چکر دینے کے بعد پوری قوت سے نالے میں پھینک دیا۔

ارسلہ کی چیخ نکل گئی۔ اس نے جلدی سے ایک نیپکن اٹھایا اور اسے رینالڈ کے بازو پر باندھ دیا۔ اسٹارز نے

فوراً ہی نوگیارہ اور رینجرز کے دفتر فون کر کے حادثہ کی اطلاع دی اور انہیں اس جگہ کے محل وقوع کے بارے میں بھی بتا دیا۔ پھر وہ نالے کے کنارے تک گیا جہاں پانی طوفانی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”انہیں یہ نالہ عبور کرنے اور ہمیں ڈھونڈنے میں وقت لگ سکتا ہے۔“

رینالڈ اور زور سے کراہ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس جنگل اور پکنک کو بھی کوس رہا تھا۔

”بہتر ہے کہ ہم خود ہی یہ نالہ عبور کر لیں۔“ اسٹارز نے کہا۔ ”وقت بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہم رینالڈ کو اس پار لے جاسکتے ہیں۔“

”نہیں۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“ رینالڈ چلایا۔ ”میں پانی میں نہیں تیر سکتا۔“

”اگر تمہیں زندہ رہنا ہے تو میری بات ماننا ہوگی۔“

اسٹارز نے اس کے بازو سے پکڑا ہٹایا اور اسلا سے بولا۔ ”اگر تم نے بازو پر پٹی باندھی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے رینالڈ کو اس کے سیدھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اسلا سے کہا کہ وہ اس کے سوجے ہوئے بازو کو نیچے کی جانب رکھے۔ پھر وہ تینوں نالے کی جانب بڑھنے لگے۔ رینالڈ بار بار پلکیں جھپک رہا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسٹارز نے محسوس کیا کہ زہر اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ وہ ڈھلوان کی طرف بڑھے۔

اسٹارز کو امید تھی کہ پانی کا بہاؤ انہیں زیادہ دور نہیں لے جائے گا اور وہ کسی ایسی جگہ پہنچے جس میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں سے ریسکیو ٹیم ایک دو میل کے فاصلے پر ہو۔ طوفانی پانی اپنے ساتھ درختوں کے تنے بھی لا رہا تھا۔ جبکہ کنارے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے درختوں کے تنے اس طرح اکٹھے ہو گئے تھے کہ انہوں نے کنارے تک پہنچنے کا راستہ ہی مسدود کر دیا تھا۔

”ہمیں بہاؤ کے مخالف تیرنا ہوگا۔“ اسٹارز نے اسلا سے کہا۔ ”ہم دونوں رینالڈ کا ایک ایک بازو پکڑے رہیں گے اور اس جگہ سے نالہ پار کریں گے جہاں یہ تنے جمع نہ ہو رہے ہوں۔“

اسٹارز نے پانی میں ڈبکی لگائی۔ پانی کی کاٹ اتنی شدید تھی کہ اسے اپنے جسم میں کرنٹ دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ رینالڈ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے اسٹارز کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسلا زور سے چلائی لیکن پانی کے شور میں اسٹارز اس کی آواز نہ سن سکا۔ دوسرے ہی لمحے رینالڈ کے وزن کی وجہ سے اسٹارز نیچے کی طرف جانے لگا اور وہ

دونوں پانی کی سطح کے نیچے چلے گئے۔

اسٹارز نے پانی کے نیچے گھاس پھوس اور کچھڑے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے۔ اس نے رینالڈ کے جسم کو سیدھا کیا اور اسے کھینچتا ہوا پانی کی سطح کے اوپر لے آیا۔ اسلا ان سے الگ ہو چکی تھی۔ اب اسٹارز ایک بازو سے تیر رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ رینالڈ کو نالے میں تیرتی ہوئی دوسری چیزوں سے بچائے۔

اسٹارز کے لیے یہ ایک انتہائی مشکل مرحلہ تھا کہ وہ رینالڈ کو ساتھ لے کر تیرتا رہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ رینالڈ کی گرفت کمزور ہو گئی اور اس کے ہاتھ اس سے دور ہو گئے۔

ہر بار اسٹارز کو مایوسی کے عالم میں اسے پکڑنے کے لیے غوطہ لگانا پڑتا۔ جب وہ گرے ہوئے درختوں کے قریب پہنچے تو اسٹارز نے رینالڈ کو ان کے سہارے کھڑا کر دیا تاکہ وہ کچھ آرام کر سکیں۔ پانی ان کے کانوں کے پاس سے گزر رہا تھا اور اسٹارز مجبور تھا کہ وہ رینالڈ کو اپنے جسم سے قریب رکھے جبکہ اسلا ساحل پر پہنچ چکی تھی، اسٹارز نے اسے کنارے پر چڑھتے دیکھا اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رینالڈ کا بایاں بازو سوج کر اس کی ٹانگ کے برابر موٹا ہو گیا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ارسلا!“

”وہ پہلے ہی کنارے پر پہنچ چکی ہے۔“ اسٹارز نے جواب دیا۔

”ارسلا۔“

”تم یہی باتیں کر رہے ہو۔ یہ میں ہوں، ارسلا نہیں۔“

”ارسلا!“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولا

چاہے۔ بادل بڑے زور سے گرجتے ہوئے ان کے سر پر سے گزرے۔ رینالڈ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسٹارز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔ ”جاگتے رہو رینالڈ۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔“ پھر اس نے رینالڈ کے چہرے کو تھپتھپایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت اسٹارز کو اپنے ذہن پر بہت زیادہ دباؤ محسوس ہوا۔ رینالڈ نے ایک بار پھر اپنے ہونٹوں کو جنبش دی اور بولا۔

”ارسلا۔“

اسٹارز نے اس کا سر ہلایا۔ رینالڈ کی گردن اکڑ گئی تھی۔ اسٹارز کی آنکھوں سے گرم آنسو نکلے اور ٹھنڈی بارش میں تحلیل ہو گئے۔ اسے لگا کہ اس کے گال جل رہے

ہیں اور سینے میں درد بھر گیا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ یوں محسوس ہوا کہ پانی کا ایک زوردار ریلہ آیا اور رینالڈ کو بہا کر لے گیا۔ اسٹارز نے کنارے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا پھر اس نے کنارے کے اوپر کئی روشنیاں دیکھیں۔ بہت سے لوگ چلا چلا کر اس کا نام لے رہے تھے۔ اسٹارز کو کئی ہاتھوں نے کھینچ کر نکالا اور ابتدائی طبی امداد دینے والے عملے نے اس کے زخموں پر دوا لگا کر کبل اوڑھا دیا۔ پولیس آفیسر زور رینجرز کے لوگ بھی اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ اسلا اسے دیکھ کر چلائی۔

”اسٹارز!“

اس نے اسلا کی جانب نہیں دیکھا پھر ایک پولیس آفیسر نے اس سے رینالڈ کے بارے میں پوچھا۔

”میرے لیے اس جیسے وزنی شخص کو لے کر آنا بہت مشکل تھا۔“ اسٹارز نے کہا۔ ”میں اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور پانی کا بہاؤ اسے میری گرفت سے نکال کر لے گیا۔“

اس کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اسلا کی بھینک چنچ سنائی دی۔ اس نے تصور ہی تصور میں اس کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اسلا کیا سوچ رہی ہوگی لیکن اسے یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر رینجرز کے لوگ رینالڈ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں رینالڈ کی ٹوٹی ہوئی پسلیاں نظر آجائیں گی جہاں پہتے ہوئے درخت کے تنے نے ضرب لگائی تھی۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اس کی تلاش میں دو دن لگ جائیں اور میڈیکل آفیسر کو معائنہ کے دوران یقین آجائے گا کہ رینالڈ کی موت سانپ کا زہر پھیل جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ البتہ بقیہ ساری زندگی اسٹارز کو وہ لمحے جو تک کی طرح چھپے رہیں گے جب اس نے درخت کے تنے کی ضرب لگنے سے پہلے رینالڈ کے جسم پر اپنی گرفت ہلکی کر دی تھی۔ اس لمحے وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے موت ہاتھ پھیلائے اس سے خیرات مانگ رہی تھی اور اس نے اس کا کہا مان لیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت گھٹیا انسان سمجھ رہا تھا بالکل ان کیڑے مکوڑوں کی طرح جو چپکے چپکے صحت مند درختوں کو کھا جاتے ہیں۔

وقتی طور پر وہ رینالڈ یا اسلا کے بارے میں سوچنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کبل ایک طرف پھینک دیا اور بارش کے قطرے اس کے سر کو بھگونے لگے پھر اس نے بادلوں کے کڑکنے کی آواز سنی۔ اس نے کھڑا ہونے کی

کوشش کی لیکن توازن برقرار نہ رکھ سکا اور رینجرز کے ایک سپاہی سے ٹکرا گیا۔

اسی وقت ایک نوجوان آفیسر اور رینجرز کے دو سپاہی نالے کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔

”سر!“ نوجوان آفیسر نے پولیس سارجنٹ کو سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے لاش تلاش کر لی ہے جو چند گز کے فاصلے پر درختوں کے ڈھیر کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ مرنے والے کا دھڑپکچ گیا ہے اور اس کا بایاں بازو سو جا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سانپ کے کاٹنے کے نشانات دیکھے ہیں۔“

”بس یا اور کچھ؟“ سارجنٹ نے ان کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے پاس سے یہ گن بھی ملی ہے۔“ آفیسر نے سارجنٹ کو وہ ہتھیار دیتے ہوئے کہا۔

اسٹارز صورت حال کی گھنٹی کو بھانپ گیا۔ اس نے اپنی پتلون پر ہاتھ مارا۔ اس کی گن اپنی جگہ موجود تھی۔ اس نے سارجنٹ سے کہا۔

”یہ ایک کھلونا گن ہے جو رینالڈ کے ڈراموں میں استعمال ہوتی ہے۔“

سارجنٹ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ ”یہ کھلونا گن نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گن کے جیمبر سے میگزین نکالا اور اس میں موجود گولیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے وہ میگزین اسٹارز کے سامنے کر دیا۔

اسٹارز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اسلا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے سسکیاں لے رہی تھی اور سارجنٹ اپنے ہاتھ میں رینالڈ کی بھری ہوئی گن لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اسٹارز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسلا کو رینالڈ کے مرجانے کا غم ہے یا اس کے زندہ رہنے پر خوشی ہو رہی ہے، البتہ وہ رینالڈ کے کہے ہوئے جملے کا مفہوم ضرور سمجھ گیا تھا۔ پہلے اسے پچھتاوا تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے رینالڈ پانی میں بہہ گیا لیکن سارجنٹ کے انکشاف کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کا جرم بھی تیز بارش میں دھل گیا ہے۔ واقعی رینالڈ اس کا رقیب تھا جو کسی بھی لمحے اس کی جان لے سکتا تھا ورنہ اسے اصل پستول جیب میں رکھ کر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے رینالڈ کی موت پر افسوس ہوا تھا لیکن رقیب کے راستے سے ہٹ جانے پر اطمینان بھی محسوس کر رہا تھا۔

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2014ء

119

سپینس ڈائجسٹ

اسٹارز نے اس کا سر ہلایا۔ رینالڈ کی گردن اکڑ گئی تھی۔ اسٹارز کی آنکھوں سے گرم آنسو نکلے اور ٹھنڈی بارش میں تحلیل ہو گئے۔ اسے لگا کہ اس کے گال جل رہے

ہیں اور سینے میں درد بھر گیا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ یوں محسوس ہوا کہ پانی کا ایک زوردار ریلہ آیا اور رینالڈ کو بہا کر لے گیا۔ اسٹارز نے کنارے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا پھر اس نے کنارے کے اوپر کئی روشنیاں دیکھیں۔ بہت سے لوگ چلا چلا کر اس کا نام لے رہے تھے۔ اسٹارز کو کئی ہاتھوں نے کھینچ کر نکالا اور ابتدائی طبی امداد دینے والے عملے نے اس کے زخموں پر دوا لگا کر کبل اوڑھا دیا۔ پولیس آفیسر زور رینجرز کے لوگ بھی اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ اسلا اسے دیکھ کر چلائی۔

”اسٹارز!“

اس نے اسلا کی جانب نہیں دیکھا پھر ایک پولیس آفیسر نے اس سے رینالڈ کے بارے میں پوچھا۔

”میرے لیے اس جیسے وزنی شخص کو لے کر آنا بہت مشکل تھا۔“ اسٹارز نے کہا۔ ”میں اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور پانی کا بہاؤ اسے میری گرفت سے نکال کر لے گیا۔“

اس کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اسلا کی بھینک چنچ سنائی دی۔ اس نے تصور ہی تصور میں اس کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اسلا کیا سوچ رہی ہوگی لیکن اسے یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر رینجرز کے لوگ رینالڈ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں رینالڈ کی ٹوٹی ہوئی پسلیاں نظر آجائیں گی جہاں پہتے ہوئے درخت کے تنے نے ضرب لگائی تھی۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اس کی تلاش میں دو دن لگ جائیں اور میڈیکل آفیسر کو معائنہ کے دوران یقین آجائے گا کہ رینالڈ کی موت سانپ کا زہر پھیل جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ البتہ بقیہ ساری زندگی اسٹارز کو وہ لمحے جو تک کی طرح چھپے رہیں گے جب اس نے درخت کے تنے کی ضرب لگنے سے پہلے رینالڈ کے جسم پر اپنی گرفت ہلکی کر دی تھی۔ اس لمحے وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے موت ہاتھ پھیلائے اس سے خیرات مانگ رہی تھی اور اس نے اس کا کہا مان لیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت گھٹیا انسان سمجھ رہا تھا بالکل ان کیڑے مکوڑوں کی طرح جو چپکے چپکے صحت مند درختوں کو کھا جاتے ہیں۔

وقتی طور پر وہ رینالڈ یا اسلا کے بارے میں سوچنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کبل ایک طرف پھینک دیا اور بارش کے قطرے اس کے سر کو بھگونے لگے پھر اس نے بادلوں کے کڑکنے کی آواز سنی۔ اس نے کھڑا ہونے کی

کوشش کی لیکن توازن برقرار نہ رکھ سکا اور رینجرز کے ایک سپاہی سے ٹکرا گیا۔

اسی وقت ایک نوجوان آفیسر اور رینجرز کے دو سپاہی نالے کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔

”سر!“ نوجوان آفیسر نے پولیس سارجنٹ کو سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے لاش تلاش کر لی ہے جو چند گز کے فاصلے پر درختوں کے ڈھیر کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ مرنے والے کا دھڑپکچ گیا ہے اور اس کا بایاں بازو سو جا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سانپ کے کاٹنے کے نشانات دیکھے ہیں۔“

”بس یا اور کچھ؟“ سارجنٹ نے ان کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے پاس سے یہ گن بھی ملی ہے۔“ آفیسر نے سارجنٹ کو وہ ہتھیار دیتے ہوئے کہا۔

اسٹارز صورت حال کی گھنٹی کو بھانپ گیا۔ اس نے اپنی پتلون پر ہاتھ مارا۔ اس کی گن اپنی جگہ موجود تھی۔ اس نے سارجنٹ سے کہا۔

”یہ ایک کھلونا گن ہے جو رینالڈ کے ڈراموں میں استعمال ہوتی ہے۔“

سارجنٹ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ ”یہ کھلونا گن نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گن کے جیمبر سے میگزین نکالا اور اس میں موجود گولیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے وہ میگزین اسٹارز کے سامنے کر دیا۔

اسٹارز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اسلا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے سسکیاں لے رہی تھی اور سارجنٹ اپنے ہاتھ میں رینالڈ کی بھری ہوئی گن لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اسٹارز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسلا کو رینالڈ کے مرجانے کا غم ہے یا اس کے زندہ رہنے پر خوشی ہو رہی ہے، البتہ وہ رینالڈ کے کہے ہوئے جملے کا مفہوم ضرور سمجھ گیا تھا۔ پہلے اسے پچھتاوا تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے رینالڈ پانی میں بہہ گیا لیکن سارجنٹ کے انکشاف کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کا جرم بھی تیز بارش میں دھل گیا ہے۔ واقعی رینالڈ اس کا رقیب تھا جو کسی بھی لمحے اس کی جان لے سکتا تھا ورنہ اسے اصل پستول جیب میں رکھ کر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے رینالڈ کی موت پر افسوس ہوا تھا لیکن رقیب کے راستے سے ہٹ جانے پر اطمینان بھی محسوس کر رہا تھا۔

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2014ء

118

سپینس ڈائجسٹ

حسابِ دشمنان

ملک صبرِ رحمت

جب محافظ ہی اپنے رشتوں کا نشان گم کر بیٹھے تو وہ بالآخر خود کو بھی جرم کی بھول بھلیوں میں دھکیل دیتے ہیں... اور حساب دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا... انصاف کے تقاضے یکساں طور پر نباہے جاتے ہیں، تب ہی نتیجے کا مزہ آتا ہے مگر قدرت کے ہر کھیل میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے... انسان جب انصاف کی میزان پکڑتا ہے تو صرف چند لوگوں کی نظریں اس کا احاطہ کیے ہوتی ہیں جبکہ اللہ رب العزت کی یہ میزان تمام عالم انسانیت کے لیے ایک نگاہ عبرت بن جاتی ہے... لہذا یہاں بھی کچھ ایسا ہی جرم و سزا کا کھیل تماشا جاری تھا، البتہ انسان اپنی طاقت کے تمام حربے آزمانے میں مصروف خود کو بے گناہ اور دنیا کی نظروں میں بہت نیک ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر آخر کب تک... ایک نہ ایک دن جیسے سورج کو مخالف سمتوں سے طلوع ہو کر ڈوبنا ہوتا ہے اسی طرح عیوب بھی زیادہ دیر پردوں کے گھٹن زدہ ماحول میں چھپے نہیں رہ پاتے، اگرچہ یہ مشکل کام تھا مگر چہروں سے نقاب اتارنے کا فن صدفِ حیات سے زیادہ بہتر کس کو آتا ہے...

قدرت کے انتقام کا عبرت اثر طریقہ کار..... ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب

بعض اوقات کاروبارِ حیات اور معاملاتِ زندگی اتنے ہموار اور امن و سکون سے چل رہے ہوتے ہیں کہ انسان کو محسوس ہوتا ہے، یہ دنیا کسی جنت سے کم نہیں پھر جب اچانک کوئی سنسنی خیز واقعہ رونما ہوتا ہے تو سب کچھ ٹپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ان دنوں میں ضلع جھنگ کے ایک قصبے نظام کوٹ کے تھانے میں تعینات تھا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے کے واقعات کے سوا کوئی ایسا کیس رجسٹر نہیں ہو رہا تھا جس کے لیے ہاتھ پاؤں کھول کر ”فارم“ میں آنے کی ضرورت پیش آتی۔ کبھی کبھی تو میں سوچنے لگتا تھا کہ اعلیٰ افسران سے درخواست کر کے میں اپنا تبادلہ کسی اور ضلع کے تھانے میں کرالوں تاکہ کوئی عملی کارکردگی دکھانے کا موقع تو ملے۔ پچھلے ایک سال سے میں مذکورہ تھانے میں ڈیوٹی دے رہا تھا اور اب تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر میں کچھ اور عرصہ یہاں تھا تو انچارجی کرتا

رہا تو میری پیشہ دارانہ صلاحیتوں کو رنگ لگ جائے گا۔ پھر قدرت نے میری سن لی۔ اس سے پہلے کہ میری بدولی، مایوسی میں بدلتی اور اپنے مالک کی نظر میں، میں کسی گناہ کا مرتکب قرار پاتا، میرے تھانے کی حدود میں ایک ایسا لرزہ خیز واقعہ رونما ہوا جس نے مجھے رات و دن کا بھاگ دوڑ میں مصروف کر دیا۔ ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو وہاں تھر تھلی مچی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ادھر قبرستان کے قریب ایک بندے کی لاش پڑی ملی ہے جسے گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور فی الفور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ جائے وقوعہ یعنی نظام کوٹ کا قبرستان میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں مقامات کے بیچ لگ بھگ ایک میل کا فاصلہ رہا ہوگا۔ کانسٹیبل جنید خان نے تھانے سے قبرستان تک جانے کے لیے ایک تانگے کا بندوبست کر لیا

گزشتہ رات کے درمیانی حصے میں موت کے گھاٹ اتار گیا تھا۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ ”جی نہیں۔“ منظور نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں فوری طور پر یہی سمجھ پایا تھا کہ وہ کوئی انسان ہے جس کی گردن کو کاٹ کر دھڑ سے الگ کر دیا گیا ہے۔“

”پھر تمہیں کب اور کیسے پتا چلا کہ یہ ساجھا کی لاش ہے؟“

”میں نے جب ساجھا کی لاش دیکھی تو بری طرح بوکھلا گیا تھا۔“ وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر قریب میں مجھے کوئی بندہ بشر نظر نہ آیا۔ پھر میں پٹری کے اوپر چڑھ کر زور زور سے چلانے لگا۔ پٹری کی دوسری جانب کھیتوں میں گاؤں کے کچھ لوگ کام کر رہے تھے۔ وہ میری پکار پر دوڑے آئے۔ پھر جب سب نے یہ غور کئے ہوئے سر کا جائزہ لیا تو مقتول کی شناخت ہوگئی۔ یہ چودھری صاحب کے خاص آدمی ساجھا کی لاش تھی.....!“

منظور نے اپنے بیان میں دومرتبہ پٹری کا ذکر کیا تھا۔ آپ کی آسانی کے لیے وضاحت کرتا چلوں کہ موضع نظام کوٹ سڑک اور ریلوے لائن کے وسط میں واقع ایک گنجان آباد قصبہ تھا۔ گاؤں کا قبرستان ریلوے لائن کی دوسری جانب واقع تھا۔ پٹری کے دونوں اطراف سرسبز و شاداب کھیتوں کا وسیع و عریض سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ نظام کوٹ کے مشرق میں، پٹری کی دوسری طرف موضع نجیب پورہ تھا۔ نظام کوٹ کی نسبت نجیب پورہ ایک چھوٹا گاؤں تھا۔ میرا تھا نال ب سڑک، لاری اڈا کے پہلو میں تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، تھا نے اور نظام کوٹ میں کم و بیش ایک میل کا فاصلہ حائل تھا۔

جب ساجھا کی لاش کی دریافت کے حوالے سے منظور کی وضاحت نے مجھے مطمئن کر دیا تو میں نے وہاں موجود دیگر لوگوں پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالنے کے بعد پوچھا۔

”کیا ساجھا کا کوئی والی وارث اس وقت یہاں موجود ہے؟“

میرے سوال پر ایک ضعیف سا شخص آگے بڑھا اور بتانے لگا۔ ”تھا نے دار صاحب! ساجھا اور ساجھا کا کوئی رشتہ دار اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ دونوں چودھری صاحب کے خاص خدمت گار ہیں اور ان کے ڈیرے پر رہتے

تین چار بیڑیوں سے میرا خاندان ادھر ہی آباد ہے.....!“

”نظام کوٹ“ کا نام دراصل چودھری ظفر علی کے پردادا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ظفر علی کے باپ کا نام قادر علی تھا جو ابھی تک حیات تھا۔ وہ پختہ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ قادر علی کا باپ یعنی چودھری ظفر علی کا دادا شہادت علی اور شہادت علی کا باپ یعنی ظفر علی کا پردادا نظام علی تھا۔ ”نظام کوٹ“ اسی کے نام سے نسبت رکھتا تھا۔

میں نے منظور سے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”منظور! تمہارا روزگار، کاروبار کیا ہے؟“

”جی، میں گاؤں میں کریانہ کی ایک دکان چلاتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آج صبح جب تم قبرستان پہنچے تو اس وقت یہاں اور کتنے لوگ موجود تھے؟“

”کوئی بھی نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اکیلا ہی تھا ادھر۔ میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور جب قبرستان سے باہر نکلنے لگا تو ساجھا کی لاش پر میری نظر پڑ گئی.....!“

”گو یا، تم نے قبرستان میں داخل ہوتے وقت اسے نہیں دیکھا تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”جناب! پہلی بات تو یہ کہ جب میں پٹری چلتے ہوئے قبرستان کی طرف آیا تھا تو اس وقت تک ابھی پوری طرح روشنی نہیں کھلی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر یہ کہ ان لمحات میں میرے ذہن میں اپنے بیٹے شاہد کا خیال سامایا ہوا تھا اور میں راستے بھر اس کے لیے مختلف قرآنی آیات پڑھتا آ رہا تھا اس لیے میں قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے کسی اور چیز پر دھیان ہی نہیں دے سکا تھا۔“ وہ لمبے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

”دوسری بات یہ کہ جب میں شاہد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد قبرستان سے باہر نکلا تو چاروں طرف اجالا پھیل چکا تھا۔ میں نے جیسے ہی قبرستان سے باہر قدم رکھا، میری نظر ساجھا کی لاش پر پڑی اور میں بری طرح چونک کر رہ گیا۔“

”کیا لاش پر نگاہ پڑتے ہی تم نے فوراً پہچان لیا تھا کہ یہ ساجھا ہے؟“ میں نے چپختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ مقتول سراج عرف ساجھا کا سر اور دھڑ خون میں اس طرح لتھڑا ہوا تھا کہ پہلی نظر میں اس کی پہچان ناممکن کی حد تک مشکل تھی۔ اسے

دشمن کا سر تن سے جدا کر دیا کرتا تھا لیکن ایسا کوئی منظر مجھے جانتے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس جگہ ساجھا کی لاش نکڑے لاش پڑی پائی گئی تھی اسے اس مقام پر قتل نہیں کیا گیا تھا۔ قبرستان کی سخت اور خشک زمین پر خون کے انکادے چھینے تو نظر آرہے تھے مگر جس انداز میں ساجھا کی موت واقع ہوئی تھی اس صورت میں تو وہاں خون کی ندی بہہ جانا چاہیے تھی، یعنی طور پر ساجھا کو کہیں اور قتل کرنے کے بعد یہاں لا کر پھینکا گیا تھا۔

میں نے تفصیلی معائنے کے بعد لاش (سر + دھڑ) کے اوپر ایک چادر ڈالوا دی اور وہاں موجود لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”سب سے پہلے ساجھا کی لاش کو کس نے دیکھا تھا؟“

مجمع میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر بولا۔

”تھا نے دار صاحب! سب سے پہلے ساجھا کی لاش کو میں نے دیکھا تھا؟“

اس بندے کی عمر پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک عام سادہ بھائی تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”منظور.....!“ اس نے جواب دیا۔

”منظور!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے کتنے بجے اس لاش کو دریافت کیا تھا؟“

”جی، میرا خیال ہے اس وقت چھ بجے ہوں گے۔“ اس نے بتایا۔

”صبح کے چھ بجے.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آج کل چھ بجے تو سورج بھی طلوع نہیں ہوتا۔ تم اتنی صبح قبرستان میں کیا کر رہے تھے؟“

”جناب! ادھر قبرستان میں میرے جوان بیٹے کی بھی قبر ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلی گرمیوں میں، کھیتوں میں ایک زہریلے موذی سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اکثر اس کی قبر پر آ جاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی وضاحت سے مطمئن ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم بھی ادھر نظام کوٹ ہی میں رہتے ہو؟“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جی سرکار!

تھا۔ میرے تھانے کے پہلو میں لاری اڈا تھا اور اس اڈے سے چند گز کے فاصلے پر تانگا اسٹینڈ۔

وہ مارچ کا مہینا تھا اور موسم بہار کا ایک خوشگوار دن۔ جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں لوگوں کا خاصا بڑا ہجوم دکھائی دیا۔ وہ لوگ مقتول کی لاش کو گھیرے کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔

میں نے مقتول کی لاش کو دیکھا تو چونک اٹھا۔ وہ ایک دل ہلا دینے والا اور روکنے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔ مقتول کا دھڑ اور گردن الگ الگ پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی انتہائی تیز دھار آلے کی مدد سے اس بدنصیب کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ قاتل نے انتہائی مہارت اور شقی القلبی سے وہ واردات کی تھی۔ دوخت لاش کو دیکھ کر فوری طور پر یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دل میں نفرت اور انتقام کا ایک بحر بے کراں رکھتا تھا۔

”کون ہے یہ بندہ؟“ میں نے لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجمع سے پوچھا۔

”یہ ساجھا ہے جناب۔“ ایک شخص نے جواب دیا۔

”چودھری صاحب کا خاص آدمی.....!“

موضع نظام کوٹ کے چودھری کا نام ظفر علی تھا۔ اس سے دو تین بار میری ملاقات ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں موجود لوگوں پر ایک متلاشی نگاہ ڈالی اور پوچھا۔

”چودھری صاحب کہیں نظر نہیں آرہے۔ کیا انہیں کسی نے اس واقعے کی اطلاع نہیں دی؟“

”چودھری صاحب اس وقت گاؤں میں نہیں ہیں جناب۔“ مجھے بتایا گیا۔ ”وہ کل سے چک چوتی (چوتیس) گئے ہوئے ہیں۔ آج شام تک ان کی واپسی ہوگی۔“

”ہوں.....!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر سراج عرف ساجھا کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔

مقتول کی عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور ہٹا کھٹا شخص تھا۔ چودھری ظفر علی کی غیر موجودگی میں ساجھا کو بڑے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مذکورہ قبرستان میں داخل ہونے کے دو راستے تھے۔ ایک شمالی اور دوسرا جنوبی۔ ساجھا کی لاش شمالی داخلی راستے کے قریب پڑی پائی گئی تھی۔ اس کی لاش کے دونوں حصے ظلم و بربریت کی عبرت انگیز داستان بنا رہے تھے۔ تاریخی کتب میں درج واقعات میں تو ایسے جتنی مناظر پڑھنے کو ملے تھے جب کوئی شہسوار تلوار کا وار کر کے اپنے

ہیں..... میرا مطلب ہے، یہ ساجھا بھی ماحجہ کے ساتھ ڈیرے پر رہتا تھا۔“

ساجھا کے ساتھ ہی ایک اور نام ”ماجھا“ بھی سامنے آیا تھا۔ یہ یقیناً معراج کا بگاڑ تھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

”ماجھا اس وقت کہاں ہے؟“

”وہ یہاں تو نظر نہیں آ رہا۔“ اسی ضعیف دیہاتی نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہوسکتا ہے، وہ اس وقت ڈیرے پر ہو اور..... اسے ساجھا کی موت کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ہو.....“

یہ ایک چونکا دینے والی اطلاع تھی۔ دو افراد جو سال ہا سال سے چودھری ظفر علی کے خاص ملازم تھے اور چودھری کا ڈیرا ان کی مستقل رہائش گاہ تھا، ان میں سے ایک کو گردن کاٹ کر بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور دوسرے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں نے ماجھا کی ”خبر گیری“ ضروری جانی اور وہاں جمع افراد کی طرف دیکھتے ہوئے تھکسانہ انداز میں کہا۔

”کوئی دوڑ کر ڈیرے پر جائے اور فی الفور ماجھا کو یہاں لے کر آئے.....!“

دونو جوان اور ایک ادھیڑ عمر شخص میرے حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گئے۔

یہاں پر چودھری ظفر علی کے جس ڈیرے کا ذکر ہو رہا ہے وہ گاؤں سے باہر کھیتوں کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا جیسا کہ بڑے زمینداروں اور چودھریوں کے کھیتوں میں کسی ڈیرے کا واقع ہونا ایک لازمی بات ہے۔ اس قسم کے ڈیروں پر عموماً مال مویشی رکھے جاتے ہیں اور زراعت سے متعلق مختلف آلات بھی وہیں پائے جاتے ہیں۔ کسی بھی زمیندار کے جو خاص ملازم ڈیرے پر رہائش پذیر ہوتے ہیں، ان کا کام کھیتی باڑی کے امور کی نگرانی وغیرہ ہی ہوتا ہے۔ ساجھا اور ماجھا بھی یقیناً چودھری ظفر علی کے لیے اسی نوعیت کی خدمات انجام دیتے ہوں گے۔

میں نے وقوعہ پر موجود افراد سے ساجھا کی الٹا تک موت کے بارے میں مختلف سوالات کیے مگر یہ پوچھ گچھ قطعی لا حاصل ثابت ہوئی۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی ایسی بات بھی میرے علم میں نہ آ سکی جو اس خونیں واردات پر کسی بھی زاویے سے اتنی روشنی ڈال سکے کہ میں جس میں ساجھا کے قاتل تک رسائی کے لیے عملی چارہ جوئی کر سکوں۔

اس ”سوال و جواب“ کے نتائج سے مایوس ہو کر میں

نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور آلہ قتل کی تلاش میں گرد و پیش کے علاقے کو ٹٹولنے لگا۔ میری یہ کوشش بھی بے سود ہی ثابت ہوئی۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کھیتوں کے کنارے ایک کچا راستہ دور تک چلا گیا تھا جس پر ڈھور ڈنگر چارے والے ریڑھے، گڈے (بیل گاڑی) اور تانگوں وغیرہ کی آمد و رفت بھی جاری رہتی تھی۔ یہ کچا راستہ مذکورہ قبرستان کے پہلو سے گزر کر آگے والے گاؤں دیہات کی طرف چلا گیا تھا۔

میں نے اس کچے راستے کا بھی بہ غور جائزہ لیا اور وہاں مجھے مختلف پیہوں کے نشانات کے علاوہ انسانوں اور مویشیوں کے لاتعداد کھرے بھی آپس میں گڈبڈھوتے دکھائی دیے۔ یہ ایک الجھا دینے والی صورت حال تھی۔ میں نے موقع کی کارروائی مکمل کی ہی تھی کہ مقتول ساجھا کے ساتھی ماجھا کو بلانے کے لیے جانے والے لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا وہ چونکا دینے والا تھا۔

”جناب! ماجھا تو ڈیرے پر موجود ہی نہیں.....!“

”ڈیرے پر نہیں ہے.....“ میں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ”پھر وہ کہاں چلا گیا؟“

اس وقت دن کے دس بجے تھے۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے جائے وقوعہ پر تفتیشی کارروائی میں مصروف تھا۔ ساجھا کے قتل والا واقعہ ایسا تھا کہ جس کی خبر پورے نظام کوٹ میں گردش کر رہی تھی۔ پھر مقتول کا ساتھی ماجھا کہاں غائب تھا۔

میرے استفسار کے جواب میں کوئی بھی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ میں نے ساجھا کی دولتخت لاش کو ضلعی اسپتال پہنچوانے کے انتظامات کیے اور واپس تھانے آ گیا۔ گاؤں سے نکلنے سے پہلے میں نے چند نو جوانوں کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد ماجھا کا سراغ لگا کر اسے میرے پاس تھانے لے کر آئیں۔

آج کل کی طرح ہمارے زمانے میں تھانوں میں اتنا زیادہ عملہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ میں اس تھانے میں تین کانسٹیبل اور ایک حوالدار کے ساتھ گزارہ کر رہا تھا۔ جن میں سے ایک کانسٹیبل جنید خان کو میں نے ساجھا کی لاش کے ساتھ اسپتال روانہ کر دیا تھا۔ باقی دو میں سے ایک کانسٹیبل نذیر حسین کی میں نے ڈیوٹی لگا دی کہ وہ سادہ لباس میں رہ کر ماجھا کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ نذیر حسین مقامی بندہ تھا۔ یہ کام وہ بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ کر سکتا تھا۔

نذیر حسین کو تھانے سے روانہ کرتے وقت میں نے خصوصی ہدایات جاری کر دی تھیں۔

اگر کوئی کام روٹین کے مطابق باروٹین کے آس پاس ہوتا رہے تو تفتیش یا اچھا نہیں ہوتا لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ انسان کا چونک جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

ایک تو کافی عرصے سے کوئی جرم زدہ بڑا واقعہ سامنے نہیں آ رہا تھا اور اب اگر ایسا ہوا بھی تھا تو بڑی واہیات صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ساجھا کو بڑی بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس کا ساتھی ماجھا اچانک غائب ہو گیا تھا۔ یہ خاصی الجھی ہوئی اور تفتیش ناک سچویشن تھی۔

حوالدار بہادر علی بھی ساجھا کی لاش کو دیکھ چکا تھا کیونکہ ڈسٹرکٹ اسپتال کی طرف جانے کے لیے تھانے کے نزدیک سے گزرتا پڑتا تھا۔ بہادر علی اس تھانے میں عرصہ دراز سے متعین تھا اور اس علاقے کے لوگوں اور ان کے مزاج سے بھی بہ خوبی آگاہ تھا۔ میں نے تھانے پہنچتے ہی اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔

”بہادر علی!“ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے کہا۔ ”تم نے ساجھا کی لاش کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ کیا کہتے ہو، اس واردات کے بارے میں؟“

”ملک صاحب! میں تو کہوں گا، قاتل نے بڑی سفاکی اور بربریت کا مظاہرہ کیا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”گردن کو کاٹ کر سر کو تن سے جدا کر دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ قاتل کے دل میں ساجھا کے لیے بے پناہ نفرت چھپی نظر آتی ہے۔“

”کون کر سکتا ہے ایسا کام؟“ میں نے حوالدار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”سردست تو میں کسی کا نام نہیں لے سکتا ملک صاحب!“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ ساجھا کے ساتھی ماجھا کو شامل تفتیش کریں تو کوئی سراغ مل سکتا ہے۔“

”ماجھا منظر سے غائب ہو چکا ہے۔“ میں نے حوالدار کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کی تلاش کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ ہتھے چڑھے تو اس سے پوچھ گچھ کی جائے.....!“

”اگر ماجھا کی روپوشی اسی واقعے کی وجہ سے ہے تو

پھر صورت حال بڑی نازک ہو جاتی ہے ملک صاحب.....!“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

”میں تمہارا اشارہ سمجھ رہا ہوں بہادر علی۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں اس سے بھی آگے دیکھ رہا ہوں۔“

”وہ کیا ملک صاحب؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”اگر ساجھا کے قتل میں کسی بھی حوالے سے ماجھا کا ہاتھ ہے تو اسے تو میں دیکھ ہی لوں گا۔“ میں نے گہمیر انداز میں کہا۔ ”میں اس سے آگے یہ سوچ رہا ہوں کہ اس انداز میں کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینا کوئی معمولی بات نہیں اور تھوڑی دیر پہلے تم اس امر کا اظہار کر چکے ہو کہ جس شخص نے بھی ساجھا کو قتل کیا ہے، وہ اس سے شدید نفرت کرتا ہوگا.....“

”جی ملک صاحب!“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”یہ بات تو یقینی ہے.....!“

”تم اس تھانے میں کافی عرصے سے حوالداری کر رہے ہو بہادر علی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا ماجھا در پردہ ساجھا سے نفرت کرتا تھا..... میں نے ”در پردہ“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اگر وہ بہ ظاہر ساجھا کو ناپسند کرتا تو اس کے ساتھ مل کر طویل عرصے سے چودھری ظفر علی کی خدمت نہ کر رہا ہوتا.....“

”یہ تو آپ منطقی بات کر رہے ہیں ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے علم اور مشاہدے میں ایسی کوئی بات نہیں کہ ماجھا، ساجھا سے نفرت کرتا ہو..... پچھلے چار سال میں تو ایسا کوئی واقعہ دیکھنے کو نہیں ملا۔“

”گاؤں کا کوئی اور آدمی بھی تو..... کسی خاص واقعے کی وجہ سے..... اپنے دل میں ساجھا کے لیے شدید نفرت چھپا کر رکھ سکتا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تم اس بارے میں کیا کہتے ہو.....؟“

”جناب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ ساجھا اور ماجھا چودھری صاحب کے خاص بندے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”چودھری صاحب بھی ان کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے دماغ بھی ہمیشہ آسان پر ہی رہتے ہیں۔ گاؤں کا کوئی آدمی ان سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتا.....“

”اور اگر یہ کسی سے الجھنے کی کوشش کرتے تو.....؟“

میں نے سوال کیا۔

”تو ظاہر ہے، ان کے مد مقابل ہی کو پسپائی اختیار کرنا پڑی ہوگی۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔

”تمہیں اس تھانے میں فرائض انجام دیتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے بہادر علی؟“

”لگ بھگ چار سال جناب!“ اس نے جواب دیا۔

”اس دوران میں نظام کوٹ میں کوئی ایسا بڑا واقعہ پیش آیا ہو جب کسی نے ان سے یا انہوں نے کسی سے الجھنے کی کوشش کی ہو؟“ میں نے بہادر علی کو ٹھولا۔

میرا ذہن اسی نقطے پر رکا ہوا تھا کہ ساچھا کو کسی ایسے شخص نے قتل کیا ہے جو اس کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کی نفرت یا عداوت رکھتا ہو۔ اگر میں ایسے شخص کو تلاش کر لیتا تو ساچھا کے پراسرار قتل کا معما آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ حوالدار بہادر علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”نہیں ملک صاحب! میری یہاں تعیناتی کے دوران میں تو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا.....!“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

بہادر علی نے کہا۔ ”ملک صاحب! اس معاملے پر چودھری ظفر علی زیادہ اچھے انداز میں روشنی ڈال سکتے ہیں۔“

”مگر چودھری ظفر اس وقت گاؤں میں موجود نہیں۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”اس کی واپسی شام تک ہوگی.....“ پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

”بہادر علی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ گاؤں میں اتنا بڑا واقعہ پیش آگیا لیکن چودھری کی حویلی میں سے ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا۔ اگر چودھری ظفر چک چوٹی گیا ہوا ہے تو..... کسی اور کو تو ادھر کا چکر لگانا چاہیے تھا۔“

”ملک صاحب! چودھری ظفر کی اولاد میں صرف تین بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے تو کوئی منظر عام پر نہیں آسکتی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بڑے چودھری قادر علی کی اب پلٹے جلنے کی عمر نہیں۔ شاید حویلی والے چودھری ظفر کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوں.....“

”لیکن میں ظفر علی کی واپسی تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا۔“ میں نے بڑے عزم سے کہا۔ ”تم کسی طرح

یہ پتانگانے کی کوشش کرو کہ ساچھا کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب!“ وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ ”میں کوشش کرتا ہوں۔“

”اور یہ بھی جاننے کی کوشش کرو کہ اندر خانہ ساچھا اور ماچھا کے تعلقات کیسے چل رہے تھے.....“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”جی ملک صاحب! اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ”آپ فکر نہ کریں، میں جلد ہی آپ کو کوئی اہم خبر دوں گا۔“

میں نے ”شاباشی“ دے کر اسے اپنے کمرے سے رخصت کر دیا۔

☆☆☆

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے سہ پہر ہو گئی لیکن ماچھا کے بارے میں مجھے کوئی بھی اچھی، بری اطلاع موصول نہ ہوئی۔ وہ نظام کوٹ میں کہیں بھی نہیں تھا۔ کاشیبل نذیر حسین نے حویلی جا کر بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی لیکن ان لوگوں کو بھی اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ ڈیرا بھی خالی تھا جہاں ساچھا اور ماچھا کی رہائش تھی۔ پتا نہیں، ماچھا کو آسمان کھا گیا تھا یا زمین نے نگل لیا تھا بہر حال، وہ فی الحال میرے لیے ناپید ہو چکا تھا۔

اس صورت حال میں میرا دھیان ایک نہایت ہی مضبوط امکان کی طرف بھی جا رہا تھا اور وہ یہ کہ..... کہیں ماچھا ہی نے تو ساچھا کو ٹھکانے نہ لگا دیا ہو اور اس واردات کے بعد خود غائب ہو گیا ہو.....

کاشیبل نذیر حسین نے واپسی پر ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ اپنے ساتھ مشتاق نامی ایک بندے کو پکڑ لیا تھا۔

مشتاق کھیتوں میں کام کرنے والا ایک عام سامزدور تھا اور اس کی مستقل ڈیوٹی چودھری ظفر علی کے کھیتوں میں ہوتی تھی اور کام کے حوالے سے وہ ہر قسم کی ہدایات ساچھا اور ماچھا سے لیا کرتا تھا گو یا وہ براہ راست ان دونوں کے رابطے میں رہتا تھا۔ مشتاق کو اس حوالے سے بھی اہمیت حاصل تھی کہ ساچھا کو زندہ حالت میں دیکھنے والا وہ آخری شخص تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

مشتاق کی عمر پینتیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ محنت اور جفا کشی اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ میں نے اسے اپنے سامنے میز کی دوسری جانب بٹھالیا۔ وہ خاصا گھبراہٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحات تک گہری نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

”مشتاق! تم نے ساچھا کو آخری بار کب، کہاں اور کس وقت دیکھا تھا؟“

میرے دوستانہ انداز نے اسے کافی ہمت عطا کی۔ اس کی گھبراہٹ میں کمی واقع ہوئی اور وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! میں نے کل شام کے وقت ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ پتا نہیں۔“

اس کا جواب میرے سوال کے لحاظ سے ادھورا تھا، میں نے پوچھ لیا۔ ”تم نے انہیں کہاں دیکھا تھا؟“

”ڈیرے پر جناب.....!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”وہ ڈیرے پر کیا کر رہے تھے؟“

”بیٹھے ہوئے تھے جناب!“ اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ ”میں نے انہیں آج کی رپورٹ دی..... مطلب یہ کہ کل دن والے کام کی رپورٹ دی اور آج کے کام کے بارے میں پوچھا اور پھر وہاں سے چلا آیا..... اس کے بعد کا مجھے کچھ پتا نہیں۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”تو گویا تم نے جب ساچھا کو آخری بار دیکھا تو وہ زندہ سلامت تھا؟“

”دونوں زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھے جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ساچھا بھی اور..... ماچھا بھی۔“

”جب تم نے انہیں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟“ میں نے کرید کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے اس بات کا اندازہ تو نہیں کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی بات کی اور وہاں سے واپس آ گیا۔ بس جناب..... میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔“

”پچھلے کچھ عرصے میں تم نے ان دونوں کے درمیان کوئی تلخ کلامی یا لڑائی جھگڑا ہوتے دیکھا تھا؟“ میں نے ایک خاص زاویے سے سوال کیا۔

”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں میں بہت اتفاق تھا۔ میں نے کبھی انہیں آپس میں فساد کرتے نہیں دیکھا۔“

”ان دونوں کا گاؤں کے کسی آدمی سے کوئی پھندا ہوا ہو.....“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے مشتاق کو دیکھا۔

”خاص طور پر ساچھا کے ساتھ؟“

”ان کے منہ کھلنے کی ہمت کون کر سکتا ہے جناب۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ”نظام کوٹ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ساچھا اور ماچھا چودھری صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ ان سے ٹکرانے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اور گاؤں سے باہر.....“ میں نے مشتاق کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”خاص طور پر ساچھا کی کسی سے دشمنی رہی ہو.....؟“

”نہیں جناب، ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے قطعی انداز میں بولا۔

”اور دوستی کے بارے میں کیا کہتے ہو..... میرا مطلب ہے، ساچھا کی ماچھا کے علاوہ اور کن لوگوں سے گہری دوستی تھی.....“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”گاؤں سے اندر بھی اور گاؤں کے باہر بھی؟“

”گاؤں کے اندر تو جناب یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دوست تھے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور گاؤں کے باہر.....!“

”باہر کیا؟“ وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے فوراً سوال کر دیا۔

”جناب! گاؤں کے باہر کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ دونوں نظام کوٹ سے باہر آتے جاتے تو ہیں مگر وہاں کے معاملات کی مجھے خبر نہیں۔“

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا، چند لمحات کے بعد میں نے پوچھا۔

”مشتاق! یہ بتاؤ، ساچھا اور ماچھا کے پاس ڈیرے پر مہمان وغیرہ بھی آیا کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے، ایسے لوگ جن کا تعلق نظام کوٹ سے نہ ہو.....؟“

”جی..... ایسا عام طور پر دیکھنے میں تو نہیں آیا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن پچھلے ایک ماہ سے گاہے بگاہے ایک آدمی ان کے پاس ڈیرے پر آتا رہتا ہے.....“

”آدمی.....!“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے مشتاق کو دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے، ایسا آدمی جس کا تعلق نظام کوٹ سے نہیں؟“

”جی ہاں، وہ یہاں کا رہنے والا تو نہیں۔“ اس نے بتایا۔

”پھر کہاں کا رہنے والا ہے؟“ میں سیدھا ہو کر

”مشتاق! تم نے ساچھا کو آخری بار کب، کہاں اور کس وقت دیکھا تھا؟“

میرے دوستانہ انداز نے اسے کافی ہمت عطا کی۔ اس کی گھبراہٹ میں کمی واقع ہوئی اور وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! میں نے کل شام کے وقت ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ پتا نہیں۔“

اس کا جواب میرے سوال کے لحاظ سے ادھورا تھا، میں نے پوچھ لیا۔ ”تم نے انہیں آج کی رپورٹ دی..... مطلب یہ کہ کل دن والے کام کی رپورٹ دی اور آج کے کام کے بارے میں پوچھا اور پھر وہاں سے چلا آیا..... اس کے بعد کا مجھے کچھ پتا نہیں۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”تو گویا تم نے جب ساچھا کو آخری بار دیکھا تو وہ زندہ سلامت تھا؟“

”دونوں زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھے جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ساچھا بھی اور..... ماچھا بھی۔“

”جب تم نے انہیں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟“ میں نے کرید کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے اس بات کا اندازہ تو نہیں کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی بات کی اور وہاں سے واپس آ گیا۔ بس جناب..... میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔“

”پچھلے کچھ عرصے میں تم نے ان دونوں کے درمیان کوئی تلخ کلامی یا لڑائی جھگڑا ہوتے دیکھا تھا؟“ میں نے ایک خاص زاویے سے سوال کیا۔

”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں میں بہت اتفاق تھا۔ میں نے کبھی انہیں آپس میں فساد کرتے نہیں دیکھا۔“

”ان دونوں کا گاؤں کے کسی آدمی سے کوئی پھندا ہوا ہو.....“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے مشتاق کو دیکھا۔

اپریل 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

سرگزشت

ماہنامہ

درویش عالم

ایک درویش صفت صاحب قلم کا زندگی نامہ

شاعر اعظم

اس شاعر کا تذکرہ جسے غالب و اقبال نے استاد مانا

بے پتا

دودھائی سے الجھا کیس جو آج بھی حل طلب ہے

پراسرار پسینا

موت بن جانے والی دبا جو یورپ میں پھیل گئی تھی

بزدل کون

سبق آموز بیچ بیانی جو دل دہلا دے گی

لگا لگا ہوا

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی "سراب"
 فلمی دنیا کی کہی ان کہی داستانیں "فلمی الف لیلا"
 اور بھی بہت ساری بیچ بیانیاں سچے واقعات۔

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور
 سبق آموز بیچ بیانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے
 لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے بس ایک بار پڑھ کر
 دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے۔

میں آپ کا بھرپور تعاون چاہیے۔

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں ملک
 صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ساجھا اور ساجھا
 میرے بڑے خاص بندے تھے۔ مجھے پتا چلا ہے، ساجھا
 بھی کہیں غائب ہو گیا ہے.....!"

"آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے چودھری صاحب!"
 میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور
 ساجھا کی پراسرار گمشدگی نے اس سنگین معاملے کو بری طرح
 الجھا کر رکھ دیا ہے۔ میں تو ایک خاص زاویے سے بھی سوچ
 رہا ہوں۔"

"خاص زاویہ.....!" اس نے چونک کر میری طرف
 دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں ملک صاحب؟"

"سیدھی اور سادہ سی بات ہے چودھری صاحب!"
 میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 "ساجھا کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا ہے اور ساجھا
 پراسرار طور پر غائب ہو چکا ہے۔ اس صورت حال میں یہ
 سوچا جاسکتا ہے کہ کہیں ساجھا ہی نے تو ساجھا کو ٹھکانے نہیں
 لگا دیا.....؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!" وہ پورے یقین
 سے بولا۔ "ان دونوں میں بڑا الیکا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا
 ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے اپنی جان تو قربان کر سکتے
 تھے مگر کبھی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بارے میں
 نہیں سوچ سکتے تھے۔"

"یہ تو ایک ٹھوس حقیقت ہے نا چودھری صاحب!"
 میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ساجھا کو موت کے گھاٹ
 اتار دیا گیا ہے اور یہ کام کسی دوست کا نہیں ہو سکتا.....!"
 "میں بھی تو آپ کو یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ
 ساجھا کسی بھی قیمت پر ساجھا کی جان نہیں لے سکتا۔" وہ
 تاکید لہجے میں بولا۔

"آپ میری بات نہیں سمجھ چودھری صاحب!"
 میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ساجھا کو
 اس کے کسی جانی دشمن ہی نے ایسے ہیمانہ انداز میں ٹھکانے
 لگایا ہے۔ ساجھا کے ایسے دشمن کے بارے میں آپ سے
 زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا....." میں لمحے بھر کو رکا، ایک
 گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس نقطے پر بھی آپ ہی روشنی ڈالیں گے کہ ساجھا
 کا ساتھی ساجھا اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے.....؟"
 "دیکھیں جناب.....!" وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے

عموماً جب میں تھانے سے اٹھ کر کوارٹر میں چلا آیا تو
 پھر تھانے کے مختصر سے عملے میں سے کوئی مجھے ڈسٹر
 نہیں کرتا تھا۔ میں اگلی صبح ہی تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچ
 کرتا تھا البتہ میں نے سب سے بڑے واضح الفاظ میں کر
 رکھا تھا کہ ایمر جنسی کی صورت میں مجھے کسی بھی وقت بلا
 جاسکتا ہے چنانچہ جب دروازے پر دستک ہوئی تو سب
 ساختہ میرے دل سے نکلا تھا..... خدا خیر کرے!

میں نے مختصر سا محن عبور کرنے کے بعد کوارٹر کا بیرونی
 دروازہ کھولا تو کانشیل کاظم علی کی صورت نظر آئی۔ اس کے
 چہرے اور آنکھوں سے گہری سنجیدگی جھلکتی تھی۔
 "خیریت تو ہے نا.....؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس
 کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کاظم نے جواب دیا۔ "چودھری صاحب آپ سے
 ملنے آئے ہیں جناب۔"

"اوہ اچھا.....!" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔
 "ٹھیک ہے، انہیں بٹھاؤ، میں پانچ منٹ میں آ رہا ہوں۔"
 کانشیل "یس سر!" کہتے ہوئے واپس چلا گیا تو میں
 مناسب لباس پہننے میں مصروف ہو گیا۔ تھانے سے آنے
 کے بعد سب سے پہلے میں وردی اتار کر کھلے ڈالے کپڑے
 پہن لیا کرتا تھا جیسا کہ عموماً لوگ اپنے گھروں کے اندر پہنا
 کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے باقاعدہ یونیفارم پہن کر تو
 چودھری سے ملنے نہیں جانا تھا تاہم لباس کی موزوں سی
 تبدیلی کے بعد میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

چودھری پہلے سے کمرے کے اندر موجود تھا۔ اس
 کے ساتھ آنے والے دونوں افراد باہر برآمدے میں بیٹھے
 دکھائی دیے تھے۔ چودھری ظفر علی بڑی الجھن میں نظر آتا
 تھا۔ ریکی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"تھانے دار صاحب! میں تو نظام کوٹ میں تھا
 نہیں۔ میرے پیچھے یہ کیسا غضب ہو گیا؟"

"چودھری صاحب! یہ واقعہ تو غضب ناک ہی
 ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 "ساجھا کی گردن کئی دو لخت لاش کو دیکھ کر بہ خوبی اندازہ
 ہو جاتا ہے کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دل و دماغ میں
 کیسا غیظ و غضب رکھتا تھا۔"

"ساجھا کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلا؟" اس
 نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ابھی تک کوئی واضح صورت حال تو سامنے نہیں
 آئی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے اس سلسلے

بیٹھ گیا۔

"یہ تو مجھے پتا نہیں جناب۔" وہ سادگی سے بولا۔
 "لیکن لگتا ہی ہے کہ وہ ادھر کہیں آس پاس ہی رہتا ہوگا۔"
 "اس آدمی کے نام کے بارے میں جانتے ہو؟"
 "نہیں جناب!" مشتاق نے نفی میں گردن ہلا دی۔
 "اس کا حلیہ اور وضع قطع کیسی ہے؟" میں نے

استفسار کیا۔

مشتاق کے مطابق اس بندے کی عمر تیس کے قریب
 رہتی ہوگی۔ رنگت سانولی اور قد پست۔ اس نے ٹھنی ڈاڑھی
 موچھیں رکھ چھوڑی تھیں اور اس کی سب سے نمایاں نشانی
 اس کی بائیں آنکھ تھی۔ یعنی اس کی بائیں آنکھ کا چراغ گل
 ہو چکا تھا۔ یہ نقص پیدا کئی نہیں بلکہ حادثاتی محسوس ہوتا تھا۔
 میں نے مشتاق کی فراہم کردہ معلومات کو اپنے ذہن
 کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا اور مزید دس، پندرہ منٹ کی
 پوچھ گچھ کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔

مشتاق نے جو کام کی بات بتائی تھی وہ اسی "ملاقاتی"
 سے متعلق تھی جسے درجنوں افراد کے بچ آنکھ والے عیب کے
 سبب بد آسانی پہچانا جاسکتا تھا۔ مذکورہ بے نام بندہ میرے
 لیے اس وجہ سے بھی دلچسپی کا باعث تھا کہ وہ موضع نظام کوٹ
 کا رہنے والا نہیں تھا۔

ایک بات تو طے تھی کہ اگر مقتول ساجھا کا یار غار ساجھا
 میرے ہاتھ چڑھ جاتا تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا۔ وہی
 بتا سکتا تھا کہ ان کے پاس آنے والا وہ ایک چشم باریش شخص
 کون تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ ساجھا منظر سے غائب ہو چکا تھا
 اور ستم بالائے ستم یہ کہ کوئی ساجھا کے غیاب کے بارے میں
 کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں نے تھانے سے اٹھنے سے پہلے مقامی کانشیل
 نذیر حسین کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ متذکرہ بالا ایک چشم شخص کے
 بارے میں معلومات جمع کرنے اور کھوج لگانے میں جت
 جائے۔ اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور
 میں اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

میری رہائش تھانے کی عمارت کے پچھواڑے واقع
 سرکاری کوارٹر میں تھی۔ کوارٹر کے بعد تھانے کی حد بندی تھی
 پھر سرسبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا نظر آتا تھا۔

میں نے کوارٹر میں آ کر مغرب کی نماز ادا کی اور
 کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سنائی
 دی۔ میں نے چونک کر کوارٹر کے داخلی دروازے کی
 طرف دیکھا۔

دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جہاں تک میرا دماغ کام کرتا ہے، ان دونوں کی کسی سے ایسی دشمنی نہیں تھی کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو اور ماجھا کی اچانک روپوشی بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے تو اسے کہیں نہیں بھیجا اور نہ ہی اس نے مجھے اپنے کہیں جانے کے بارے میں بتایا تھا۔“

”یہ سب پیش آچکا ہے چودھری صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اور اس سامنے کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔“ وہ بڑے مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

ہمارے درمیان مزید تھوڑی دیر تک اسی حوالے سے بات ہوتی رہی پھر میں نے چودھری ظفر علی سے اس پست قامت یک چشم باریش آدمی کے بارے میں پوچھ لیا جو پچھلے چند روز سے ماجھا اور ماجھا سے ملنے ڈیرے پر آیا کرتا تھا۔

چودھری نے اس بندے کے حوالے سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ہمارے درمیان مزید کچھ دیر تک ماجھا کے قتل کے حوالے سے بات ہوتی رہی۔ وہ اس سانحے پر خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ میں نے سلی آمیز لہجے میں کہا۔

”چودھری صاحب! تفتیش کا مکمل جاری ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں بہت جلد ماجھا کے قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ آپ بھی اپنے طور پر ماجھا کی روپوشی کا معاملہ کرنے کی کوشش کریں اور چھوٹی یا بڑی جو بھی بات آپ کے علم میں آئے آپ سب سے پہلے مجھے اس سے آگاہ کریں گے۔“

”جی بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو یہی چاہوں گا کہ ماجھا کا قاتل قانون کے کٹہرے میں ہوں۔“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔

”ماجھا کی لاش اسپتال سے کب تک آجائے گی؟“ ”امید ہے، کل شام تک یا پھر پرسوں صبح اسپتال والے لاش دے دیں گے۔“ میں نے امکانی لہجے میں کہا۔

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد صورت حال مزید واضح ہو جائے گی۔“ ”ٹھیک ہے جناب۔“ وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ اپنی تفتیش کو اور تیز کر دیں۔ میں چاہتا ہوں، ماجھا کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں آجائے۔“

”انشا اللہ! ایسا ہی ہوگا۔۔۔۔۔!“ میں نے پروتوق انداز میں کہا۔

پھر وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

میں رات کو سونے کے لیے لیٹا تو میرے ذہن میں ساجھا۔۔۔۔۔ یعنی اس کی دولخت لاش اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ موجود تھی۔ میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ساجھا کا کوئی جانی دشمن نہ ہو۔ اگر ماجھا نے اسے موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا تو پھر کسی اور نے اس کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے چند چیزوں کی جان کاری بہت ضروری تھی۔ نمبر ایک، ساجھا کے قتل کے بعد ماجھا کہاں غائب ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ نمبر دو، یکہ چشم باریش اجنبی کون تھا۔۔۔۔۔؟

یہ۔۔۔۔۔ اور انہی جیسے دوسرے سوالات کے ساتھ تو آزمائی کرتے ہوئے پتا نہیں، کب میں نیند کی داوی میں اتر گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی تہلکہ خیز اور ہنگامہ پرور ثابت ہوئی۔ گزشتہ روز تو تھا نے پہنچنے کے بعد مجھے بتایا گیا تھا کہ قبرستان کے قریب ساجھا کی لاش پڑی پائی گئی تھی لیکن اس صبح میں ابھی اپنے کوارٹر ہی میں تھا کہ ایک سنسنی خیز اطلاع مجھ تک پہنچ گئی اور یہ اطلاع مقتول ساجھا کے جگر یار ماجھا کے بارے میں تھی۔ ماجھا کو ساجھا سے بھی زیادہ بہیمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

میں جلدی سے تیار ہو کر تھانے پہنچا اور کانٹیل کاظم علی کے ساتھ فی الفور جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وقوعہ موضع نظام کوٹ کے مشرق میں پہنے والی نہر کا کنارہ تھا۔ مذکورہ نہر ریلوے لائن سے دو، ڈھائی سو گز مشرقی سمت میں رواں دواں تھی۔ ماجھا کی دو ٹکڑے لاش اسی نہر کے کنارے پڑی ملی تھی۔ اس کی گردن تو دھڑ کے ساتھ ہی جڑی ہوئی تھی تاہم کمر پر تقریباً ناف کے مقام سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ کام کسی نہایت ہی تیز دھار والے خطرناک آلے کی مدد سے کیا گیا تھا۔ اس لاش کے دونوں ٹکڑوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ بورے (برادے) سے اٹے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ماجھا کو سپرد موت کرنے کے بعد برادے کے کسی ڈھیر میں دبا دیا گیا ہو، میں اکڑوں بیٹھ کر بغور لاش کا جائزہ لینے لگا۔

ماجھا کو بڑی عبرت ناک موت مارا گیا تھا۔ موت تو ساجھا کی بھی کچھ کم عبرت ناک نہیں تھی۔ ان قتل کی دونوں وارداتوں میں قدر مشترک ان کے جسموں کا کٹاؤ تھا یعنی ان کے بدنوں کو جس وحشت ناک انداز میں کاٹ کر دو کر

حساب دہشتان

یا کیا تھا وہ ایک ہی جانب اشارہ کرتا تھا کہ اس کام کے لیے جھری، چاقو، خنجر یا کھانڈی وغیرہ استعمال نہیں کی گئی ہوگی۔ آلہ قتل بہت ہی خطرناک اور تیز دھار تھا مثلاً کوئی آری وغیرہ۔ بہر حال، میرا ذہن اس نتیجے پر تو پہنچ گیا تھا کہ ساجھا اور ماجھا کا قاتل کوئی ایک ہی شخص تھا، مجھے اس تاہم اس کی تلاش تھی۔

ماجھا کی لاش کی دریافت کا سہرا شوکت نامی ایک چھوٹے زمین دار کے سر بندھتا تھا۔ شوکت کا تعلق نجیب پورہ سے تھا۔ وہ علی الصباح نہر کی طرف گیا تو نہر کے کنارے دو ٹکڑے انسانی جسم کو پڑے دیکھ کر وہ دہشت زدہ انداز میں چلانے لگا تھا۔ وہ بورے سے اٹے ان انسانی حصوں کو تو شناخت نہیں کر پایا تھا تاہم جب اس کی چیخ پکار پر چند لوگ وہاں جمع ہوئے تو ماجھا کو پہچان لیا گیا۔ یہ پہچان اس لیے بھی آسان ہوئی تھی کہ گزشتہ روز قبرستان کے قریب سے ساجھا کی دولخت لاش مل چکی تھی اور سب لوگ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ ماجھا منظر عام سے غائب ہو چکا ہے۔۔۔۔۔

میں نے شوکت نامی اس زمیندار سے ٹھہرا کر مختلف سوالات کیے مگر منظور کی طرح وہ بھی مجھے کوئی مفید معلومات فراہم نہ کر سکا۔ میں موقع کی کارروائی سے فارغ ہوا ہی تھا کہ چودھری ظفر علی بھی وہاں پہنچ گیا۔

”ملک صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ ماجھا کی لاش کی طرف اشارہ کر کے بکھرے ہوئے لہجے میں متفسر ہوا۔

”جو کچھ بھی ہو رہا ہے، آپ کے بھی سامنے ہے چودھری صاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ایک کے بعد ایک میرے دو اہم آدمی بڑے وحشت ناک انداز میں قتل کر دیے گئے۔۔۔۔۔“ وہ کبھیر انداز میں بولا۔ ”پولیس اس سلسلے میں کیا کرتی پھر رہی ہے؟“

”پولیس کی کارکردگی بھی آپ سے ڈھکی چھپی نہیں چودھری صاحب۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”مجھے آپ سے بھی زیادہ اس شخص کی تلاش ہے جس نے بڑی بے دردی سے ساجھا اور ماجھا کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ ایسا کام ان کا کوئی جانی دشمن ہی کر سکتا ہے۔“

”تو جناب ڈھونڈیں اس جانی دشمن کو۔۔۔۔۔!“

”ساجھا اور ماجھا آپ کے خاص بندے تھے۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کے کسی خفیہ دشمن کی نشاندہی بھی آپ ہی کی طرف سے ہوگی۔ میں آپ کے تعاون کے بغیر ایک قدم بھی درست

سمت میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔۔۔۔۔“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب! میں موقع کی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد تھانے جا رہا ہوں۔ آپ بھی وہیں آجائیں۔ پھر اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔ ایک بات ذہن میں رکھیں۔۔۔۔۔“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔

”کون سی بات جناب؟“ ”قاتل جو کوئی بھی ہے وہ آپ کی نظر سے چاہے اوجھل ہو۔۔۔۔۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”مگر وہ آپ سے زیادہ دور نہیں!“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ وہ گھبرا کر اپنے ارد گرد میں دیکھنے لگا۔

چودھری نے ایسا رد عمل دیا تھا جیسے نامعلوم قاتل اس کی بغل میں کھڑا ہو۔ وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”مطلب یہ کہ۔۔۔۔۔ ابھی تو کسی خاص بندے کی طرف دھیان نہیں جا رہا لیکن جب میں ہتھکڑی لگا کر ساجھا اور ماجھا کے قاتل کو آپ کے سامنے کھڑا کر دوں گا تا تو مجھے یقین ہے، آپ کہیں گے۔۔۔۔۔ اس بندے کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔۔۔“

”اللہ کرے، ایسا ہی ہو!“ وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ پھر کہا۔ ”آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ یہاں سے فارغ ہو کر میرے پاس حویلی میں آجائیں۔ وہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

چودھری ظفر علی کے جانے کے بعد میں نے کاظم علی کی مدد سے موقع کی کارروائی نمٹائی اور ماجھا کی دولخت لاش کو بھی پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ کاظم کو میں نے لاش کے ساتھ ہی روانہ کر دیا تھا۔

آلہ قتل کی تلاش میں، میں نے کچھ زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی کیونکہ مجھے اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ میں لاکھ کوشش کر لوں، آلہ قتل کو باز یاب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ ساجھا اور ماجھا کی دولخت لاشوں کو دیکھ کر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ آلہ قتل کو قاتل کی نشاندہی کے بغیر حاصل کرنا ناممکنات میں سے تھا لہذا میں نے اپنی تمام تر

توجہ قاتل کی تلاش پر مرکوز کر دی۔

تھانے کی طرف واپسی میں جیسے ہی میں نے ریلوے لائن عبور کی، میری نظر منظور پر پڑی۔ وہ میری طرف ہی آرہا تھا۔ اس کی نظام کوٹ میں کریانہ کی دکان تھی۔ سا جھا کی لاش گزشتہ روز اسی نے دریافت کی تھی جب وہ اپنے بیٹے کی قبر پر قاتحہ پڑھنے قبرستان کی طرف گیا تھا۔

وہ میرے قریب پہنچا تو اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ”تھانے دار صاحب..... سنا ہے، ماجھا کو بھی کسی نے قتل کے بعد نہر کے کنارے پھینک دیا ہے؟“

”کس نے؟“ میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ ”ما جھا کو کس نے قتل کیا ہے.....؟“

وہ بوکھلا کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”یہ تو مجھے پتا نہیں جناب.....!“

”کیا تم نہر کی طرف جا رہے ہو؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے اب ادھر جانے کا.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے ماجھا کی لاش کو سرکاری اسپتال روانہ کر دیا ہے..... تمہیں اگر چلنا ہی ہے تو..... میرے ساتھ تھانے چلو!“

”تھانے.....!“ وہ ہراساں نظر سے مجھے ہٹنے لگا۔

”میں نے کیا جرم کیا ہے جناب؟“

تھانے والی بات ایک خاص حوالے سے اچانک ہی میرے ذہن میں آگئی تھی۔ میں نے حالات کی کشیدگی کو کاٹنے کے لیے منظور سے تھوڑی تفریح لینے کے بارے میں سوچا۔

”تمہارا جرم بڑا سنگین ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پر..... پر میں نے آخر کیا کیا ہے؟“ اس کی پریشانی سوا ہو گئی۔

”تم نے کل صبح ادھر قبرستان میں مجھے بتایا تھا کہ تم تین، چار پڑھیوں سے ادھر نظام کوٹ ہی میں رہ رہے ہو.....؟“

”جی.....!“ اس نے یک لفظی جواب پراکتفا کیا تاہم اس ایک لفظ میں بھی زمانے بھر کی وحشت سسٹی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر تو تم نظام کوٹ میں رہنے والے

ایک ایک بندے سے واقف ہو گئے..... اور یہاں چلنے آنے والے ہر چھوٹے بڑے واقعے سے بھی.....؟“

”جی ہاں..... بالکل.....“ اس کی پریشانی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے منظور۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں تھانے میں بیٹھ کر تمہارے ساتھ پرانے وقتوں کی کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ.....!“ اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور اس کی جان میں جان آئی۔ ”ٹھیک ہے، چلیں جی.....“

وہ ہاتھ کی پشت سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔

”آپ نے تو مجھے ڈرائی دیا تھا.....“

میں منظور کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ گیا۔

منظور کی عمر چالیس سے تجاوز تھی۔ وہ ایک عام سا دیہاتی انسان تھا اور موضع نظام کوٹ میں کریانہ کی دکان چلاتا تھا۔ یہ دکان اس کے گھر کے بیرونی حصے میں تھی۔ اس کی بیوی کا نام کلثوم تھا اور دو بیٹیوں کے نام علی الترتیب رابعہ اور سعدیہ تھے۔ ان بہنوں سے بڑا بھائی شاہد سانب کے ڈننے سے زندگی ہار گیا تھا اور قبرستان کی زمین اوڑھ کر بڑے ”مزنے“ سے سو رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ کاشیمل نذیر حسین مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ خاصا پر جوش اور بے قرار دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہو۔ اس کی کیفیت کے پیش نظر میں نے پوچھ لیا۔

”نذیر حسین! کوئی خاص بات.....؟“

میں نے نذیر حسین کو یک چشم بارش پر اسرار بندے کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا مشن سونپ رکھا تھا۔ وہ ذومعنی انداز میں منظور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی ملک صاحب! میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چلو ٹرائل روم میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی تھی کہ نذیر حسین کے ذہن میں جو کچھ بھی تھا وہ منظور کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم چلتے ہوئے اس کمرے میں آگئے جہاں خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کے لیے مختلف نوعیت کے نفسیاتی حربے آزمائے جاتے تھے۔ اس کمرے کو عرف عام میں ڈرائنگ روم بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں دو کرسیاں

زیادہ خوف ناک اور روٹنے کھڑے کر دینے والا تھا۔“ میں نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے کمر کے مقام سے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک دن کے وقفے سے دولاشوں کا منظر عام پر آنا کوئی معمولی بات نہیں.....“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے، کسی ایک ہی بندے نے ان دونوں افراد کو قتل کیا ہے۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس قاتل تک تم مجھے پہنچاؤ گے منظور.....!“

”میں.....!“ وہ ایک مرتبہ پھر بوکھلاہٹ کا شکار دکھائی دیا۔ ”جناب، مجھے کیا پتا، وہ بندہ کون ہے؟“

”تمہیں نہیں پتا..... مجھے تمہاری بات کا یقین ہے منظور!“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر جناب.....؟“ اس کی ابھمن میں اضافہ ہو گیا۔

”پھر یہ کہ..... تم میری ایک بات سے ضرور اتفاق کرو گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کہ قاتل جو کوئی بھی ہے وہ سا جھا اور ماجھا سے شدید نوعیت کی نفرت کرتا تھا.....“

”جی ظاہر ہے..... یہ بات تو یقینی ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سا جھا کی گردن کئی لاش کو دیکھ کر تو یہ بات اور بھی پکی ہو جاتی ہے۔“

”ہوں!“ میں نے سمجھیر انداز میں کہا۔ ”منظور! تم نے اسی گاؤں میں آنکھ کھولی ہے۔ یہاں بسنے والے ایک ایک بندے کے حالات اور معاملات سے تم اچھی طرح آگاہ ہو۔ ذرا ذہن پر زور ڈالو اور مجھے بتاؤ، سا جھا اور ماجھا کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے والا شخص کون ہو سکتا ہے؟“

”جناب! اگر مجھے پتا ہوتا تو میں کل صبح ہی آپ کو بتا دیتا۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”یہ تو جانتے ہو گے، ماضی میں ان دونوں کا گاؤں کے کسی وینک سے کوئی شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا ہو۔“ میں نے کرید کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”جس میں سا جھا اور ماجھا کے ہاتھوں کسی کو نقصان اٹھانا پڑا ہو.....؟“

”براہ راست تو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جناب لیکن.....!“

”لیکن کیا؟“ وہ اٹکا تو میں نے فوراً سوال کر دیا۔

”سا جھا اور ماجھا کے علاوہ دو اور بندے بھی چودھری صاحب کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”ایک کا نام علی نواز اور دوسرے کا نام جان محمد تھا۔ یہ

نام تھا جاوید عرف جیدا.....!

”جیدا کو کتنے سال کی سزا ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”عمر قید کی سزا سننے میں آئی تھی۔“ منظور نے بتایا

”اس نے درجنوں آدمیوں کے سامنے جان محمد اور علی نواز کو

بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا اور مقتول بھی چودھری ظفر علی

کے آدمی۔ جیدا کو جتنی بھی سزا ہو جاتی کم تھی۔“

”کہیں.....“ میں نے پرسوج اور ٹٹولنے والی نظر

سے منظور کو دیکھا اور کہا۔ ”جیدا ہی نے تو سا جھا اور ما جھا کا

کام تمام نہیں کر دیا.....؟“

”لیکن جناب! جیدا کو تو جیل گئے ابھی چھ سال تھے

چھ سال ہوئے ہیں۔“ وہ ابھمن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے

ہوئے بولا۔ ”عمر قید اتنی جلدی کیسے ختم ہو سکتی ہے؟“

”بعض قیدی اپنی سزا پوری ہونے سے پہلے بھی جیل

سے باہر آ جاتے ہیں۔“ میں نے یہ دستور سوچ میں ڈوبے

ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جیل توڑ کر.....!“

”اوہ.....!“ وہ سراپیمہ نظر سے مجھے نکلنے لگا۔

”آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جیدا جیل توڑ کر نکل آیا ہے اور

اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے اس نے سا جھا اور

ما جھا کو قتل کر دیا ہے.....؟“

”ایسا سوچنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔“ میں

نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”مجرموں کے جیل سے فرار ہونے

کے اکاؤنٹ واقعات پیش تو آتے رہتے ہیں۔“

”لیکن جناب.....!“ منظور نے اپنی سمجھ بوجھ کے

مطابق بڑی پتے کی بات کی۔ ”اگر جیدا واقعی جیل سے فرار

ہوا ہوتا تو قانون کے محافظ اس کی تلاش میں سب سے پہلے

نظام کوٹ ہی کا رخ کرتے جبکہ یہاں ایسی کوئی بات دیکھنے

یا سننے میں نہیں آتی۔“

”چلیں، ابھی دیکھتے ہیں کہ کیا نتیجہ سامنے آتا ہے۔“

میں نے گول مول الفاظ میں کہا۔ ”میں نے کاشیمل نذیر حسین

کو خوشی محمد کی طرف بھیجا تو ہے۔ وہ واپس آنے ہی والا ہوگا۔“

”خوشی محمد!“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”یہ

وہی بندہ ہے نا، ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے جس کا ذکر کیا

تھا..... وہ سانولا اور ایک آنکھ والا.....؟“

”ہاں بالکل.....!“ میں نے اثبات میں گردن

ہلائی۔ ”خوشی محمد اسی بندے کا نام ہے۔“

”اس بندے کے بارے میں مجھے بھی کچھ بتائیں

جناب؟“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

آئندہ پانچ منٹ میں، میں نے مشتاق کی فراہم کردہ

دیا اور خود ہی تھانے پہنچ کر گرفتاری بھی دے دی۔“

”اوہ..... بہت ہی افسوس ناک اور دل گرفتہ واقعہ

ہے۔“ منظور کے خاموش ہونے پر میں نے کہا پھر پوچھا۔

”جیدا کے والدین کا کیا ہوا..... وہ کہاں ہیں اب؟“

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بتانے لگا

”جیدا کی گرفتاری کے ایک ہفتے بعد نظام کوٹ میں ایک

عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک رات کرم دین اور

صابرہ بی بی اپنے گھر میں آرام سے سوئے ہوئے تھے کہ

اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر خود

کو بچانے کی کوشش کرتے، آگ نے گھر کے ساتھ ہی

انہیں بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں

بدل گیا..... کہانی ختم!“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی منظور۔“ میں

نے ابھمن زدہ انداز میں کہا۔ ”کوئی اتنی گہری نیند نہیں

سو سکتا کہ گھر کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو جائے اور اس کی

آنکھ بھی نہ کھلے.....؟“

”یہی بات اور بھی چند لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی

تھانے دار صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور ان کا

خیال تھا، پہلے کرم دین اور صابرہ بی بی کو موت کے گھاٹ

اتارا گیا تھا، بعد ازاں ان کے گھر کو نذر آتش کر کے قصہ تمام

کر دیا گیا تھا۔ یہ بات جیل میں بند جیدا تک بھی پہنچی تھی مگر

مختلف انداز میں۔“

”مختلف انداز میں.....!“ میں نے چونکے ہوئے

انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”منظور! ذرا اپنی بات کی

وضاحت تو کرو؟“

”جناب! اسی گاؤں کے کسی بندے نے جیدا کو

جا کر بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کو سا جھا اور ما جھا نے قتل

کیا ہے۔“ منظور نے بتایا۔ ”انہوں نے علی نواز اور جان

محمد کا انتقام لینے کے لیے پہلے بوڑھے میاں بیوی کو جان

سے مارا پھر گھر کو آگ لگا کر اپنے سینوں میں روشن آگ کو

ٹھنڈا کر لیا۔“

”پھر جیدا نے اس اطلاع پر کیا رد عمل ظاہر کیا تھا؟“

”وہ بے چارہ جیل کی آہنی سلاخیں توڑ کر یہاں تو

آ نہیں سکتا تھا۔“ منظور نے بددلی سے بتایا۔ ”ادھر قید ہی

میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا ہوگا۔“

ان لمحات میں میرا ذہن نہایت ہی تیز رفتاری سے

کام کر رہا تھا۔ منظور کی زبانی بالآخر یہ بات سامنے آگئی تھی

کہ سا جھا اور ما جھا سے بے پناہ نفرت کرنے والے شخص کا

بکھرے ہوئے متعدد واقعات کو ایک جگہ جمع کرنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ میں نے گہری دلچسپی اور سنجیدگی سے اس

کے چہرے پر نظر جمادی۔ چند لمحات کے بعد سمجھ بوجھ کے

بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حزن

و ملال ٹپکتا تھا۔

”ملک صاحب! یہ کوئی چھ یا ساڑھے چھ سال پہلے کا

واقعہ ہے۔ میں نے جس جیدا کا ذکر کیا ہے وہ اسی گاؤں میں

اپنے ماں باپ اور چھوٹی بہن عابدہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

غریب گھرانہ بڑے شریفانہ انداز میں زندگی گزار رہا تھا کہ

وہ واقعہ رونما ہوا جس نے جیدا کو دو افراد کا قاتل بنا کر جیل

کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا.....!“

”ہوا کیا تھا؟“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے

متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ

میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں وہی تو بتانے والا ہوں جناب!“ وہ ساواکی

سے بولا۔ ”جیدا کی چھوٹی بہن عابدہ بہت خوب صورت

تھی۔ اس پر جوانی ٹوٹ کر برسی تھی۔ جان محمد اور علی نواز کی

بری نظریں جب عابدہ کو میلا کرنے کے لیے پر تو لے لگیں تو

جیدا کا خون کھول اٹھا۔ اس نے چودھری کے بندوں کو

سمجھانے کی کوشش کی۔ جیدا کے باپ کرم دین نے چودھری

ظفر علی سے اس حوالے سے شکایت بھی کی لیکن جان محمد اور

علی نواز صاف مکر گئے اور عابدہ ہی کو قصور وار ٹھہرا دیا۔ یہ

دیکھ کر جیدا کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا اور اس نے

طیش میں آ کر ان دونوں کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی

دیں جس کا علی نواز اور جان محمد پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں

نے چودھری کے بندے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی

روش جاری رکھی اور ایک رات موقع پا کر انہوں نے عابدہ کو

اغوا کرنے کے بعد برباد کر ڈالا۔ اگلی صبح عابدہ کی بے حرمت

لاش کھیتوں کے اندر پڑی ملی تھی۔“ وہ لمحے بھر کے لیے

متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ کلام کو

آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کسی کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ظلم

و بربریت کی داستان علی نواز اور جان محمد نے رقم کی ہوگی مگر

جیدا کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ بے غیرتی کا ایسا مظاہرہ

انہی دونوں نے کیا ہے۔ عابدہ والے واقعے نے جیدا کو

ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا اور..... اگلے ہی روز اس نے دن

دہاڑے درجنوں افراد کی نظروں کے سامنے منجھر کے پے

درپے دار کر کے علی نواز اور جان محمد کو موت کے گھاٹ اتار

دونوں خاصے اتھرے اور مندر زور قسم کے بندے تھے اور

پھڈے جھکڑے کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔

گاؤں ہی کے ایک نوجوان کے ہاتھوں علی نواز اور جان محمد کا

قتل ہو گیا تھا جس کا ظاہر ہے، سا جھا اور ما جھا کو بہت دکھ ہوا

تھا کیونکہ وہ دونوں سا جھا ما جھا کے ساتھ ڈیرے پر ہی

رہتے تھے۔“

منظور کی زبان سے برآمد ہونے والے حقائق ماضی

نہایت ہی کارآمد اور سنسنی خیز تھے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا

اور پوچھا۔

”کیا اس نوجوان کا نام خوشی محمد تھا؟“

اس نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلا دی۔

”سانولے رنگ کا ایک پستہ قامت آدمی.....!“

میں نے منظور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”جس

نے کھنی ڈاڑھی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور اس کی بائیں آنکھ

بھی نہیں تھی یعنی وہ کانٹا تھا.....؟“

”بالکل نہیں جناب.....!“ پوری توجہ سے میری

بات سننے کے بعد اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”آپ پتا نہیں،

کس بندے کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو جس آدمی

کے بارے میں بتایا ہے اس کا نام جاوید عرف جیدا تھا۔

اب تو وہ بے چارہ جیل میں سڑ رہا ہے.....!“

”اس کا کس بات پر علی نواز اور جان محمد کے ساتھ

جھگڑا ہوا تھا؟“ یہ جان لینے کے باوجود بھی کہ خوشی محمد اور

جیدا دو مختلف آدمی تھے، میں نے اپنی معلومات کی غرض سے

پوچھ لیا۔ ”جیدا کے گھر کے دیگر افراد تو اسی گاؤں میں موجود

ہوں گے نا؟“

”نہیں جناب، کوئی بھی نہیں.....!“ وہ مایوسی سے

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیا مطلب منظور؟“

”جناب! بڑی دروہری داستان ہے اس بد نصیب جیدا کی

بھی۔“ وہ کھلی لہجے میں بولا۔ ”آپ سن کر کیا کریں گے.....؟“

”میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔“ میں نے

متعدیل انداز میں کہا۔ ”میرے تھانے کی حدود میں پیش

آنے والے ہر چھوٹے بڑے واقعے کی مجھے خبر ہونا چاہیے،

چاہے وہ واقعہ حال کا ہو یا..... اس کا تعلق ماضی سے ہو۔“

وہ میرے مقصد کی تہ تک پہنچنے کے بعد ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اچھا جی، بتاتا ہوں.....!“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ ماضی کے

”مقبول حسین نے نجیب پورہ میں اپنے گھر کے قریب ہی آرا مشین لگا رکھی ہے۔“

”کیا کہا.....؟“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں چلا اٹھا ”آرا مشین.....!“

میرے تصور میں اس وقت ماجھا کی دولت لاش روشن ہو گئی تھی۔ اس کا مردہ بدن بورے (برادے) سے لٹا ہوا تھا۔ آرا مشین اور برادے کا چولی دامن کا ساتھ ہو رہا ہے۔ جہاں بھی لکڑی کو کاٹا جائے، برادہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔

”جی ہاں، آرا مشین.....!“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”مقبول حسین آرا مشین پر مختلف قسم کی لکڑیوں کی کٹائی کا کام کرتا ہے۔ اس کی اپنی ٹال بھی ہے۔ خوشی محمد اسی آرا مشین پر کام کرتا تھا اور اس کی رہائش بھی آرا مشین والے احاطے ہی میں تھی.....“

صورت حال روز روشن کی طرح میرے سامنے عیاں ہو چکی تھی۔ ماجھا کی گردن اور ماجھا کی کمر جس انداز میں کاٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا وہ کام کسی آرا مشین ہی سے ممکن تھا اور یہ بات بھی طے تھی کہ اپنی ”کٹائی“ کے وقت ماجھا اور ماجھا ہوش و حواس میں نہیں رہے ہوں گے ورنہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے اس ظالمانہ سلوک پر اتنا اودھم مچاتے کہ پورا نجیب پورہ آرا مشین کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ ماجھا اور ماجھا کے قتل میں خوشی محمد کے سوا کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا، میں ریڈارٹ ہو گیا۔ اب پہلی فرصت میں مجھے خوشی محمد کو تلاش کرنا تھا اور اس یک چشم، باریش بندے کے بارے میں مقبول حسین سے زیادہ مجھے کوئی اور شخص بتا نہیں سکتا تھا۔

”نذیر حسین! ہمیں ابھی نجیب پورہ جانا ہے۔“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مقبول حسین سے کڑی پوچھ گچھ بہت ضروری ہو گئی ہے.....“

”ٹھیک ہے، ملک صاحب!“ وہ چاق چوبند لہجے میں بولا۔ ”میں ابھی ایک تانگے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

میری دیکھا دیکھی منظور بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب؟“

”تم اپنے گھر جاؤ اور کریانے کی دکان چلاؤ۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اور جیدا کے حوالے سے میں نے تمہیں جو ہدایات کی ہیں ان کو ذہن میں رکھنا۔“

”جی..... میں سمجھ گیا۔“ وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اطلاعات کی روشنی میں منظور کو خوشی محمد کے بارے میں مختصراً بتا دیا اور اپنی بات کے اختتام پر کہا۔

”ابھی یہ معاملہ کسی اور کو نہیں بتانا منظور!“ میرے اس جملے سے تنبیہ جھلکتی تھی۔ ”ورنہ یہ کیس بگڑ کر رہ جائے گا۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں تھانے دار صاحب!“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

ہمارے درمیان اسی موضوع پر بات چیت چل رہی تھی کہ کانٹیل نذیر حسین واپس آ گیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ انجمن کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے نذیر حسین۔ خوشی محمد کدھر ہے؟“ وہ کہیں بھی نہیں ہے ملک صاحب.....!“ وہ پریشانی سے بولا۔

”کہیں بھی نہیں ہے..... کیا مطلب؟“

”جناب! وہ آج صبح ہی سے غائب ہے۔“ کانٹیل نے بتایا۔ ”کسی کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

”تم نے اس کے گھر والوں سے پوچھنا چھوڑ کی؟“

”اس کا کوئی گھر ہو تو میں پوچھ گچھ کرتا.....!“

”نذیر حسین! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ میں نے کانٹیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے برہمی سے کہا۔ ”تم ہی نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ نجیب پورہ کا رہنے والا ہے.....؟“

”جی ہاں، میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“ وہ اپنی پوزیشن کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ پچھلے کچھ عرصے سے نجیب پورہ میں رہ رہا تھا مگر اس کا گھر یہاں پر نہیں.....!“

نذیر حسین کے تازہ ترین انکشافات نے میری سوچ میں ہلچل مچا دی۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ”اگر اس کا گھر نجیب پورہ میں نہیں تو پھر وہ یہاں کس کے پاس رہ رہا تھا؟“

”اس نے مقبول حسین کے پاس نوکری کر رکھی تھی۔“ کانٹیل نے جواب دیا۔ ”اور اسی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا.....!“

ماجھا اور ماجھا کے قتل کے حوالے سے خوشی محمد پر میرا شک اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا۔ وہ بندہ پراسرار انداز میں ڈیرے پر آکر ماجھا اور ماجھا سے ملاقاتیں کیا کرتا تھا اور ان کی بیہمانہ اموات کے بعد یکا یک وہ منظر سے غائب ہو گیا تھا اور پھر سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ وہ اس علاقے کا رہنے والا بھی نہیں تھا.....

”مقبول حسین کے پاس وہ کس قسم کی نوکری کرتا تھا؟“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

رہا ہوں ورنہ تصدیق تو اس خون کے لیبارٹری ٹیسٹ کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

ہم نے اس احاطے کے کونے کونے کی تلاشی لی جہاں مقبول حسین نے لکڑی کی ٹال اور آرا مشین لگا رکھی تھی۔ پرانے سامان کے اندر سے مجھے استعمال شدہ کپڑوں کے چند ایسے ٹکڑے بھی مل گئے جو خون آلود تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ ساجھا اور ماجھا ”کی کٹائی“ کے بعد کپڑے کے ان ٹکڑوں سے آرا مشین کو صاف کیا گیا تھا۔ میں نے لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے برادے کے علاوہ یہ خون آلود پارچہ جات بھی محفوظ کر لیے اور ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد مقبول حسین کے پاس آ گیا۔

وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ میں نے اس کی حالت کو اطمینان بخش پاکر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”خوشی محمد تمہارا کیا لگتا تھا مقبول حسین؟“

”کچھ نہیں جی۔“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”میری اس سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔“

”مجھے پتا چلا ہے، وہ اس علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”جب تم اسے جانتے نہیں، اس سے کوئی رشتہ داری نہیں تو پھر اسے ملازمت پر کیسے رکھ لیا۔ تم نے اس سے کوئی بچہ پریت نہیں کی تھی؟“

”میں نے بچہ پریت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جناب۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ ”تم نے نہ صرف اسے آرا مشین پر ملازم رکھ لیا بلکہ اس کی رہائش کا بھی ادھر ہی بندوبست کر دیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جی۔۔۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ من منایا۔

”اس بھروسے اور اندھے اعتماد کی وجہ؟“ میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

”اس کی وجہ صفر علی ہے تمہانے دار صاحب!“

”صفر علی!“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”یہ کون چاچا۔۔۔۔۔؟“

”صفر میرا چھوٹا بھائی ہے جناب!“ اس نے بتایا۔

”وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتا ہے۔ خوشیا اس کا رقبہ لے کر آیا تھا میرے پاس۔“

”کیسا رقبہ؟“ میں نے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بالکل وہی۔“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو خوشیا کا کچھ پتا ہے جی؟“

”بس اتنا پتا ہے کہ وہ اب بھی واپس نہیں آئے گا۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”تک۔۔۔۔۔ کیا مطلب جناب؟“ اس کی حیرت پریشانی میں بدل گئی۔

”تم گھبراؤ نہیں چاچا۔۔۔۔۔!“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”اگر خوشیا تمہیں دھوکا دے کر کہیں غائب ہو گیا ہے تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج سے تمہاری آرا مشین میں چلاؤں گا۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔؟“ وہ ہکا بکا ہو کر مجھے نکلنے لگا۔

میں نے مقبول حسین کی حیرت اور تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے کالٹیل سے کہا۔ ”آؤ نذیر حسین! دیکھتے ہیں، آرا مشین کیا کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔“

ہم دونوں مقبول حسین کو حیران پریشان چھوڑ کر آرا مشین پر پہنچے۔ مشین کے نچلے حصے میں برادے (برادے) کا ایک نمایاں ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ میں نے نذیر حسین سے کہا۔

”ادھر ٹال سے ایک دو لکڑیاں اٹھا لاؤ۔۔۔۔۔!“

اسی لمحے گدھے کے ہنہانے کی آواز ابھری۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹال کی دوسری جانب اور احاطے کے اندر ہی ایک گدھا کھڑا نظر آیا۔ اس وقت وہ گدھا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مذکورہ گدھے کے نزدیک ہی دیوار کے ساتھ ایک گدھا گاڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ گدھے کی ہنہانہٹ نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی خیز لہری دوڑا دی تھی۔

میں نے جانوروں کی نفسیات اور رویوں پر بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ یہاں جانوروں سے میری مراد حیوان ہیں۔ حیوان ناطق یعنی انسان کی بہ نسبت ان کی حیات زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق حیوان فطرت اور ماحول کے بارے میں انسان سے زیادہ جان کاری رکھتا ہے تاہم قوت گویائی یا قوت اظہار کی عدم موجودگی کے باعث یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کیے رہنے پر مجبور ہوتا ہے البتہ بعض سنگین حالات میں مختلف قسم کی آوازیں نکال کر یہ بہت کچھ بتانے کی کوشش ضرور کرتا ہے جیسا کہ بعض حادثات و سانحات سے پہلے کہتے اور بلیاں اسے حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالتے لگتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ مقبول حسین کے گدھے کی ہنہانہٹ بے معنی نہیں ہوگی۔

نذیر حسین کے ساتھ ہی مقبول حسین بھی میرے قریب آ گیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور ایک لمبی لکڑی کی مدد سے برادے کے ڈھیر کے ساتھ چھینر چھاڑ شروع کر دی۔ میری دیکھا دیکھی نذیر حسین بھی اسی کام میں جُت گیا۔ بہت جلد کامیابی نے ہمارے ہاتھ پاؤں چوم لیے۔ ہم نے برادے کے ڈھیر کا ”پوسٹ مارٹم“ کیا تو وہ تمام تر شواہد حاصل ہو گئے جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی تھی کہ کسی خون آلود لاش کو یہاں ”دفن“ کیا گیا تھا۔ گویا، ماجھا کی لاش کے دونوں حصوں کے برادے میں اٹے ہونے کا راز فاش ہو چکا تھا۔

اس سنگین انکشاف پر مقبول حسین وحشت زدہ ہو گیا پھر اس کے حلق سے کپکپاتی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ خون۔۔۔۔۔ کہاں سے۔۔۔۔۔ آیا۔۔۔۔۔؟“

”یہ ساجھا اور ماجھا کا خون ہے مقبول حسین!“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ان دونوں بندوں کو تمہاری آرا مشین پر کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔“

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ ”مم۔۔۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا جناب۔۔۔۔۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ ساجھا اور ماجھا کو تم نے قتل کیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ کام تمہارے ملازم خوشیا نے کیا ہے۔۔۔۔۔ بتاؤ، وہ کہاں غائب ہوا ہے؟“

”رب دی قسم، مجھے کچھ پتا نہیں۔“ وہ منت زیر لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ پر شک نہ کریں جناب۔۔۔۔۔!“

میں نے مقبول حسین کو ایک چارپائی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کی حالت خاصی غیر ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ اگر میں نے اسے آرام سے بیٹھنے کے لیے نہ کہا تو وہ ڈھے جائے گا اور ہو سکتا ہے، زندگی بھی ہار بیٹھے۔

”تم اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالو مقبول حسین!“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اس بات کا مجھے یہ خوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ تم مجرم نہیں ہو مگر میں یہ بات بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تمہارے تعاون ہی سے قاتل تک پہنچوں گا۔۔۔۔۔ تم خود کو اور اپنے حواس کو قابو میں رکھو۔ میں تھوڑی دیر میں تم سے بات کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

اس کے زرد ہوتے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نذیر حسین کو ساتھ رکھ کر موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا۔ آرا مشین کے نیچے جمع شدہ برادے کے اندر سے ساجھا اور ماجھا کے خون کے آثار مل گئے تھے۔ یہ بات میں حالات و واقعات کی روشنی میں کہہ

☆☆☆

وہ مارچ کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔

آج صبح ہی سے ایسی بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی کہ دوپہر کے کھانے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ بھوک اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی لیکن فرض آڑے آ رہا تھا۔ میں اس فارمولے کا حامی ہوں کہ ”پہلے کام، پھر طعام، پھر آرام“ سو مجھے پہلے مقبول حسین کی ”خبر گیری“ کرنا تھی۔ باقی کے معاملات بعد میں بھی نمٹائے جاسکتے تھے۔ پیٹ میں اگر بھوک بردار چوہے ہاکی کا بیج کھیل رہے تھے تو ذہن میں سنسنی خیز خیالات کا سونامی آیا ہوا تھا۔ ”سونامی“ کے لفظ پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے، جس زمانے کا یہ واقعہ ہے جب یہ لفظ متعارف نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ یہ کہانی لکھی بہت بعد میں جاری ہے اس لیے اس لفظ کو صورت حال کی وضاحت کے لیے اور ہنگامہ خیزی کے اصلی احساس کو اجاگر کرنے کے لیے اس تمثیل کا استعمال کیا گیا ہے۔ مجھے یقین تھا، آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔ ساجھا اور ماجھا کا قاتل اگر میرے ہتھے نہ بھی چڑھا تو اس تک رسائی کا راستہ ضرور مجھے مل جائے گا۔

جب ہم آرا مشین پر پہنچے تو مقبول حسین کسی گا ہک کے لیے ٹال پر لکڑیاں تول رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے نذیر حسین سے عوامی لباس میں ملاقات کر چکا تھا۔ اب جو اس نے دو باوردی پولیس والوں کو اپنی جانب آتے دیکھا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔ نذیر حسین پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی جھلکی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔

”مقبول حسین! کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی سوال کیا۔

”لکڑیاں تول رہا ہوں سرکار!“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

مقبول کی عمر بچپن اور ساٹھ کے درمیان نظر آتی تھی۔ وہ گندی رنگت والا ایک عام سادہ پھاتی تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

”آج تمہارا آرا کیوں نہیں چل رہا۔۔۔۔۔؟“

”خوشیا پتا نہیں، کدھر غائب ہو گیا ہے۔“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”آج صبح ہی سے نظر نہیں آ رہا۔۔۔۔۔“

”چاچا! تم خوشی محمد کی بات کر رہے ہونا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”وہ جس کی ایک آنکھ کا چراغ بجھ چکا ہے؟“

الگ نظر آتے ہیں۔“

اس امر کی تصدیق منظور پہلے ہی کر چکا تھا کہ جیدا اور خوشیا دو مختلف بندے ہیں۔ میں نے سوچتی ہوئی نظر سے چودھری کو دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آپ کے خیال میں جیدا اس وقت کہاں ہوگا؟“

”ظاہر ہے، وہ جیل ہی میں ہوگا۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”عمر قید کی سزا اتنی جلدی تو ختم نہیں ہو سکتی نا.....!“

”اور اگر وہ کسی طرح جیل سے فرار ہو گیا ہو تو.....؟“

”تو کیا ملک صاحب؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ جیدا جیل سے فرار ہو گیا ہو۔“

میں نے اپنی بات کو دہرایا اور وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اس نے خوشیا کا بھیس بدل کر نجیب پورہ کا رخ کیا ہوا اور پھر مضبوط منصوبہ بندی کے بعد سا جھا اور ما جھا کو ٹھکانے لگا دیا ہو؟“

”جناب! پہلی بات تو یہ کہ میں ماننے کو تیار نہیں جیدا جیل تو ذکر فرما رہا ہوں۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

”دوسری بات یہ کہ وہ لاکھ بھیس بدل لے مگر سا جھا اور ما جھا اسے ہر روپ میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے اور تیسری بات یہ کہ جیدا کی سا جھا اور ما جھا سے کیا دشمنی..... اس کا جھگڑا جان محمد اور علی نواز سے ہوا تھا اور انہی کے قتل کے جرم میں وہ عمر قید کی سزا پا کر جیل میں سڑ رہا ہے۔“

”آپ کی پہلی دونوں باتیں تو امکانی ہیں چودھری صاحب۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”یعنی ہو سکتا ہے، وہ جیل سے فرار ہو گیا ہو اور ہو سکتا ہے، وہ ابھی تک جیل ہی میں ہو۔ ممکن ہے بدلے ہوئے بھیس میں سا جھا اور ما جھا نے اسے پہچان لیا ہو اور عین ممکن ہے، وہ اسے پہچان نہ پائے ہوں لیکن.....“ میں نے لحاظی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن جہاں تک سا جھا اور ما جھا سے اس کی دشمنی کا تعلق ہے، تو میں آپ کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ جان محمد اور علی نواز کی موت کے بعد یہ سلسلہ رک گیا تھا۔“

”جی.....“ اس نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا۔

”ملک صاحب، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”میرے سننے میں یہ آیا ہے کہ جیدا کے جیل چلے جانے کے بعد اس کے گھر میں آتش زدگی کا ایک خوف ناک واقعہ پیش آیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جس میں گھر کے ساتھ ہی جیدا کے ماں باپ بھی نذر آگ بن گئے تھے۔“

آئندہ دس منٹ میں، میں نے چودھری ظفر علی کو صورت حال سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ گہیر انداز میں بولا۔

”یہ تو بڑا سنگین معاملہ ہے ملک صاحب۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ یہ ایک آنکھ والا بندہ ہے کون اور اس کی میرے بندوں سے کیا دشمنی تھی؟“

”چودھری صاحب! اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کریں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے یہ بندہ آپ کے دماغ میں کہیں ابھر آئے؟“

”آپ نے کل بھی اس بندے کا ذکر کیا تھا۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”میں جیسی سے اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن یقین کریں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔“

”میری معلومات کے مطابق، یہ خوشیا پچھلے ایک مہینے میں گا ہے رہا ہے سا جھا اور ما جھا سے ملنے ڈیرے پر بھی جایا کرتا تھا۔“ میں نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔

”ان دونوں نے آپ سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”اگر ایسا کوئی ذکر مجھ سے ہوا ہوتا تو میں اس ایک آنکھ والے آدمی کو کیسے بھول سکتا تھا۔“

چودھری کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”چودھری صاحب! آپ کو یہ تو اچھی طرح یاد ہوگا کہ چھ ساڑھے چھ سال پہلے اسی گاؤں کے ایک نوجوان نے آپ کے دو خاص بندوں کو دن دھاڑے قتل کر دیا تھا؟“

”میں بھلا اس واقعے کو کیسے بھول سکتا ہوں ملک صاحب۔“ وہ پروٹوق لہجے میں بولا۔

”وہ دونوں بندے سا جھا اور ما جھا کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ جان محمد اور علی نواز کے قاتل کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔“

”کیا اس نوجوان کا نام جاوید عرف جیدا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، آپ نے بالکل ٹھیک نام لیا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔

”کیا جیدا اور خوشیا کا حلیہ یا وضع قطع میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے؟“ میں نے چودھری کا ذہن پڑھنے کے لیے سوال کیا۔

”نہیں جناب! آپ نے اس خبیث خوشیا کی جتنی بھی نشانیاں بتائی ہیں وہ کہیں سے بھی جیدا سے میل نہیں کھاتیں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”مجھے تو یہ دونوں الگ الگ

”تم مجھے اپنے بھائی صفدر علی کے بچے ٹھکانے کی تفصیل بتاؤ گے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں اپنے کسی بندے کو تو یہ ایک سنگھ بیچ کر اس کے بارے میں معلومات کراتا ہوں۔ اس بات کا مجھے یقین ہے کہ صفدر علی نے خوشیا کو تمہارے پاس بھیجا ہو یا نہ ہو مگر وہ اس کے بارے میں جانتا ضرور ہوگا۔“

مقبول حسین نے ٹوبہ فیک سنگھ میں صفدر علی کے گھر کے بارے میں مجھے تفصیلی معلومات فراہم کر دیں۔ میں نے اسے چند ضروری ہدایات دیں پھر واپس تھانے آ گیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ایک خصوصی خط لکھا اور نذیر حسین کو خون کے دونوں نمونے (برادہ + خون آلود کپڑے) دے کر لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اسپتال بھیج دیا۔

مجھے پوری امید تھی کہ یہ نمونہ جات سا جھا، ما جھا کے خون سے میچ کر جائیں گے۔ وہ خوشی محمد تھا یا خوشیا اور یا پھر کوئی اور..... اس نے کمال ہنرمندی سے سا جھا اور ما جھا کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اس بات میں بھی قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ایک چشم باریش شخص ان دونوں کے لیے اجنبی تھا۔ اگر یہ دونوں اسے اپنے دشمن کی حیثیت سے جانتے ہوتے تو کبھی اسے اپنے قریب نہ آنے دیتے تو کیا..... خوشیا نے کسی اور کا انتقام لیا تھا، اس نے کرایے کے قاتل کا کردار ادا کیا تھا.....؟

ان سوالات نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا۔ میں نے افراتفری میں دن کا کھانا کھایا اور پریشان سوچ کے ساتھ آ کر اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ چودھری ظفر علی مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا۔

”کی علیک سلیک کے بعد چودھری نے شکایتی لہجے میں کہا۔“ ملک صاحب! میں تو اپنی حویلی میں بیٹھا آپ کا انتظار کرتا رہ گیا اور آپ.....!“

”ایک ضروری کام.....!“

میں نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے سب پتا چل گیا ہے ملک صاحب۔ آپ نجیب پورہ میں مقبول حسین کی آرائشیں پر کوئی نہایت ہی اہم کارروائی کر کے آئے ہیں۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”تو ساری خبریں آپ تک پہنچ گئی ہیں۔“

”ساری نہیں، آدمی ادھوری خبریں۔“ وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ان کو مکمل تو آپ کریں گے.....“

”خوشیا، صفدر سے جو رقعہ لایا تھا اس میں لکھا تھا.....“ وہ مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ”کہ خوشیا ایک لاوارث شخص ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں اور یہ صفدر کے ایک دوست رمضان علی کا بیٹا ہے۔ صفدر نے اس رقعے میں مجھ سے کہا تھا کہ میں خوشیا کو اپنے پاس نوکر رکھ لوں۔ یہ بہت بھروسے اور کام کا بندہ ہے۔ اسے تنخواہ وغیرہ کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اگر روٹی کپڑا اور رہنے کی جگہ بھی مل گئی تو یہ بہت خوش رہے گا..... یہ ہے ساری کہانی تھانے دار صاحب۔“

”اور تم نے بغیر کسی تصدیق کے خوشیا کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”جناب! آپ ہی بتائیں، میں تصدیق کیسے کر سکتا تھا۔“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں صفدر سے پوچھنے جھنگ سے ٹوبہ فیک سنگھ تو جانیں سکتا تھا.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے صفدر کے رقعے پر یقین کر کے خوشیا کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ جناب! اس بندے نے مجھے ایک چھوٹی سی شکایت کا موقع بھی نہیں دیا۔ آرائشیں کا کام تو اس نے سنبھال ہی لیا تھا۔ اس کے علاوہ لکڑیاں ڈھونڈنے کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ یہ گدھا گاڑی بھی اسی کے استعمال میں رہتی تھی۔“ بات کے اختتام پر اس نے گدھا گاڑی کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

ویسے میں مقبول حسین کی ایک بات سے پوری طرح متفق تھا کہ اس زمانے میں اعتماد اور بھروسے کا بول بالا ہوا کرتا تھا۔ لوگ زبانی پیغامات اور رقعہ جات پر یقین کر لیا کرتے تھے اور کسی خاص تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ پھر ٹیلی فون یا موبائل فون کا بھی گاؤں دیہات میں نام و نشان نہیں ہوا کرتا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مقبول حسین! یہ تو بھول جاؤ کہ خوشیا اب لوٹ کر واپس آئے گا اور اپنے ذہن سے یہ غلط فہمی بھی نکال دو کہ اسے تمہارے چھوٹے بھائی صفدر علی نے رقعہ دے کر بھیجا تھا۔ خوشیا نے تمہیں بے وقوف بنا کر اپنا مشن پورا کیا ہے۔ وہ یہاں آیا ہی اس مقصد سے تھا کہ سا جھا اور ما جھا کو بڑی صفائی سے ٹھکانے لگا دے.....!“

”مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے تھانے دار صاحب!“

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اب آپ خوشیا کو کہاں تلاش کریں گے؟“

”جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ایسا واقعہ رونما ہوا تھا مگر اس کا سا جھا اور ماجھا سے کیا تعلق؟“

”بہت گہرا تعلق ہے جناب۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آتش زنی والے اس واقعے میں سا جھا اور ماجھا ملوث تھے۔ جان محمد اور علی نواز ان کے قریبی ساتھی تھے۔ ان کا انتقام لینے کے لیے سا جھا اور ماجھا نے کرم دین اور صابرہ بی بی کو گھر کے ساتھ ہی جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔“

”یہ بعض لوگ کون ہیں جو اس قسم کے فضول خیالات رکھتے ہیں۔“ چودھری طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ذرا مجھے بھی تو پتا چلے؟“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں چودھری صاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان لوگوں کا تعلق نظام کوٹ ہی سے ہے۔“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ صرف یہ بتائیں کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں؟“ میں سمجھتا ہوں، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“ وہ اپنے لہجے کو مستحکم بناتے ہوئے بولا۔ ”جو شخص بھی ایسا سوچتا ہے، وہ سخت بے وقوف ہے۔“

”آپ کا یہ خیال نہیں ہے، میری تسلی کے لیے یہی کافی ہے۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں بڑے اطمینان سے تفتیش کو آگے بڑھا سکوں گا۔“

”اللہ کرے، آپ جلد از جلد سا جھا اور ماجھا کے قاتلوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“ اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ ”جیسے علی نواز اور جان محمد کا قاتل جیداجیل کی پتھر ملی دیواروں کے پیچھے مڑ رہا ہے ویسے ہی میں ایک آنکھ والے اس خبیث خوشیا کو بھی گتے مڑتے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”انشا اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد سا جھا اور ماجھا کے قاتل کو گرفتار کر کے آپ کی آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دوں گا۔“

اس نے میرا شکر یہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ ☆☆☆

اگلے روز دوپہر کے بعد سا جھا اور ماجھا کی لاشیں اسپتال سے واپس آئیں۔ میرے انداز کے عین مطابق،

چودھری کے ان دونوں بندوں کو ایک ہی رات گیارہ بارہ کے درمیان آرا مشین پر کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا تاہم قاتل نے ان کی دو لخت لاشوں کو منظر عام پر لانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے سا جھا کی لاش کو قبرستان کے قریب پھینکا اور اس سے اگلے روز ماجھا کی برادے سے لٹھڑی ہوئی لاش کو دریا کے کنارے پھینک دیا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ خوشیا نے ماجھا کی لاش کو ایک دن کے لیے برادے کے ڈھیر میں دبا کر رکھا تھا۔ میں نے خون آلود برادے اور کپڑوں کے جن ٹکڑوں کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیجا تھا اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ سا جھا اور ماجھا ہی کا خون تھا۔

لیبارٹری میں دونوں کے معدوں سے حاصل ہونے والے نمونوں کے کیمیکل ٹیسٹ سے بھی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ اپنی موت کے وقت وہ حالت بے ہوشی میں تھے ورنہ اگر وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے تو خوشیا کے ہاتھوں ایسی عبرت ناک موت کو کسی قیمت پر قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ انہیں خوشیا نے پہلے کوئی نشہ آور شے کھلا کر بے ہوش کیا تھا، اس کے بعد بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

میں نے دوپہر تک سا جھا اور ماجھا کی لاشوں کو چودھری ظفر علی کے حوالے کر دیا۔ شام تک ان کی تجویز و تشخیص کے مراحل طے ہو گئے۔ اگلی صبح میں کاشیمل جیل کے ساتھ اپنے تھانے سے روانہ ہو گیا۔ گزشتہ رات میں نے خوشیا کو ڈھونڈنے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایک آدھ روز میں، میں اپنے مطلوبہ بندے تک پہنچ جاؤں گا۔ تھانے سے نکلنے وقت میں نے حوالدار بہادر علی کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میری غیر موجودگی میں اسے کس طرح تھانے کا انتظام و انصرام سنبھالنا ہے۔

میں سب سے پہلے سیدھا ایس پی علاقہ سے جا کر ملا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی تعاون کی درخواست کی۔ میری بات پوری توجہ سے سننے کے بعد ایس پی صاحب نے کہا۔

”بتاؤ صفدر حیات! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ ”سر! میں آپ کے تعاون سے جیدا کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ عدالت سے عرقید کی سزا پا کر جیل چلا گیا تھا جیسا کہ میں نے بتایا۔ وہ چھ ساڑھے چھ سال پہلے ڈھیرے تل کے جرم میں گرفتار ہوا تھا۔ میں پتا چلا

چاہتا ہوں کہ وہ ابھی جیل ہی میں ہے یا۔۔۔۔۔!“ ”میں سمجھ گیا۔“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایس پی صاحب بول اٹھے۔ ”تمہارے ذہن میں یہ خدشہ ہے کہ جیداجیل سے فرار ہو گیا ہوگا۔ ہیں نا؟“ ”ییس سر!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”موجودہ حالات میں، میں ایسا سوچنے پر مجبور ہوں۔“ ”ٹھیک ہے، میں ابھی سپرنٹنڈنٹ جیل کو فون کر کے معلوم کر لیتا ہوں۔“ وہ میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

اس زمانے میں آج کل کی طرح جگہ جگہ ٹیلی فون کا استعمال عام نہیں ہوا تھا تاہم سرکاری محکمے کے اعلیٰ افسران کے دفاتر میں یہ سہولت موجود ہوا کرتی تھی۔ ایس پی صاحب نے دو منٹ کی گفتگو کے بعد مجھ سے کہا۔

”صفدر حیات! سپرنٹنڈنٹ جیل کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جیداجیل میں موجود ہے تاہم تمہارے لیے ایک سنسنی خیز اطلاع بھی ہے۔۔۔۔۔“

ایس پی صاحب نے میری موجودگی میں سپرنٹنڈنٹ جیل سے بات کی تھی تاہم میں سمجھ نہیں سکا تھا کہ ادھر سے سپرنٹنڈنٹ صاحب کیا فرما رہے تھے کیونکہ ایس پی صاحب محض ”ہوں، ہاں“ سے کام چلا رہے تھے۔

”کیسی اطلاع سر؟“ میں نے چونک کر ایس پی صاحب کی طرف دیکھا۔

”تم نے ابھی کسی یک چشم بارش بندے کا ذکر کیا ہے جو آرا مشین پر فوکر کر رہا تھا۔“ ایس پی صاحب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”کیا نام بتایا ہے تم نے اس کا۔۔۔۔۔!“

”خوشی محمد۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یا پھر خوشیا۔۔۔۔۔!“

”جس کی رنگت سانولی اور قد پست ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔!“

”میرے اندازے کے مطابق اس بندے کا نام لیاقت ہونا چاہیے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔

”میں سمجھا نہیں سر!“ میں نے ابھن زدہ انداز میں کہا۔ ”کیا سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آپ کو اس حوالے سے کچھ بتایا ہے؟“

”ہاں!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ”سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مطابق اسی جیلے اور قد کاٹھ کا مالک ایک بندہ جیدا کے ساتھ ہی جیل میں سزا کاٹ رہا تھا جس کا نام لیاقت بتایا گیا ہے۔ جیدا اور لیاقت میں بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ لیاقت دو ماہ پہلے اپنی سزا پوری

کر کے جیل سے رہا ہو چکا ہے۔۔۔۔۔“ ”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”صفدر حیات! اگر تم اس لیاقت کو ڈھونڈ کر گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو میں سمجھتا ہوں، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ ایس پی صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”عین ممکن ہے، تم نے جس خوشیا کا ذکر کیا ہے وہ لیاقت ہی ہو۔۔۔۔۔“

”میرا ذہن بھی اسی طرف جا رہا ہے سر!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”خوشیا کے حوالے سے میرے پاس جو معلومات ہیں، میں ان کی روشنی میں اسے تلاش کرنے کی ضرورت کو محسوس کروں گا لیکن فوری طور پر آپ سے ایک اور تعاون کی درخواست ہے۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ بولو صفدر حیات؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگے۔

”سر! تھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ خوشیا دراصل لیاقت ہی ہے اور اس نے حق دوتی نبھاتے ہوئے جیدا کی خاطر سا جھا اور ماجھا کو قتل کیا ہے۔“ میں نے اپنی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہمارا یہ فرض کر لینا صد فیصد درست ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ لیاقت اپنے اس کارنامے کے بارے میں جیدا کو ضرور بتائے گا۔“ ”ہوں۔“ ایس پی صاحب نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”صفدر حیات تم نے بڑی ذہانت کی بات ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر۔۔۔۔۔؟“

بات ختم کر کے انہوں نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”سر! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کہہ کر چند روز کے لیے ملاقاتیوں پر گہری نظر رکھنے کا بندوبست کروادیں۔“

”ایسا ہو جائے گا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولے۔ ”اور بتاؤ؟“

”جیل کے عملے کے لوگ ان افراد کی خصوصی نگرانی کریں جو جیدا سے ملاقات کے لیے وہاں آئیں۔“ میں نے اپنی سوچ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”خوشیا یا لیاقت کی شخصیت ایسی ہے کہ وہ ہزاروں میں بالکل الگ ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ سانولا رنگ، پست قد، بائیں آنکھ سے محروم اور گھنی ڈاڑھی مونچھیں۔ اگر وہ ڈاڑھی مونچھ صاف بھی کرا لے تو پھر بھی اس کی شناخت میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ وہ جیسے ہی جیل کی حدود میں نظر آئے، اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔“

میرا دیا ہوا آئیڈیا ہی اس کی گرفتاری کا سبب بنا تھا یعنی اسے سینٹرل جیل جھنگ صدر سے اس وقت حراست میں لے لیا گیا جب وہ ایک ملاقاتی کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا۔ اس نے ڈاڑھی مونچھ صاف کر دی تھی تاہم ایک آنکھ کی محرومی اور پستہ قاسمی اس کی گرفتاری کے لیے کافی ثابت ہوئی، جیل کے عملے کے لیے اتنا اشارہ ہی کافی تھا کہ وہ جیڑا سے ملنے جیل پہنچا تھا۔ گرفتاری کے روز ہی شام میں ایس بی صاحب نے پولیس کی ایک مختصر سی ٹیم کی نگرانی میں لیاقت کو میرے تھانے میں پہنچا دیا تھا۔

جب کوئی بھی مجرم پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان سے اقبال جرم کرانا مشکل ثابت نہیں ہوتا لیکن لیاقت ایسا مجرم ثابت ہوا کہ اعتراف جرم کے سلسلے میں مجھے اس پر ذرا سی بھی محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس نے یہ بانگ دہل بڑی بہادری کے ساتھ سا جھا اور ما جھا کے بیہیمانہ نقل کا اقرار کر لیا اور بڑے اطمینان سے بولا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے سا جھا اور ما جھا کو عبرت ناک انجام سے دو چار کر کے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ اب آپ مجھے کوئی بھی سزا دیں، منظور ہے۔“

اس کے چہرے پر بلا کا اعتماد اور سکون نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

”فرض پورا کیا ہے یا دوستی کا حق ادا کیا ہے.....؟“

”ایک ہی بات ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جید امیر دوست ہے۔ میں اس کے ہر دکھ درد کا شریک ہوں۔ اس کی بہن عابدہ جس بے بسی سے برباد ہوئی اور جتنے ظلم کے ساتھ اس کی زندگی کا چراغ گل کیا گیا، اس واقعے کی تفصیل سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ نہ آپ کا قانون اس موقع پر جید کی مدد کر سکا اور نہ ہی گاؤں میں سے کسی نے عابدہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی کیونکہ آواز اٹھانے والوں کو اس بات کا خوف تھا کہ عابدہ کی عزت کا جنازہ نکال کر اسے موت کے حوالے کرنے والے چودھری ظفر علی جیسے طاقتور شخص کے خاص آدمی تھے۔ پھر مجبوراً جید کو قانون اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا تھا.....“

”یہ باتیں دہرانے کا تمہارا مقصد کیا ہے لیاقت؟“

میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے دو افراد کو بڑی بے دردی سے قتل کیا ہے اور اپنے جرم کا اقرار بھی کر چکے ہو۔ تمہیں ایک مرتبہ پھر جیل جانا ہوگا اور اب تو شاید تمہاری باقی کی زندگی

بھی کسی سے ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ لمبی سزا کاٹ کر جیل سے نکلا ہے تاہم طفیل کے مطابق وہ دو تین دن اس کے پاس ٹھہر کر واپس چلا گیا تھا۔ طفیل نے مجھے بتایا کہ لیاقت کا تعلق ضلع سرگودھا سے تھا۔ میں نے جب طفیل کو سا جھا اور ما جھا کی موت کے بارے میں بتایا تو وہ خوف اور حیرت سے شذر رہ گیا۔ انتہائی دہشت زدہ انداز میں اس نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔“

”یہ بات میں سمجھ سکتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس بات کا امکان تو نہیں کہ وہ دوبارہ یہاں آئے لیکن اگر اس نے ایسی غلطی کی بھی تو تم قانون کے ساتھ پورا پورا تعاون کرو گے۔“

”جی ضرور کروں گا۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

”آپ حکم کریں۔“

”اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا کہ تم اس کے تازہ جرم سے آگاہ ہو چکے ہو۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تمہیں کوئی بھی چالاکی دکھانا پڑے، اسے بے بس کر کے گرفتار کرانا ہے۔“

”جی، میں سمجھ گیا۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اگر لیاقت نے دوبارہ میرے گھر میں قدم رکھا تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

میں نے سرگودھا میں لیاقت کے پتے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا اور ضروری ہدایات کے بعد اس کے گھر سے نکل آیا۔ طفیل نے مجھے بتایا تھا کہ لیاقت کا کوئی قریبی رشتے دار اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

واپسی میں، میں نے صدر علی کو بھی سختی سے تاکید کر دی کہ اس معاملے کو پھیلانے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کا یقین دلایا اور میں جھنگ واپسی کے لیے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے روانہ ہو گیا۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ جید کا ساتھی قیدی لیاقت ہی سا جھا اور ما جھا کا قاتل تھا۔ اس کی گرفتاری کے لیے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں، میں نے مکمل بندوبست کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ بہت جلد وہ میری تحویل میں ہوگا۔

☆☆☆

میں نے لیاقت کی گرفتاری کے لیے جھنگ، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور سرگودھا میں جس حد تک بھی ممکن ہو سکا، انتظامات کر دیے تھے۔ تین روز بعد وہ قانون کے ہتھے چڑھ گیا۔ بالآخر

ہلاتے ہوئے بولا۔ ”رقعے والی بات تو سرے سے ہے ہی غلط۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔“

”پھر بتاؤ، مشتاق کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا وہ ادھر ہی رہتا ہے؟“

”رہتا تو نہیں جناب، وہ یہاں کسی کے گھر مہمان آیا ہوا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن یہ ڈیڑھ، دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ یہاں نہیں ہے۔“

”وہ کس کے گھر مہمان آیا تھا؟“ میں نے سسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”طفیل مہر کے گھر جناب۔“ اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ”جناب! آخر معاملہ کیا ہے..... آپ کس سلسلے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہیں؟“

”معاملہ بھی بتانا ہوں۔“ میں نے تھکسا نہ انداز میں کہا۔ ”پہلے تم مجھے طفیل مہر کے گھر لے کر چلو.....“

وہ میرے حکم کی تعمیل میں فوراً میرے ساتھ ہولیا۔ راستے میں جب میں نے اسے مشتاق/خوشیا/لیاقت کے ”کارنامے“ کے بارے میں بتایا تو اس کی حیرت کی انتہاء رہی۔ وہ بے حد پریشانی سے بولا۔

”جناب! اس نامراد کی وجہ سے بھائی مقبول پر کوئی مصیبت تو نازل نہیں ہوگی؟“

”میں نے مقبول حسین سے تفصیلی پوچھ گچھ کی ہے۔“ میں نے صدر علی کی تسلی کی غرض سے کہا۔ ”اس سارے معاملے میں بے چارے تمہارے بھائی کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اپنی سادگی اور شرافت میں اسے ملازم رکھ بیٹھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، مقبول حسین کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہوگی۔“

”آپ کا بہت شکریہ تھانے دار صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ نے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ آپ کو اللہ حیاتی دے.....!“

”آمین.....!“ میں نے تہ دل سے کہا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے طفیل مہر کے گھر پہنچ گئے۔ طفیل مہر سے ملاقات پر کئی نئے انکشافات ہوئے۔ اس نے مجھ سے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔ طفیل مہر ایک شریف انفس انسان تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ٹھہرنے والے یک چشم، باریش مہمان کا نام لیاقت تھا اور وہ اس کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھا۔ کئی سال پہلے وہ کسی سنگین جرم کی سزا پر جیل چلا گیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ محض ملنے کے لیے طفیل کے پاس آیا تھا اور اسی کی فرمائش پر طفیل نے گاؤں والوں کو اس کا نام مشتاق بتایا تھا اور اس بات کا

”بہت عمدہ آئیڈیا ہے۔“ وہ ستائی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”میں اس نوعیت کے سخت انتظامات کرادوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

میں نے ایس بی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے اجازت دیں سر۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہاں سے سیدھا ٹوبہ ٹیک سنگھ جاؤں گا تا کہ مقبول حسین کے چھوٹے بھائی صدر علی سے مل کر یک چشم باریش خوشیا کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں۔“

”اوکے..... وٹن یو گڈ لک۔“ انہوں نے تہ دل سے کہا۔

میں ان کے آفس سے باہر نکل آیا پھر میں اور جنید جھنگ سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی جانب روانہ ہو گئے۔ صدر علی کی طرف سفر کے دوران میں میرا ذہن مسلسل سا جھا اور ما جھا کے قاتل کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں، میرا ذہن بھی اسی نقطے پر پہنچا تھا کہ خوشیا ایک فرضی نام ہے۔ خوشیا کا نام اختیار کر کے دراصل لیاقت ہی نے سا جھا اور ما جھا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

لیاقت اگر جید کے ساتھ جیل میں سزا کاٹ رہا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ بھی کوئی مجرم ہی تھا لہذا قتل و غارت گری اس کے لیے کوئی نیا کھیل نہیں تھا۔ ویسے بھی سا جھا اور ما جھا کو جتنے ظالمانہ طریقے سے حوالہ موت کیا گیا تھا اس سے خوشیا (لیاقت) کی سفاکی اور شقی القلمی واضح ہو جاتی تھی۔

میرا ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا دلچسپ ثابت ہوا.....

صدر علی کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا مگر جب اس سے ملاقات ہوئی تو وہ اس بات پر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس نے کسی خوشیا کو قہر دے کر نجیب پورہ کی طرف بھیجا تھا۔

میں نے جب خوشیا کا قد کاٹھ اور حلیہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا تو وہ چونک اٹھا اور اضطرابی لہجے میں بولا۔

”جناب! آپ جس بندے کا ذکر کر رہے ہیں اس کا نام خوشیا نہیں بلکہ مشتاق ہے.....“

”اچھا!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہارا مطلب ہے، تم نے مشتاق کو قہر دے کر مقبول حسین کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہاں جا کر اپنا نام خوشیا بتایا.....؟“

”نہیں جناب!“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن

یاد جزیرہ بھی ہے اور ذخیرہ بھی... جب یادیں تنہائی بن کر انسان کے اندر اتنی خاموشی سے اتر جائیں کہ سوائے اپنے کچھ یاد نہ رہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی جزیرے میں قید بھی ہے اور آزاد بھی اور جب یہی یادیں اتنا شور برپا کر دیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے تو اس ذخیرے میں بھی وہ خود کو تلاش کرتا رہ جاتا ہے... بہر حال یہ بھی اس کی یادداشت کا کچھ ایسا ہی امتحان تھا جو کبھی سناتوں میں دھکیل دیتا اور کبھی ہجوم میں گم کر دیتا تھا۔

یادداشت

یونس



ماضی کی ڈوری سے کھلنے والی گرہوں کا ماجرا

ہیں کہ ایک حادثے کی وجہ سے میری یادداشت چلی گئی ہے اور اپنا ماضی یاد نہیں رہا۔ میں صرف حال میں زندہ ہوں اور گزری ہوئی باتیں مجھے یاد نہیں رہیں۔

یہ عورت ہر روز میرے لیے ناشا بناتی اور ساتھ لے جانے کے لیے پیچ پیک کر کے دیتی ہے۔ آج اس نے چکن سلاد اور چیری بنائی ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے کھانے کا ڈبا

اس کا نام جینی تھا۔ وہ میری محبت تھی اور میں اسے اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہتا تھا لیکن میں نے اسے کھو دیا۔ میرے سامنے میز پر جو عورت بیٹھی ہے، وہ اپنے آپ کو جینی کہتی ہے اور سب لوگ اسے اسی نام سے بلاتے ہیں لیکن میں جب بھی اس پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اسے نہیں پہچان پاتا۔ شاید اس حادثے نے میرے ذہن سے اس کی تصویر بھی مٹا دی ہے۔ لوگ کہتے

تو ہر حال میں کڑوا ہی ہوا کرتا ہے۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیاقت! تم نے قانون اور قانون کے رکھوالوں کے حوالے سے جو ترش باتیں کی ہیں، میں ان سے مکمل اتفاق کرتا ہوں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جس زمانے میں جیدا کی بہن کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوئی، میں اس تھانے کا انچارج نہیں تھا اور نہ خدا کی قسم، ایسا ہرگز، ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بھی چودھریوں، وڈیروں، جاگیرداروں اور بااثر افراد کے ناجائز مطالبات کو اہمیت نہیں دی اور ہمیشہ وہی کیا ہے جو قانون کا مطالبہ ہو، میں لگ بھگ ایک سال پہلے اس تھانے میں تعینات ہوا ہوں۔“

”میں آپ کی باتوں سے بہ خوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ ایک سچے، کھرے اور دیانت دار پولیس آفیسر ہیں۔“ وہ سناسی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میری گرفتاری کے لیے آپ نے جس قسم کی بھاگ دوڑ کی ہے اس سے آپ کی مثبت اور صحت مند کارکردگی کا ثبوت ملتا ہے۔“

میں نے اس کے ان تعریفی جملوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ میں بھی جانتا ہوں کہ میری باقی کی زندگی جیل کی پتھری، بلند وبالا دیواروں کے پیچھے ہی گزرے گی لیکن آپ سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔“

”کیا...؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کے ہاتھ جب بھی دعا کے لیے اٹھیں تو ان لمحات میں مجھے بھی یاد رکھیے گا۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ”میں نے حالات کے جبر کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر جو جرائم کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے مجھے معاف کر دے۔ میں دنیا کے قانون کے مطابق تو سزا بھگت کر مروں گا۔ یہ حساب نہیں پر ختم ہو جانا چاہیے۔ میں اللہ کے حضور ایک مجرم کی حیثیت سے پیش نہیں ہونا چاہتا۔“

”دل کا حال صرف خدا جانتا ہے، وہی نیت کو پہچاننے والا ہے۔“ میں نے گہمیر انداز میں کہا۔ ”میں تمہاری معافی اور بخشش کے لیے ضرور دعا کروں گا۔“ اس کی آنکھ میں نمی اتر آئی۔ ان لمحات میں مجھے وہ بہت ہی معصوم اور دکھی نظر آیا۔ آنکھوں کی نمی بڑی بے زبان ہوتی ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا، کب اور کس بات پر دل خون ہو گیا!.....

(تحریر: حسام بٹ)

جیل ہی میں گزرے گی۔ تم زندہ باہر نہیں آ سکو گے۔“

”زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے تھانے دار صاحب!“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آپ کا قانون بااثر افراد کے ہاتھوں مصلحت کا شکار ہو کر انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر پاتا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے گھور کر اس کی ایک آنکھ میں دیکھا۔

”یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر جیدا کی بہن عابدہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر آپ کا قانون خاموش نہ رہتا اور علی نواز و جان محمد جیسے چودھری کے پالتو کتوں کو آپ نے قرار واقعی سزا دلوا دی ہوتی تو یہ حالات ہرگز، ہرگز پیش نہ آتے۔“ وہ نہایت ہی ٹھنڈے مگر کٹیلے انداز میں بولا۔ ”پھر جیدا کو قانون اپنے ہاتھوں میں لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ نہ ہی ساجھا اور ماجھا کو اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کے لیے جیدا کے ماں باپ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد گھر سمیت جلا کر خاکستر کرنا پڑتا اور..... نہ ہی مجھے جیدا کے دشمنوں کا حساب بے باق کرنے کے لیے ساجھا اور ماجھا کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک ٹھنڈی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جیل میں ایک بار چند خطرناک قیدیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس وقت اگر جیدا میری مدد نہ کرتا تو آج میں آپ کے سامنے زندہ کھڑا نہ ہوتا۔ جیدا کا یہ احسان مجھے دن رات بے چین رکھتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جیل سے رہا ہوتے ہی میں اس احسان کے بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے جیدا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ دوست کا دشمن بھی اپنا دشمن ہی ہوتا ہے۔ ساجھا اور ماجھا میرے بھی اتنے ہی دشمن تھے جتنے کہ جیدا کے..... میں نے جیل سے باہر آنے کے بعد مضبوط منصوبہ بندی سے ان دونوں شیطانوں کو جہنم واصل کر دیا لیکن میری بد قسمتی کہ جب میں جیدا کو یہ خوشخبری دینے پہنچا کہ میں نے ”حساب دشمنان“ چکاتا کر دیا تو مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے اپنی گرفتاری کا ذرا افسوس نہیں۔ میرا کلیجا ٹھنڈا ہے کہ میں نے جیدا کے احسان کا بدلہ اتار دیا۔“

ایک خطرناک مجرم سے انوکھی نوعیت کی یہ بات چیت بڑی سنسنی خیز ثابت ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس کی باتوں میں زہر گھلا ہوا تھا مگر ان میں سے اکثر باتیں سچی تھیں اور.....

لے کر شکر یہ ادا کرتا ہوں اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر چلا جاتا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ گلاب کے پودوں کے پاس کھڑی ہاتھ ہلا رہی ہوتی ہے۔ میں اسے دیکھ کر سمندر کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔ یہ ایک جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف پانی ہے۔

میں اب پہلے سے بہتر ہوں لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ سب کچھ بکھرا ہوا اور بدلا بدلا سا محسوس ہوتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ مجھے اپنی گزشتہ زندگی سے جڑے رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اچانک ہی کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جائے جس کا تعلق میرے ماضی سے ہو تو میری یادداشت واپس آسکتی ہے۔ میں ان کی بات سن کر ہنستا ہوں کیونکہ ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے لیکن جینی کا اصرار ہے کہ مجھے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔ اسی لیے میں باقاعدگی سے ہر روز اپنے کام پر روانہ ہو جاتا ہوں۔ ڈاکٹروں کی محنت سے اس قابل تو ہو گیا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چل سکوں۔ اس کے لیے میں اور جینی ان کے شکر گزار ہیں۔ میرے لیے گھر سے چل کر ٹرین تک جانا آسان ہے۔ راستے میں کوئی پہاڑی یا چڑھائی نہیں آتی کیونکہ اب میں اونچائی پر چڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔ یہ بھی اچھا ہے کہ میں ایک ایسے جزیرے میں رہتا ہوں جہاں زمین کی سطح بالکل ہموار ہے۔

فیری ٹرینل بہت بڑا ہے۔ وہاں صرف دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے ایک چھت اور کشتی تک جانے کے لیے لکڑی کے تختوں سے بنا راستہ ہے جس کے دونوں جانب ریٹنگ لگی ہوئی ہے جبکہ پارکنگ لائٹ سے متصل ایک باغ بھی ہے۔ ہم لوگ دروازے پر کھڑے گاڑیوں کو چیک کر کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور جب لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا راستہ طے کر کے فیری تک پہنچتے ہیں تو عملے سے بھی ہائے ہیلو ہو جاتی ہے۔ عملے کے بھی لوگ مجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اسی لیے میرے ساتھ خاص سلوک کیا جاتا ہے۔ میں کشتی کے اگلے حصے میں بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ کشتی میں آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔ جس میں انجن کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس شور میں بھی کچھ لوگ خاموش نظر آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابیں کھول لی ہیں یا کمپیوٹر سے دل بہلا رہے ہیں اور کچھ میری طرح دوسروں کو دیکھ کر وقت گزار رہے ہیں۔ میں نے اپنے اطراف میں نظر دوڑائی۔ میرے

سامنے ایک درمیانی عمر کا آدمی شکن آلود سوٹ پہنے بیٹھا ہے اس کے برابر میں ایک جوان عورت خاموش بیٹھی سمندر کا نظارہ کر رہی ہے۔ دو عورتیں اپنے پانچ بچوں کو روکنے کی کوشش کر رہی ہیں جو نشستوں کی درمیانی جگہ پر دوڑ لگا رہے ہیں۔ زیادہ دیر تک لوگوں کو دیکھوں تو آکٹا بہت محسوس ہونے لگتی ہے لہذا گردن گھما کر ایک بار پھر سمندر پر نظریں جمالیتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے جیکٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکال لی۔ اس میں لوگوں کے نام، جگہیں اور فون نمبرز لکھے ہوئے ہیں۔ میں اس تحریر کو نہیں پہچانتا، صفحہ پلٹا تو ایک جگہ مجھے جہازوں کا وزن، ان کے انجن کی تفصیلات اور دیگر معلومات درج نظر آئیں۔ میں نے آخری صفحات پلٹے تو وہاں مجھے مختلف تحریریں ملیں۔ وہ عورت جو اپنے آپ کو میری بیوی کہتی ہے اسی نے مجھے یاد دلانے کے لیے ان صفحات پر کچھ لکھا تھا کیونکہ میں اس حالت میں ہوں کہ مجھے ہر وقت یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ ایک صفحے پر لکھا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ دوسرے صفحے پر بتایا گیا تھا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا اور تیسرے صفحے پر لکھا ہے کہ میں کون ہوں۔

میں نے پہلا صفحہ پڑھا۔ ”کشتی سے اتر کر سیدھے عمارت کی طرف جاؤ، وہاں سے سیدھے ہاتھ مڑ کر بندرگاہ کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ۔ تمہیں پانچ بج کر دس منٹ کی فیری سے واپس آنا ہے۔“

دوسرے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔ ”تم پائلٹ کی کشتی سے جہاز کی سیڑھیوں پر گر گئے تھے۔ اس وقت سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا۔ تمہارے لیے یہ کوئی غیر معمولی صورت حال نہیں تھی اور تم ہمیشہ اس سے بہ آسانی نمٹتے رہے ہو۔ تم آدمی سیڑھیاں طے کر چکے تھے لیکن ایک سیڑھی میں نقص تھا جس کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ وہ سیڑھی ٹوٹ گئی۔ تم خوش قسمت تھے کہ سمندر کے بجائے پائلٹ بوٹ کے عرشے پر گرے۔“

تیسرے صفحے پر درج تھا۔ ”تم برائن ڈونن ہو۔ تمہاری عمر 56 سال ہے۔“ وہاں 55 کاٹ کر 56 لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں بہتر ہو رہا ہوں اور پڑھنے سے پہلے ہی بہت سے لفظ مجھے یاد آ جاتے ہیں۔ آگے لکھا تھا۔ ”تم بندرگاہ پر پائلٹ تھے اور سترہ سال تک جہازوں کو بندرگاہ تک لانے کا کام کرتے رہے۔ اس سے پہلے تم جہاز پر کپتان تھے۔ تمہیں جہازوں کی بہت زیادہ پہچان تھی۔ ہماری ایک ٹیم

وہ مجھ سے ناراض ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اس کا دل دکھایا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اور جینی ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے لیکن میں اب بھی اسے چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر مجھے زندگی میں ایک خلا محسوس ہوتا ہے۔ صرف یہ عورت ہی نہیں بلکہ ہر چہرہ ہی مجھے اجنبی لگتا ہے اسی لیے گھر سے باہر نکل کر میں اپنے آپ کو پرسکون محسوس کرتا ہوں۔ لوگ مجھ سے کوئی توقع نہیں رکھتے۔ میں زیادہ سے زیادہ ان سے ہائے ہیلو یا موسم کی بات کر لیتا ہوں۔ بہت سے لوگ تو کچھ کہے بغیر ہی میرے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ کوئی یہ توقع نہیں کرتا کہ میں اسے پہچانتا ہوں۔

میں کشتی سے اتر کر عمارت کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔ ریسٹوران سے مجھے کافی اور چاکلیٹ کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہاں سیدھے ہاتھ کو مڑ کر بندرگاہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہاں پیدل چلنے والوں کے لیے بنائی گئی سڑک کے اطراف شیش لگا ہوا تھا جہاں سے سمندر کا پانی گہرا سبز نظر آتا تھا۔ جب میں اس عورت کے ساتھ جو اپنے آپ کو میری بیوی کہتی ہے، اس راستے پر چلنے کی مشق کر رہا تھا تو اس کا کہنا تھا کہ رات کے وقت روشنیاں اس شیشے کے نچلے حصے پر منعکس ہو کر بندرگاہ کے گرد ایک سنہری ہالہ بنا لیتی ہیں۔

اب یہاں جہاز نہیں آتے۔ اس عمارت کے کچھ حصے میں دفاتر، دکانیں اور کار پارکنگ ہے جبکہ خالی جگہوں پر کبوتروں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ اب تمام کاروبار آکٹینڈ فنشل ہو چکا ہے۔ میں نے کئی برسوں سے بندرگاہ کے اس حصے میں کسی جہاز کے لیے راہنمائی کی۔ یہاں زیادہ تر سیاح ہی آتے ہیں۔

کمپنی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے ابھی تک ملازمت سے برخاست نہیں کیا تھا لیکن وہ مجھے پائلٹ کی ڈیوٹی دینے سے ہچکچاتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ میرے لیے مشکل ہوگا جبکہ میری مہارت کی گواہی تو وہ عورت بھی دیتی تھی۔ اس نے ایک دن روتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔ ”تم وہ شخص ہو جس کے اشارے پر ہوا بھی اپنا رخ بدل لیتی تھی۔“

پھر میں یہ ڈیوٹی کیوں نہیں کر سکتا لیکن شاید انہیں ایسے آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں مختلف صورتوں میں مشکل شخص ثابت ہو رہا ہوں۔ وہ عورت کہتی ہے کہ تم ہر بات پر ہاں کہہ دیتے ہو کیونکہ تمہیں اس کا مطلب معلوم نہیں ہوتا حالانکہ وہ غلطی پر ہے۔ میں جو کہتا ہوں اس کا مطلب بھی جانتا ہوں، یہ بات دوسری ہے کہ مجھے اس کی سمجھ نہیں ہوتی۔

مجھے یہاں تک پہنچنے میں تھوڑا سا وقت لگتا ہے لیکن

اب میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرخ رنگ کی ٹینچوں پر بیٹھ جاتا ہوں جن کے برابر میں باغ ہے اور جہاں رنگ برنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ان کے گرد منڈلاتی ہوئی تیلیوں کی جھنجھٹا ہٹ مجھے محو کر دیتی ہے اور میں نظریں جمائے ان درجنوں چھوٹی کشتیوں کو دیکھتا رہتا ہوں جو بندرگاہ کے کنارے بندھی ہوئی ہیں، ریسٹوران سے آنے والی ایلے ہوئے انڈوں اور تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو فضا میں رچ بس گئی تھی۔ شام ہونے سے پہلے میں نے واپسی کی راہ لی کبھی کبھی میں بھولے سے تیز قدم اٹھانے لگتا ہوں جب مجھے خیال آتا ہے کہ سمندر کے دوسرے کنارے پر جینی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

گھر واپس جاتے وقت زیادہ تر لوگوں کے چہروں پر خوشی نظر آ رہی ہے لیکن وہ بھورے بالوں اور ٹھکی ٹھکی آنکھوں والی جوان عورت اب بھی اداس ہے، نہ جانے کیوں؟ سوچتا ہوں کہ اگر موقع مل جائے تو اس سے اداسی کی وجہ پوچھ لوں۔ یہ موقع مجھے بہت جلد مل گیا۔ دوسرے دن نہیں بلکہ تیسرے روز بیچ ٹائم میں جب لوگ ریسٹوران کا رخ کر رہے تھے تو وہ میرے برابر آکر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”ہیلو۔“

”میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ مجھے حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہے کہ اسے پہچان لیا۔ یہ اچھی علامت ہے۔ ”میرا خیال ہے شاید فیری بوٹ پر۔“

”ہاں۔“ وہ کہتی ہے۔ ”فیری بوٹ پر۔“ اس کی آنکھیں بھوری تھیں اور چہرے پر ہلکی ہلکی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے کافی کی پیالی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور وہ ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں سمندر کے کنارے کی طرف تھیں۔

”تم نے کھانا کھالیا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”میرے پاس ضرورت سے زیادہ پیاز ہے۔ میں اسے ختم نہیں کر پاؤں گا۔“ میں نے اسے سینڈویچ پکڑاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی سوچوں سے واپس آئی تو میں نے کہا۔ ”یہ بہت اچھے ہیں۔ میری بیوی روزانہ بناتی ہے۔“

میرے لیے یہ الفاظ ادا کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن مجھے اس کی مشق کرنا تھی۔ صرف اس امید پر کہ شاید ایک دن سچ ثابت ہو۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سینڈویچ لے لیا اور ایک لقمہ لیتے ہوئے بولی۔ ”دافنی بہت اچھا ہے۔“

کھانا ختم کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر کشتیوں کی جانب دیکھنے لگے۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے سکوت

توڑتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی زینون کے تیل میں یہ سینڈویچ بناتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مجھے یہی پسند ہیں۔“
اس عورت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب میں چلتی ہوں، تمہارا شکر یہ۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”اے، بے۔“ اس نے کہا اور چلی گئی۔

اس شام ایک سرخ بالوں والا شخص ٹریٹل پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں ذرا قافلے پر تھا لیکن سمجھ سکتا ہوں کہ اسے دیکھ کر نو جوان عورت کی آنکھوں میں کوئی چمک نہیں آئی۔ وہ اس عورت کے قریب پہنچا لیکن اس نے اپنے شانے یوں مسکیر لیے جیسے اس کے بازوؤں کی گرفت سے بچنا چاہ رہی ہو۔ گھر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح چھ بجے کھانا تیار ملا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ معمول جاری رہنا چاہیے۔ کھانے کے دوران ہی ٹیلی وژن پر خبریں شروع ہو گئیں اور اس طرح خاموشی کا سکوت ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد میں میز صاف کرتا اور برتن دھوتا ہوں۔ مجھے کھانا بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ برتن دھوتے ہوئے میری نظر باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر جاتی ہے۔ وہاں وہی عورت کھڑی تھی جو اپنے آپ کو میری بیوی کہتی ہے۔

”میں تمہارے لیے کچھ لے کر آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک چھوٹا سا پیکٹ میری جانب بڑھاتی ہے۔
”یہ گھر کا بنا ہوا ایک ہے۔ یقیناً یہ تمہارے لیے صحت بخش ہوگا۔“ دوسرے دن اے، بے پھر میرے ساتھ بیٹھی تھی۔

”جیہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔“ وہ مسکرائی۔ میں پہلی بار اس کے چہرے پر جگمگاہٹ دیکھ رہا تھا۔
ایک ختم کرنے کے بعد بھی وہ بیٹھی رہی۔ لگتا ہے اسے جانے کی جلدی نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم کیا کام کرتی ہو؟“
وہ کچھ دیر خاموش رہی اور مجھے لگا جیسے وہ اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی۔ مجھے بالکل برا نہیں لگا پھر وہ بولی۔ ”میں آرٹ اسٹی ٹیوٹ میں انسٹرکٹر ہوں۔“

میں نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ وہاں مجھے رنگ یا سیاہی کا کوئی دھبہ نظر نہیں آتا البتہ اس کے ہاتھ تھوڑے سے کھردرے ہیں اور کھال پر ہلکے ہلکے نشانات بھی نظر آ رہے تھے۔ میں سوچے سمجھے بغیر اس کی انگلیاں پکڑ لیتا ہوں تاکہ اس کے پرانے زخم دیکھ سکوں۔ اس نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔
”معاف کرنا، میرا خیال ہے کہ کام کی زیادتی کے

سبب تمہارے ہاتھوں کا یہ حال ہوا ہے۔“
”میں ایک مجسمہ ساز ہوں، چاہے کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کی جائے لیکن ہتھوڑا جھیننی استعمال کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں چوٹ لگ ہی جاتی ہے۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے شام کے پروگرام پر نظر ڈالی۔ ”مغرب کی جانب پانچ بلاک کے قافلے پر ہائیڈ اسٹریٹ بائزر ہے۔ گیٹ پر اپنا پاس دکھاؤ۔ ساڑھے چار بجے فیری کے لیے روانہ ہو جاؤ۔“

فلکٹ گھر کی کھڑکی پر موجود تینوں کلرک مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے تو میں بھی جواب میں مسکرا دیتا ہوں۔ صرف دکھاوے کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کہ کم از کم ان کے چہرے یاد رہ سکیں۔ ان میں سے ایک کی بھوری پلکیں چشمے کے فریم میں سے بھی نظر آ جاتی ہیں۔ لڑکی کی آنکھیں نیلی ہیں، تیسرے آدمی کے دانت پیلے ہو گئے تھے، جب انہیں فرصت ہوتی تو وہ مجھ سے بات کر لیا کرتے لیکن میں انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے برعکس مجھے وہاں کھڑے ہونے جہازوں کو دیکھنے میں سکون محسوس ہوتا تھا۔

یہ سب پرانے جہاز ہیں اور ان کے نام بھی ایسے ہی پرانے ہیں۔ اگر سو سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا تو شاید مجھے بھی ان جہازوں کو راستہ دکھانے کا موقع مل جاتا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر میں فیری میں سوار ہو جاتا ہوں اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر سمندری ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہونے لگتا ہوں۔ چوٹ لگنے کے بعد میرے ذہن سے وہ تمام نقشے نکل گئے ہیں جو میں نے پائلٹ کا امتحان دینے کے لیے سیکھے تھے۔ میں نے اسپتال میں قیام کے دوران اور اس کے بعد گھر پر بھی انہیں یاد کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بس کچھ شکستہ سی لکیریں باقی ہیں لیکن میں اب بھی سمندر میں راستہ تلاش کر سکتا ہوں۔ سطح سمندر کا جائزہ لے سکتا ہوں کہ کہاں کہاں لہروں کا مدوجذ رہے اور کس جگہ دریا کا پانی سمندر میں گرتا ہے۔ ان جہازوں کو دیکھنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے آپ کو پائلٹ سمجھنے لگا ہوں اور تصور ہی تصور میں دیکھ رہا ہوں کہ دوسرے پائلٹ نے انہیں بندرگاہ تک لانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا ہوگا۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل میں بھی کچھ کام کرنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی لیکن فی الحال میری حیثیت ایک مسافر کی ہے جس کی مٹھی میں چھوڑا کر ایہ کی رسید دینی ہوتی تھی۔
اس رات میں تہا آتش دان کے پاس بیٹھا تھا اور

مجھے میڈروم سے اس عورت کے کروٹیں بدلنے کی آوازیں آرہی تھیں پھر ٹیلی وژن آن ہوا اور مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ایک دوسرے سے دور رہ سکیں۔ میری خواب آور گولیاں کچن کے کاؤنٹر پر رکھی تھیں لیکن میں نے انہیں وہیں چھوڑ دیا تھا کیونکہ جب آتش دان کی آگ بجھنے لگتی ہے اور دیوار کی دوسری طرف سے آوازیں آنا بند ہو جاتی ہیں تو میں بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتا ہوں۔ اس کمرے کی آدمی حجت میں بیٹھے لگے ہوئے ہیں جن سے آنے والی چاند کی روشنی تصویروں پر پڑتی ہے تو ان کے رنگوں کی چمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جینی خود ہی رنگ بنایا کرتی تھی اور وہ عورت جو نیچے کمرے میں سو رہی ہے بھی اس کمرے میں نہیں آتی اگر وہ بھی جینی کی طرح تصویریں بنا رہی ہوتی تو میں یقین کر لیتا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے اور وہی جینی ہے۔

وہ مجھے لے کر اسپتال جا رہی تھی تاکہ میری ذہنی صحت کے بارے میں تازہ ترین صورت حال کا اندازہ ہو سکے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی وہ مجھ پر مہربان ہوتی تھی تو بالکل جینی جیسی لگتی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے نری رخصت ہو چکی تھی اور یہ چہرہ جینی کا نہیں ہو سکتا تھا۔

”اب تم کیا کر رہے ہو؟“ سارے ٹیسٹ مکمل ہونے کے بعد ڈاکٹر نے ہم دونوں سے پوچھا تھا۔

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے خود ہی سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ”جسمانی پروگریس بہت اچھی ہے۔ البتہ نئی معلومات ذہن میں محفوظ رکھنے اور پرانی باتیں یاد کرنے کا عمل بہت سست ہے۔ برائن اب بھی ان لوگوں کو نہیں پہچان سکتا جنہیں وہ اس حادثے سے پہلے جانتا تھا۔“

”اس حادثے کو دو سال ہو چکے ہیں۔“ درد میں ڈوبی ہوئی ایک آواز ابھری۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ یہ الفاظ میرے ہیں کیونکہ میرے ذہن میں بھی یہی کچھ چل رہا تھا لیکن یہ آواز اس عورت کی تھی۔

ڈاکٹر نے کمپیوٹر اسکرین پر نظریں دوڑائیں اور بولا۔ ”تم دونوں کو مل کر فیصلہ کرنا ہے ورنہ اپنے طور پر بھی سوچ سکتے ہو کہ اس وقت جو کچھ تمہارے پاس ہے اس پر توجہ دینے اور نئے رشتے کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے یا پھر تم ماضی میں ہی زندہ رہنا چاہتے ہو۔“

”ہم مل کر کس طرح فیصلہ کر سکتے ہیں؟“ ہم دونوں نے بیک آواز کہا۔

”جینی، میرا مشورہ ہے کہ تمہیں کچھ وقت اور دینا

فقیر اور امیر میں فرق

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ ایسا تھا جو درویشوں سے نفرت کرتا اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان درویشوں میں سے ایک بادشاہ کی اس حرکت کو جان گیا تھا۔ اس نے ایک روز بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بادشاہ سلامت! ہم درویش اس دنیا میں عیش میں تجھ سے بہتر ہیں لشکر و فوج کے لحاظ سے آپ بہتر اور ہم کمتر مگر مرنے میں ہم برابر ہیں ہمارے اللہ نے چاہا تو ہم قیامت کے روز آپ سے بہتر ہوں گے۔ بادشاہ ہو کہ فقیر دنیا سے جاتے وقت کفن کے سوا کچھ ساتھ نہیں لے جاتے اور کفن بھی دونوں کا وہ جس میں جھیلیں نہیں ہوتیں۔

بادشاہ یہ ساری باتیں غور سے سن رہا تھا اور اسے غصہ بھی آرہا تھا۔ اس نے فقیر کو ایک مقام پر بات کو آگے بڑھانے سے روکا تو فقیر نے اپنی بات یوں مکمل کی۔

”اے بادشاہ! تجھے اپنی بادشاہت کا بستر یوریا سمیٹ کر جانا ہوگا اور جب معاملہ یہ ہو تو پھر تیری بادشاہت سے ہماری فقیری بہتر نہیں ہے۔ فقیر کے کپڑے پھٹے ہوئے ضرور ہوتے ہیں مگر وہ دل زندہ کا مالک ہوتا ہے اور نفس کو مار کر زندگی گزارتا ہے۔“

شیخ سعدی نے اس حکایت میں جو بات اجاگر کی ہے وہ یہ ہے کہ فقر و درویشی میں ذکر الہی اور شکر گزاری ہوتی ہے۔ ایثار اور صبر ہوتا ہے۔ فقیر متوکل ہوتا ہے توحید پر قائم رہتا ہے۔ بادشاہ خواہ کتنی قیمتی عبا اور قبا پہن لے ان تمام اوصاف سے محروم نفس امارہ کے ہاتھوں شکست خوردہ اور دنیا دار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تصدق حسین کی کتاب ”حکایات مولانا رومی“ سعدی سے اقتباس

ہوگا۔ دماغ کا زخم بہت آہستگی سے بھرتا ہے۔ تمہارے تعاون سے اس میں بہتری آسکتی ہے۔ اس کے علاوہ خاندان کے دوسرے لوگوں، دوستوں اور پڑوسیوں کو بھی تمہاری مدد کرنا ہوگی۔“

”وہ سب اپنی اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”ان کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہوگا کہ برائے ابھی تک کسی کو نہیں پہچانتا۔“

کیا مجھے ان لوگوں کو پہچاننے کے لیے جھوٹ بولنا چاہیے۔ ایک طویل عرصے تک تو میں اپنے آپ کو ہی نہیں پہچان سکا۔ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ میں ہی ہوں پھر آہستہ آہستہ میں اس کیفیت سے باہر آ گیا۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے جب تک میں دوسرے لوگوں کو پہچانتا نہ شروع کر دوں۔

اگلی شام اے، جے مجھے فیری پر نظر نہیں آئی۔ البتہ سرخ بالوں والا معمول کے مطابق اس کا انتظار کر رہا تھا اور جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ نہیں آئی تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اس لیے میں اس کی باتیں سن نہ سکا پھر اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھا اور ڈھیلے قدموں سے چلتا ہوا لوہے کی بیچ پر بیٹھ گیا۔

میں نے عورت کو فون کر کے کہا۔ ”میں نے کچھ مزید وقت پرانے جہازوں پر گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے اگلی فیری سے آؤں گا۔“

میں نے اس سے جھوٹ بولا کیونکہ میں تو پہلے ہی اپنے جزیروں پر پہنچ چکا تھا اور اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے لینے کے لیے نہ آئے۔

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں کسی مشکل میں ہوں یا مجھے اس کی تحریر شدہ ہدایات پر عمل کرنے میں دشواری ہو رہی ہے یا یہ ایک اچھی علامت ہے کہ میں آزادانہ طور پر بھی کچھ کر سکتا ہوں۔

”مجھے بتاؤ کہ آج سارا دن تم کیا کرتے رہے؟“ اس کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔ میں نے اسے پوری رپورٹ سنادی۔ وہ میری باتوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں اور مجھے کسی قسم کی محنت یا دباؤ نہیں ہے۔ ”تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی، تم جانتے ہو ناں کہ

باہر کی چیزیں تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔“

”اطمینان رکھو، میں گھر آ کر ہی کھانا کھاؤں گا۔“ وہ مطمئن ہو گئی تو میں باغ میں پڑی ہوئی ایک اینٹ بیچ پر بیٹھ گیا جہاں سے ان دونوں کو دیکھ سکوں۔ اس انتظار میں آدھا گھنٹا گزر گیا۔ وہ شخص بے چینی کے عالم میں اپنے فون سے کھیلتا رہا، کبھی کبھی وہ اسکرین پر نظر ڈالتا اور پھر ساحل کی طرف دیکھنے لگتا۔ جب فیری آ کر رکی تو وہ سب سے آخر میں باہر آئی۔ وہ شخص تیزی سے اس کی جانب پلٹا اور جب اس نے نوجوان عورت کی کمر کے گرد بازو ڈالا اور اس میں قریب ہو کر دیکھنے لگا کہ اس نے کتنی مضبوطی سے عورت کے کندھے پکڑ رکھے تھے۔ رش کی وجہ سے انہیں بھوم میں راستہ بنانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ عورت تھوڑا سا لڑکھرائی تو اس نے مضبوطی سے اسے تھام لیا۔

میں نے فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس عورت کے مقابلے میں مرد زیادہ بول رہا ہے۔ وہ دونوں مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ایک عمارت پر پہنچے۔ مرد نے جیب سے چابی نکالی اور لابی کا دروازہ کھولتے ہوئے سخت آواز میں بولا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ اس کے بعد وہ دونوں اندر چلے گئے۔ اس وقت تک میں بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس لیے آخری جملہ سننے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک عجیب طرز کی بلڈنگ تھی جس میں اوپر نیچے دو اپارٹمنٹ تھے لیکن اوپر والے اپارٹمنٹ کا ایک کمرہ آگے کی طرف بڑھا ہوا تھا اور ڈرائیو کے دوستوں پر بنایا گیا تھا۔ وہ دونوں اسی کمرے میں گئے تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹ اتار کر الماری میں لٹکائے اور اے جے ایک دروازے سے باہر نکل گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچن میں گئی ہوگی۔ مرد چلتا ہوا کھڑکی تک آیا اور باہر کی طرف جھانکنے لگا اور اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ یقیناً وہ اگلی مرتبہ مجھے پہچان لے گا اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اے جے نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو اس نے پلٹ کر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

دوسری صبح میں اے جے کا انتظار کرتا رہا پھر ہم دونوں معمول کے مطابق کھانے کے وقفے کے دوران اپنی مخصوص بیچ پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اچانک ہی میں پوچھ بیٹھا۔

”وہ آدمی کون ہے جو روزانہ تمہارا انتظار کرتا ہے؟“

میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دے گی لیکن اس نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”ڈیوڈ۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر گھٹنوں پر رکھ لیے مگر وہ کھانا ختم کر چکی تھی لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے جانے کی جلدی نہیں ہے۔

میں کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ شخص ٹھیک نہیں ہے لیکن اس کے بجائے میرے منہ سے نکلا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ وہ تم سے اچھی طرح پیش آتا ہے۔“

اس نے اپنا سراں انداز میں ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ جو چاہو سمجھ لو۔

”وہ کیا کام کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”فی الحال کچھ نہیں کر رہا۔ وہ مالیات کے شعبے سے وابستہ ہے لیکن جس کمپنی میں کام کر رہا ہے وہ بند ہو گئی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم ایک سخت دور سے گزر رہی ہو۔“ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جملہ اس پر کس قدر گراں گزر سکتا ہے۔

اس نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”زندگی میں اس طرح کے دور آتے رہتے ہیں۔ ایک مشکل ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے۔“ پھر وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم یہ بات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے جانتے ہو۔“

”کیا خاندان یا دوستوں میں کوئی ایسا نہیں جو تمہاری مدد کر سکے؟“

”وہ سب اپنے اپنے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ میں ان میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی۔“

یہ کہہ کر وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی جیسے اسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو اور وہ مجھے خدا حافظ کہے بغیر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ اب میں ایک بار پھر وہاں سے گزرنے والے سیاحوں، پرندوں اور مچھلیاں پکڑنے والی کشتیوں کو دیکھ رہا تھا۔

گھر واپس آیا تو وہ عورت جو خود کو جینی کہتی تھی، مجھے دیکھتے ہی صوفے سے کھڑی ہو گئی۔ کافی کی میز پر مشروب کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا جس سے میں اندازہ لگا سکتا کہ وہ جینی نہیں ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دونوں کی آنکھیں، چہرہ، ناک اور گال ایک جیسے تھے لیکن جینی نے مشکل سے ہی شراب کو ہاتھ لگایا ہوگا جبکہ یہ عورت وائن پیتی ہے اور اس کے باوجود مجھے اس کے چہرے پر خوشی نظر نہیں

جان پہچان

خاتون جو تا خریدنا چاہ رہی تھیں، مگر انہیں کوئی پسند نہیں آ رہا تھا۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے دکان پر موجود ہر جوتے کو اپنے بعد سے پیروں میں ڈال کر دیکھ لیا۔ بالآخر ایک جوتا انہیں بھا گیا جب پیسے دینے کے لیے پرس کھولا تو حیران ہو کر بولیں۔ ”ارے میں پیسے لانا تو بھول ہی گئی۔ اگر آپ اعتبار کریں تو جوتا لے جاؤں، پیسے کل آ کر دے جاؤں گی۔“

”کوئی بات نہیں خاتون! آپ شوق سے لے جائیں۔“

سیلز مین نے جواب دیا۔ ”اور جوتا ڈبے میں ڈال کر انہیں تمہا دیا۔“ وہ خوش خوش چلی گئیں۔ دکان کے مالک نے بعد میں سیلز مین سے کہا۔ ”تم انہیں پہچانتے ہو؟“

”پھر تم نے جوتے کیوں دے دیے؟ کیا پتا وہ نہ آئے۔“

”آپ بے فکر رہیں، میں نے دونوں جوتے دائیں پیر کے دیے ہیں۔“

حساب دانی

ایک بڑے میاں ہر اتوار کو اپنے پوتے کے ساتھ گرجا گھر جاتے اور پادری کے وعظ کے دوران سو جاتے۔ ایک روز پادری نے پوتے سے کہا۔

”بیٹے! میں تمہیں دو ڈالر انعام دوں گا۔ تم اپنے دادا جان کو میرے وعظ کے دوران سونے نہ دیا کرو۔“

بچہ بڑی خوشی سے راضی ہو گیا۔ مگر اگلے ہفتے بڑے میاں پھر زور شور سے خرائے لے رہے تھے۔ وعظ کے بعد پادری نے غصے میں پوتے سے کہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں دو ڈالر دوں گا، تم دادا جان کو سونے نہ دینا۔“

”جی جناب! مگر دادا جان نے مجھے تین ڈالر دیے تھے اور کہا تھا کہ مجھے جگانا نہیں۔“

مرسلہ: عاطف عمیر، گلستان جوہر، کراچی

آتی، وہ ہر وقت پریشان رہتی ہے، لگتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہونٹ چبانے لگتی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد مجھے بے چینی سی ہونے لگتی ہے لیکن ہم دونوں کے درمیان طے ہو چکا تھا کہ رات کے وقت اکیلا باہر نہیں جاؤں گا لہذا میں لیونگ روم میں ہی ٹہلتا رہتا ہوں۔ وہ عورت کھانے کے برتن میز پر چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور میں اس کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنتا ہوں۔ پڑوسی کے گھر کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر آرہی ہے۔ پہلے اس گھر اور کمرے میں رہنے والے لوگ خوش و خرم زندگی گزارتے تھے لیکن اب ہم اجنبی بن چکے تھے۔ میں صرف گھر کے دوسرے سامان صوفے، لیپ، کرسیوں اور الماری کی طرح ایک شوپس بن کر رہ گیا تھا۔ اس گھر میں رہنے والوں کی کوئی تصویر بھی نظر نہیں آتی۔ مجھے یاد ہے کہ اس عورت نے تمام تصویریں بکس میں بند کر دی تھیں تاکہ انہیں دیکھ کر مجھے کوئی ذہنی صدمہ نہ پہنچے۔

اوپر جینی کا اسٹوڈیو تھا لیکن وہاں جا کر کیا دیکھوں گا۔ گرد میں اٹی ہوئی رنگ کی ٹوئیں جن کے ڈھکنے مضبوطی سے بند کر دیے گئے تھے تاکہ ان میں موجود بچا ہوا رنگ خراب نہ ہونے پائے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا، وہاں مجھے بہت سے باکس نظر آئے۔ میں نے ان میں سے ایک کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ اس میں اونی بیٹ، چشمے، موٹے دستانے اور گرم موزے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جینی برف باری میں باہر نکلتے وقت انہیں استعمال کیا کرتی تھی۔ دوسرے باکس میں تصویریں تھیں۔ ان کے فریم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے، یہ کافی وزنی باکس تھا لیکن میں اسے اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے وہ باکس لیونگ روم کے قالین پر رکھا اور ایک ایک کر کے تصویریں نکالنے لگا۔ باری باری مختلف چہرے میری نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ان میں سے کسی کو نہ پہچان سکا۔ البتہ ایک تصویر پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ میں نے پہلے بھی اسے پہچاننے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ اب مجھے اپنی ناکامی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

میں اس سے کیا کہوں گا کہ اپنی بیٹی کو نہ پہچان سکا۔ جی ہاں اے جے میری بیٹی تھی۔ اس کا پورا نام ایلگزینڈرا جین لیکسی ہے۔ مجھے اس کا سامنا کرتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ یہ ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی۔ اس روز میں وقت سے پہلے آ گیا اور ایسی جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ البتہ میں اس شخص کو دیکھ سکتا تھا جو پہلے سے

وہاں موجود تھا۔ وہ آئی تو میں نے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ اس سے دور رہ کر چل رہی تھی لیکن اس نے لپک کر اے جے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں چونکا ہوا گیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کرے گا لیکن کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ وہ گھر میں داخل ہو گئے تب بھی میں سڑک کے کنارے کھڑا رہا لیکن اس کے اپارٹمنٹ سے کسی قسم کے شور یا چیخنے چلانے کی آواز نہیں آئی۔

رات کے کھانے کے بعد جب وہ عورت اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں نے الماری سے تصویروں والے باکس نکالا اور تمام تصویریں میز پر پھیلا دیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان تصویروں میں میری ساری زندگی سمٹ آئی ہے۔ ان تصویروں کے نیچے چھوٹے چھوٹے سنگ تراشی کے نمونے لفافوں میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ لیکسی نے بنائے ہوں گے ہر نمونہ پہلے سے بہتر تھا۔ جیسے جیسے اس کی مہارت بڑھتی جا رہی تھی اس کام میں بھی بہتری آرہی تھی۔

اب میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا لہذا میں دوسرے دن سہ پہر میں اس کے آرٹ اسکول پہنچ گیا اور کہا کہ کیا وہ میرے ساتھ چل سکتی ہے۔ وہ رضامند ہو گئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں نے کوشش کی تھی۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی مرتبہ لیکن تم تو کسی کو پہچانتے ہی نہیں ہو۔“ وہ چلتے چلتے رک گئی اور اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن اس نے پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے جلدی کی، سب لوگ یہی کہتے ہیں۔“

”میں تمہیں نہیں پہچانتا تھا۔“ میں نے اعتراف کیا۔ اب بھی یہی کیفیت ہے، کئی چہرے میرے قریب سے گزر جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ میرے لیے کتنے اہم ہیں لیکن مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”اب تم مجھے پہچاننے لگے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

اگر میں اسے سچ بتا دوں تو وہ مجھ سے دور ہو سکتی ہے لہذا میں نے گولی مول جواب دیا۔ ”کبھی کبھی پرانی یادیں ذہن میں گونجنے لگتی ہیں۔ کیا تم گھر آؤ گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اور اپنی ماں کے ساتھ ڈنر کرو۔“

وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملاتی لیکن میں دیکھ سکتا ہوں کہ وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہی ہے اور اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں

بچھنی ہیں۔ ”نہیں، میں ہمارا کوئی تکلیف نہیں دے سکتی۔“

”مجھے حالات کو بہتر بنانے کے لیے تھوڑا سا وقت دو۔ صرف چند روز۔“ مہینوں کی مشق کے بعد مجھ میں اتنا یقین پیدا ہو گیا تھا کہ اب مجھے تیزی سے آگے بڑھنا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پورا سچ نہ ہو لیکن مجھے ان لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ جنہیں اب کسی حد تک پہچاننے لگا ہوں۔

ہم تقریباً ایک بلاک کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئی۔ وہاں کافی لوگ موجود تھے اور ان کے درمیان سے راستہ بنانا مشکل تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی اور اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ ہاتھ تھام لیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں بچپن میں اسے اسکول چھوڑنے جاتا تھا تو وہ کلاس روم میں جانے سے پہلے اسی طرح ہاتھ ہلایا کرتی تھی۔

اس روز میں نے اسے واپسی کے وقت فیری میں نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ شخص ٹرینٹل پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی تو ٹھہلتا ہوا اس کے اپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔ اندر کی ساری روشنائیاں گل تھیں اور کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے اس پار کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی، میں واپس ٹرینٹل کی طرف آیا لیکن وہاں ان دونوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں بھی وہ دونوں نظر نہیں آئے۔ میں بہت تھک گیا تھا، دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ اس عورت کے پاس تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ روشن ہو گیا۔ وہ جینی اور لیکسی تھیں۔ جینی کے بازو اس کی کمر کے گرد تھے اور کھڑکی کے باہر نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی نیا منظر تھا۔ بس یوں تھا جیسے وقتی طور پر یہ دھندلا گیا تھا۔ ابھی میں اس لمحے کی لذت سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”بیٹھ جاؤ۔“

میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جب جہاز پر کوئی مسئلہ پیش آجائے تو وہ بڑی تیزی سے پھیلتا ہے اور اتنا وقت نہیں ہوتا کہ اس کا حل تلاش کیا جائے۔ بس فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے۔ وہ مچن کے دروازے میں کھڑا ہوا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں ہال کی طرف

مڑ گیا۔ وہ ان عورتوں کو چھوڑ کر میرے تعاقب میں چلا آیا۔ میں نے اسے اپنے قریب آنے کا موقع دیا پھر میں نے آہستہ سے الماری کا دروازہ کھول کر اس میں سے بیس ہال کا بلا نکال لیا اور پوری قوت سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک غراہٹ نکلی لیکن چاقو ہاتھ سے نہیں گرا۔ وہ دوبارہ میری طرف آیا اور میں نے بلے سے اس کا راستہ روکتے ہوئے دیوار کی جانب دھکیلا اور اس کے چاقو والے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا پھر میں نے جینی کی آواز سنی، وہ مجھے پکار رہی تھی۔

”برائے، برائے۔“

اس کی آواز سن کر میرا دھیان بٹ گیا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھے زوردار گھونسا مارا، یہ وار کافی سخت تھا۔ میرے قدم اپنی جگہ سے اکھڑ گئے اور اس نے چاقو والا ہاتھ میری گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر چاقو کا وار کر دیا۔ مجھے کاری ضرب لگی اور تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی لیکن میں نے جس ہاتھ میں بلا پکڑا ہوا تھا وہ محفوظ رہا۔ اس نے... مڑ کر میرے گھروالوں کی طرف دیکھا۔ جینی فون ملا رہی تھی اور لیکسی چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

”ڈیوڈ، رک جاؤ۔“

اب وہ اپنی ماں سے الگ ہو کر کھڑی تھی۔ اس لیے مجھے اس کی قمیص پر خون نظر آ گیا۔ وہ انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھا اور میں نے عقب سے بلا گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ یہ ضرب شدید تھی جسے وہ سہہ نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

پولیس کے سراغ رساں نے مجھ سے کچھ سوالات کیے اور میرا جواب یہی تھا۔ ”اس کے پاس چاقو تھا۔ پہلے اس نے میری بیٹی کو زخمی کیا اور وہ میری بیوی کو بھی مارنا چاہ رہا تھا۔“

اس نے مجھ سے کوئی ایسا سوال نہیں کیا جس کا جواب میں اب بھی نہیں دے سکتا۔ سچی جانتے ہیں کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اور مجھے پرانی باتیں یاد نہیں رہیں البتہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ جینی کا پیچھا کرتے ہوئے میرے گھر تک کیوں آیا؟ شاید وہ مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا تاکہ میں اپنی بیٹی کی حمایت نہ کر سکوں لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ میری یادداشت میں بہتری آرہی ہے اور میں لوگوں کے چہرے پہچاننے لگا ہوں۔ اب تو مجھے اس عورت کے بھی جینی ہونے کا یقین آ گیا ہے۔

مذہب شہر و سخن

✽ محمد امجد ریاض..... اقبال نگر، چیمپوٹنی
میرے عیبوں کو مٹانے والو بیشک مجھے سنگسار کر دو
مگر اٹھائے وہ پہلا پتھر جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو
✽ راجا ثاقب محمود جنجوعہ..... جہلم
کر تو رہا ہے آج بے توقیر تو ہمیں
کل خواب تیری آنکھ کا سُندر رہیں گے ہم
تھک جائے گا تو مانگ کے ہم کو دعاؤں میں
تیرے خیال و خواب کا محور رہیں گے ہم
✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
اُسے کہنا کہ پلکوں پر نہ ٹانگے خواب کی جھار
سند کے کنارے گھر بنا کر کچھ نہیں ملتا



✽ سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، لیہ
سلسلہ قنہ قیامت کا
تیری خوش قیامت سے ملتا ہے
مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
لوٹ کر دل، اسی سے ملتا ہے

✽ عرفان احمد عاجز، ندیم افضل..... آڑہ
جو کبھی ہو تیرے بدل میں سوال کہ کتنی ہے مجھے ضرورت تیری
تو ذرا اپنی سانس روک کر سانس کی طلب محسوس کرنا
✽ متین سلطان..... کراچی

در پردہ رقیبوں سے گلے شکوے نہیں اچھے
جسمیں جو بھی شکایت ہو، ہمارے روبرو کرنا
✽ رضوان تنولی کریڑوی..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
مل ہی جائے گا کہیں دل کو یقین رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ
نازک مزاج لوگ تھے ہم جیسے آئینہ
ٹوٹے کچھ اس طرح کہ صدا بھی نہ کر سکے
خوش بھی نہ رکھ سکے تجھے ہم اپنی چاہ میں
اچھی طرح سے تجھ کو خفا بھی نہ کر سکے



✽ حاجی خالد محمود خان..... سوہان، اسلام آباد
سورج ہمیں ہر شام یہ درس دیتا ہے
مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے
✽ ذوالفقار احمد..... پشاور

لبے سے ہر مکان کے نکلے ہوئے تھے ہاتھ
آندھی کو روکنے کی بڑی کوششیں ہوئیں
✽ ڈاکٹر ناہیدہ شیخ..... سیٹلائٹ ٹاؤن، کراچی
مجھے چھوڑ کر تو چلا گیا
تو اپنا اپنا طرف ہے
تجھے دے گی جینے کا حوصلہ
تیری یاد رکھ لی سنبھال کے

✽ امتیاز علی اللہ..... سرگودھا
دل کے دروازے یہ دستک نہیں دے گا کوئی
کوئی نامہ بر کوئی پیغام نہیں آئے گا

✽ محمد عماد..... ملاکنڈ گاؤں اوچ
کون کہتا ہے نفرتوں میں درد ہیں محسن
کچھ محبتیں بھی بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں

✽ اعجاز احمد راحیل..... ساہیوال
آپ کے ساتھ ہی ملی تھی مجھے
پھر کہیں زندگی نہیں دیکھی
مدتوں سے اداس ہوں میں
کوئی صورت بھلی نہیں دیکھی

✽ عاطف شاہین..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
تیرا سلوک تجھے روز زخم دیتا ہے
کسی کو پہلی محبت میں مات ہو جیسے
ہمارے دل کو کوئی بھی مانگتے نہ آیا
کہ کسی غریب کی بیٹی کا ہاتھ ہو جیسے

✽ احسان اللہ بھٹی..... سکھیکی گاؤں
قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں

✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص
کوئی جھوٹا ادھر آئے گا خوشبو لے کر
سوچ کر ہم بھی یہی وقت سحر بیٹھے ہیں
یاد کا دیپ جلا ہے تو یہ لگتا ہے خلیل
میرے پہلو میں کئی شمس و قمر بیٹھے ہیں

✽ محمد رشید سیال..... روہڑی
کبھی لوگ تو کبھی بھی اچھے نہیں رہتے
جن سے سچ سیکھا ہو وہ بھی سچے نہیں رہتے
اعتبار کی ٹوٹی ہوئی دلیلیز پر اکثر
جو بہت ہوں اپنے اپنے نہیں رہتے

✽ جاوید شبیر بربرہ..... علی پور
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیکھ
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
✽ اظہر حسین بچار..... ہزاری، جتوئی
مجھے بھی شوق تھا نیت نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی

✽ محمد صفدر معاویہ..... خانوال
احساس بدل جاتے ہیں بس اور کچھ نہیں
اک ہی دل سے ہوتی ہے نفرت بھی محبت بھی

✽ سوہاجی..... لاہور کینٹ
اپنے احساس سے چھوکر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھوری ہوں مکمل کر دو
مسئلہ ہوں تو نگاہیں نہ چراؤ مجھ سے
اپنی چاہت سے توجہ سے مجھے حل کر دو

✽ راجکماری..... لاہور کینٹ
زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساس جاننا
دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو افسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاننا

✽ بیہوجی..... لاہور
جسے چاہو اسے احساسِ خدائی دے دو
سلسلہ پیار کا رکھو تو عبادت جیسا
ہم بھرے شہر میں تنہا تو نہیں تھے لیکن
کوئی رشتہ نہ ملا پھر تیری چاہت جیسا

✽ سید اکبر شاہ..... اوگی، مانسہرہ
بڑا مزہ آئے جو حشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتیں کریں کہ چپ رہو خدا کے لیے

✽ بشیر احمد بھٹی..... فوجی بستی، بہاولپور
دعائیں شرف قبولیت حاصل نہ کریں
تو سمجھ لیا کرو کہ ہم بدکار ہیں، گناہ گار ہیں
✽ راجا افتخار علی افقی..... چوآسمن شاہ، موہڑہ

نہ کر ضد اپنی اوقات میں رہ اے دل
وہ بڑے لوگ ہیں اپنے شوق سے یاد کرتے ہیں
✽ احسان قریشی..... کوئٹہ

مدت کے بعد حضرت ناصح کرم کیا
فرمائیے مزاج مقدس کی بات چیت
پر ترکِ عشق کے لیے ارشاد کچھ نہ ہو
میں کیا کروں نہیں یہ مرے بس کی بات چیت
✽ محمد حنیف ہانی..... حیدرآباد، تھل بھکر

کرنے کو انتظار تیرا حشر تک کریں
مگر سوال مختصر زندگی کا ہے
✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی

اسے کہو کہ میں سانس لینا چاہتا ہوں
میرے وجود سے یادوں کی رسیاں کھولے

گورڈن کا ہن روز کسی کو قتل کرنے کی نیت سے نہیں لکھا تھا، لیکن اس روز بدھ کا دن اس کی زندگی میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے احتیاط سے لباس کا انتخاب کیا۔ ٹائی کی گرہ درست کی۔ جوتوں کی پالش کرنے میں اس نے کئی منٹ لگا دیے۔ وہ ڈینس میرٹ سے ملنے جا رہا تھا، کالج کلب کے پرائیویٹ روم میں، یہ ظاہر یہ ایک گفت و شنید کی نشست تھی، جس میں مفاہمت کے امکانات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ تاہم گورڈن جانتا تھا کہ میرٹ نے مفاہمت کا کوئی ایماندارانہ راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ چند ہزار ڈالرز کے بدلے میں میرٹ، گورڈن سمیت متعدد موجود حضرات کی زندگی بھر کی محنت لوٹ چکا تھا۔ بات چیت کا مرحلہ گزر گیا تھا۔ اب ڈینس

70 نمبر

محبت

عجب اسرار ہے کہ نمبروں کی اس دنیا میں ہر ہندسہ کوئی نہ کوئی تماشہ دکھا رہا ہے... اور اس تماشے میں مقدر کی کتاب سے کوئی رازوں کو منکشف کرنے کی سعی میں مبتلا ہے... وہ بھی ایک ایسا ہی نمبر تھا جس کے پیچھے ایک بہت بڑا کھیل کھیلا جا رہا تھا... چور سپاہی کے اس کھیل میں فتح اس کا نصیب ہوتی ہے جو نمبروں کی اس گتھی کو سلجھا لیتا ہے... اور جب جستجو بھی ہوا اور حوصلہ بھی... اور ڈوری کا کوئی سرا بھی ہاتھ لگ جائے تو کیسے ممکن تھا کہ گتھی سلجھ نہ پاتی۔

کاروبار حیات میں معاشیات کی فریب کاریوں میں

ابھی ایک منفرد کہانی



ایم کامران خالد... خسر خیل چھب
نہند تو کانٹوں کے بستر پہ بھی آئی ہے وہی
اس کی گود میں سر ہو یہ فروری تو نہیں
عاصم اقبال چپال... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وہ ایک منفرد پھول تھا جو میرے دل کو بھا گیا
ورنہ میں وہ نہیں جو ہر گل پہ فدا ہو جاؤں
قیصر اعوان... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اک دن کی جو مل جاتی حکمرانی مجھے
ختم سے اس ملک میں تری تصویر کا سکھ چلا
عقیق الرحمن... فیصل آباد
اُس کے دل پر بھی کڑی عشق میں گزری ہوگی
نام جس نے محبت کا سزا رکھا ہے
اشفاق شاہین... کراچی
اک لمحے کو ٹھہرا تھا وہ محراب نظر میں
اب تک ہے میرا ذوق ملاقات سفر میں
ماہین فاطمہ... کراچی
آئینہ دیکھو ذرا، کیا میں غلط کہتا ہوں
تو نے مجھ سے بھی کوئی بات چھپا رکھی ہے
داؤد اشفاق... کراچی
چلو یہ عشرتو احساس بھی غنیمت ہے
کہ جس کو یاد کروں، وہ بھی سوچتا ہے مجھے
حسان گل محمد سیال... سکھر
ہم میں سو عیب ہوں گے پر اک خوبی ہے فراز
ہم رستے میں کسی کو تنہا چھوڑا نہیں کرتے
احمد خان توحیدی... اسٹیل ٹاؤن، کراچی
ایک تل ہی تو ہے جس نے تیرے رخسار کو سجا رکھا ہے
ورنہ مجھ میں کیا کمی ہے اور تجھ میں کیا رکھا ہے
رمضان پاشا... گلشن اقبال، کراچی
یہ خدا کی دین عجیب ہے کہ اسی کا نام نصیب ہے
جسے تو نے چاہا وہ مل گیا جسے میں نے چاہا ملا نہیں

جنید احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
کیا حسن اتفاق ہے اُس کی گلی تک
ہم کام سے گئے تھے کہ پھر کام سے ہی گئے
ریاض بٹ... حسن ابدال
اس گھر میں آسیب بناتے ہیں نشین
جس گھر میں بزرگوں کی دعائیں نہیں ہوتیں
زوہیب احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
تم تو سمجھ رہے تھے نہ لائیں گے تابِ غم
ہم نے تمہارے غم کو مسیحا بنا لیا
محمود احمد... لاہور
یارب اب کے یہ کس رنگ میں آئی ہے بہار
زرد ہی زرد ہے پیڑوں پہ ہر اکچھ بھی نہیں
گلریز خان... اسلام آباد
یہ کس مقام پہ تنہائی سوچتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تعلق کا معاملہ بھی نہیں
مہرین ناز... حیدر آباد
زمین کے آستانوں سے فلک کے چاند تاروں تک
کوئی اہل وفا ڈھونڈو، اگر ہم بے وفا ہیں تو
البیلی... کراچی
لے لو واپس یہ آنسو یہ تڑپ اور یہ یادیں ساری
نہیں تم اگر میرے تو پھر یہ سزائیں کیسی
محمد ارشاد... کراچی
یہ بزم ہے یہاں کوتاہ دتی میں محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں یہ مینا اس کا ہے
احمد حسن عرضی خان... قبولہ شریف
ہر گھڑی بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا اندر سے خاموش ہوں میں
مہر افتخار لک... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تیرے وجود کی خوشبو آج بھی میرے من میں ہے
کون کہتا ہے کہ میں تیری یاد سے بے خبر ہوں

محفل شعرو سحر

کوین

برائے

شمارہ

مئی

2014

میرٹ کو مرنے دیا۔

بیالیسویں اسٹریٹ پر آنے کے لیے گورڈن کا ہن نے سب دے کا استعمال کیا پھر چلتا ہوا دو بلاک کے فاصلے پر کالج کلب میں داخل ہو گیا۔

استقبالیہ میز پر موجود خاتون نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ کاروباری ملاقاتوں کی ترتیب و تدوین میں مشغول تھی۔ ساتھ ہی اس کی توجہ کلب کے ذاتی ڈاننگ روم میں آنے والے ظہرانے کے انتظامات کی جانب تھی۔ ایک ویٹر بھی وہاں تھا، جو اس کے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ بہر حال وہ بغیر کسی دقت کے ڈینس میرٹ تک پہنچ گیا۔ میرٹ نے کھڑے ہو کر دل پذیر مسکراہٹ کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا۔

”خوب، خوب، اچھا لگا تمہیں دوبارہ دیکھ کر، ہم یہاں تنہائی میں اطمینان سے، آفس کے جھیلوں سے دور رہتے ہوئے، گفت و شنید کر سکیں گے۔ کیا تم لچ کر دے؟“ گورڈن نے گلا صاف کیا۔ ”نہیں، بس ایک گلاس چلے گا۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

”میں نے الگ کمر مخصوص کر رکھا ہے، آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔“ میرٹ کھڑا ہو گیا۔ گورڈن اس کے عقب میں چلتا ہوا ایک خاص طور پر آراستہ و پیراستہ پرائیویٹ روم میں داخل ہوا۔ دیواروں کو کیسپس کے مناظر سے سجایا گیا تھا۔ کھانے کی میز اتنی بڑی تھی کہ ایک درجن افراد آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ دونوں وسیع میز پر آٹے سے سائے بیٹھ گئے۔ لگ رہا تھا کہ دو حریف پہنچنے لڑنے کے لیے مد مقابل آگئے ہیں۔

میرٹ نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور وہی عمر رسیدہ ویٹر نمودار ہوا۔

کاہن رومال ناک پر رکھ کر ایک جانب جھک گیا کہ ویٹر کی نگاہ اس کے چہرے پر نہ پڑے۔ رومال کی سلوٹوں کے عقب سے اس نے بیٹھی بیٹھی آواز میں اسکاچ اور پانی کی خواہش کا اظہار کیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ پھر سوں..... سوں..... کرتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہاں تو مسٹر گورڈن۔“ میرٹ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”تم اس ملاقات کے خواہش مند تھے۔ تمہارے ذہن میں کیا بات ہے؟“

کاہن کھنکارا، رومال اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ ”میں ”ٹرانس ڈیوسر“ کی بات کرنا چاہتا ہوں..... ہمیں معاملات طے کرنے چاہئیں۔“ اس نے ایک نوٹ بک نکالی

اور میز پر رکھ دی۔ بال پوائنٹ بھی ساتھ تھا۔ نوٹ بک کھلا تھی، صرف پہلے صفحہ پر کئی ماہ قبل کا ہن نے ایک نمبر لکھا تھا۔ ”معاملات کیسے معاملات؟ گورڈن تم سمجھ نہیں جو بھی معاملہ تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے۔“ ٹرانس ڈیوسر نے ہماری ملکیت ہے..... میرٹ انٹر پرائز کی ملکیت ہے۔ اس کے عوض مناسب ادائیگی کر دی گئی ہے۔“

”مجھے تین ہزار ڈالر ملے ہیں اور یہ یقین دہانی کرا ل گئی ہے کہ جب تک میں میرٹ انٹر پرائز میں ملازم ہوں مجھے اس کی رائلٹی بھی ملتی رہے گی، علاوہ ازیں کارپوریشن کے ایک ہزار شیئرز بھی مجھے دیے گئے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے مجھے چھ مہینے بھی برداشت کر لیا تو مجھے کیا ملے گا؟ صرف تین ہزار ڈالر کے ساتھ میں ہڑک پر کھڑا ہوں گا۔“

”گورڈن۔“ میرٹ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”کاروباری دنیا کے مروجہ طریقے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد بھی تمہیں بھی اور دوسروں کے ساتھ فارغ کرنا پڑے۔ تم ہمارے ملازم تھے، یوں ”ٹرانس ڈیوسر“ ہمارا ہے۔ تمہاری محنت اور وقت کے لیے ہم نے مناسب ادائیگی اور پیشکش کی ہے۔ ہر جگہ کارپوریشنز کا طریقہ کار ملتا جلتا ہے، کورٹ بھی اسے تسلیم کرے گا۔“

”ٹرانس ڈیوسر کو میں نے اپنے وقت میں ایجاد کیا تھا اور اس وقت میں تمہارا ملازم بھی نہیں تھا۔“ ”عدالت میں تمہیں یہ ثابت کرنے میں ایک مشکل وقت گزارنا پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے تمہاری ایجاد کو بہتر حالت میں لانے کے لیے کچھ رسک لیے ہیں اور اس پر پیسا بھی لگایا ہے۔“

اسی اثنا میں ویٹر مشروب کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا۔ کاہن نے کھانستے ہوئے رومال پھر منہ پر رکھ لیا۔ ”لگتا ہے مجھ پر ٹھنڈ کا اثر ہو گیا ہے۔“

ویٹر کے جانے کے بعد کاہن پھر سنبھل گیا۔ ”تم کیا کہہ رہے تھے؟“ ”میں کہہ رہا تھا کہ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک اچھی قیمت مل چکی ہے۔“ میرٹ نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا پچانہ صبر لبریز ہوتا جا رہا ہے۔

”میلینز کی ایجاد کے صرف تین ہزار ڈالر۔“ کاہن کی آواز میں حقارت کا تاثر نمایاں تھا۔

میرٹ نے شانے اچکائے۔ ”تمہاری ایجاد کی قیمت تھی جب تک تم اسے بہتر کر کے مارکیٹ میں نہ لاتے اور جس کے لیے تمہارے پاس رقم نہیں تھی۔“

”اسی طرح، تم نے اور کتنے لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا ہے؟“ کاہن کے تاثرات بدلنے لگے۔

”کیا مطلب؟“ میرٹ نے ناگواری سے سوال کیا۔ ”ڈینس میرٹ نے کئی لوگوں کی زندگی بھر کی مغرباری کے نتائج منٹوں میں دھوکے سے چند ہزار ڈالر میں خریدے۔“ گورڈن کاہن نے سرد آواز میں بلا تکلف کہا۔

میرٹ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ایک چسکی لے کر گلاس نیچے رکھ دیا اور ہاتھ لہرا کر ملاقات کے خاتمے کا اشارہ کیا۔

”اب بات کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے اور نہ اب میرے پاس کوئی ایسی وجہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ مزید مہذب انداز اختیار کروں۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ کاہن نے سکون سے کہا اور قلم واپس جیب میں رکھا۔ ہاتھ دوبارہ باہر آیا تو اس میں اعشاریہ 22 کلپر کا سائیکلنر لگا آنویٹک ریولور موجود تھا۔

میرٹ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ”یہ کیا ہے؟“ ”حق! اسے نیچے کرو۔“

”کیا مجھے معقول ادائیگی کی گئی تھی، مسٹر میرٹ؟“ میرٹ کے ہاتھ نے گھنٹی کی جانب جنبش کی تھی کہ کاہن نے ہاتھ بڑھا کر آتشیں ہتھیار اس کے سر کے قریب کر دیا۔ میرٹ کا ہاتھ اب بھی گھنٹی کی جانب رینگ رہا تھا، اس کا اعتماد اور بالادستی ختم ہو چکی تھی۔

کاہن نے بائیں کپٹی کے اوپر گولی ماری، میرٹ کھانس کر میز پر اونڈھا ہو گیا۔ کاہن نے سن گن لی، اطراف کا جائزہ لیا۔ رومال سے اسکاچ کا گلاس صاف کیا اور کسی چیز کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پانی کا گلاس ویسے ہی رکھا تھا۔ اعشاریہ 22 واپس جیب میں منتقل ہو چکا تھا۔ ڈینس میرٹ اپنی مکاریوں سمیت جہنم واصل ہو چکا تھا۔ کاہن نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ گھنٹی کا تار کاٹ دے پھر فوراً ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ گھنٹی بجانے والا وادی اجل میں اتر چکا تھا۔

کاہن نے نوٹ بک اٹھانی چاہی۔ معاً اسی وقت دروازے پر دنگ ہوئی۔ وہ منجھدرہ گیا۔

”یہ؟“ اس نے خود پر قابو پایا۔ ”مسٹر میرٹ کے لیے کال ہے۔“ ایک آواز آئی۔

”وہ اس وقت کسی اور جانب متوجہ نہیں ہو سکتے۔“ پیغام لے لو۔“

”یس سر۔“

کاہن نے لعنت بھیجی اور دروازے کی جھری میں سے جھانکا۔ ویٹر واپس جا رہا تھا، وہاں زیادہ دیر نہیں رکا جاسکتا تھا۔ راستہ صاف دیکھ کر وہ باہر نکل گیا، دروازہ عقب میں بند کر دیا۔

☆☆☆

میرٹ نے اپنے آفس میں بتا دیا تھا کہ وہ کہاں ہے، یہی چیز کاہن کے حساب کتاب میں نہیں تھی۔ اس نے قصداً میرٹ کے نیویارک ایپارٹمنٹ میں فون کر کے میٹنگ کا طے کیا تھا۔ بجائے اس کے آفس میں رابطہ کرنے کے، آفس رابطہ کرنے میں خطرہ تھا کہ اس کی قابل سیکریٹری ایپارٹمنٹ منٹ بک میں کاہن کا نام لکھ لیتی۔ میرٹ کی بیوی فلوریڈا میں تھی اور کسی کو پتا نہیں تھا۔

لیکن آفس والوں کو پتا تھا کہ ڈینس میرٹ کہاں ہے۔ کیا میرٹ نے آفس میں کاہن کا نام بھی بتایا تھا۔ یہ نکتہ گورڈن کاہن کے لیے فکر کا باعث تھا۔ وہ کلب کی سیر جیوں کے نیچے لابی میں رکا اور پے فون کے ذریعے سیکریٹری سے رابطہ کیا۔ ”آہ..... دس از مسٹر راجر۔ کالج کلب میں ڈینس

خوشخبری

طلسماتی انگوشی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ بینی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوشی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نا فرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، بیج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، برقان، جسم میں مردوغورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوشی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826, 021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرہ کراچی

میرٹ سے میری ملاقات تھی لیکن وہ پتا نہیں کہاں ہیں؟ کیا تم میری مدد کر سکتی ہو؟“

لڑکی کی آواز میں الجھن تھی۔ ”وہ یہیں ہیں، مسٹر راجر اور وہ کسی اور کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہیں غالباً اس کے بعد آپ مل سکیں گے۔“

”میرے خیال میں میٹنگ میرے ساتھ تھی وہ کس کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہیں؟“

”انہوں نے یہ تو نہیں بتایا تھا لیکن امید ہے کہ میٹنگ جلد ختم ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔ شکر ہے۔“ اس نے سکون کی سانس لے کر فون بند کر دیا اور بوتھ سے نکل آیا۔ کوئی خامی نہیں ہے، کوئی کلیو بھی نہیں... کوئی شک نہیں ہے، اس کا انتقام بڑی صفائی سے اختتام پذیر ہوا تھا۔ وہ خود کو ہلکا چمکا محسوس کر رہا تھا۔

چلتے چلتے اس کے قدم جم گئے۔ دفعتاً اسے نوٹ بک کا خیال آیا۔ وہ نوٹ بک اٹھانے ہی والا تھا کہ وہ منحوس ویٹر آن ٹپکا۔ بعد ازاں نوٹ بک اس کے ذہن سے اتر گئی اور وہ تیزی سے وہاں سے نکل آیا تھا۔ یہ ظاہر خطرے والی بات نہیں تھی۔ نوٹ بک کا کور ایسا تھا کہ اس پر انگلیوں کے نشانات تلاش نہیں کیے جاسکتے تھے اور اندرونی صفحات کو اس نے چھوا نہیں تھا۔ مگر وہ نمبر موجود تھا جو اس نے پہلے صفحے پر لکھا تھا۔ وہ بھی کئی ماہ قبل۔ نمبر یہ ظاہر غیر اہم تھا لیکن کوئی بھی قابل سراغرساں نمبر کی حقیقت جان سکتا تھا۔ جس کے بعد اسے بقیہ زندگی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑتی۔

کوئی چوائس نہیں تھی اسے نوٹ بک واپس حاصل کرنا پڑے گی۔ کاہن نے دوبارہ سیزھیوں کا رخ کیا۔ جب وہ بچتا بچتا دوبارہ جائے واردات پر پہنچا تو ویٹر کو کمرے کا دروازہ کھولتے دیکھا۔ ویٹر کے ہاتھ میں کوئی پرچی تھی اور دستک کا جواب نہ ملنے پر وہ کمرے میں گھس رہا تھا۔

کاہن نے پھرتی دکھائی اور عقب سے ویٹر پر حملہ کیا۔ ویٹر کا سر بلوط کے مضبوط دروازے سے ٹکرایا۔ تاہم کاہن کو ایک لمحہ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ ویٹر نے اندرونی خونی منظر دیکھ کر چیخ ماری... کاہن نے اسے ایک طرف ہٹانا چاہا لیکن اس کا کمزور بدن ادھ کھلے دروازے میں پھنسا ہوا تھا اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ متواتر چلائے جا رہا تھا۔

کاہن کو دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ نوٹ بک کو بھول کر فائر ڈور سے باہر نکل جائے۔ فائر ڈور کی

سیڑھیاں براہ راست سڑک پر اتر گئی تھیں۔ جلد ہی دوسرے کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ وہ بال بال بچ گیا تھا۔

ویٹر اس کے چہرے سے نا آشنا تھا۔ نہ لابی میں کسی نے نوٹس لیا تھا۔ اس نے انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے تھے نہ سیکریٹری کو اس کا نام معلوم تھا۔ صرف ایک کام یاد ہو گیا تھا کہ نوٹ بک اس منحوس نمبر کے ساتھ وہاں رہ گیا تھی۔ وہ صرف امید ہی کر سکتا تھا کہ پولیس اس نمبر کی حقیقت سے واقف نہ ہو سکے۔

☆☆☆

کیس، ہومی سائڈ ایسٹ کے لیفٹیننٹ برنس کے پاس آیا تھا۔ برنس کے لیے یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا لیکن یہ کچھ مختلف قسم کا معاملہ لگ رہا تھا۔ بلکہ مرڈر اسٹوری نے دی ٹائمز کے ٹائٹل کو ہٹ کیا تھا اور پہلی بار برنس کو سیٹی ہال سے انکوائری کا فون آیا تھا نیز پیش رفت کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔

چوبیس گھنٹے میں کیا پروگریس ہوئی۔ معاملہ ابھی زیر ہی تھا۔ کوئی کلیو نہیں ملا تھا۔ ویٹر چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ تاہم اس نے جو حلیہ بتایا وہ نیویارک کے آدھے لوگوں پر منطبق کیا جاسکتا تھا۔ سیکریٹری نامعلوم مسٹر راجر کی کال کے بارے میں بتاتے ہوئے رو پڑی تھی۔ راجر نام کی کوئی کال اس سے قبل بھی نہیں آئی تھی۔

راجر کی کال نے کیس کو مزید پراسرار بنا دیا تھا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“ برنس نے ہمیشہ کے مانند خود کلامی کی۔ خود کلامی بھی عادتاً بلند آواز میں تھی۔ اسکوڈروم کے دیگر سراغرسانوں نے بھی سنی۔ ”فراسٹ، کوئی دشمن جس کے پاس کوئی معقول وجہ تھیں؟“

”درجنوں، بلکہ سیکڑوں ہو سکتے ہیں۔“ سرجنٹ فراسٹ نے جواب دیا۔ وہ اپنی نوٹ بک کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ”میرٹ ہیرو کے طور پر شائع ہوتا تھا۔ تاہم کاروباری ڈیلنگ میں وہ ویلن کی شہرت رکھتا تھا۔ اس کی من پسند ٹرک کا نشانہ وہ سائنسدان بنتے تھے جو گمنام ہونے کے باوجود کسی مفید ایجاد پر کام کرتے تھے۔ میرٹ ایسے سائنسدانوں کو مختلف جھگڑوں کے ذریعے اپنی فرم میں لے آتا اور مطلب پورا ہونے پر انہیں فارغ کر دیتا۔“

”قتل کرنے کے لیے معقول محرک ہے۔“ برنس نے اتفاق کیا۔ ”ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھنا پڑے گا۔“

”یہی مشکل ہے لیفٹیننٹ... ایسے لوگ اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ میرٹ غالباً ایسے تیس چالیس افراد کو انہوں

نے چکا تھا اور اس کے خلاف درجنوں سے زیادہ مقدمات عدالتوں میں زیر التوا ہیں۔ میرٹ انٹرپرائز ایک بڑا کاروبار تھا اور ایک برا کاروبار تھا۔“

برنس نے پنل کا سر امیز کی سطح پر بجانا شروع کر دیا۔ ”اور کچھ؟“

”روایتی کاروباری دشمنوں کے علاوہ چند مشتعل شوہر۔ جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کی بیگمات کو بے وقوف بنا کر...“

”ٹھیک ہے سمجھ گیا۔“

برنس نے چند افسران کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کالج کلب کے تمام ملازمین کی پڑتال کریں... ویٹر کے سوا کسی کی ڈیوٹی قاتل سے نہیں ہوئی۔ برنس نے رگزر کو اشارہ کیا۔ رگزر دو آفیسرز کو لے کر نکل گیا۔

برنس، قاتل کی چھوڑی ہوئی نوٹ بک کو گھور رہا تھا۔ ”سوئی گھوم پھر کر نوٹ بک پر آئے گی... یعنی اس نمبر پر جو پہلے صفحے پر درج ہے... 5560894۔ آخر اس نمبر کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟“

”کیا اس کی کوئی اہمیت بھی ہے، لیفٹیننٹ؟“

برنس متواتر پنل بجا رہا تھا۔ ویٹر کے بیان کے مطابق قاتل واپس آیا اور ویٹر پر عقب سے حملہ کیا۔ وہ کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ آخر کیوں؟ ایک ہی وجہ ہے کہ وہ نوٹ بک لے آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی چیز وہاں نہیں چھوڑی تھی۔ نوٹ بک کسی کام کی نہیں، کسی بھی اسٹیشنری کی دکان سے ایک ڈالر میں مل جائے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ نمبر اہم ہے، جس کے لیے وہ آیا تھا۔

”لیکن اس نمبر کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“

اسکوڈروم کے آخری سرے پر بلیک بورڈ پر جائے واردات کا نقشہ بنا تھا۔ وہ چلتا ہوا بلیک بورڈ تک گیا۔ کچھ دیر تک چاک کے نشانات کو گھورتا رہا۔ پھر ڈسٹراٹھا کر بلیک بورڈ صاف کر دیا۔

بلیک بورڈ کے سینٹر میں برنس نے بڑے سائز میں 5560894 لکھ دیا۔

”سات اعداد“ برنس نے کہا۔ ”یہ کسی قسم کا شناختی نمبر ہے۔ امکانات کا جائزہ لیتے ہیں۔“

اس نے چاک کی مدد سے پھر لکھنا شروع کیا۔ پھر دور ہٹ کر بورڈ کو دیکھنے لگا۔

- 1- سوشل سیکوریٹی نمبر
- 2- ٹیلی فون نمبر

آبگینہ

وقت، دوست اور رشتے مفت میں ملتے ہیں مگر ان کی قیمت کا پتا تب چلتا ہے، جب یہ کہیں کھو جاتے ہیں۔

☆☆☆

قائد اعظم بھی دنیا میں نہیں رہے۔
علامہ اقبال بھی انتقال کر گئے۔
میری بھی طبیعت خراب ہے۔
پتا نہیں کیا بنے گا اس پاکستان کا؟

☆☆☆

نفرت گناہ سے کرو، گناہ کرنے والوں سے نہیں،
شاید وہ تمہاری محبت میں آکر گناہ چھوڑ دیں۔

☆☆☆

ادب

ایک دفعہ مغل بادشاہ عالمگیر نے اپنے نوکر ”محمد حسن“ کو حسن کہہ کر پکارا تو نوکر وضو کا پانی لے کر آیا۔ کسی نے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ بادشاہ کو وضو کی حاجت ہے؟

نوکر نے جواب دیا۔ ”بادشاہ کی عادت ہے کہ وہ بغیر وضو کے محمد کا نام نہیں لیتے۔ جب بادشاہ نے صرف حسن کہہ کر پکارا تو میں سمجھ گیا کہ ان کا وضو نہیں ہے۔“

کاش ہمیں بھی نئی پاک، کا ایسا ادب حاصل ہو۔

☆☆☆

نگینے

ڈاکٹر نے ایک آدمی کی میموری واش کر دی اور پوچھا۔ ”کچھ یاد ہے؟“

آدمی۔ ”جی بس بیوی کا نام یاد ہے۔“
ڈاکٹر۔ ”سارا ڈیٹا ڈیلیٹ ہو گیا مگر دائرس نہیں گیا۔“

(مرسلہ: سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ)



محی الدین نواب

پانچویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی مہک، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک ہر گئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی مٹاؤں، راتوں اور راتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



دوسرا دن پھر ہنگامہ آرائی کا تھا۔ پھر ایک بار ماروی کے لیے گولیاں چلنے والی تھیں۔ حشمت جلائی کو یقین تھا کہ وہ جہاں بھی چھپی ہوئی ہے آج مراد سے ملنے کے لیے باہر ضرور نکلے گی اور اگر واقعی اغوا کی گئی ہے اور اب تک کسی نے اسے مار ڈالا ہے تو سینٹرل جیل کے دروازے پر دکھائی نہیں دے گی۔

اس کا وجود ہے یا نہیں اس کی طلب میں اسلحہ بدست ہو کر کچھ کر گزرتا تھا۔ چیئر مین باہر بٹیر اور بلو شاہ نہیں جانتے تھے کہ وہ مراد سے ملاقات کرنے آئے گی لہذا وہ میدان کارزار میں نظر آنے والے نہیں تھے۔

البتہ ماروی کے مخالفین میں مرینہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مراد کو قریب سے قریب تر رکھنے کے لیے ماروی کو دور پھینکنا بہت ضروری تھا۔ اس نے ماروی کا بہت چرچا سنا تھا۔ اسے اب تک دیکھا نہیں تھا۔ اس روز پہلی بار دیکھنے والی تھی اور دیکھنے سے پہلے یہ طے کر چکی تھی کہ اگر وہ واقعی بے حد حسین و جمیل ہے اور آئندہ بھی سحر پھونکتی رہے گی اور اس کے راستے میں رکاوٹ بنتی رہے گی تو اسے یوں غائب کرنا ہے کہ وہ قیامت کے دن ہی نظر آئے۔

وہ سمندر پار سے آئی تھی۔ ماروی کے تمام مخالفین سے خطرناک تھی۔ وسیع ذرائع اور اختیارات کی حامل تھی۔ کسی وقت بھی ناممکن کو ممکن بنا سکتی تھی۔

اس روز محبوب کی بے چینی اور پریشانی قابل دید تھی۔ وہ بہ ظاہر ماروی سے لا تعلق تھا۔ دشمنوں کو یہ یقین دلا چکا تھا کہ وہ خود ہی ماروی کو تلاش کر رہا ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ سینٹرل جیل نہیں جاسکتا تھا۔ اس روز وہ محبوب کے بغیر جانے والی تھی۔

طے شدہ منصوبہ کے مطابق وہ اور سمیرا برقع پہن کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر جیلر کے پاس آئی تھیں۔ محبوب لین دین کے معاملے میں حاتم ظاہری تھا۔ جیلر نے اس کی خواہش کے مطابق جیل کے اندر پردے کا خاص خیال رکھا تھا۔ دوسرے لوگ جو قیدیوں سے ملنے آئے تھے انہیں ماروی کے قریب آنے نہیں دیا تھا۔

ملاقات کا وقت ہوا تو سمیرا جیلر کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ ماروی لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ اندر آگئی وہاں مراد آہنی جالیوں کے پیچھے اس کا خطر تھا۔ دونوں نے بڑے پیار سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر آہنی جالیوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ وہ ہاتھ ان جالیوں کے آریار ہو کر ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے تھے۔ بس ایک ذرا تسلی سی ہوتی تھی

کہ بہت قریب ہو گئے ہیں۔

ماروی نے کہا۔ ”آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں اس ایک ملاقات کے انتظار میں تھی۔ یہاں سے نکلنے کے بعد پھر اس شہر میں نہیں رہوں گی۔“

”ہاں۔ یہ تم فون پر بھی کہہ چکی ہو۔ ٹھیک ہے تمہیں بدنامیوں سے دور بہت دور ہو جانا چاہیے۔“

”میں وہاں ساری عمر تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔“

”ماروی بہت ہوشیاری سے رہتا ہوگا۔ اگر دشمنوں کی نظروں میں آ جاؤ گی تو وہ جینا محال کر دیں گے۔“

”مجھے یقین ہے اس ویران علاقہ میں کوئی دشمن بھولے سے بھی بھٹکتا ہوا نہیں آئے گا۔“

مراد نے دل میں کہا۔ ”پتا نہیں میں کن حالات سے گزرتا رہوں گا۔ نہ جانے مرینہ مجھے کب یہاں سے باہر لے جا سکے گی۔ آگے دھند چھائی ہوئی ہے۔ دکھائی نہیں دے رہا ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟“

مرینہ اس وقت گارڈز روم میں تھی۔ وہاں سے ملاقات کرنے والے قیدیوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ وہ اسی ایک کھڑکی سے جھانک کر ماروی کو دیکھ رہی تھی۔

تصویر میں دلکشی ہو تو نظریں اس پر جم جاتی ہیں۔ مرینہ سوچ رہی تھی۔ ایسی کیا دلکشی ہے اس میں کہ دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

عورتیں ایک دوسرے سے جلتی کڑھتی ہیں۔ یہ دیکھنے بھینے کی کوششیں کرتی ہیں کہ سامنے والی میں کچھ زیادہ سی کشش کیوں ہے؟ دیکھنے میں تو بس یونہی ساناک نقش ہے۔ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور پر ہی نہیں ہے۔

مرینہ نے حقیقت کو تسلیم کیا کہ ماروی کوئی عالمی حسینہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود سب سے الگ ہے اور اس میں ایسی کشش ہے جو سمجھ میں نہیں آتی لیکن دل میں گھر کر لیتی ہے۔

وہ گارڈز روم سے باہر آگئی۔ اپنا فون نکال کر سمیرا سے ملنے لگی۔ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ مراد سے اس کی یہ آخری ملاقات ہے۔

جیل کے باہر برکت اور رحمت دو الگ گاڑیوں میں ایک دوسرے سے دور تھے۔ فون کے ذریعے اپنے باپ کو رپورٹ دے رہے تھے۔ برکت کہہ رہا تھا۔ ”بابا جانی! ماروی ابھی تک نظر نہیں آئی ہے۔ میں دور بین سے دیکھ رہا ہوں۔“

رحمت بھی جہاں تھا وہاں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے فون پر کہا۔ ”صرف تین عورتیں بے پردہ ہیں۔ پانچ برقعوں میں اور چادروں میں ہیں۔ کچھ

عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ ہیں اور کچھ تنہا آئی ہیں۔“

حشمت نے کہا۔ ”ماروی برقع میں چھپ کر آسکتی ہے۔ اسے برقع میں پہچانو۔“

”بابا جانی! کیسے پہچانوں؟ برقع کے باہر سب ہی ایک جیسی دکھائی دیتی ہیں۔“

”جب وہ ملاقات کے بعد واپس جائیں تو ان کا پیچھا کرو۔ ان کا پتا ٹھکانا معلوم کرو۔“

حشمت نے اپنی کارسزک کے کنارے کھڑی کی تھی۔ سینٹرل جیل سے اور اپنے بیٹوں سے دور تھا۔ دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا مگر آگیا۔

محبوب نے ادھر سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ لیا۔ وہ سر جھکائے بیٹوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ دیکھ لیا گیا ہے۔

محبوب اس کی موجودگی سے پریشان ہو گیا۔ وہ کبخت وڈیرا ماروی کی تاک میں تھا۔ جیل سے واپسی پر اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہی اسے وہاں سے بھاگنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر فون پر لنگڑے جانی سے پوچھا۔ ”کہاں ہو؟“

وہ بولا۔ ”یہاں جیل کے قریب ہی اپنے ساتھی کے ساتھ بائیک پر بیٹھا ہوا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”تین ہٹی کی طرف جو راستہ جاتا ہے۔ اس کے موڑ پر حشمت جلائی اپنی کار میں بیٹھا ہے۔ ابھی جاؤ اور اس پر فائرنگ کرتے ہوئے گزر جاؤ۔“

لنگڑے نے کہا۔ ”اگر آپ کہیں قریب ہیں تو ابھی فائرنگ کی آواز سنیں گے۔“

وہ فون بند کر کے دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے بیٹے اور کرائے کے بد معاش کہاں ہیں؟ تھوڑی دیر بعد ہی دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ لنگڑا دو پاؤں والوں سے زیادہ تیزی دکھا کر گزر گیا تھا۔

وڈیرے کی توجہ جان نکل گئی تھی۔ وہ فون پر باتیں کرتے وقت اسٹیرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ گولی چلتے ہی سیٹ کے نیچے دبک گیا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے چھٹا کے سے ٹوٹنے ہوئے بھر گئے تھے۔ آس پاس کے لوگ کیا اس کی مدد کو آتے سب ہی اپنی جانیں بچانے کے لیے دور بھاگتے چلے گئے تھے۔

وہ سیٹ کے نیچے تھوڑی دیر تک گہری گہری سانس لیتا رہا۔ آس پاس کی خاموشی نے سمجھایا کہ خطرہ ٹل گیا ہے

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لوگ بہت دور کھڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ فوراً ہی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لوگ بہت دور کھڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ فوراً ہی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔

سینٹرل جیل سے دور جا کر اس نے بیٹوں سے باری باری فون پر کہا۔ ”ابھی مجھ پر گولیاں چلائی گئی ہیں۔ ابھی تم یتیم ہونے والے تھے۔ ماروی کی قسمت سے بچ گیا ہوں۔ میں اس کے تعاقب میں ہوں۔ آج تو اسے لے کر ہی جاؤں گا۔“

رحمت نے پوچھا۔ ”بابا جانی...! ہمارا کیا ہو گا؟ دشمنوں نے ہمیں یہاں دیکھ لیا ہے۔ تم پر گولیاں چلانے والے ہمیں کب چھوڑیں گے۔ وہ کہیں سے ہمارا نشانہ لے رہے ہوں گے۔“

دوسرے بیٹے نے بھی یہی کہا۔ ”ہم ان کی نظروں میں آگئے ہیں۔ وہ ہماری چلنے نہیں دیں گے۔ ایسی صورت میں ہم اسے نہ اغوا کر سکیں گے نہ گولی مار سکیں گے۔“

وہ بولا۔ ”خبردار! بھاگنے کی باتیں نہ کرنا۔ دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ وہ جیل سے باہر آ رہی ہوگی۔ جس برقع والی پر شبہ ہو اس کے پیچھے جاؤ۔ مجھے فون کرو میں تمہارے پیچھے آؤں گا۔“

جیل کے اندر مرینہ کو اس کے فون نے پکارا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہاں دارا...! بولو۔“

وہ بولا۔ ”یہاں جیل سے باہر دو سو گز کے فاصلے پر فائرنگ ہوئی ہے۔ ایک کار پر گولیاں چلائی گئی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”اس شہر میں گولیاں چلنا معمول کی بات ہے۔“

”ہاں مگر جیل کے قریب فائرنگ ہوئی ہے۔ اس گاڑی والے نے جگہ تبدیل کر دی ہے لیکن جیل کے ہی قریب ہے۔“

”ہوں۔ پھر تو یہ ماروی کے لیے ہو رہا ہے۔ پتا نہیں اس لڑکی کے کتنے طلبگار ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ ماروی کسی کے ہاتھ لگے۔ اسے زندہ سلامت لے جاؤ۔ یہ میرے بہت کام آئے گی۔“

مرینہ نے بولتے ہوئے ایک سمت دیکھا۔ ماروی لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ جیلر کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ فون پر بولی۔ ”دارا...! ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ یہ واپس جانے والی ہے۔ ابھی چند منٹوں میں جیل سے باہر آئے گی۔“

”اوکے۔ میں اسے کسی کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔“
سینٹرل جیل کے تین اطراف بھری پری سڑکیں
تھیں۔ ان سڑکوں کے کنارے دشمنوں کی گاڑیاں ادھر ادھر
کھڑی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں تھے۔ جب
برقع پوش عورتیں مختلف گاڑیوں میں بیٹھ کر جانے لگیں تو وہ
گاڑیاں بھی حرکت میں آ گئیں۔ جس کو جس پر شبہ ہوا وہ اس
کے پیچھے چل پڑا۔

محبوب جانتا تھا کہ ماروی اور سمیرا کن برقعوں میں
ہیں۔ وہ جس ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں۔ اس کے پیچھے ایک
ویگن کار چل پڑی۔ اس میں بہرام اور دارا تھے۔ محبوب نے
اس کا راستہ روکنے کے لیے اپنی کار آگے بڑھا دی۔

تینوں گاڑیاں آگے پیچھے تیز رفتاری سے جا رہی
تھیں۔ آگے ٹیکسی تھی۔ پیچھے ویگن کا محتاط انداز میں تعاقب
کر رہی تھی۔ محبوب رفتار بڑھاتا ہوا ویگن کار کے برابر
آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالی پھر ریوالور
والا دوسرا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر تڑا تڑ گولیاں چلا
دیں۔ نشانہ پہیوں کی طرف تھا۔ ایک پہیہ دھماکے سے
پھٹا ویگن کار بے قابو ہو گئی۔ محبوب آگے نکل گیا۔

یہ عشق ہے جو بزدلوں کے ہاتھوں میں تلوار اور
شریفوں کے ہاتھوں میں بندوق پکڑا دیتا ہے۔ محبوب نے
برسوں پہلے ایک ریوالور اس لیے خریدا تھا کہ سب ہی
دولتمند احتیاطاً اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اسے بھی رکھنا
چاہیے۔ چلانا آئے یا نہ آئے یہ پاس رہے تو چور بد معاش
سبے رہتے ہیں۔

اس نے معروف جنگی کا مشورہ مان کر کسی حد تک نشانہ
بازی کی مشقیں بھی کی تھیں مگر یہ کبھی سوچا نہیں تھا کہ دشمنوں
پر گولیاں چلانے کی نوبت آئے گی۔ اب یہ حال تھا کہ
ماروی کے لیے ایکشن میں رہنے لگا تھا۔ ایک روز پہلے اس
کے لیے خون بہا چکا تھا۔ اب دشمنوں کے قریب سے فائر کرتا
ہوا گزر گیا تھا۔ حالات کہہ رہے تھے کہ اسی طرح جان
جو کھم میں ڈالنا رہا تو کسی دن جان سے جائے گا۔

ماروی کا تعاقب کرنے والوں کی گاڑی نا کارہ ہو گئی
تھی۔ اب وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ محبوب
نے آگے جا کر اپنی کار روکی آگے تین راستے تھے۔ ایک
راستہ نیشنل اسٹڈیم کی طرف دوسرا راستہ کار ساز کی طرف
اور تیسرا ملینیم کی طرف جاتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ
ماروی اور سمیرا کدھر گئی ہیں؟

موجودہ خفیہ رہائش گاہ تک جانے کے لیے وہ کار ساز

کی طرف مڑ گیا۔ اسے یقین تھا کہ سمیرا جیل سے نکل
کر ماروی کو اس خفیہ کونجی میں لے گئی ہوگی۔

وہ کار کی رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ رفتار ایسی تھی کہ وہ
آدھے گھنٹے میں ان کی ٹیکسی تک پہنچ جاتا۔ پھر وہ پریشان اور
ٹیکسی آگے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

اس نے سڑک کے کنارے کار روکی پھر فون پر سمیرا کے
نمبر شیخ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی
پھر کسی شخص کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو آپ کون ہیں؟“

محبوب نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟ یہ میری لپ
اے مس سمیرا کا فون ہے۔“

”اگر یہ واقعی آپ کی پی اے ہیں تو جتنی جلدی ہو
سکے آپ لیاقت اسپتال میں آ جائیں۔“

وہ ایکدم سے پریشان ہو گیا۔ ”اسپتال میں کیوں؟
وہ خیریت سے تو ہے؟“

”وہ ایک ٹیکسی میں بیہوش پڑی تھیں۔ ڈرائیور بھی
بیہوش تھا دونوں کو یہاں لایا گیا ہے۔“

اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”ماروی کہاں ہے؟“
پوچھا گیا۔ ”کون ماروی؟“

”سمیرا کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔“
”سوری ہم نہیں جانتے۔ آپ آ جائیں۔ مس سمیرا کو
ہوش آ گیا ہے لیکن وہ بات کرنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ
آ جائیں۔“

فون بند ہو گیا جیسے محبوب کی سانسیں بند
ہو گئیں۔ ماروی کا پتا نہیں تھا۔ وہ گم ہو گئی تھی اور گم ہونے کا
مطلب یہی تھا کہ انہو کی گئی ہے۔ کوئی دشمن کامیاب
ہو گیا ہے۔

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا کہ کس طرح ڈرائیور
کرتا ہوا اسپتال تک پہنچا۔ وہاں ایک پولیس انسپکٹر موجود
تھا۔ اس نے کہا۔ ”ڈائریکٹر پر یہ واردات ہوئی ہے۔ لوگوں
کا بیان ہے کہ تین گن مین ایک کار میں آئے تھے۔ وہ گن
پوائنٹ پر ایک لڑکی کو اپنی کار میں بٹھا کر لے گئے۔“

وہ انسپکٹر کے ساتھ اس کمرے میں آیا جہاں سمیرا
آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس نے آہٹ سن کر آنکھیں
کھولیں پھر محبوب کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ وہ اس کے پاس
بیٹھ کر تھکتے ہوئے بولا۔ ”حوصلہ کرو۔ میں آ گیا
ہوں۔ فوراً بتاؤ۔ وہ کون تھے؟ کیا تم کسی کو پہچانتی ہو؟ یا
آئندہ پہچان سکتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”کسی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں

ملا۔ وہ سب گن لیے ہوئے تھے۔ ایک نے میری طرف کا
دروازہ کھولتے ہی منہ پر رومال رکھ دیا۔ پھر مجھے ہوش نہ
رہا۔ یہ بتائیں ماروی تو خیریت سے ہے؟“

محبوب نے مٹھیاں پہنچ کر بڑے کرب سے کہا۔
”میری دنیا ٹ رہی ہے۔ وہ اسے لے گئے ہیں۔“

سمیرا نے چیخ کر کہا۔ ”نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے
ہیں؟ وہ کون تھے؟ لوگوں نے ان کی صورت دیکھی ہوگی۔“

پھر وہ بولی۔ ”لیکن نہیں مجھے یاد آ رہا ہے۔ انہوں
نے منہ پر ڈھانٹا باندھا ہوا تھا۔ ان کی صرف آنکھیں دکھائی
دے رہی تھیں۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پاؤں پیچ کر کہنے لگا۔ ”کہاں
جاؤں؟ وہ کتے اسے لے گئے ہیں؟ میں اسے کہاں تلاش
کروں؟“ اس پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ دیوار پر
گھونسا مار کر چیخ پڑا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔ وہ سیدھی
سادھی مصوم لڑکی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں
گے؟ میں مر جاؤں گا۔“

پھر اس نے دیوار پر سر مار تے ہوئے کہا۔ ”یا خدا
اسے واپس لے آ۔ میری جان لے لے۔ اسے عزت آبرو
سے رہنے دے۔ یا مجھے وہاں پہنچا دے جہاں وہ ہے۔ میں
اس کی سلامتی کے لیے مرنوں گا۔“

اس نے دونوں ہاتھ دیوار پر مارے۔ اس کے حلق
سے ایک کمزوری چیخ نکلی۔ ”ماروی...!“

پھر اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ دیوار کے
ساتھ لگا ہوا جھکتا ہوا سگڑتا ہوا فرش پر گر پڑا۔

اسپتال میں ایک اور مریض کا اضافہ ہو گیا۔
ادھر ماروی کے لیے اب تک بھاگ دوڑ جاری
تھی۔ برکت نے فون پر کہا۔ ”بب بابا جانی...! ایک برقع
والی جیل سے باہر آئی ہے۔ ماروی جیسی لگ رہی ہے۔ ایک
ٹیکسی میں بیٹھ کر جا رہی ہے۔ میں اس کے پیچھے جا رہا
ہوں۔ تم بھی پیچھے پیچھے آؤ۔“

رحمت نے بھی اسی اکیلی برقع والی کو تاڑا تھا۔ وہ
تینوں اس کا پیچھا کرتے ہوئے دور تک گئے۔ آگے جا کر وہ
برقع والی پچھلی سیٹ سے اٹھ کر اگلی سیٹ پر آ گئی۔ اس نے
برقع اتار دیا۔ پھر ڈرائیور کے شانے پر بڑے پیار سے سر
رکھ دیا۔

یہ صاف سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنے قیدی شوہر سے رسی
طور پر ملنے آئی تھی۔ اب یار کے ساتھ سیر پانے کر رہی تھی۔
حشمت جلالی نے تمللا کر دونوں بیٹوں کو ٹکڑی گالیاں

دیں اور کیا کر سکتا تھا؟ اب تو وہ ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔
کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح جانے کہاں چلی گئی تھی۔
یہ سوال ہر دوست اور دشمن کے دماغوں میں گونجتے
والا تھا کہ اسے کون لے گیا ہے؟

مرینہ جیلر باپ کے ریٹ روم میں آرام سے لیٹی
ہوئی اہم فون کی منتظر تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کالنگ ٹون چیخنے
لگی۔ وہ اسی آواز کی منتظر تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ فون کا بٹن دبا
کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں دارا...! بولو۔“

دارا کی تھکی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ”کیا بولوں؟ وہ
ہاتھ سے نکل گئی ہے۔“

وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولی۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟
تمہارے ہاتھ سے شکار نکل گیا؟“

”ہاں۔ یہ خوش فہمی تھی کہ پاکستان میں ہم سے بھلا
کون ٹکرائے گا۔ آج کسی نے سبق سکھا دیا ہے۔“

”وہ کون لوگ تھے؟“
”وہ تھے نہیں صرف تھا۔ ایک ہی تھا۔ میں نے اس
کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ وہ ہماری کار کو نا کارہ بناتے
ہوئے گزر گیا۔“

وہ بولی۔ ”ڈونٹ وری۔ کسی نے ماروی کو سکیورٹی
دی ہے۔ وہ اپنی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ گئی ہوگی۔ کوئی بات
نہیں پھر کسی دن اپنے بل سے باہر آئے گی۔“

”نہیں مرینہ! نہ اسے سکیورٹی ملی ہے نہ وہ اپنی محفوظ
پناہ گاہ میں ہے۔ اسے کوئی اڑا لے گیا ہے۔“
”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”ہم اپنی کار کا پہیہ بدل کر آگے گئے تھے۔ ہمیں
ڈائریکٹر پر ملیم سے آگے وہی ٹیکسی نظر آئی جس میں ماروی
گئی تھی۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ تین مسلح شخص ایک لڑکی کو
اور ڈرائیور کو بیہوش کر کے دوسری لڑکی کو گن پوائنٹ پر لے
گئے ہیں۔“

مرینہ نے کہا۔ ”یعنی ماروی کو لے گئے ہیں؟“

”وہی اہم ہے۔ اسے ہی لے گئے دوسری کو چھوڑ دیا۔“
وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سخت لہجے میں بولی۔ ”میرے ہاتھوں
سے کوئی نہیں بچتا۔ میں نے تم سے کام لے کر غلطی کی ہے۔“

”سوری مرینہ! میں اسے ڈھونڈ نکالنے کی پوری
کوشش کروں گا۔ ابھی ایک گاڑی کا تعاقب کر رہا ہوں۔“

اس نے غصہ سے فون بند کر دیا۔ وہ ماروی کو ہلاک
نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے کہیں زندہ رکھ کر مرادی کمزوریوں
سے کھیلنا چاہتی تھی۔ یہ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم

ہو گیا تھا۔ وہ دارا پر بھروسہ کر کے ناکام رہی تھی۔ اسے اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

اب یہ اہم سوال تھا کہ ماروی کو کون لے گیا ہے؟ یہ تو کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ خود ہی سب کو دھوکا دے کر کہیں چا کر چھپ گئی ہے۔ سمیرا اور ڈرائیور کی بیہوشی اور لوگوں کی چشم دید گواہی تھی کہ تین سح دشمن آئے تھے اور ماروی کو مار ڈالنے کی دھمکی دے کر بددوق کے نشانے پر لے گئے تھے۔

کون تھے وہ؟

حشمت جلالی، چیرمین بابر بشیر اور بیلو شاہ نہیں تھے۔ مرینہ بھی ناکام ہوئی تھی۔ محبوب علی چانڈیو اسپتال میں پڑا تھا۔ جب ان میں سے کوئی نہیں تھا تو پھر اور کون تھا؟ کیا ماروی کا کوئی نیا طلب گار پیدا ہو گیا تھا؟ اور وہ ایسا تیز طرار تھا کہ سارے پرانے کھلاڑیوں کو مات دے کر جیسے آنکھوں سے کا جل چرا کے لے گیا تھا۔ نہ جانے کتنی مدت تک اس سوال کا جواب ملنے والا تھا اور شاید جیج جواب بھی ملنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

یہ تو پہلے سے طے ہو چکا تھا کہ وہ ایک بار اور آخری بار مراد سے جیل میں ملے گی۔ اس کے بعد چاچا چچی کے ساتھ شہر سے چلی جائے گی۔ چاچا چچی اس قابل نہیں تھے کہ وہ بیچارے فرار کا کوئی منصوبہ بناتے لیکن ارادے مضبوط ہوں تو راہیں ہموار کرنے والے مل جاتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے ماروی کو سمیرا مل گئی تھی۔ محبوب کے لیے سمیرا کے اپنے دلی جذبات تھے پھر یہ کہ وہ کاروبار کی سلامتی چاہتی تھی اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ ماروی محبوب سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ اس نے ماروی سے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی وہ دور جانا چاہے گی تو وہ اس کا بھرپور ساتھ دے گی۔

اس نے اس سلسلے میں معروف جلی سے بات کی۔ ”سر! آپ مجھے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔ مجھے محبوب صاحب کی شریک حیات بنانا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے تعاون سے ان کا کاروبار سنبھال رہی ہوں اور ان کا اعتماد حاصل کر رہی ہوں۔“

وہ ڈراما یوس ہو کر بولی۔ ”لیکن جب تک ماروی ان کی نگاہوں کے سامنے رہے گی تب تک ہم محبوب صاحب کو نارمل نہیں بنا سکیں گے نہ ان کے کاروبار کو اچھی طرح سنبھال سکیں گے۔“

معروف نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ مراد کا مقدمہ کمزور ہوگا۔ اسے سزائے موت ہوگی تو ماروی محبوب سے راضی ہو جائے گی۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ تم محبوب کی منکوحہ بن جاؤ۔ اس کے کاروبار میں تم برابر کی شریک رہو گی تو یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔“

سمیرا نے پوچھا۔ ”کیا آپ کبھی انہیں نارمل بنا سکیں گے اور کیا ماروی کو ان کی زندگی میں لانے کے لیے کبھی مراد کے مقدمہ کو کمزور بنا سکیں گے؟“

”میں محبوب کی بہتری کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہاری بات کا یہی جواب ہے کہ مراد کی زندگی سے بھی کھیل سکتا ہوں۔“

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی۔ سوچتی رہی۔ معروف نے کہا۔ ”میری یہ بات سن کر تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔“

”میں جانتی ہوں آپ محبوب صاحب کی بہتری اور سلامتی کے لیے کچھ بھی کر گزریں گے۔ لیکن کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ مراد کا مقدمہ کمزور نہ کرنا پڑے وہ اپنی پوری زندگی جئے اور محبوب صاحب کو ماروی سے نجات مل جائے تو؟“

”تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی لیکن ماروی سے ہمارے محبوب کو نجات کیسے ملے گی؟“

”وہ خود محبوب صاحب کی لاعلمی میں چھپ کر بہت دور چلی جانا چاہتی ہے۔ وہ بہت ہی شرم و حیا والی ہے۔ بدنامیوں سے گھبرا گئی ہے۔ کسی ایسی جگہ جانا چاہتی ہے جہاں کوئی اسے جانتا نہ ہو وہاں وہ نیک نامی سے رہ سکے گی۔“

”ایسی بات ہے تو میں اس سے ملوں گا اور اس سلسلے میں چند اہم باتیں اسے سمجھاؤں گا۔“

پھر محبوب کی لاعلمی میں معروف جلی نے ماروی سے ملاقات کی۔ سمیرا نے اس سے کہا۔ ”میں نے معروف صاحب کو تمہارے نیک ارادوں سے آگاہ کیا ہے۔ تم اپنے محسن محبوب صاحب کی بہتری کے لیے یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ ان کی نظروں سے کم ہو جانا چاہتی ہو۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”میں ان کی نیکیوں کا اور احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔ خدا کرے میرے جانے کے بعد وہ مجھے بھول جائیں۔“

معروف نے کہا۔ ”نہیں بھولے گا۔ تم اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر اور شدت سے یاد آؤ گی اور دن رات اسے تڑپاؤ گی۔“

”انسان صرف مرنے والوں کو رفتہ رفتہ بھولتا ہے۔ ایک دن اسے صبر آ جاتا ہے۔“

”میں کیسے مر جاؤں۔ خودکشی ہمارے دین میں حرام ہے۔“

”مرنا ضروری نہیں ہے۔ میرے بوڑھے تجربات جو کہتے ہیں وہ کرو گی تو یہ سنگین مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”آپ جو کہیں گے وہ کروں گی۔“

”تم یہاں سے جاتے ہی اپنے فون کی سم پھینک دو گی۔ اسے کبھی فون پر بھی آواز نہیں سناؤ گی۔“

”میں یہی کروں گی۔ آپ اچھا مشورہ دے رہے ہیں۔ اپنی آہٹ بھی نہیں سناؤں گی۔“

”ہاں۔ تب اسے یقین ہوگا کہ تم اس دنیا میں نہیں رہی ہو۔ اسے صدمہ تو ہوگا اور وہ بڑی حد تک اپنا نارمل رہے گا پھر رفتہ رفتہ نارمل ہوتا چلا جائے گا۔“

سمیرا نے کہا۔ ”یہ اچانک ہی چپ چاپ یہاں سے جائے گی تو انہیں کیسے یقین ہوگا کہ یہ وفات پا چکی ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”یہ سیدھے سادے انداز میں یہاں سے نہیں جائے گی۔ اسے اغوا کرانے جانے کا ڈراما پلے کیا جائے گا۔ جس روز یہ مراد سے ملنے جیل جائے گی۔ اس روز نہ معلوم کتنے دشمن اس کی تاک میں ہوں گے۔ میں بھی فنکاروں سے کام لوں گا۔ وہ اسے گن پوائنٹ پر لے جائیں گے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”یہ اچھی تدبیر ہے۔ اغوا کے بعد جب ماروی کسی سے رابطہ نہیں کرے گی۔ اس کا کوئی سراغ ملے گا نہ کوئی خبر ملے گی تو اس کی موت کا یقین ہو جائے گا۔“

سمیرا۔۔۔! تمہیں بھی تھوڑی تکلیف اٹھانی ہوگی۔“

”تھوڑی کیا زیادہ بھی اٹھاؤں گی۔ آپ حکم دیں۔“

معروف نے کہا۔ ”اغوا کرنے والے تمہیں اور نیکی ڈرائیور کو بچ بیہوش کریں گے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”کوئی بات نہیں۔ زندگی میں بیہوش ہونے کا تجربہ بھی حاصل کر لوں گی۔“

اس منصوبہ کے مطابق انہوں نے یہی کیا۔ ماروی کو ڈالیا روڈ سے اغوا کر کے سپر ہائی وے پر پہنچا دیا۔ وہاں معروف جلی چاچی اور چاچا کے ساتھ موجود تھا۔ ایک بڑی سی آرام دہ انٹرکنٹیننٹ کوچ میں ان کی ضرورت کا تمام سامان رکھ دیا گیا تھا۔

ماروی نے معروف کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں آپ کی یہ مہربانیاں کبھی نہیں بھولوں گی۔ آپ نے وعدہ کیا ہے۔ مراد کا مقدمہ ضرور جیتیں گے اور اسے میرے پاس

ماروی

پہنچائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ تم بھی اپنے وعدہ پر قائم رہو گی۔ محبوب سے کبھی فون پر بات نہیں کرو گی۔“

”میں آپ کے سامنے سم بدل چکی ہوں۔ سامعین بھی مجھ سے بات نہیں کر سکیں گے۔“

معروف نے اسے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ دو لاکھ روپے میری طرف سے ہیں۔“

پھر دوسرا لفافہ دے کر کہا۔ ”سمیرا نے بھی بڑی محبت سے یہ دو لاکھ دیے ہیں۔ اب جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہے۔“

چاچی اور چاچا جانے بھی معروف کا شکر یہ ادا کیا پھر وہ لکڑی کوچ میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ماروی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا ہے۔ وہ نیک نامی سے نئی زندگی گزارنے جا رہی ہے۔

معروف تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ ماروی کو دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ یقین کرتا رہا کہ وہ جا رہی ہے اور محبوب کی زندگی میں کبھی واپس نہیں آئے گی۔

ماروی کے ٹل جانے سے یہ کہہ سکتے تھے کہ بلا ٹل گئی ہے۔ لیکن نہیں۔ وہ جو گئی تھی، کوئی بلا نہیں حقیقی معنوں میں شریف زادی تھی۔ محبوب کی دولت بھی اسے خرید نہ سکی تھی۔

معروف نے بڑے جذبے سے زیر لب کہا۔ ”یہ بلا نہیں ہے۔ رحمت خداوندی ہے آج اس نے ہم سب پر احسان کیا ہے۔ اربوں روپے کے بزنس کو سلامتی دے کر جا رہی ہے۔“

وہ اپنی پیشانی تک ہاتھ لے جاتے ہوئے بولا۔ ”ماروی! یہ بوڑھا تجھے سلام کرتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تیرے مراد کو عدالت سے باعزت بری کرانے گا۔“

وہ اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے بھی سی اسکرین کو دیکھا۔ سمیرا کال کر رہی تھی۔ وہ بٹن دبا کر لاؤڈ اسپیکر کو آن کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بولو! کہاں ہو؟ کیا اکیلی ہو؟“

”ہاں۔ اسپتال کے کمرے میں ہوں۔ بیہوشی کے بعد کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ یہ تشویشناک اطلاع دے رہی ہوں کہ محبوب اپنا نارمل ہو گئے ہیں۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”اسی اسپتال میں ہیں۔ ڈاکٹر نے سکون کی دوائیں دی ہیں۔ وہ سو رہے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”یہ تو ہونا ہی تھا۔ تم پریشان نہ

گئے۔ کیا تم پہچان سکو گے کہ کون اسے لے کر گیا ہے؟“
سمیرا نے کار قریب لا کر روک دی۔ معروف نے
اسے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ خود پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔
سمیرا نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ معروف نے
کہا۔ ”کیا تم سمجھ رہے ہو کہ ابھی عقل کے خلاف پیدل چل
رہے تھے۔“

وہ بولا۔ ”ہماری دنیا کے بے شمار عقل مند پیدل چلتے
ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پیدل چلنے سے یوں لگ رہا
تھا۔ جیسے اسے تلاش کر رہا ہوں۔ ایک طرح سے آسودگی مل

وہ بیڈ سے اترتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں نہیں
رہوں گا۔“
معروف نے کہا۔ ”تمہیں یہاں رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر
تمہارے حالات کے مطابق تمہیں ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔“
”میں ٹریٹمنٹ نہیں چاہتا۔ اس کی واپسی چاہتا ہوں۔“
وہ کمرے سے باہر جانے لگا۔ باہر معروف کی کار
کھڑی تھی۔ وہ ادھر نہیں گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسپتال
کے احاطے سے باہر آ گیا۔ سڑک کے کنارے دائیں بائیں
دیکھتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ”میں دن رات پیدل چلتا
رہوں گا تو وہ کہیں تاکہیں ضرور ملے گی۔“

سمیرا اور معروف بل کی ادائیگی کے بعد باہر آئے تو
وہ گاڑی کے اندر اور باہر کہیں نہیں تھا۔ سمیرا نے وارڈ بوائے
سے معلوم کیا تو وہ باہر مین گیٹ کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے بولا۔ ”وہ ادھر گئے ہیں۔“

معروف نے ادھر جاتے ہوئے سمیرا سے کہا۔ ”تم
گاڑی لے کر آؤ۔ میں دیکھتا ہوں وہ کہاں گیا ہے۔“
اس نے اسپتال کے احاطے سے باہر آ کر سڑک کے
کنارے آ کر دور تک دیکھا۔ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سمیرا کار
ڈرائیو کرتی ہوئی آئی۔

معروف اسپتال کے دائیں سمت گیا۔ وہ کار
دوڑاتے ہوئے بائیں سمت گئی۔ بہت دور تک تیزی سے
چلتے رہنے کے بعد وہ نظر آیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کرتے
ہوئے فون پر سمیرا سے کہا۔ ”میری طرف آؤ۔ وہ یہاں نظر
آ رہا ہے۔“

اس نے فون بند کر کے اسے آواز دی۔ ”محبوب رک جاؤ۔“
اس نے پیچھے پلٹ کر معروف کو دیکھا پھر رک گیا۔ وہ
بڑھا ہانتا ہوا قریب آ کر بولا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ میں
نے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تھا۔“

”وہ گاڑی میں بیٹھنے سے نظر نہیں آئے گی۔“
وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”محبوب اپنے حواس میں
رہو۔ وہ سڑکوں پر ٹھٹھٹے اور تم سے ملنے کے لیے گم نہیں ہوئی
ہے۔ ذرا صبر کرو ہم سب اسے طریقے سے ڈھونڈتے رہیں
گے تو شاید وہ ہمیں کہیں مل جائے گی۔“

”آپ شاید کہہ رہے ہیں۔“
”اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اغوا کرنے والے اسے
زندہ چھوڑ کر گرفتار ہونا نہیں چاہیں گے۔“
”میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”زندہ تب نہیں چھوڑو گے جب وہ نظر آئیں

گے۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے حادثات اور تکلیفیں
وہ واقعات کودل پر نہیں لیتے ہوں گے۔“
”پلیز ڈاکٹر! مجھے مجبور نہ کریں۔“
”پلیز چائنڈ یو صاحب! میں ڈاکٹر ہوں۔ اپنا فرض
کروں گا۔ یہ دوا پلا کر جاؤں گا۔“
”میں پی نہیں سکوں گا۔“

”کوئی بات نہیں ہے کر دیں۔ مگر میرے سامنے پی لیں۔“
ڈاکٹر نے نرس سے گلاس لے کر اس کی طرف بڑھا
دیا۔ وہ گلاس ڈاکٹر کے ہاتھوں سے سامنے آیا تھا۔ وہ مزید
انکار نہ کر سکا۔ اسے لے کر پینے سے پہلے ہچکچانے لگا۔ ڈاکٹر
نے کہا۔ ”وہ زندہ ہے۔ آپ کی زندگی جا بھتی ہے۔“
محبوب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سر ہلا کر
بولا۔ ”یہ جام اس کے نام کرو اور پیو۔“

دل کی گہرائیوں سے ماروی کا نام نکلا۔ اس نے گلاس
ہونٹوں سے لگا لیا۔ گھونٹ گھونٹ ماروی کو حلق سے اتار لے
لگا۔ ڈاکٹر پلٹ کر دروازے تک گیا پھر وہاں رک گیا۔ اسے
دیکھ کر بولا۔ ”ماشاء اللہ آپ ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔“

وہ دروازے سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل
ہو گیا۔ اس نے آدھا گلاس پی کر اسے ٹرے میں رکھ
دیا۔ نرس ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔ اب تو تنہائی ہوگی اور اس کی
جستجو ہوگی کہ وہ کہاں ہے؟ جہاں بھی ہوگی زندہ ہوگی تو ابھی
ضرور واپس آئے گی۔

دروازہ کھلا وہ آگئی مگر وہ سمیرا تھی۔ اس کے پیچھے
معروف چلی تھا۔ اس نے اندر آ کر اس کے شانے پر محبت
اور ہمدردی سے ہاتھ رکھا۔ ”ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ
حالات یوں بھی ہوں گے۔ مصیبت اس بیچاری پر آئے گی
اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

وہ اس کے قریب بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے
بولا۔ ”تمہیں حوصلے سے جینا ہوگا۔ میں نے اپنے
ڈیپارٹمنٹ کے عہدیداروں کو حکم دیا ہے کہ وہ آج ہی سے
تمام پریس اور الیکٹرونک میڈیا پر اس کی تلاش کی خبر جاری
کرا دی ہے کہ جو اسے تلاش کر کے لائے گا اسے دس لاکھ
روپے انعام میں دیئے جائیں گے۔“

اس نے معروف پر ایک نظر ڈالی۔ پھر سر جھکا کر کہا۔
”شکریہ! آپ میری بہتری کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے
ہیں جو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔“

معروف اور سمیرا نے ایک دوسرے کو چور نظروں
سے دیکھا۔ وہ انجانے میں درست کہہ رہا تھا۔

ہوتا۔ جب اسے ماروی کی ہلاکت کا یقین ہوگا تو وہ کچھ زیادہ
ہی جنون میں مبتلا ہوگا لیکن وہ کچھ دنوں تک مانتی حالت میں
رہے گا۔ پھر خدا نے چاہا تو جلد ہی نارمل ہو جائے گا۔“
”آپ کہاں ہیں؟“

”ہائی وے پر ہوں۔ اسے ابھی رخصت کیا ہے۔ اس
لڑکی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ خدا اسے اپنے حفظ و امان
میں رکھے۔ اوکے میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“
اس نے فون بند کر دیا۔ اسے پہلی بار ولی اطمینان
حاصل ہو رہا تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے شہر کی طرف
جانے لگا۔

☆☆☆
اسے سکون آور دوا میں دی گئی تھیں۔ لیکن صدمہ ایسی
گہرائی میں اتر گیا تھا کہ دوا میں دیر تک موثر نہ رہیں۔ وہ
دیر تک سکون سے سو نہ سکا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ پھر یاد آنے
لگتی۔ یاد آتے ہی یہ تکلیف وہ سوال خجری طرح دل میں
اتر جاتا کہ اس محسوس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہوگا؟
اس نے مٹھیاں جھینچ لیں۔ صدمہ برداشت کرتے
ہوئے چھت کو ٹکٹے لگا۔ خود کو سمجھانے لگا۔ میرے دکھ
اٹھانے سے کیا اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا؟
کیا شیطانوں نے نیکیاں کرنے کے لیے اسے اغوا
کیا ہے؟

وہ سفید چھت کی اسکرین پر نظر آنے لگی اسے دیکھ کر
دل کہہ رہا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اب وہ مرے یا جیئے۔ نظر
آئے یا نہ آئے۔ دل سے تو کبھی نہیں جائے گی۔

دواؤں نے اس حد تک اثر کیا تھا کہ وہ جنون میں مبتلا
نہیں ہو رہا تھا۔ اسے سکون سے اور گہری سنجیدگی سے یاد کر
رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک نرس ٹرے میں پھلوں کا
جوس لے کر آئی۔ ٹرے کو سرہانے والی میز پر رکھ کر گہرا ہوا
گلاس پیش کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر دروازے
پر کھڑا تھا۔ اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”اسپتال میں جو
جھبی دوا ملے اسے کھانے پینے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ
جوس بھی ایک دوا ہے۔“

وہ بولا۔ ”سوری۔ ابھی میرے حلق سے کچھ نہیں
اُترے گا۔“

”دوا حلق سے اترتی نہیں ہے۔ اتاری جاتی
ہے۔ آپ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ آپ بزنس ٹائیکون
ہیں۔ یوں اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کس قدر ذہین ہوں

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ ایک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو ایک اسٹال کا PTCL یا سول گزٹ فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63-فیر ۱۱۱ سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

تھا۔ ”میرا ایک چھوٹا سا پرسل مشن ہے۔ ایک لڑکی ماروی کو اغوا کر کے میرے پاپا کے ایک بنگلے میں پہنچانا ہے اور اسے قیدی بنا کر رکھنا ہے۔“

خطرناک واردات کرنے والوں کے لیے وہ بہت چھوٹا سا کام تھا۔ لیکن اس کام میں وہ بڑی طرح ناکام ہوئے تھے۔ اس ناکامی نے مرینہ کو جھجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے مراد کے سبیل میں آکر پوچھا۔ ”اس شہر میں ماروی کے کتنے عاشق ہیں؟“

اس نے پوچھا۔ ”یہ کیسا سوال کر رہی ہو؟“

”جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو۔“

وہ بولا۔ ”ماروی کے عاشق نہیں ہیں دشمن ہیں اور کتنے ہیں میں نہیں جانتا۔ میں بچپن سے صرف وڈیرے حشمت جلالی اور اس کے بیٹوں کو جانتا ہوں۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”اور وہ محبوب علی چاند یو؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ عاشق ضرور ہے۔ دشمن نہیں ہے۔ اس کا سر پرست اور محافظ ہے۔“

”وہ تمہاری معشوق کو چاہتا ہے۔ تمہارا کھلا رقیب ہے اور تم اسے دشمن نہیں سمجھ رہے ہو۔ بانی گاؤ۔۔۔! تم تو آسمانی فرشتے ہو۔ زمین پر کیوں آگئے۔“

”مجھے طعنے دے رہی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ تمہارا مزاج اُکھڑا ہوا سا کیوں ہے؟“

”تمہارا بھی مزاج اُکھڑ جائے گا۔ سنو۔۔۔ ماروی کو کوئی لے گیا ہے۔ اب اسے بھول جاؤ۔“

وہ ایک دم تڑپ کر بولا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”باہر جو واردات ہو چکی ہے وہ یہاں بکواس لگے گی۔ آج نہیں تو کل تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں تو یقین سے کہتی ہوں۔ وہ تمہارا ہم شکل اسے لے گیا ہے۔“

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ماروی اسی کی چھت کے نیچے

کہا۔ ”جسے تم دل و جان سے چاہتی ہو وہ تمہارے حالات سے بے خبر ہے۔“

اسے یوں لگا کہ اس کی مسکراہٹ بجھ گئی ہے۔ وہ اس ہو گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا اسے بتادوں کہ تم ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہو اور شاید نہیں ہو۔“

اس نے بڑے دکھ سے سر اٹھایا جیسے آسمان کو دیکھ رہی ہو۔ پھر اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔

وہ سحر زدہ سا تھا۔ اس نے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ اگر میں ایب نارل ہو رہا ہوں تو مجھے ہونے دو۔“

تصویر تو ساکت ہوتی ہے۔ وہ پلک بھی نہیں جھپک رہی تھی۔ لیکن اسے بولتی ہوئی سی لگی۔ اس نے ہمدن گوش ہو کر سنا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر کہہ رہی تھی۔ ”مراد۔۔۔ ہائے مراد! اس نے وعدہ کیا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ میرے ساتھ جیے گا۔ میرے ساتھ مرے گا۔ میں دنیا سے جا چکی ہوں۔ کیا وہ میرے پیچھے آئے گا؟ کیا عاشق اپنا وعدہ نباتے ہیں؟“

جیسے محبوب کی روح اس کی طرف کھینچی جا رہی تھی۔ وہ جیسے نیند کی حالت میں بولا۔ ”میں تمہارے پیچھے آؤں گا۔ تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔ کل سے یہ دنیا خالی خالی سی لگ رہی ہے۔ نہ کہیں پھول کھل رہے ہیں۔ نہ خوشبو کا جھونکا آ رہا ہے۔ ساری خوشبوئیں سارے رنگ سارے

نظارے تم لے گئی ہو۔

تم مجھ سے بولتی رہو۔ مجھے بلاتی رہو۔ ایک بار میرا نام لو۔۔۔ محبوب! صرف ایک بار بولو میرے محبوب۔۔۔! آ جاؤ۔ خدا کی قسم ابھی چلا آؤں گا۔“ وہ بولتے بولتے رک گیا۔ بجلی چلی گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ وہ اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔

تاریکی میں نظارے جاتے ہی صدائیں رہ جاتی ہیں۔ اس کی صدا ابھری۔ ”میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“

☆☆☆

مرینہ نے ریکارڈ کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ یورپ اور ایشیا کے جن ملکوں میں بھی خاص مشن پر گئی۔ نمایاں کامیابیاں حاصل کر کے آئی تھی۔ یہ دعویٰ تھا کہ پاکستان میں برٹارڈ کی رہائی کے مشن میں کامیاب رہے گی۔ اسے مکھن کے بال کی طرح قانون کے شکنجے سے نکال کر لے جائے گی۔

اس سے پہلے وہ اپنے ذاتی معاملے میں الجھ گئی تھی۔ اپنے دونوں ساتھیوں دارا اور بہرام سے کہا

وہ ہوتے تو آتے۔ ایک کھٹے بعد میڈم روزی نے فون پر کہا۔ ”سر! وہ یمن گوتھ میں نہیں ہیں۔ رومانہ کے کمر والوں نے اور دوسرے لوگوں نے ان کی صورت بھی وہاں نہیں دیکھی ہے۔ وہ جھوٹ بول کر کہیں گئے ہیں۔“

محبوب نے کہا۔ ”کہیں جانے کے لیے ان پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھی۔ پھر وہ جھوٹ بول کر کیوں گئے؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں سر! وہ صبح یہاں سے گئے تھے۔ اب شام ہو چکی ہے۔ پتا نہیں کب آئیں گے۔ جب آئیں گے تو ان کا جھوٹ معلوم ہوگا۔“

محبوب نے ان کے جھوٹ کو اہمیت نہیں دی۔ یہ سوچا کہ ایسا ہوتا ہے آپس میں جھوٹ بولنے کی کوئی معمولی سی وجہ ہوتی ہے۔ وہ آجائیں گے۔

اس نے آدھی رات کو فون کیا۔ وہ واپس نہیں آئے تھے۔ تب ذرا تشویش ہوئی تھی کہ وہ بوڑھے کوٹھی کا عیش و آرام چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں؟

دوسرے دن یقین ہو گیا کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ اپنے لیے کوئی دوسری جگہ بنائی ہے۔ اسے یہ بات عجیب سی لگی کہ جس دن ماروی کو اغوا کیا گیا، اسی دن وہ دونوں بھی کہیں چلے گئے جبکہ کوٹھی میں آرام اور سلامتی سے تھے۔ اسے فی الحال یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے مطابق گئے ہیں۔

ماروی کا غم بھاری تھا۔ اس نے ان بوڑھوں کی گم شدگی کو اہمیت نہیں دی۔ اس کا ذہن مراد کی طرف گیا۔ اس نے سوچا۔ ”وہ ماروی کی بد نصیبی سے بے خبر ہے۔ کتنے سکون سے ہوگا۔“

اچھا ہے جدائی کا صدمہ نہ اٹھائے جب تک رہائی نہ ملے اس سے کبھی ملنے کی امید میں اس کے سنے دیکھتا رہے۔ لیکن کب تک؟ وہ سوچے گا کہ میں ماروی سے اس کی بات کیوں نہیں کر رہا ہوں؟ اب ماروی نہیں ہے۔ میں اس سے ملنے جاؤں گا تو کیا کہوں گا۔ اس سے حقیقت چھپائی نہیں جاسکے گی۔ اس کے سامنے سچ بولنا ہی ہوگا۔ کیا اسے ابھی حقیقت بتادی جائے۔

ورنہ بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہوگی۔ وہ مجھ پر شبہ کرے گا کہ میں نے ماروی کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے۔ اسی لیے نہ اس سے جیل میں ملنے آتی ہے اور نہ ہی فون پر بات کرتی ہے۔ لہذا دانش مندی یہ ہے کہ اسے ابھی معلوم ہو جائے۔“

اسکرین پر ماروی زیر لب مسکرا رہی تھی۔ اس نے

رہی تھی۔ میری یہ بات تمہارے خیال کے مطابق ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے مجھے ایب نارل یا اور کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔“

سمیرا اور معروف نے مزید بحث نہیں کی۔ جلد ہی اسے یقین ہونے والا تھا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ سمیرا نے کوٹھی میں پہنچ کر کہا۔ ”جب تک آپ کا صدمہ کم نہیں ہوگا۔ تب تک اجازت دیں میں یہاں رہنا چاہوں گی۔“

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”صدمہ عمر بھر کم نہیں ہوگا۔ تم کب تک ایک چھت کے نیچے میرے ساتھ رہو گی؟ ایک تو ساتھ نہ رہتے ہوئے بدنامیاں اٹھا کر چلی گئی۔ کیا تمہاری بھی بدنامی کا سبب بننا رہا ہے؟“

معروف نے کہا۔ ”ہم تمہیں یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ اچانک جذباتی اور جنونی ہو جاتے ہو۔“

”یہاں میری دیکھ بھال کے لیے تین ملازم ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

سمیرا اور معروف سمجھ رہے تھے کہ ابھی وہ کسی کی نہیں مانے گا۔ رفتہ رفتہ موجودہ حالات سے سمجھوتا کرے گا۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔

وہ اس وسیع و عریض کوٹھی کی چار دیواری میں تنہا رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ خواب گاہ کے بڑے سے نی وی اسکرین پر وہ آتی تھی اور اس کا دل بہلاتی رہتی تھی۔ اس بار اس نے اسکرین پر اسے دیکھا تو صدمے سے دل تھام کر رہ گیا۔ وہ نگاہوں کے سامنے تھی۔ شاید دنیا میں نہیں تھی۔ اغوا کرنے والوں نے اس کا فون چھینک دیا ہوگا۔ کہیں سے بھی اس کے وجود کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اسے اسکرین پر دیکھتے دیکھتے وہ اچانک ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ چاچی چاچا یاد آ گئے۔ وہ بیچارے غم زدہ ہوں گے۔ وہ ماروی کے بارے میں بتا سکیں گے۔ اس نے فوراً ہی فون پر میڈم روزی کے نمبر شیخ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ ”یس سر!“

اس نے کہا۔ ”چاچی جنتی سے بات کراؤ۔“

”چاچی اور چاچا نہیں ہیں۔ وہ صبح آٹھ بجے یمن گوتھ کسی سے ملنے گئے تھے۔ اب تک نہیں آئے ہیں اور ہاں سر وہ اپنے ساتھ پانچ لاکھ روپے بھی لے گئے ہیں۔“

”ہاں ہو سکتا ہے وہاں انہیں ان کی ضرورت ہو کر کیا وہ جانتے ہیں کہ ماروی کے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟“

”نوسر۔۔۔ یہ واقعہ ان کے علم میں نہیں ہے۔“

”ابھی ایک ملازم کو ان کے پاس یمن گوتھ بھیج دو۔ کوٹھی میں آئیں تو مجھ سے بات کراؤ۔“

”یس سر! ان کے آتے ہی بات کراؤں گی۔“

رہتی ہے۔ وہ اسے اور کہاں لے جائے گا۔
 ”وہ اس سے راضی نہیں ہو رہی ہوگی۔ اب اسے
 کہیں قیدی بنا کر اس پر جبر کر رہا ہوگا۔“
 ”میں نہیں مانتا۔“

”مان جاؤ گے جب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اتنا
 تو جانتے ہو کہ جس عورت سے زور زبردستی کی جاتی ہے اسے
 بیان دینے کے لیے زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔“

مراد نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”تم نے
 میرا سکون برباد کر دیا ہے۔ جب تک ماروی کی خیریت معلوم
 نہیں ہوگی میں کرب میں مبتلا رہوں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔ اپنے
 پاپا سے بولو کہ چائڈ یو صاحب سے میری بات کرائیں۔ یقین
 کرو۔ ان کے ذریعے ماروی کی سچ رپورٹ ملے گی۔“

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر
 کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے رقیب کو سچا اور پارسا
 کیوں سمجھتے ہو۔ بہر حال فون پر تم سے بات کراؤں گی۔ میں
 بھی سنوں گی کہ وہ کیا جانتا ہے اور کیا کہتا ہے؟“

وہ اپنے باپ سے ملنے چلی گئی۔ وہ بے چینی سے ٹپکتے
 ہوئے سوچنے لگا۔ ”میری ماروی کچھ نہیں اہوا ہے۔ وہ مجھے
 پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ جیل میں یہ آخری ملاقات ہے۔ وہ سائیں
 محبوب کے احسانات سے دور چلی جائے گی۔ مجھے پریشان
 نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق گئی ہے۔“

دوسری بات ذہن میں آئی کہ وہ خود نہیں گئی
 ہے۔ مرینہ کہہ رہی تھی کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور پتا نہیں
 کیوں وہ اس کے اغوا ہونے پر جھنجھلائی ہوئی تھی؟

مجھے یوں لگ رہا ہے کہ ماروی کے اغوا ہونے سے
 مرینہ کو نقصان پہنچا ہے۔ یہ جو چاہتی تھی وہ نہیں ہوا۔ کچھ اور
 ہو گیا ہے۔

وہ آدھے گھنٹے بعد اپنے جیلر باپ کے ساتھ آگئی۔ وہ
 غصہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ محبوب سے مراد کی بات نہیں کرانا
 چاہتا تھا۔ لیکن بیٹی ایک پیار کرتی تھی تو باپ پھیل جاتا تھا۔

وہ اپنا فون نکال کر بولا۔ ”کان کھول کر سن لو۔ اس
 کے بعد پھر کبھی بات نہیں کراؤں گا۔“

”میں پھر کبھی پریشان نہیں کروں گی۔“

”میں سیل کا دروازہ نہیں کھولوں گا۔“

”یہ کھولیں صرف بات کرا دیں۔“

اس نے نمبر سچ کر کے فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہوا

اور جواب ملا۔ ”جی ہاں۔ دلاور صاحب! ابھی میں آپ

سے بات کرنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا۔“

”مجھ سے بامراد سے؟“

”مراد سے لیکن پہلے تو آپ سے رابطہ ہوتا ہے۔“

ابھی اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

”یہ لیں بات کریں۔“

اس نے فون مراد کی طرف بڑھایا۔ مرینہ نے اسے

لپک لیا۔ اس کے وائڈ اسپیکر کو آن کیا پھر اسے سلاخوں کے

درمیان سے گزار دیا۔ مراد نے اسے کان سے لگا کر

کہا۔ ”سائیں! میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ یہ میں کیسی خبر

سن رہا ہوں۔ خدا کے لیے صرف اتنا کہہ دیں کہ ماروی

خیریت سے ہے۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ اتنا ہی جواب کافی

تھا۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ”میں کیا سمجھوں؟“

محبوب نے کہا۔ ”میں کیا بولوں؟ اگرچہ یہ سچ ہے مگر

یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ ہم سے چھین لی گئی ہے؟“

مراد پر جیسے سکتا طاری ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک کچھ

بول نہ سکا۔ محبوب بول رہا تھا۔ ”میں اسے ڈھونڈ نکالنے کی

ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ میں اسے

کہاں ڈھونڈوں۔ آج دوسرا دن ہے اور اس کا کوئی سراغ

نہیں مل رہا ہے۔“

”چاچی اور چاچا کہاں ہیں؟“

”وہ پتا نہیں اچانک کونسی چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں۔“

مراد کے دھڑکنے ہوئے دل نے کہا۔ ”پھر تو ماروی

خیریت سے ہے۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق چاچی اور

چاچا کے ساتھ گئی ہے۔ میں ناحق پریشان ہو رہا ہوں۔“

اس نے فون پر کہا۔ ”ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں

کے ساتھ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہو۔“

”نہیں مراد! تین گن مین منہ پر ڈھانٹا باندھ کر آئے

تھے۔ وہاں کے لوگوں نے بتایا ہے۔ وہ ماروی کو گن

پوائنٹ پر لے گئے تھے۔“

مراد کا اطمینان پھر غارت ہو گیا۔ اسے واقعی اغوا کیا

گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی پلاننگ کے مطابق نہیں گئی

تھی۔ اس نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”وہ ذلیل ڈھیر

اسے لے گیا ہے۔“

”میں بھی یہی کہتا ہوں۔ وہی ایک دشمن ہے۔ فی

الحال میری معلومات کے مطابق وہ تینوں باپ بیٹے اسی

میں ہیں۔ انہوں نے ماروی کو بیٹیں کہیں چھپایا

ہوگا۔ میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ان کی زمینوں میں کئی خفیہ اڈے

ماروی

عیاشی کے لیے شکار گاہیں ہیں ماروی کو وہاں چھپایا گیا
 ہوگا۔“

محبوب نے کہا۔ ”مجھے وہاں کے پتے بتاؤ۔ میں ابھی

ان تمام اڈوں پر جاؤں گا۔“

فون کے وائڈ اسپیکر سے ابھرنے والی باتیں مرینہ

سن رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مراد کو منع کیا۔ مراد نے

فون پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میری بات مانو۔ اس کے خفیہ اڈوں کے

پتے نہ بتاؤ۔ میں وہاں جاؤں گی۔“

وہ بولا۔ ”سائیں اس کی زمین اتنی کلومیٹر تک پھیلی

ہوئی ہیں۔ جہاں خفیہ اڈے ہیں وہاں کے مقامات کے نہ

کوئی نام ہیں نہ کسی جگہ کی کوئی خاص پہچان ہے۔ میں جیل

میں بیٹھ کر آپ کی رہنمائی نہیں کر سکوں گا۔ مجھے کسی طرح

یہاں سے جلدی نکالیں۔ عدالت سے جلدی فیصلہ

کرائیں۔“

عدالت سے جلدی فیصلہ کرنا محبوب کے بس کی بات

نہیں تھی۔ مراد نے اسے ٹال دیا تھا۔ مرینہ نے ہاتھ بڑھا

کر فون کو اس کے ہاتھ سے لیا پھر اسے بند کر دیا۔ باپ نے

اپنا فون لیتے ہوئے پوچھا۔ ”تم اس کے معاملے میں دلچسپی

کیوں لے رہی ہو؟ کیا ماروی کو تلاش کرنے و ڈیرے کی

زمینوں پر جاؤ گی؟“

”میں یہ کنفرم کرنا چاہتی ہوں کہ وہ اس دنیا میں نہیں

ہے۔ وہاں جا کر اسے تلاش کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔

میرے پاس گاڑیاں ہوں گی۔ کارندے ہوں گے۔ ایک یا دو

ڈنوں میں اتنی کلومیٹر زمینوں کو کھنگال ڈالوں گی۔“

وہ اپنی سر پھری بیٹی سے بحث نہیں کرتا تھا۔ اتنا تو سمجھ

گیا تھا کہ وہ مراد میں ذاتی طور پر دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟

مرینہ نے مراد سے معلوم کیا کہ شہمت جلالی کی شکار

گاہیں اور عیاشی کے اڈے کہاں کہاں ہیں۔ وہ جلد سے جلد

ماروی کو اپنی قید میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن

اپنے باپ کے مسلح ملازموں کو لے کر وڈیرے کی زمینوں

پر چلی گئی۔

محبوب نے بھی دیر نہیں کی۔ اس کے دل نے کہا کہ

وہ شہمت جلالی کی زمینوں پر جا کر ماروی کو ڈھونڈ سکے

گا۔ اس نے لنگڑے جانی کی ایک ٹیم کو وہاں روانہ کیا پھر

حماد صدیقی اور اس کے دو جاسوسوں کے ساتھ خود ادھر

روانہ ہو گیا۔

شہمت جلالی کو خبر ملی کہ شہر کے لوگ اس کی زمینوں پر

آئے ہوئے ہیں اور ماروی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وہ
 دوڑا ہوا شہر سے گوٹھ میں آیا۔ حماد صدیقی نے کہا۔ ”تم سے
 تو صرف مقدمے کی باتیں ہوں گی۔ تم نے نہ جانے کس
 بیچاری کو قتل کرایا تھا۔ اس مقتولہ کو اپنی بیٹی زلیخا ثابت کرنا
 چاہتے ہو۔ دو روز بعد عدالت میں پیشی ہے۔ تم اس کا چہرہ
 بگاڑ کر اسے زلیخا ثابت نہیں کر سکو گے اور نہ ہم ثابت ہونے
 دیں گے۔“

شہمت نے کہا۔ ”دو روز بعد عدالت میں دیکھا
 جائے گا۔ ابھی آپ ہماری زمینوں پر کیوں آئے ہیں؟“

”صرف میں ہی نہیں محبوب علی چانڈیو صاحب اور
 اسکاٹ لینڈ یارڈ کی اسٹیشن جس سے تعلق رکھنے والی مرینہ دلاور
 بھی یہاں موجود ہے اور وہ ماروی کو تلاش کر رہے ہیں۔“

”ساری زندگی تلاش کرتے رہیں۔ وہ نہیں ملے
 گی۔ کیونکہ میں نے اسے اغوا نہیں کرایا ہے اور نہ کہیں چھپا
 کر رکھا ہے۔“

مرینہ اور محبوب اس وڈیرے کی زمینوں پر اسے
 تلاش کر رہے تھے۔ وہاں جتنے بھی کچے پکے مکانات تھے
 ان میں گھس کر دیکھ رہے تھے۔ ایسی ہی ایک جگہ مرینہ اور

محبوب کا سامنا ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر بولی۔ ”اچھا تو تم ماروی
 کو ڈھونڈنے آئے ہو؟“

محبوب نے پوچھا۔ ”اور تم کس لیے آئی ہو؟“

”ہاں وہی ایک لڑکی معنابین گئی ہے۔ نہ تم کو نہ مراد کو
 یقین ہو رہا ہے کہ اسے اغوا کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا ہے
 اور اس کی لاش کہیں پھینک دی گئی ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”یقین تو ہونا چاہیے کہ اب وہ اس
 دنیا میں نہیں رہی ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا۔“

”یہاں ہم ناکام ہو چکے ہیں۔ ماروی کو زندہ یا مردہ
 نہ پائیں گے۔ اب تو عاشقوں کو مان لینا چاہیے کہ وہ مر چکی
 ہے۔ لیکن وہ ادھر جیل میں آہیں بھر رہا ہے۔ وہ بھی نہیں
 مانے گا۔“

”جس روز اس کی ہلاکت کا ثبوت ملے گا۔ اس روز
 میں جان سے گزر جاؤں گا۔“

مرینہ نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر کہا۔
 ”مراد کہتا ہے ماروی اس کی جان ہے لیکن تم بھی اس پر جان
 دیتے ہو۔“

”اور کیا کروں گا؟ بس ایک جان رہ گئی ہے۔ وہ نہیں
 رہے گی تو جان بھی دے دوں گا۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”سنائے ارب پتی بزنس مین ہو

کی تصدیق ہوگی تو میں اس کے پاس پہنچنے کے لیے جان کیسے دوں گا؟

خودکشی حرام ہے اور میں اس کے بغیر جی نہیں سکوں گا۔ تم میری مشکل آسان کر رہی ہو۔ اب میں مراد کو زندگی دینے کے لیے پھانسی پاؤں گا تو یہ نیکی ہوگی۔

وہ اسے حیرانی سے دیکھے جا رہی تھی۔ بہت ہی متاثر ہو کر بولی۔ ”بائی گاڈ...! آج آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ عاشق کیسے دیوانے اور پاگل ہوتے ہیں۔“

وہ صوفہ کے پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”تمہاری پلاننگ میرے حالات اور میری سوچ کے مطابق ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ تم اور تمہارے پاپا مجھے جبراً وہاں سے نہیں نکال سکیں گے۔ نکالنا چاہیں گے تو میں بھید کھول دوں گا کہ میں مراد نہیں محبوب ہوں پھر تمہارے باپ کی ملازمت بھی جائے گی اور اسے سنگین سزا بھی ملے گی۔“

”تم جیل سے واپس کیوں نہیں آنا چاہو گے؟“

”ماروی زندہ سلامت رہے گی تو وہاں سے آ جاؤں گا۔ ورنہ نکالے نہیں نکلوں گا۔“

مرینہ گم صدم سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اندر سے بہت خوش تھی۔ اس کی پلاننگ یہی تھی کہ محبوب کو جیل میں پہنچا کر مراد کو باہر لے آئے پھر اسے واپس نہ جانے دے۔

اب وہ خود ہی یہ کہہ کر آسانی پیدا کر رہا تھا کہ ماروی کی موت کا یقین ہوگا تو وہ مراد کی جگہ پیار کا وعدہ بنا ہے گا۔ یہ وعدہ یہ قسم مراد اور ماروی کی تھی کہ ”ہم جیل میں گے ایک ساتھ اور میں گے ایک ساتھ۔“ اب محبوب کہہ رہا تھا کہ وہ مراد کی جگہ آ کر قسم پوری کرے گا۔

مرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ہماری دنیا میں عاشق سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہوتا۔ اس احمق نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ میں مراد کو جیل کی چار دیواری میں واپس نہیں آنے دوں گی۔ اپنی مرادیں پوری کرتی رہوں گی۔ یہ پاگل عاشق مراد بن کر اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں گزارے گا۔“

☆☆☆

قیدی کو بدل دینا۔ ایک کی جگہ دوسرے کو لے آنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ ایسے اقدامات سے پہلے ہر پہلو سے محتاط رہنا لازمی تھا۔ مرینہ نے مراد کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے دو دونوں کے لیے جیل سے باہر لے جائے گی اور اس کی جگہ محبوب دو دونوں تک وہاں رہے گا۔

اس نے اپنی پلاننگ کے مطابق مراد سے کہا تھا کہ وہ

”واہ کیا عاشقی ہے؟ میں پاکستان آ کر عجب پیار کرنے والوں کو دیکھ رہی ہوں۔“

پھر وہ محبوب کی طرف جھک کر بولی۔ ”میں مراد کو جیل سے باہر لاسکتی ہوں۔ ہم اسے آزما سکتے ہیں کہ وہ رہائی پا کر ماروی کو ڈھونڈ کر لاسکے گا یا نہیں؟“

اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا تم اسے باہر لاسکتی ہو؟“

”اگر تم میرا ساتھ دو گے تو ناممکن کو ممکن بنا دوں گی۔“

”میں جی جان سے ساتھ دوں گا۔ بولو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”تمہیں اس کی جگہ جیل میں رہنا ہوگا۔“

محبوب نے چونک کر اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”مراد سے کہا جائے گا کہ وہ جلد سے جلد دونوں میں اسے ڈھونڈ کر لے آئے۔ ناکامی کی صورت میں بھی واپس آ جائے۔ تم صرف دو یا چار دن جیل میں گزارو گے۔“

وہ سوچنے لگا۔ وہ قیدی بن کر رہنے کی بات پر پریشان نہیں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاپا کو اور جیل کے اندر اہم عہدیداروں کو معلوم ہوگا کہ قیدی بدل گیا ہے؟“

”کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔ صرف پاپا ہمارے رازدار ہوں گے۔ میں اس بات کی ضمانت لیتی ہوں کہ مراد دو دنوں میں یا زیادہ سے زیادہ چار دنوں میں لوٹ آئے گا۔“

”تم اس کی ضمانت نہ لو تب بھی میں جانتا ہوں۔ وہ شریف آدمی ہے۔ وعدے کے مطابق واپس آئے گا لیکن...“

اس نے بات ادھوری چھوڑی۔ مرینہ نے کہا۔ ”ہاں بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ دل گرفتہ سا ہو کر بولا۔ ”اگر ماروی نہ ملی تو یقین ہو جائے گا کہ وہ مرچکی ہے۔“

”ہاں تب یقین ہو جائے گا۔“

”اور تب میں جیل سے باہر نہیں آؤں گا۔“

مرینہ نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”وہ جان سے گئی ہے۔ میں بھی زلیخا کا قاتل بن کر پھانسی پر چڑھ جاؤں گا۔ اس کے بغیر نہیں جیوں گا۔“

مرینہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”میں اس اُجھن میں تھا کہ ماروی کی موت

ہے؟ کیا مراد اور ماروی کے درمیان کوئی راز ہوگا؟“

انہوں نے اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہو۔ کسی وجہ سے نہیں نہ بتاتے ہوں۔ اگر مراد کو جیل سے باہر جانے کا موقع ملے تو وہ اس جگہ ضرور جائے گا جو ان کے پیار کی پناہ گاہ ہوگی۔“

مرینہ کی یہ باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ پیار کرنے والوں کے لیے وہ جگہ اہم ہوتی ہے جہاں وہ پہلی بار پیار کی قسمیں کھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسی کسی جگہ انہوں نے ملنے کی قسم کھائی ہو اور ماروی اسی جگہ چھپ کر اس کا انتظار کرتے رہنے کے لیے گئی ہو۔

محبوب کے دل میں ایک اہم بات نکلی ہوئی تھی کہ جس دن ماروی کو اغوا کیا گیا اسی دن چاچی اور چاچا بھی گم ہو گئے تھے۔ دل کہہ رہا تھا کہ انہوں نے ماروی کو چھپایا ہے اور وہ خود چاہتی تھی کہ بدنامیوں سے دور چلی جائے اور کسی جا کرنے سے نیک نامی کے ساتھ زندگی گزارے۔

اگرچہ یہ کہا گیا تھا کہ تین بددوق بردار دشمنوں نے اسے اغوا کیا تھا۔ تاہم خوش خیالی کہتی تھی کہ ماروی بدنامیوں سے گھبرا کر گئی ہے۔ کوئی بددوق بردار نہیں تھا۔ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا ہے۔ اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔

اس کی گم شدگی نے الجھا دیا تھا۔ دل کوئی ایک بات نہیں مانتا تھا۔ سبھی وہ سوچتا تھا ماروی اس دنیا میں ہے۔ سبھی شدت سے دل تڑپ کر کہتا کہ وہ اس دنیا سے جا چکی ہے۔ دوسرے دن مرینہ اس سے ملنے کے لیے کوششیں

آئی۔ محبوب نے کہا۔ ”ماروی کے بارے میں صحیح بات اس وقت معلوم ہوگی جب چاچی اور چاچا کہیں مل جائیں گے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”اور وہ پتا نہیں کہاں ہوں گے۔ مراد کہتا ہے کہ وہ انہیں ڈھونڈ نکالے گا۔“

”وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جیل سے باہر نکل کر ماروی کو تلاش کر کے لے آئے گا۔“

”وہ یقیناً ماروی اور چاچی چاچا کے بارے میں اندر کی کوئی بات جانتا ہوگا تب ہی انہیں ڈھونڈ نکالنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”جو میں سوچ رہی ہوں۔ وہی تم فرض کرو کہ وہ واقعی ماروی کو ڈھونڈ کر لے آئے تو؟“

”تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ میں اس کے برابر سونا تول کر اسے دوں گا۔“

”ماروی تو اسی کی رہے گی۔ تمہیں کیا ملے گا؟“

”ماروی کی زندگی ملے گی۔ میں اسے جیتے جاتے

ہتے بولتے دیکھوں گا۔ میرے تمام اندیشے اور صدقات

کیا اسے اتنی شدت سے چاہتے ہو کہ عزت شہرت اور دولت سب کچھ اس کی خاطر چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“

”میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آنے والا وقت بتائے گا۔“

”مجھے تمہارے معاملے سے دلچسپی ہو رہی ہے۔ یہ بتاؤ جب تمہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہی ہے تو کیا تم خودکشی کر لو گے؟“

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”خودکشی حرام ہے۔ میں سوچتا رہتا ہوں۔ کس طرح اپنی ماروی کے پاس جاؤں گا۔ ویسے ہر حال میں جاؤں گا۔ اس کے بغیر اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔“

وہ اسے سوچتی ہوئی گہری نظروں سے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”مجھے آج رات کراچی پہنچنا ہے۔“

”میں بھی واپس جا رہا ہوں۔“

”کل کسی وقت ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نے سب سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ تنہائی میں وہ میرے پاس ہوتی ہے۔ ایسے میں کوئی آجائے تو اس کی موجودگی گمراہ گزرتی ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”مانیٹر نہ کرو۔ میں ملاقات نہیں کر سکوں گا۔“

”میں ماروی کے بارے میں مختصر سی باتیں کروں گی۔ اس کے بعد چلی آؤں گی۔“

”وہ باتیں ابھی کر سکتی ہو۔“

”ابھی کچھ کہہ نہیں سکوں گی۔ کچھ باتیں دماغ میں پک رہی ہیں۔ کل ہی کہہ سکوں گی۔“

”ٹھیک ہے ماروی کی بات کرو گی تو کل دن کے دو بجے آ جا۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا تم مراد سے ملتی رہتی ہو؟“

”ہاں میں اسے پسند کرتی ہوں۔“

”نادانی کر رہی ہو۔ وہ مر جائے گا لیکن ماروی کو بھول کر تمہاری طرف مائل نہیں ہوگا۔“

”میں طوفانوں کے رخ موڑ دیتی ہوں۔ وہ تو ایک بچارا سا عاشق ہے۔ ایسا بد نصیب ہے کہ ماروی سے ملنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں اور اب تو اس کا وجود ہی نہیں رہا ہے۔“

”میری طرح اسے بھی یقین نہیں ہوگا کہ وہ مر چکی ہے۔“

”ہاں کہتا ہے۔ جیل سے باہر رہے گا تو اسے ڈھونڈ نکالے گا۔ شاید وہ جانتا ہوگا کہ وہ بھی گم ہو جائے تو کہاں ملے گی۔“

پھر اس نے محبوب سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال

رہا ہوں۔ اب میں جیل کی چار دیواری میں رہ کر دعا مانگتا رہوں گا کہ مراد کے باہر جاتے ہی ماروی زندہ سلامت نظر آجائے۔“

مرینہ مراد کے ساتھ جیل سے باہر آئی تو یہی سمجھا گیا کہ وہ محبوب علی چانڈیو کے ساتھ جارہی ہے۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک قیدی وہاں سے فرار ہو رہا ہے۔ جیل کی چار دیواری میں اس سب کا دروازہ کھلا جو قیدی نمبر سات سو سات کے لیے کھلتا تھا۔ اس وقت قیدی کا نمبر وہی تھا۔ صورت شکل بھی وہی تھی۔ فی الحال کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ قیدی بدل گیا ہے۔

☆☆☆

وہ ارب پتی سرمایہ دار زندگی میں پہلی بار ایک ایسے چھوٹے بند کمرے میں رہنے آیا تھا۔ جس کا دروازہ آہنی سلاخوں والا تھا۔ جو اس کی مرضی سے نہ کھل سکتا تھا نہ بند ہو سکتا تھا۔

سپاہی تالا لگا کر چلا گیا تو جیلر دلاور جان نے کہا۔ ”چانڈیو صاحب! آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ سچے عاشق ہیں۔ میں نے اٹھائیس برس کی ملازمت میں آپ جیسا قیدی نہیں دیکھا۔“

وہ بولا۔ ”جیسا ہم کبھی نہیں دیکھتے، ویسا تماشا تقدیر دکھا دیتی ہے۔ آپ میری ماروی کے لیے دعا کریں کہ وہ جہاں بھی ہے مراد وہاں سے اسے زندہ سلامت لے آئے۔“

”مراد دو دنوں بعد پرسوں اسی وقت واپس آئے گا۔ ضرور خوش خبری سنائے گا۔“

”خدا کرے وہ زندہ سلامت ہو اور میں یہاں سے جاؤں۔ اگر وہ نہ ملی تو میں یہاں سے باہر نہیں جاؤں گا۔“

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”بچوں جیسی باتیں نہ کریں۔ آپ دو دنوں کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ میں نے بیٹی کے کہنے پر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ میری ملازمت خطرے میں ہے۔ اگر ہم پکڑے گئے تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ”میں ایک قیدی کو فرار کرانے اور تمہیں قیدی بنانے کا مجرم کہلاؤں گا۔ پھر مجھے بھی ان سلاخوں کے پیچھے زندگی گزارنی ہوگی۔“

محبوب نے کہا۔ ”میں بھی قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قیدی بننے آیا ہوں۔ مجھے بھی عدالت سے سزا ہوگی۔“

”اسی لیے کہتا ہوں۔ چاہے کچھ ہو جائے میں آپ کو

اپنے باپ کو دھوکا دے کر دو دنوں کے وعدے پر اسے باہر لے جائے گی۔ وہ اس کے ساتھ رہے گا اور قانون کے محافظوں سے چھپ کر اپنی ماروی کو تلاش کرتا رہے گا۔

مرینہ کو یقین تھا کہ ماروی کبھی نہیں ملے گی اور اگر ملے گی تو وہ اپنی سوکن کو بڑی رازداری سے ٹھکانے لگا دے گی۔ مراد قانون کے خلاف کبھی جیل سے باہر نہ جاتا لیکن اچانک ہی ماروی کے اغوا اور اس کی گم شدگی نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس کے بغیر مقدمہ کیوں لڑے؟ جیل میں سزا کیوں کاٹے؟ کیوں نا باہر جا کر اسے تلاش کرے؟

وہ اسے تلاش کیے بغیر اس کی صورت دیکھے بغیر جیل میں سکون سے رہ نہیں سکتا تھا۔ ہاں اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ محبوب اس کی جگہ قیدی بن کر رہے گا۔ تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا۔ اپنے محسن کو کبھی اپنے حصے کی مصیبتوں میں مبتلا نہ کرتا۔ مرینہ نے اس کے مزاج کو سمجھ کر اس سے یہ بات چھپائی کہ اس کی غیر قانونی رہائی کے پیچھے وہ محسن پھر اس پر احسان کر رہا ہے۔ اس کی جگہ قاتل بن کر مقدمہ بھگتنے والا ہے۔ محبوب بھی یہی چاہتا تھا کہ مراد اصل پلاننگ سے بے خبر رہے۔

محبوب نے جیل میں جانے سے پہلے معروف تجلی کے نام ایک اتھارٹی لیٹر لکھا۔ جس کی رُو سے وہ اس کی عدم موجودگی میں کاروبار سنبھالنے والا تھا۔ پھر اس نے اپنے وکیل کے نام خط لکھا کہ وہ ایک غیر معینہ مدت کے لیے گوشہ نشین ہونے جا رہا ہے اس دوران میں وہ فون کے ذریعہ بھی کسی سے رابطہ نہیں رکھے گا۔ بہتر ہے کہ اس کی واپسی تک اسے تلاش نہ کیا جائے۔

اس نے دوسرے دن دوپہر ایک بجے جیل میں آکر مرینہ اور جیلر سے ملاقات کی۔ جیلر اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اس نے لباس تبدیل کیا۔ ایک قیدی کا لباس پہن لیا۔ اب جیل کا پورا عملہ اسے دیکھ کر کسی شک و شبہ کے بغیر یہی کہتا کہ وہ قیدی نمبر سات سو سات مراد علی منگی ہے۔ دوسرے کمرے میں مراد کے تن سے قیدی کا لباس اتر گیا۔ اس نے شلوار قمیض پہن لی۔ وہ باہر جا کر محبوب علی چانڈیو بن کر رہنے والا نہیں تھا۔ اسے قانون کے محافظوں کی نظروں سے چھپ کر مراد ہی رہنا تھا۔

مرینہ نے محبوب کے پاس آکر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ۔ تم ماروی کو تلاش کرنے کے لیے ایک سنگین مشن میں ہمارا ساتھ دے رہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”شکریہ کیسا؟ میں تم لوگوں پر احسان نہیں کر

اگل سکوں گا نہ ہی نکل سکوں گا۔ تم جہاں بھی ہو ابھی مرادو لے کر یہاں آؤ۔“
دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ”آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ آپ کچھ دیر بعد کوشش کریں۔“

وہ اپنے فون کو دیکھ کر جھنجھلا گیا۔ خواہ مخواہ اتنی دیر سے بول رہا تھا۔ اس نے فون کو میز پر پھینک دیا۔ ریوا لوٹک چیم پر ادھر سے ادھر گھومنے لگا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ محبوب کی مرضی کے مطابق اسے مرادو بنا کر وہاں رکھنا ہوگا۔ ورنہ وہ بڑا... طرح قانون کے شکنجے میں آجائے گا۔

☆☆☆

مرینہ اپنے دلبر کو جیل سے نکال کر لے جانے میں کامیاب رہی تھی۔ اس وقت ایک لینڈ کروزر میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اس کا ایک ماتحت گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ دو مسیح ماتحت درمیانی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ وہ تینوں اس کے جیلر باپ کے تابعدار تھے۔

وہ سب سے پچھلی سیٹ پر مرادو کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر سے یہ ارادہ کر کے چلی تھی کہ سفر کے دوران میں اسے اپنی طرف مائل کرتی جائے گی۔

اب تک یہ دیکھتی آرہی تھی کہ وہ ماروی کے سحر میں گم رہتا ہے۔ اسی کی تلاش میں جیل سے نکلا ہے۔ اب تک مرینہ سے اتنا ہی لگاؤ تھا کہ وہ اس کا احسان مند تھا۔ لیکن اس کے حسن سے اور اس کی پرسنلٹی سے متاثر نہیں تھا۔

جب سفر شروع ہوا تو وہ دونوں کئی کلومیٹر تک ایک ہی سیٹ پر قافلہ رکھ کر بیٹھے رہے۔ مرادو نے کہا۔ ”سبکی کی طرف چلو۔ میرا دل کہتا ہے۔ ماروی وہاں ضرور ملے گی۔“

مرینہ ماروی کو ڈھونڈ نکالنے سے پہلے مرادو کو اپنا ایسا بنا لیتا چاہتی تھی۔ بعد میں ماروی تک پہنچنے سے پہلے بہرام اور دارا کے ذریعہ اسے اوپر پہنچا دینا چاہتی تھی۔

وہ بولی۔ ”ابھی ہم سبکی کی طرف نہیں جاسکیں گے۔ ادھر کے تھانے والوں سے میرے پاپا کی دوستی نہیں ہے۔ اب تک تمہارے جیل سے فرار ہونے کی خبر تمام تھانوں میں پہنچ گئی ہوگی۔ جب پاپا ہمیں اطلاع دیں گے کہ خطرہ نہیں ہے۔ تب ہم ادھر جائیں گے۔“

مرادو قائل ہو کر چپ رہا۔ مرینہ نے ماروی تک جانے کا راستہ کاٹ دیا تھا۔ بے چینی سے سوچ رہی تھی کہ اسے کس طرح اپنے قریب آنے پر مائل کرے؟ وہ مسیح تابعداروں کی موجودگی میں محل کر رہا تھا۔

دو دونوں سے زیادہ نہیں رہنے دوں گا۔“

”یہاں رہنا یا نہ رہنا میری مرضی پر ہے۔ اگر ماروی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے تو میں بھی سزائے موت پانے تک نہیں رہوں گا۔ آپ مجھے یہاں سے نہیں نکال سکیں گے۔“

”یہ کیسی فضول باتیں کر رہے ہیں؟“
”آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ میں ماروی کے پاس جانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اس کے والد کو سزائے موت سے بچا کر خود وہ سزا پا کر اس کے پاس جاؤں گا۔“

وہ پورے یقین اور اعتماد سے بول رہا تھا۔ ”اس کے پاس جانے کا یہی ایک راستہ ہے اور میں اس راستے پر آکر بیٹھ گیا ہوں۔ یہاں سے اٹھنے والا نہیں ہوں۔“

”تم بیکو اس کرتے رہو۔ میں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں۔ پرسوں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔“

وہ جانے لگا۔ محبوب نے کہا۔ ”میں چیخنا شروع کر دوں گا کہ قیدی تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اب تک جو بات راز میں ہے وہ عدالت میں پہنچے گی۔ مجھے تو مرنا ہی ہے۔ آپ کا کیا بے گا؟“

وہ جاتے جاتے رُک گیا۔ اسے گھور کر دیکھنے اور سوچنے لگا۔ اس نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ قیدی رہائی سے انکار کرے گا تو اس کی شامت آجائے گی۔

محبوب نے کہا۔ ”ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے۔ آپ مجھے یہاں مرادو بن کر رہنے دیں۔“

وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔ ”یہ بھید کبھی نہیں کھلے گا۔ آپ کی ملازمت سلامت رہے گی۔ آپ ایک قیدی کو فرار کرانے کے اور دوسرے بے قصور کو قیدی بنانے کے مجرم نہیں کہلائیں گے۔“

جیلر دل ہی دل میں یہ تسلیم کر رہا تھا کہ محبوب کوئی جاہل گنوار نہیں ہے۔ یہ جانتا ہے کہ جیل کے اندر کس طرح اپنا احتجاج اپنی فریاد ریکارڈ کرانا چاہیے۔

محبوب نے کہا۔ ”دلاور صاحب! یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مرادو میرا احسان مند ہے۔ وہ میرے خلاف یہاں کوئی بیان نہیں دے گا۔ جو میں بولوں گا وہی وہ بولے گا۔ بہتری اسی میں ہے کہ آپ بھی وہی کریں جو میں چاہتا ہوں۔“

وہ چپ چاپ سر جھکا کر سوچتا ہوا اپنے آفس میں آیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے بیٹی سے فون پر رابطہ کیا۔ وہ اس قدر الجھ گیا تھا کہ نمبر بیچ کرتے ہی بولنے لگا۔ ”مرینہ! تم کہاں ہو؟ مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ یہ محبوب علی چاند پوگلے میں ہڈی کی طرح اٹکنے والا ہے۔ نہ میں اسے

نہیں سکتی تھی۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ دس جماعتیں پڑھی ہیں۔ کیا یہ لیٹنگ بول سکتے ہو؟“
اس نے کہا۔ ”میں سمجھ لیتا ہوں۔ مگر بول نہیں پاتا ہوں۔“
وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کیا کرے؟ پھر ایک دوسرے سے کان میں بولنے کے لیے اس کے قریب ہونے کا بہانہ مل گیا۔

وہ ذرا کھسک کر اس کے قریب ہو کر کان میں بولی۔ ”کچھ ایسی باتیں ہیں کہ ہم دوسروں کے سامنے بول نہیں سکتے۔“

اسے بھی کان میں بولنے کے لیے اس کی طرف جھکنا پڑا۔ اس طرح وہ ایک دوسرے سے لگ گئے۔ مرینہ کی ایک حسرت پوری ہو گئی۔ وہ کان میں بولا۔ ”ایسی کیا بات ہے کہ ہم ان کے سامنے نہیں کر سکیں گے؟“

پھر وہ بولنے کے لیے اس کے کان سے لگی تو دانستہ اپنے چہرے کو اس کے چہرے سے لگا دیا۔ ایک آہ کے ساتھ بولی۔ ”کیوں جان بوجھ کر انجان بنتے ہو؟“

اس کی قربت ایسی تھی کہ مرادو کی رگوں میں حرارت سی دوڑ گئی۔ وہ فوراً ہی ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ مرینہ نے دیر نہیں کی اس کے ساتھ ہی کھسک کر پھر اس سے لگ گئی۔ اس نے اشارے سے سمجھایا۔ ”یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔“

وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر اشارے کی زبان سے بولی۔ ”اونہ! پرواہ نہ کرو۔ کوئی پیچھے گھوم کر نہیں دیکھے گا۔“
پھر وہ کان میں بولی۔ ”میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر تمہاری ماروی کی کھوج میں لگی ہوں۔ میری طرح اپنے دن رات کون کسی کو دیتا ہے؟“

وہ اس کے کان میں بولا۔ ”میں مانتا ہوں۔ تم نے مجھے جیل سے نکال کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ میرے ہی کام سے دن رات میرے ساتھ رہو گی۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔“

”کیا مطلب..... صرف عزت؟“
”مجھے مشکل میں نہ ڈالو۔ مجبور نہ کرو۔ میں ماروی کی محبت کی کوئی نہیں دوں گا۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ ماروی کی محبت مجھے دو؟ بس اتنا چاہتی ہوں کہ وہ نہ رہے تو مجھے پیار کرو۔ جب وہ آجائے گی تو میں خود ہی تم سے دور ہو جاؤں گی۔“

”یہ ماروی سے بے ایمانی ہوگی اور اس طرح بار بار میرے کان سے نہ لگو۔ تمہارے ہونٹ میرے چہرے کو

جھونے لگتے ہیں۔ مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔“
”میں یہی چاہتی ہوں تمہیں کچھ ہوتا رہے۔“
وہ پریشان ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ ”اس کے ساتھ کیسے رہوں گا؟ اور کتنے دن رہوں گا؟ کیا میری جو پارسائی ماروی کے لیے ہے وہ داغ دار نہیں ہوگی؟“

یہ اہم سوال تھا کہ وہ اپنی ماروی کی تلاش میں مرینہ کے ساتھ فرشتہ بن کر رہ سکے گا؟ یہ ممکن نہیں تھا۔ فرشتہ صفت رہنے کے لیے شجر ممنوعہ سے دور رہنا تھا۔ اور وہ تھی کہ اس پر مسلکنا ہوا سایہ کرنی جا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں یہ گھنٹی بجتی جا رہی تھی کہ آج کی رات خیریت سے نہیں گزرے گی۔

وہ بلوچستان کے ایک ویران علاقے میں پہنچ گئے۔ وہاں کا ایک ریست ہاؤس بھی ویران پڑا تھا۔ برسوں میں کوئی سرکاری افسر ادھر آکر کچھ دنوں کے لیے رہتا تھا۔ پھر وہ پہلے کی طرح خالی پڑا رہتا تھا۔ وہاں کا بوڑھا ملازم ادھر سے گزرنے والوں کو اس ہاؤس کے کمرے کرائے پر دیتا تھا۔ مرینہ نے کہا۔ ”رات گزارنے کے لیے یہ جگہ اچھی ہے۔“

اس نے وہ پورا ریست ہاؤس کرائے پر حاصل کر لیا۔ وہ باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ آئی تھی۔ تقریباً دو ہفتے بعد برنارڈ کو جیل سے نکال کر لے جاتا تھا۔ جس طیارے میں اسے لے جاتا تھا اسی میں مرادو کو اپنے ساتھ لے جانے والی تھی۔

پھر کہاں ماروی...؟ اور کہاں دیوانوں کا عشق لافانی؟ سات سمندر پار سے مرادو بھی واپس نہیں آسکتا تھا۔ مرادو نے کہا۔ ”میں سبکی کی طرف جاؤں گا۔ وہاں ماروی کے رشتے دار رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے وہ مجھے وہیں ملے گی۔“

مرینہ نے کہا۔ ”جب ملنے کی امید ہے تو صبر کرو۔ پہلے معلوم تو ہو کہ تمہارے جیل سے آنے کے بعد وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

وہ ایک ریوالور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ”کبھی تم نے گولی چلائی ہے؟“

”میں نے ایسی چیزوں کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔“
”اسے ہاتھ لگاؤ۔ اٹھاؤ میں تمہیں نشانہ بازی سکھاؤں گی۔ تم پہلے کی طرح ایک سیدھے سادے شریف آدمی نہیں رہے ہو۔ تم قاتل کہلا رہے ہو اور اب ایک مفرور مجرم بھی ہو۔“

”تم مجھے دو دنوں کے وعدے پر لائی ہو۔ جب واپس جاؤں گا تو کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں مفرور بن گیا تھا۔“
”دو دنوں میں ماروی نہ ملی تو اسے مزید ڈھونڈتے نہیں

تشانے پر لگیں۔ پھر وہ مرینہ کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھا۔ یہ بات دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی کہ کھانے کے بعد اسے ایک ہی کمرے میں اس کے ساتھ رات گزارنی ہے۔

دل راضی نہیں تھا۔ دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ رہ کر یہ تحریک پیدا ہو رہی تھی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ سوال پیدا ہوا بھاگ کر جائے گا تو کہاں بھٹکے گا؟ جواب تھا کہ کہیں بھی بھٹکنا رہے گا۔ گناہ سے بچنے گا تو خدا کی مدد ضرور شامل حال رہے گی۔

بنیادی تقاضا یہی تھا کہ خود کو گناہوں سے بچاؤ۔ یہ الزام نہ تو کہ ایک بار مجبور ہو کر گناہ کیا تھا تو وہی مجبوریاں بار بار گناہوں کا سبب بن رہی ہیں۔

اس نے سوچا۔ ”پھر مجبوری کیسی؟ میں مرد ہوں۔ رات کی تاریکی میں کہیں بھی نکل جاؤں گا۔ کل دن کے اجالے میں راستہ پوچھتا ہوا رہتی ناؤں پہنچ جاؤں گا۔“ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ رہتی سندھ میں نہیں بلوچستان میں ہے۔ بس اتنا جانتا تھا کہ ماروی وہیں ملے گی۔ وہ تو اڑتے ہوئے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

اس کے اندر ایسی تحریک پیدا ہوئی کہ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”بس پیٹ بھر گیا۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ شوٹنگ کروں گا۔ اپنا نشانہ لپکا کروں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”یہ ہوئی نا بات۔ اتنی لگن سے سیکھو گے تو دو ہی دن میں بہترین شوٹر بن جاؤ گے۔ بائی دا وے آدھے گھنٹے میں چلے آنا۔ میں انتظار کرتی رہوں گی۔“ وہ بولا۔ ”اور پلٹس کہاں ہیں؟“

اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بیگ میں ہیں۔ جتنے چاہو لے جاؤ۔“

وہ کمرے سے باہر آیا تو اس کی شلواری کی دونوں جیبیں پلٹس سے بھری تھیں۔ دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر وہ تینوں تابعدار روٹیاں کھانے میں مصروف تھے۔

وہ دبے قدموں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کچھ دور تک گیا۔ وہاں سے پلٹ کر ریٹ ہاؤس کی طرف دیکھا۔ باہر برآمدے میں کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا۔

بس یہی موقع تھا۔ اس نے اچانک ہی دوڑ لگائی۔ جدھر سڑک جا رہی تھی ادھر جانے لگا۔ یہ سوچ لیا تھا کہ وہ لوگ اسے تلاش کرنے گاڑی میں آئیں گے تو وہ سڑک سے دور ہو کر پہاڑی ٹیلوں کی طرف چلا جائے گا۔

وہ کمرے سے باہر برآمدے میں آ کر دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ دور مغربی کنارے پر سورج ڈوب رہا تھا۔ ڈوبتی ہوئی سرخ روشنی میں چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ سامنے ایک لمبی سڑک نہ جانے کس سمت سے آرہی تھی اور کس سمت جا رہی تھی۔

وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس سڑک پر کس سمت سے آیا تھا۔ قریب ہی لینڈ کروزر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ فرار ہونے کے معاملے میں ایسا نا کارہ تھا کہ گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں جانتا تھا۔ ان لمحات میں وہاں سے بھاگنے کے لیے اپنی اوقات کے مطابق اسے گدھا گاڑی یاد آرہی تھی۔

موجودہ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ تیز رفتار ہو جائے۔ اپنے آپ کو بدل دے۔ گاڑی ڈرائیو کرے اور بندوق کی گولیوں کی طرح دشمنوں کو چھلنی کرتا ہوا گزرتا جائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔ پھر اس کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر انگلی ٹریگر پر رکھی۔ دور خلا میں گولی چلائی چاہی۔ لیکن ٹریگر نہیں دبا۔ گولی نہیں چلی۔

وہ اسے الٹ پلٹ کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ گولی کیوں نہیں چل رہی ہے؟ ایک تابعدار اسے بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر اسے سمجھایا۔ ”یہ سیفٹی کیج ہے۔ یہ دیکھو اسے یوں ہٹانا ہوگا۔“

اس نے سیفٹی کیج کو ہٹا کر ریوالور اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ چلے گا۔“

مراد نے پوچھا۔ ”نشانہ کیسے لیتے ہیں؟“ وہ اسے اچھی طرح سمجھانے کے بعد بولا۔ ”اس درخت کے تنے کا نشانہ لو۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور کو مضبوطی سے تھام کر نشانہ لیا۔ پھر ٹریگر کو دبایا۔ قاز کی آواز کے ساتھ گولی کہیں چلی گئی۔ تابعدار نے کہا۔ ”ٹریگر کو دباتے وقت ہاتھ ذرا بھی ہلے گا تو سامنے کھڑے ہوئے ہاتھی کو بھی گولی نہیں لگے گی۔ کوشش کرو ہاتھ نہ ہلے۔“

وہ کوشش کرنے لگا۔ دوسرے تیسرے قاز کے بعد گولی درخت کے تنے میں بیوست ہو گئی۔ مرینہ اس کے پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ تالی بجاتے ہوئے بولی۔ ”شاباش! ہاتھ نہ ہلے دو۔ قاز کرتے رہو۔ نشانہ صحیح لگانا آسان ہے۔ اگر خود کو بدلنے کا اور سیکھ لینے کا ارادہ مضبوط ہو۔“

وہ ریوالور لوڈ کرنے اور نشانہ لگانے لگا۔ اس نے آدھے گھنٹے میں بیس گولیاں چلائیں۔ ان میں سے پانچ صحیح

چاہے۔ ایسا کرو مجھ سے نکاح پڑھو الو۔ پھر تو ہم گناہ گار نہیں کہلا سکیں گے۔“

وہ ٹالنے کے لیے بولا۔ ”یہاں نکاح پڑھوانے کے لیے قاضی صاحب نہیں ہیں۔ ایک وکیل اور دو گواہ بھی لازمی ہیں۔“ ”بھیڑ لگانا کوئی ضروری نہیں ہے۔ تم مجھے دل سے تسلیم کرو۔ ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کلمہ پڑھ کر ایک دوسرے کو قبول کر لیں گے۔ یہاں ہمارے تین تابعدار ہیں۔ یہ تینوں وکیل اور گواہ بن جائیں گے۔“

”نکاح بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ باقاعدہ رجسٹرڈ قاضی صاحب نکاح پڑھاتے ہیں۔“ ”مجھے ٹالنے کے لیے باتیں نہ بناؤ۔ ماروی کے مقابلہ میں میری انسلٹ نہ کرو۔“ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے۔ رات ہونے تک مجھے اپنی منکوہہ بنا لو۔ میری حیا کا تقاضا بھی یہی ہے۔“ وہ اور پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”جب میں دین کے مطابق بات مان رہی ہوں تو مجھ سے کترانے کی حماقت نہ کرنا۔ اچھی طرح سوچو اور سمجھو مجھے دشمن بنا کر تم صرف اپنی زندگی سے ہی نہیں ماروی سے بھی دشمنی کرو گے۔“

اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ کھلے ہوئے دروازے کو تکتے لگا۔ سوچنے لگا۔ ”اس سے پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ یہ دوسرے تمام معاملات میں اچھی ہے لیکن مجھے اپنی ضرورت بنا کر میرے لیے مصیبت بن رہی ہے۔“

اور میں ماروی کا حق اسے نہیں دوں گا۔ نہ اس سے نکاح پڑھاؤں گا اور گناہ گار تو ہرگز نہیں بنوں گا۔“

اس نے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر سوچا۔ ”یا اللہ...! میں کیا کروں...؟“

وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔ ”کیا کروں...؟ رات ہوگی تو کھانے کے بعد اسی کمرے میں سونے کے لیے آئے گی۔ میں کہاں جاؤں...؟“

جا بھی کہاں سکتا ہوں؟ پتا نہیں یہ کون سا علاقہ ہے؟ ہم تقریباً آٹھ گھنٹے سفر کرتے رہنے کے بعد یہاں آئے ہیں۔

پتا نہیں سکھر یہاں سے کتنی دور ہوگا۔ وہاں سے کئی کئی میٹر دور ایک جگہ ہے رہتی وہاں چاچی کی بہن رہتی ہے۔ ماروی ضرور وہاں آئی ہوگی۔

میں وہاں تک کیسے جا سکوں گا؟ مرینہ کہہ رہی تھی کہ ہم بلوچستان میں ہیں۔ یا خدا...! سندھ کس طرف ہوگا؟

رہو گے؟ کیا یہ معلوم نہیں کرو گے کہ وہ زندہ ہے بھی یا نہیں؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ قریب آ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”جیل کی چار دیواری سے نکل کر آنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میری کوششوں سے نکل آئے ہو تو ماروی کو تلاش کر کے ہی واپس جانے کی سوچو۔ دانشمندی یہی ہوگی۔“

وہ قریب آ گئی تھی۔ مراد نے اس سے کترانے کے لیے پیچھے ہٹ کر ریوالور کو اٹھا لیا پھر کہا۔ ”درست کہتی ہو۔ جب نکل آیا ہوں تو اسے تلاش کیے بغیر اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔“

”اور تب تک مفروضہ قیدی مراد کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہوگا۔“

اس نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ”تمہیں قانون کے محافظوں سے اور حشمت جلالی جیسے دشمنوں سے نمٹنا ہوگا۔ ان سے ڈر کر چھپتے رہنا بزدلی ہوگی۔ مقابلہ کرتے رہنا اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے رہنا مردانگی ہے۔ تم میرے مرد ہو۔ میں تمہاری چھپی ہوئی مردانگی کو دشمنوں کے سامنے چیلنج بنا دوں گی۔“

مراد کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تم میرے مرد ہو۔ یہ بات اس ضدی اور منہ زور حسینہ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ صرف ماروی کا ہے۔

وہ پھر اس کے پاس گئی۔ مسکرا کر بولی۔ ”یہ پہلا سبق ہے۔ مرد اچھے برے کی تمیز نہیں کرتا جہاں موقع ملتا ہے مردانگی دکھاتا ہے۔ چلو دکھاؤ۔“

وہ پریشان ہو کر پیچھے ہٹنا چاہتا تھا۔ مرینہ نے اس کا گریبان پکڑ کا اپنی طرف کھینچ لیا، وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میری تہائی کی ساسھی صرف ماروی ہے۔“

”تمہاری تہائی میں زلیخا بھی آچکی ہے۔“

”اس وقت میں مجبور ہو گیا تھا۔“

”آج بھی مجبور ہو۔ میں تمہیں چھپا کر نہ رکھوں تو تلاش کرنے والے سپاہی مفروضہ کو گولی مار دیتے ہیں۔ کیا تم ماروی کو تلاش کرنے سے پہلے حرام موت مرنا چاہتے ہو؟“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”مرینہ...! تم۔ تم صرف اور صرف ایمان کی بات سمجھو۔ میں گناہ گار بننا نہیں چاہتا۔ خدا کے لیے تم بھی اپنی شرم و حیا کو اہمیت دو۔“

وہ اسے دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی پھر بولی۔ ”تمہاری یہ بات اچھی لگ رہی ہے۔ مجھے اپنی حیا کا پاس رکھنا

یہ محبت کا جذبہ اور گناہ سے بچنے کا حوصلہ تھا کہ ایک غریب مجبور اور بے بس بن کر رہنے والا طاقتوروں کے آگے جھکنے والا پہلی بار ریوالتور لے کر اپنی ماروی کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

اچانک اسی طرح تبدیلیاں آتی ہیں۔ وہ بہت عرصہ تک ایک بے چارہ عاشق بن رہا تھا۔ اب کن پوائنٹ پر اپنے عشق کے ڈنکے بجانے والا تھا۔

مرینہ نے کھانا ختم کیا پھر پانی پیتے ہوئے سوچا۔ ”اتنی دیر ہوئی۔ مراد نے ایک بھی گولی نہیں چلائی۔ عجیب جاہل ہے پھر سیٹھی کیجھٹا بھول گیا ہوگا؟“

اس نے آواز دی۔ ”مراد کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟“ کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ مزے سے ہنستے ہوئے بولی۔ ”کیا ریوالتور نہیں چل رہا ہے؟“

وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آئی۔ برآمدہ اس کے وجود سے خالی تھا۔ اس نے ادھر ادھر دور تک دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ”کہاں ہو؟ ایسے اندھیرے میں دور کیوں گئے ہو؟ کم آن۔۔۔ لو! پس آؤ۔“

اس نے چپ ہو کر جواب کا انتظار کیا۔ پھر چیخ کر بولی۔ ”کہاں مر گئے۔۔۔؟ جواب کیوں نہیں دیتے۔۔۔؟“ وہ تینوں تابعدار فوراً ہی کھانا چھوڑ کر باہر آگئے۔ ایک نے پوچھا۔ ”کیا ہوا میڈم۔۔۔؟“

وہ بولی۔ ”مراد شوٹنگ کے لیے باہر آیا تھا۔ اسے یہاں ہونا چاہیے لیکن وہ نہیں ہے۔ کیا وہ میری آواز نہیں سن رہا ہے؟ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہا ہے؟“

یہ سنتے ہی ایک تابعدار ہجیر و میں جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اشارت کر کے ہیڈ لائٹس آن کیں پھر گاڑی کو گھما کر دور تک ہیڈ لائٹس کی روشنی پھینکنے لگا۔ باقی دو تابعدار حلق پھاڑ کر اسے آوازیں دے رہے تھے۔

مرینہ کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ وہ دور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ گاڑی ہر طرف گھوم رہی تھی۔ جہاں تک روشنی جا رہی تھی وہاں تک وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے دکھائی نہ دے“ وہ آواز تو دے سکتا ہے۔ کیا بھاگ گیا ہے؟“

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ”کیا وہ مجھے دھوکا دے کر فرار ہو گیا ہے؟ اتنی روشنی اور اتنی آوازیں کے بعد اسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔ او گاڈ! یقین نہیں آ رہا ہے کہ مجھے دھوکا دے کر اندھیری رات میں ٹھوکریں کھانے گیا ہے۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”اسے پکڑو۔ وہ دور نہیں گیا ہوگا۔“

وہ تینوں کمرے میں جا کر اپنی اپنی گتیں اور کارتوس کے بیگ لے آئے۔ مرینہ بھی مسلح ہو کر اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی ڈرائیو کرنے والے نے پوچھا۔ ”میڈم! راستہ دو طرف کیا ہے۔ وہ کدھر گیا ہوگا۔ ہمیں کس طرف جانا چاہیے۔“

وہ بولی۔ ”ہم جدھر سے آئے ہیں وہ جدھر ہی گیا ہوگا۔ چلو وہ پیدل جا رہا ہے۔ ہم اسے پکڑ لیں گے۔“

لینڈ کروزر ادھر چل پڑی۔ وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ مراد اس کے احسانات کو بھول کر کیوں اسے دھوکا دے گیا ہے؟

سیدھی سی بات سمجھ میں آئی کہ وہ ماروی کے حقوق اسے دینا نہیں چاہتا۔ اسے ماروی کی دشمن سمجھتا ہے اور یہ غلط نہیں تھا۔

مرینہ نے سوچا۔ ”وہ سمجھ گیا ہے کہ ماروی کہیں مجھے ملے گی تو میں اسے زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ لہذا ماروی تک پہنچنے سے پہلے وہ مجھے چھوڑ گیا ہے۔“

وہ جھنجھلا کر اسے گالیاں دینے لگی۔ ”ذلیل، کبیر، احسان فراموش۔ اس کی شامت آگئی ہے۔ گدھا گاڑی والا گدھے کی اولاد بیچ کر کہاں جائے گا۔ ابھی پکڑا جائے گا۔ اب میں اسے اپنا بیچ بنا کر اپنی جوتیوں میں رکھوں گی۔“

وہ غصہ سے تکتا رہی تھی۔ ڈرائیو کرنے والا گاڑی کو دائیں بائیں گھماتا جا رہا تھا تاکہ راستے کے دونوں طرف ہیڈ لائٹس کی روشنی دور تک جائے اور وہ بھاگنے والا نظر آجائے۔

وہ تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا بہت دور نکل آیا تھا۔ پھر بھی لینڈ کروزر کی رفتار سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو بہت دور سے گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ وہ سڑک سے دور دوڑتا ہوا گیا پھر ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

اس علاقہ میں ایسے کئی چھوٹے بڑے ٹیلے تھے۔ اگر وہ گاڑی سے اتر کے ان ٹیلوں کے پیچھے اسے ڈھونڈنے جاتے تو صبح ہو جاتی اور وہ ایک آدھ میل سے آگے جانے پاتے۔

وہ گاڑی ادھر سے بھی گزری جدھر ایک ٹیلے کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی وہاں سے گزرتی ہوئی چلی گئی تھی۔ تمام خاموش ٹیلے اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہے تھے۔ ”آؤ ہماری پناہ میں آنے والے کو ڈھونڈ نکالو۔“

مرینہ نے کہا۔ ”گاڑی روکو۔ ہم بہت دور آگئے ہیں۔ وہ پیدل دوڑنے والا اتنی جلدی یہاں تک نہیں آئے گا۔“ ایک نے کہا۔ ”میڈم! وہ ایسے نہیں ملے گا ہمیں ان ٹیلوں کے پیچھے جا کر ڈھونڈنا ہوگا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”دور تک اونچے نیچے ٹیلے ہیں۔ ہم یہاں ڈھونڈتے رہیں گے تو وہ دوسری طرف سے نکل جائے گا۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں یہی سوچ رہی ہوں۔ ہمیں ادھر نہیں ادھر جانے والے راستے پر جانا چاہیے۔ ہم نے ادھر آ کر غلطی کی ہے۔ فوراً گاڑی موڑو۔ ادھر چلو۔“

گاڑی نے ایک یوٹرن لیا پھر واپس ریٹ ہاؤس کی طرف جانے لگی۔ وہاں سے جو راستہ آگے گیا تھا۔ اب اس راستے پر وہ اسے تلاش کرنے جا رہے تھے۔

مراد ٹیلے کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے ہجیر و کی روشنی کو دور جا کر واپس آتے دیکھا۔ اس کی روشنی پھر اس ٹیلے پر سے گزرتی ہوئی چلی گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سوچنے لگا۔ ”اب میں مرینہ کے لیے چیخ بن گیا ہوں۔ یہ میرا بیچا نہیں چھوڑے گی۔ مجھے جلد سے جلد ریتی پہنچنا چاہیے۔ خدا کرے مرینہ وہاں میرا انتظار کر رہی ہو۔“

وہ تھوڑی دیر تک ادھر دیکھتا رہا، جدھر وہ جا رہی تھی۔ جب اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ پھر سڑک کے قریب آ کر آگے جانے لگا۔ اب دوڑنا ضروری نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دوڑنے کے انداز میں تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔

وہ سڑک نہ جانے کس شہر یا کس صحرا کی سمت جا رہی تھی؟ نہ جانے انسانی آبادی وہاں سے کتنی دور تھی؟ بلا سے جتنی بھی دور ہو۔ وہ راہ عشق کا مسافر سینے میں کھلتا ہوا گلاب اور ہاتھوں میں بارود لیے چل پڑا تھا۔

☆☆☆

مرینہ نے مراد کو اپنا یار دلدار بنائے رکھنے کے لیے بہت دور تک سوچا تھا۔ ارادہ تھا کہ جب برنارڈ کو جیل سے نکال کر پرائیویٹ طیارے سے لندن لے جائے گی تو یوں اسے قتل کے مقدمے سے اور قانون کے شکنجے سے دور لے جائے گی۔ مراد بھی مفروضہ کہلانے کے بعد اس کے رحم و کرم پر رہا کرے گا۔ اسے چھوڑ کر کہیں جانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن سر منڈاتے ہی اگلے پڑنے کے مصداق مراد نے جیل سے نکلنے ہی لال جھنڈی دکھا دی تھی۔ مرینہ کو اپنے ساتھ آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

وہ آدھی رات تک اسے تلاش کرتی رہی۔ ہجیر و میں ادھر سے ادھر دوڑتی رہی۔ وہاں سے پچاس کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا ٹاؤن تھا۔ وہاں پہنچ کر تھانیدار کو اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا تو اس نے مرعوب ہو کر سیلیوٹ کیا۔ تھانے کے تمام

سپاہی دوڑتے ہوئے ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔ مرینہ نے کہا۔ ”میں ایک مجرم کی تلاش میں آئی ہوں۔ وہ اسی طرف آیا ہے۔ اسے یہاں کی ہر گھر میں تلاش کیا جائے۔“

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس رات بستی والوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ سپاہی ہر گھر میں گھس کر مفروضہ مجرم کو تلاش کر رہے تھے۔ لیکن مراد پوری نہیں ہو رہی تھی۔ کسی گھر سے وہ نامراد برآمد نہیں ہو رہا تھا۔

وہ جھنجھلا رہی تھی۔ قسمیں کھا رہی تھی کہ وہ مل جائے گا تو اسے کتے کی طرح باندھ کر رکھے گی۔ یہ یقین تھا کہ آج نہیں تو کل اسے ڈھونڈ نکالے گی۔ اس نے اپنے جیلر باپ سے فون پر رابطہ کیا۔ وہ ادھر سے چیخ کر بولا۔ ”تم کہاں مر گئی ہو؟ کئی بار تم سے رابطہ کرنا چاہا۔ لیکن تم نے فون کا سوئچ آف رکھا تھا۔“

وہ بولی۔ ”میں اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے کوئی کال انیڈ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی ایسا دھوکا کھا رہی ہوں جس کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔“

”کیسا دھوکا؟ اب نئی بات کیا ہو گئی ہے؟“

”مراد مجھے دھوکا دے کر کہیں چلا گیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں رات آٹھ بجے سے تلاش کر رہی ہوں۔ اس وقت ایک بیچ رہا ہے۔ میں نے تقریباً پچاس کلومیٹر تک پورا علاقہ چھان مارا ہے۔ وہ کتا معلوم نہیں کہاں مرنے چلا گیا ہے۔“

”وہ مرے گا واپس نہیں آئے گا تو جانتی ہو میرے پیچھے برس کا سروس کیمریز خاک ہو جائے گا۔ ایک قیدی کو فرار کرانے کے جرم میں سخت سزا بھی ہوگی اور ملازمت بھی جائے گی۔“

”آپ کو کچھ نہیں ہوگا وہاں محبوب اس کی جگہ ہے۔ وہ باؤلا عاشق یہ دل میں عہد کر کے گیا ہے کہ ماروی زندہ نہیں ہوگی تو وہ مراد بن کر سزائے موت پا کر اپنی معشوقہ سے جا ملے گا۔ ایسے احمق عاشق نصیب سے ہمیں ملے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ ہم یہ قیدی بدلنے والا راز کب تک چھپا سکیں گے؟ راز کھلے گا تو میری شامت آجائے گی۔“

”میں نے کہا نا۔۔۔ محبوب خود یہ بھید کھلتے نہیں دے گا۔ وہ پاگل کا بیچہ وہاں پھانسی پانے کے لیے گیا ہے۔ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ”کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ہی گرا پھر ذرا تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ادھر سے مسلسل فائرنگ کے شور میں کسی نے ادھر سے ایک گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا ایک ساتھی کم ہو گیا ہے۔ یہ وہی وقت تھا۔ جب مرینہ نے بیس یا بائیس کلومیٹر دور سے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں اور یہ اندازہ لگایا تھا کہ مراد ایسی اندھا دھن فائرنگ کی زد میں آ سکتا ہے۔

وہ اسے مردہ نہیں زندہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ادھر چل پڑی تھی۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر وہاں پہنچ سکتی تھی۔ گویا وہ عاشق جاننا دو اطراف سے مصیبتوں میں گھرنے والا تھا۔ اگر ڈاکوؤں سے بچتا تو مرینہ کی گرفت میں ضرور آ جاتا۔ حالات اس کے موافق نہیں تھے۔ اس کی مردانگی کو آزمایا رہے تھے کہ وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جائے گا یا مرینہ کے ہتھیرے میں پہنچے گا۔

فائرنگ کرنے والے رک گئے تھے۔ وہ گویا ہوا میں گولیاں چلا رہے تھے۔ انہیں جوابی فائرنگ کی توقع تھی۔ جبکہ ایک بھی گولی مخالف سمت سے نہیں آئی تھی۔

ایک نے کہا۔ ”وہ اکیلا ہے۔ یقیناً سہا ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس ہتھیار نہ ہوں۔“

دوسرے نے اونچی آواز میں کہا۔ ”اے! اگر تمہارے پاس ہتھیار نہیں ہے تو سامنے آ جاؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں یہاں سے زندہ جانے دیں گے۔“

وہ جواب کا انتظار کرنے لگے۔ پھر ایک نے غصہ سے کہا۔ ”یہ سالابو لٹا نہیں ہے۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اگر یہ پولیس والا ہے تو اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کی خاموشی کا کوئی مطلب ضرور ہے۔“

”اے رفیق! گاڑی میں جا۔ ہیڈ لائٹس آن کر۔ یہ سالاروشنی میں چھپ نہیں سکے گا۔ ابھی سامنے آئے گا۔“

جس کا نام رفیق تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ”بھیرو“ کے پاس آیا۔ مراد پہلے ہی اس گاڑی کے پیچھے آ گیا تھا اور اسی گاڑی کے قریب پہلے ہی ایک دشمن کی لاش گرا چکا تھا۔

رفیق گاڑی میں جانے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا پھر کچھ فاصلے پر اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر چیخ پڑا۔ ”سردار! ہمارا جمالی مر گیا ہے۔ کسی نے گولی ماری ہے۔“

اس اطلاع نے دھماکا کیا تھا۔ سردار کے ساتھ دو اور ساتھی دوڑتے آ رہے تھے۔ گاڑی کے پیچھے مراد نظر آنے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی اس نے فائرنگ شروع کر دی۔

وہ قریب آنے والے ایک دم سے بوکھلا گئے۔ چھپ کر فائر کرنے کے لیے پلٹ کے بھاگنے لگے۔ مراد نے پھر گولیاں چلائیں، چار ادھر ادھر گئیں۔ دو نے کام دکھایا۔ ان کے دو کام آ گئے۔ یوں سات میں سے تین کم ہو گئے۔

جو دوسرے ٹیلے کی طرف تھے۔ انہوں نے گولیاں چلائیں۔ وہ گاڑی کے پیچھے محفوظ تھا۔ اس نے فوراً ہی زمین پر لیٹ کر دیکھا۔ گاڑی کے نیچے سے دوسری طرف دو پاؤں دکھائی دے رہے تھے ادھر سے کوئی گاڑی کی آڑ میں تھا اور اب وہ بھی جھک رہا تھا۔ وہ بھی گاڑی کے نیچے سے اس کا نشانہ لینا چاہتا تھا۔

مراد نے اسی لمحہ میں دو فائر کیے جیسا کہ اتنا ڈی پین کا تقاضا تھا ایک فائر خالی گیا۔ دوسرے نے اس کی آخری چیخ سنائی۔ پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ وہ گاڑی سے اور گھوڑوں سے دور دوسری جگہ بھاگ بنانے جا رہے تھے۔

سات میں سے تین رہ گئے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے دشمن تھے۔ اب کتنے رہ گئے ہیں اور اسے کب تک ان کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا ہوگا؟

وہ دل ہی دل میں دعا میں مانگ رہا تھا۔ ”یا اللہ...! مجھے ان دشمنوں سے نجات دے۔ مجھے میری ماروی تک پہنچا دے۔“

وہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازوں سے اندازہ کر چکا تھا کہ دشمن دوسری جگہ سے چھپ کر گولیاں چلائیں گے۔ اس نے گاڑی کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر گھوڑوں کے قریب ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس پر نوٹوں کی گڈیاں اور سونے چاندی کے زیورات دکھائی دے رہے تھے۔

وہ لوگ تھوڑی دیر پہلے مال آپس میں بانٹ رہے تھے۔ اب اس مال کے چار حصے دار کم ہو گئے تھے۔ مراد نے سوچا۔ ”یہ مال حاصل کرنے کے لیے وہ ہر حال میں ادھر آئیں گے۔ انہیں آنا تو ہوگا۔ وہ گاڑی ان کے لیے ضروری ہے۔ کیوں نہ میں انہیں یہاں آنے کا موقع دوں؟“

وہ اوندھے منہ لیٹ کر پھر اس ٹیلے کی طرف جانے لگا جہاں پہلے چھپا ہوا تھا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ مرینہ کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کا تابعدار بڑی تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ مراد پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھا۔ وہ دہرے عذاب کی طرح تازل ہونے آ رہی تھی۔

بد نصیبی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری

تیسری مصیبتیں آتی چلی جاتی ہیں اور اگر نصیب اچھے ہوں تو حالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ اچانک ہی ساری مصیبتیں نکل جاتی ہیں۔

اچانک ہی لینڈ کروزر کی تیز رفتاری کم ہونے لگی۔ ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ ”میڈم! میں نے پہلے بھی کہا تھا، ہمیں کسی پیٹرول پمپ کی طرف جانا چاہیے۔ اب ہم آگے نہیں جاسکیں گے۔ پیٹرول ختم ہو چکا ہے۔“

گاڑی آگے جا کر جھکے کھاتے کھاتے رک گئی۔ مرینہ نے دروازہ کھول کر باہر آ کر دیکھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اونچی نیچی پہاڑیاں دور تک دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے درمیان ایک پختہ سڑک آگے جا کر تاریکی میں گم ہو گئی تھی۔

وہاں سے آگے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر مراد اور ڈاکوؤں کے درمیان جنگ جاری تھی۔ ان ڈاکوؤں نے دور ہلکی سی روشنی دیکھی پھر سردار نے پریشان ہو کر کہا۔ ”گاڑی کی ہیڈ لائٹس ہیں۔ اس کا مطلب ہے اب یہ دشمن اکیلا نہیں رہے گا۔ آنے والے اس کے ساتھی ہوں گے۔“

دوسرے نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔ ورنہ اپنے ساتھیوں کی طرح ہم بھی مارے جائیں گے یا پکڑے جائیں گے۔“

تیسرے نے کہا۔ ”ہمارا مال وہاں پڑا ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ وہ تقریباً پچیس لاکھ روپے ضرور ہوں گے۔ زیورات الگ ہیں۔“

سردار نے کہا۔ ”مال تو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ بس ایک ہی صورت ہے۔ ایک ذرا ہمت کرنی ہوگی۔ ہم تینوں بیک وقت فائر کرتے ہوئے جائیں۔ اسے جوانی فائرنگ کا موقع نہ دیں اور فوراً ہی تمام مال کو سمیٹ کر گھوڑوں پر بھاگ نکلیں۔“

”گھوڑوں پر نہیں گاڑی میں جائیں گے۔“

”گاڑی کے اشارت ہونے میں وقت لگے گا۔ بحث نہ کرو۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“

دوسری طرف مراد نے بھی دور سے آنے والی روشنی دیکھی۔ مرینہ کا خیال ذہن میں آیا۔ کیا وہ پھر تلاش کرنے پلٹ کر آئی ہے۔ اب تو میں پکڑا جاؤں گا۔ مجھے یہاں سے بھاگنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔

ایسے ہی وقت تزار فائرنگ کا شور بلند ہوا۔ وہ تینوں بھیرو کی طرف فائر کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مراد وہیں چھپا ہوا ہے۔ جبکہ وہ اپنے پہلے مورچے کی

طرف آ گیا تھا۔ اب ان کے پیچھے تھا۔

اس نے بھی ایک ذرا رُک کے بغیر گولیاں چلائیں تو وہ بوکھلا گئے۔ دشمن کو آگے سمجھ رہے تھے۔ وہ پیچھے سے حملہ کر رہا تھا۔ تقریباً چھ سات گولیاں چلانے کے بعد ایک زخمی ہو کر گرا۔ باقی دو نے اپنی خیر منائی۔ مال چھوڑ کر گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگے تو تیسرا گھوڑا بھی ان کے ساتھ بھاگتا چلا گیا۔

مراد دوڑتا ہوا اس زخمی کے پاس آیا۔ وہ زمین پر پڑا تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس کے قریب ایک گن پڑی ہوئی تھی۔ مراد نے اسے اٹھا لیا پھر زخمی کے بالکل قریب ہو کر اس کا نشانہ لیا۔

وہ گڑ گڑانے لگا۔ ”مجھ پر رحم کرو مجھے نہ مارو۔“

اس کے دائیں طرف لباس لہو میں بھیگ رہا تھا۔ گولی اس کی ایک پسلی کو توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ التجا کر رہا تھا۔ ”مجھے بچا لو۔ کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ میں بچ جاؤں گا۔ میرے بچوں کی دعائیں لے لو۔“

ایسے وقت کسی سے ہمدردی کی جائے تو مہنگی پڑتی ہے۔ مراد نے گاڑی کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ”ادھر سے مرینہ آ رہی ہے۔ یہاں سے بھاگنے کے لیے گاڑی ضروری ہے۔“

اس نے زخمی سے پوچھا۔ ”گاڑی چلا سکتے ہو؟“

وہاں ہاں کہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مراد نے اسے سہارا دے کر ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچایا۔ پھر اس کی نظر چادر پر پھیلی ہوئی دولت کی طرف گئی۔ اسے دولت کی ہوس نہیں تھی۔ لیکن آگے جا کر نقد رقم کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

اس نے نوٹوں کی گڈیاں وہاں سے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈالیں پھر وہیں پیچھے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”چلو...!“

گاڑی اشارت ہو کر اونچے نیچے راستے سے گزر کر پٹی سڑک کی طرف جانے لگی۔ اسی وقت مرینہ اپنے تین تابعداروں کے ساتھ دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ سب ہاتھ اٹھا اٹھا کر آوازیں دے رہے تھے۔ ”رک جاؤ۔ ہمیں تھوڑا سا پیٹرول چاہیے۔ ہماری مدد کرو۔ پلیرز رک جاؤ۔“

مراد نے ڈرائیو کرنے والے سے کہا۔ ”ایک ذرا نہ رکتا۔ وہ دشمن ہیں۔ رفتار بڑھاؤ۔“

پھر اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ تارکی میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ مراد نے اس کی آواز سے اسے پہچان لیا تھا۔ اونچی آواز میں بولا۔ ”مرینہ! سائے کے پیچھے نہ دوڑو۔ مجھے بھول جاؤ۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

وہ مراد کی آواز سنتے ہی تڑپ گئی۔ گاڑی کے پیچھے تیزی سے دوڑتے ہوئے بولی۔ ”ہائے مراد! رُک جاؤ۔“

میرے ساتھ رہو۔ میں تمہیں دشمنوں سے اور قانون کے درندوں سے بچاؤں گی۔“

وہ اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس کی پکار سے اس کی منت و سماجت سے بہت دور ہوتا چلا گیا۔

وہ چیخ رہی تھی۔ اس کی خوشامدیں کر رہی تھی۔ آخر دوڑتے دوڑتے تھک کر رک گئی۔ ہانپتے ہوئے اسے گالیاں دینے لگی۔ قسمیں کھانے لگی کہ اس بے عزتی اور بے وفائی کا بدلہ ضرور لے گی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے تابعداروں کے ساتھ وہاں آئی جہاں چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ایک چادر پر سونے چاندی کے زیورات بکھرے ہوئے تھے۔

اس نے حیرانی سے سوچا۔ ”مراد اکیلا تھا اور تو کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ کیا اس نے تنہا ان سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کی لاشیں گرائی ہیں؟“

اس کا منہ شدید حیرانی سے کھل گیا تھا۔

☆☆☆

محبوب علی چاند یو اچانک گم ہو کر حیران پریشان کر رہا تھا۔ اس کی گم شدگی نے مسائل پیدا کر دیے تھے۔ سمیرا اور معروف بخٹی اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ جبکہ وہ کاغذ لکھ کر گیا تھا کہ اسے تلاش نہ کیا جائے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔

وہ جس حکمت عملی سے جیل میں گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں واقعی تلاش کرنے والے دھوکا کھاتے رہتے۔ جیل میں آکر اسے دیکھتے ہوئے بھی دیکھ نہ پاتے۔ جیل کی چار دیواری میں اسے مراد ہی سمجھتے رہتے۔ یہ بھی نہ سوچتے کہ وہ محبوب کو دیکھ رہے ہیں۔

معروف نے جھنجھلا کر کہا۔ ”وہ کسی شک و شبہ کے بغیر پاگل ہو چکا ہے۔ اربوں کا کاروبار مٹی میں ملانے گیا ہے اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں ہے کہ ہم اس کی عدم موجودگی میں اتنا پھیلا ہوا کاروبار کیسے سنبھالیں گے؟“

سمیرا نے کہا۔ ”کتنے افسوس کی بات ہے۔ انہوں نے ہماری محبت اور عقیدت کا صلہ بھی نہیں دیا۔ ماروی کے معاملات میں صرف میرا ہی نہیں آپ کا دل بھی توڑتے رہے۔ انہیں کچھ تو سوچنا چاہیے کہ آپ ان کے والد کے زمانے سے وفاداری کی مثالیں قائم کرتے آرہے ہیں۔ لیکن انہوں نے آپ کی بھی قدر نہیں کی۔“

وہ سمیرا کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”ہاں افسوس ہوتا ہے۔ ہمیں اس

پر غصہ بھی آتا ہے۔ مگر نہیں آنا چاہیے۔“

سمیرا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”

کچھ کہے سنے بغیر ہم دونوں کو نظر انداز کر کے گیا ہے۔ جیسا کہ ہماری کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ یہی بات ہے نا؟“

پھر وہ اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ”غصہ تم کو دو۔ تصویر کا دوسرا رخ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس پاگل کی نظروں میں ہم دونوں سب سے زیادہ اہم ہیں۔“

سمیرا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”اربوں کا کاروبار ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہم اس کے سکے نہیں ہیں۔ دور کے رشتے دار بھی نہیں ہیں اور وہ صرف اور صرف ہم پر بھروسہ کرتا ہے۔“

وہ ذرا قائل ہوئی۔ معروف نے کہا۔ ”وہ ہم سے اتنی محبت اتنی عقیدت رکھتا ہے کہ اپنے تمام بزنس کے کل اختیارات ہمارے نام لکھ دیے ہیں گویا اربوں روپے کو سیاہ و سفید بنانے کا مالک ہمیں بنا کر گیا ہے۔ ایک بات یاد رکھو وہ دیوانہ عاشق ضرور ہے۔ لیکن پاگل بزنس مین نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”بے شک وہ ہم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف ہمیں اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن ماروی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ انہوں نے ہماری محبت کی قدر نہیں کی۔ صرف ہماری صلاحیتوں اور وفاداریوں کے قدر دان ہیں۔“

”لیکن ہے۔ ہمارا قدر دان ہے۔ سماجی اعتبار سے اور ملی جذبات کے حوالے سے ایک دوسرے کی قدر کی جاتی ہے۔ ہم کاروباری حوالے سے اس کے لیے قابل قدر ہیں۔ ماروی جذباتی حوالے سے اہم ہے۔ تم اپنے دل کو سمجھاؤ۔“

وہ دوسرے صوفے پر جا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ماروی کاروباری معاملات میں بھی تم سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اسی طرح یہ سچ حقیقت ہے کہ دیوانے عاشق کی دنیا میں تم ماروی کی جگہ نہیں لے سکو گی۔“

سمیرا کی آنکھیں جھجک گئیں۔ دل کے معاملے میں سچ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ کڑوی گولی نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بڑے کرب سے بولی۔ ”وہ کہاں ہوں گے؟ مجھے ماروی کا پیار بند دیں۔ نظروں کے سامنے تو رہیں۔“

”میں نے اس کے بینک اکاؤنٹس چیک کیے ہیں۔ اس نے کسی بھی اکاؤنٹ سے ایک روپیہ بھی نہیں نکالا ہے۔ خالی ہاتھ کنگال ہو کر جانے کہاں جھنگ رہا ہوگا؟“

وہ دونوں اسے ڈھونڈ نکالنے کی ہر ممکن کوششیں کر رہے تھے۔ تمام اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعہ اس کی

تصویریں نشر کر رہے تھے۔ اسے ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے پچاس لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کر رہے تھے اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے کہیں سے پکڑ کر لے آئیں۔

”ڈھنڈورا شہر میں اور بچہ بغل میں۔“ موجودہ حالات میں یہ کہاوت درست ہو جاتی ہے کہ سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا اور بغل میں رہنے والا بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وکیل نے کہا۔ ”معروف صاحب! وہ محبوب کی شکل صورت والا جیل میں ہے۔ اس کا کیا کیا جائے۔ کل عدالت میں پیشی ہے۔ اس کا مقدمہ لڑنے والے محبوب صاحب غائب ہو گئے ہیں۔ اب آپ کیا کہتے ہیں؟“

معروف نے کہا۔ ”محبوب نے اپنے کاروبار کے کل اختیارات مجھے دیے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کے صرف کاروباری مسائل کو ہی نہیں اس کے ذاتی مسائل کو بھی حل کروں۔ اس کا مقدمہ لڑا جائے گا۔ وہ بھی نہ بھی تو واپس آئے گا۔ مجھے اپنی تمام ذمے داریاں پوری کرنی ہیں۔“

وکیل نے قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”اور وہ جو آپ مراد کو الٹا لٹکا دینا چاہتے تھے؟ اس کے لیے جناب مجھے بڑی رقم دینے والے تھے۔“

”اس معاملے کو بھول جائیں۔ بے چارہ مراد بے قصور ہے۔ اس نے محبوب سے نہیں کہا کہ وہ ماروی سے عشق کرے۔ یہ نہیں کہا کہ تمام کاروبار چھوڑ کر کہیں کنگال بن کر چلا جائے۔ محبوب سراسر غلطیاں کرتا آ رہا ہے۔ آپ اس بے چارے کو مقدمہ سے بری کرانے کی پوری کوشش کریں۔“

یہ بات وکیل کے مفادات کے خلاف تھی۔ مراد کو مزائے موت تک پہنچانے کے لیے معروف نے اسے لاکھوں روپے دینے کا وعدہ کیا تھا اور اب ان لاکھوں کی گنتی سے اسے محروم کر رہا تھا۔

وہ معروف سے شکایت نہیں کر سکتا تھا کہ رال ٹپکانے کے بعد مٹھائی پھپھارے ہو۔ وہ ان کا پرانا وکیل تھا۔ انتقاماً مراد کو الٹا لٹکا تا تو اسے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ لہذا اسے صبر کرنا پڑا۔ اس نے سوچا۔ ”بڑے لوگ ہیں۔ پھر کسی دن ارادہ مثبت سے منفی ہو سکتا ہے۔ وہ لاکھوں روپے پھر واپس آ سکتے ہیں۔“

جھپٹے دنوں وڈیرے شہمت جلالی نے اسے آفر دی تھی کہ وہ در پردہ اس کا ساتھ دے گا۔ بڑی چالبازی سے مقدمے کو کمزور بنا دے گا تو وڈیرا اسے ایک لاکھ روپے ادا کرے گا۔ اس نے انکار نہیں کیا تھا۔ اس سے سوچنے کی مہلت لی تھی۔ اب خسارے کو کم کرنے کا وقت آ گیا

تھا۔ اس نے فون پر شہمت جلالی سے کہا۔ ”سامیں آپ کا یہ خدمت گار بول رہا ہے۔ کل عدالت میں پہلی پیشی ہے۔ حکم کریں۔ بندہ حاضر ہے۔“

وہ بولا۔ ”اب کیا حکم دینا ہے۔ نہ کچھ لینا ہے نہ دینا ہے۔ اب اس مقدمہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

”وکیل صاحب! میں تو ماروی کو حاصل کرنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ کوئی بتائے وہ کہاں ہے؟ سب ہی کو یقین ہو گیا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اسے مار ڈالا ہے۔“

”اس کی موت سے مقدمے کا کیا تعلق ہے؟“

”وہی روپ متی تو فساد کی جڑ ہے۔ وہ ہم جیسے وڈیرے اور ایک صنعت کار کے درمیان چیخ بن گئی تھی۔ کوئی اسے ہار کر اپنی ناک نیچی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ حاصل ہو جاتی تو کیا آپ اس کے لیے تاج محل بنادیتے؟“

نہیں وکیل صاحب! ہم تو اس لڑکی کو جیت کر رقیب کو جو تارنا چاہتے تھے۔ لیکن ہم دونوں میں سے کسی کی حسرت پوری نہیں ہو رہی ہے۔ وہ یقیناً مر گئی ہے تب ہی محبوب پاگل ہو کر کہیں جا کر مر گیا ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں آئندہ درجنوں مارویوں کے لیے زندہ رہوں گا۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔ اسے دھچکا سا لگا۔ دوسری طرف سے ہونے والی آمدنی بھی ڈوب گئی تھی۔

اس نے دوبارہ رابطہ قائم کرتے ہی کہا۔ ”فون بند نہ کریں۔ آپ ہوا میں نہ اڑیں۔ یہ مقدمہ ختم نہیں ہوگا۔ آپ کے گلے کا پھندا بن جائے گا۔ آپ نہیں جانتے، معروف بخٹی اس عدالتی جنگ کو جاری رکھے گا اور آپ کو کاروباری کے الزام میں بیٹی کے قتل کے کیس میں الجھائے گا۔“

”ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ مراد زلیخا کو قتل کرنے کے بعد لاکھوں کے زیورات لے کر فرار ہو گیا تھا۔“

”اور ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ کھیتوں میں پائی جانے والی لاش زلیخا کی نہیں تھی۔ آپ اس مقدمہ سے اس وقت تک نہیں نکل سکیں گے جب تک میں اسے کمزور نہیں بناؤں گا۔“

شہمت جلالی سوچ میں پڑ گیا۔ وکیل نے فون بند کر دیا۔ رابعہ اپنے بیڈروم سے نکل کر ڈائننگ روم میں آئی تھی۔ وہاں اپنے وڈیرے شوہر کو فون پر باتیں کرتے دیکھ کر دروازے پر رک گئی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ

دروازے کو تھام کر سنبھل گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پچھلے کئی دنوں سے حشمت علی اس کے کھانے میں سلو پوائزن ملا رہا تھا اور اس کے دھیمے دھیمے اثر سے وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

وہ شہر میں اپنے ایک معتمد ڈاکٹر سے علاج کرا رہی تھی۔ وہ پہلے ہی بلڈ پریشر اور السر کی مریضہ تھی۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی تھی کہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بیماری اور بڑھاپے کے باعث اور کچھ فینشن میں رہنے کے باعث سر چکر جاتا ہے۔ اپنے دل سے صدمات نکال کر ہنستے بولتے رہنا چاہیے۔

بہنی کی موت کا صدمہ تھا۔ وہ دشمن شوہر اور بے غیرت بیٹوں کے سائے میں رہتی تھی۔ وہاں کوئی بات اسے ہنسانے والی اور دل بہلانے والی نہیں تھی۔

اس نے ایک قدم پیچھے ہو کر دروازے کو بند کر دیا۔ حشمت کے پاس جا کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔

پھر ڈاکٹر کی ہدایت یاد آئی کہ موجودہ دوائیں اس وقت اثر کریں گی جب السر کی مریضہ صبح وقت پر کھاتی پیتی رہے گی۔ اس نے سوچا جب وہ ڈائننگ روم تک آہی گئی ہے تو اسے زبردستی ہی سہی تھوڑا کھالینا چاہیے۔

ملازمہ کھانے کی ڈشیں رکھ کر چلی جایا کرتی تھی۔ پھر رات کا کھانا پکانے آیا کرتی تھی۔ اس وقت دونوں بیٹے کہیں کام سے گئے تھے۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے ڈائننگ روم میں جانے کے لیے دروازے کو آہستگی سے کھولا تو ایک دم سے چونک گئی۔ دیدے پھاڑ کر حشمت کو دیکھنے لگی۔

چونکنے کی بات ہی تھی۔ حشمت کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی۔ اس نے اسے کھول کر اس کا ایک قطرہ رابعہ کے پرہیزی سالن میں ڈپکا یا تھا۔ پھر جلدی سے شیشی کو بند کر کے اسے اپنے چھوٹے سے سینڈ بیگ میں رکھ رہا تھا۔

رابعہ نے فوراً پیچھے ہٹ کر دروازے کو بند کر لیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس کے کھانے میں کچھ ملایا جاتا ہے اور وہ ”کچھ“ زہر ہی ہو سکتا ہے۔

اس نے مختلف زہر کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ یہ جانتی تھی کہ زہریوں تو فوراً ہلاک کرتا ہے لیکن ایسا زہر بھی ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ کئی مہینوں میں اثر کرتا ہے۔

خود اس کے میکے میں اس کے مرحوم باپ نے اپنے چھوٹے بھائی کو یعنی رابعہ کے چچا کو جاندا سے محروم کرنے

کے لیے سلو پوائزن دیا تھا۔ کئی ماہ بعد جب اس کے پتا فوت ہوئے تو کسی کو شبہ نہیں ہوا کہ اسے زہر مارا ہے۔

ایسا اس کے خاندان میں ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے سمجھ رہی تھی کہ پچھلے چار دنوں میں وہ پہلے سے زیادہ کمزور کیوں ہو گئی ہے؟ کیوں اس کا سر چکرانے لگا ہے؟ وہ ڈرنے والی نہیں تھی۔ شوہر سے اور بیٹوں سے لڑتی آرہی تھی۔ اب بھی ان کے خلاف طوفان برپا کر سکتی تھی لیکن اس وقت غصہ کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہی تھی کہ ابھی شوہر کی زہریلی دشمنی کا پول کھولے گی تو وہ تسلیم نہیں کرے گا۔ ثبوت غائب کرنے کے لیے اس شیشی کو کہیں چھپک دے گا۔ وہ اس طرح آستین کے سانپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گی۔

اسی لمحہ میں اس نے مرحوم بہنی کی قسم کھائی کہ اب اس وڈیرے کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ فی الحال تو اس کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھائے گی۔ آج یا کل اپنے بھائی سے زہر منگوا کر اس کے کھانے میں ملائے گی۔

دوسرے دن عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مراد کے مقدمہ میں زلیخا کے مرڈر کیس میں ایک ماں کی گواہی اہم تھی۔ ان حالات میں کوئی یہ شبہ نہ کرتا کہ ایک اہم گواہ نے عدالت میں پیش ہونے سے پہلے اپنے شوہر کو زہر دیا ہے پھر یہ کہ میاں بیوی کے درمیان اندرونی دشمنی کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ شوہر اور بیٹوں کی کمینگی کے باعث ساری دنیا دشمن دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر آہٹ سن کر کھول دیں۔ حشمت نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں کھانے پر انتظار کر رہا ہوں اور تم سو رہی ہو۔“

”میں جاگ رہی ہوں۔ کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے۔“

”کھانا تو ہوگا ڈاکٹر نے سختی سے کہا ہے کہ تمہیں وقت کی پابندی سے کھانا چاہیے۔“

”مجھے کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں نہیں جا سکوں گی۔ برکت یا رحمت سے بولیں۔ میرا کھانا یہاں لے آئیں۔“

”ٹھیک ہے ابھی کھانا آجائے گا۔“

وہ پلٹ کر گیا پھر تھوڑی ہی دیر میں کھانے کی ٹرالی دھکیلا ہوا کمرے میں آتے ہوئے بولا۔ ”بیٹے باہر گئے ہیں۔ میں ہی لے آیا ہوں۔ یہاں تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔“ وہ پریشان ہوئی۔ اس نے کھانا وہاں منگوا یا تھا تا کہ بند

کمرے میں اس زہریلے سالن کو ضائع کر سکے۔ وہ آج یا کل اسے زہر دینے تک اس سے دشمنی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

حشمت ایک کرسی اٹھا کر کھانے کی ٹرالی کے پاس لا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”چلو اٹھو۔ بسم اللہ کرو۔“ وہ چور نظروں سے پرہیزی سالن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کھاتے وقت سالن کی ڈش اٹھاتے ہی اسے گرا دے گی۔ جیسے دھوکے سے گر گئی ہو۔ پھر گرایا ہوا سالن نہیں کھائے گی یوں اس وقت جان چھوٹ جائے گی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایسے ہی وقت کا لنگ ٹون نے حشمت کو متوجہ کیا۔ اس نے ٹن دبا کر فون کو کان سے لگا یا۔ دوسری طرف سے رحمت کی آواز سنائی دی۔

”بابا جانی...! جلدی آؤ۔ برکت نے یہاں بڑے گیٹ سے گاڑی لگرا دی ہے۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔“

حشمت نے دوڑ کر کھڑکی کے پاس آکر باہر دیکھا۔ اس کی گاڑی مین گیٹ کے ایک آہنی پٹ سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برکت آنکھیں بند کیے ایک طرف ڈھلکا ہوا دکھائی دیا۔ وہاں رحمت کان سے فون لگائے باپ کو بلا رہا تھا۔

وہ فوراً ہی پلٹ کر کھانے کی ٹرالی کے سامنے سے گزرتے ہوئے دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔ رابعہ کو خوب موقع ملا تھا۔ اس کے اندر اچانک ہی پھرتی پیدا ہوئی۔ اس نے بیڈ سے اتر کر کھڑکی کے باہر ایک نظر ڈالی۔ پھر زہریلے سالن کی ڈش اٹھا کر واش روم میں آگئی وہاں اس نے آدھی پلیٹ کا سالن کوڈ میں ڈالا۔ پھر کمرے میں آکر ایک روٹی کا لقمہ توڑ توڑ کر پانی میں بھگو کر چبانے اور نگلنے لگی۔ یوں حشمت وہاں آکر مطمئن ہو جاتا کہ رابعہ نے آج کی زہریلی خوراک حلق سے اتار لی ہے۔

وہ لقمے چبانے کے دوران کھڑکی کے پاس جا کر دیکھ رہی تھی۔ حشمت اور رحمت نے برکت کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آرام سے لٹا دیا تھا۔ رحمت ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا تھا۔ باپ اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ وہ گاڑی کو واپس موڑ کر اسے کسی قریبی اسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔

یکبارگی رابعہ کے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ حشمت جلدی میں گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ چھوٹا بیٹھ بیگ نہیں تھا جس میں زہریلی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈائننگ روم میں آئی۔ وہ بیگ میز پر رکھا ہوا تھا۔

اس نے قریب آکر اسے اٹھایا پھر اسے کھول کر وہ

شیشی نکال لی۔ اب ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر شیشی کو زہر سے خالی کرنا تھا۔ دماغ نے سمجھایا اسے یہ قوف بنانے کے لیے خالی شیشی میں پانی بھر دے تاکہ وہ اسے زہر ہی سمجھتا رہے اور اس کے پرہیزی کھانے میں ٹپکا تار ہے۔

وہ سوچتی ہوئی پٹن کے سینک کے پاس آئی۔ دل ہی دل میں اسے بددعا میں دے رہی تھی۔ ایسے وقت پھر ذہن میں بات آئی کہ زہر کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

پھر کیا کرے...؟ اس کے ہتھیار کو اسی پر آزمانا چاہیے۔ جو گڑھا وہ کھود رہا ہے۔ اسی میں اسے گرانا چاہیے۔

اس نے شیشی کے زہر کو گھور کر دیکھا۔ پھر اسٹور میں جا کر ایک خالی شیشی لے آئی۔ اس کا زہر اس میں منتقل کر دیا۔ خالی شیشی کو اچھی طرح دھویا۔ وہ زہر یلا رقیق مادہ ایک ڈرا گاڑھا تھا۔ فریج میں رکھی ہوئی ایک بے ذائقہ دوا کے مانند تھا۔ اس نے وہ دوا فریج سے نکال کر خالی شیشی میں ڈال دی۔ آئندہ حشمت اس کے قطرے کھانے میں ٹپکا تا تو اسے نقصان نہ پہنچتا۔

اس نے دوسری شیشی کو دیکھا۔ اس میں زہر تھا۔ اب اس پر گاڑی چلا کر اسے کچلنے والے کا پیٹہ لٹا گھونسنے والا تھا۔ اب وہ اس کے کھانے میں وہی زہر ٹپکانے والی تھی۔ اس نے وہ بے ضرر شیشی حشمت کے بیگ میں رکھ دی۔ اصل زہر کی شیشی لے کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ وہاں ٹرالی میں حشمت کے حصے کا سالن اور روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سالن کی ڈش میں دو قطرے ٹپکا دیے۔

☆☆☆

تقدیر تو تماشے دکھاتی ہی رہتی ہے۔ انسان بھی کچھ کم تماشے نہیں کرتا ہے۔ عشق نچائے تھیا تھیا۔ محبوب دیوانہ وار رقص کناس تھا اور اپنے ساتھ مرینہ کو جبر کو سمیرا اور معروف جی کو نچاتا چلا جا رہا تھا۔

وہ ایک معما ایک پہیلی بن گیا تھا کہ بوجھ تو جانیں؟ کیا وہ پہچانا جاسکتا تھا؟ جب جیل خانے کی بند گاڑی میں اسے عدالت تک پہنچایا گیا تو اس کے ہاتھوں میں جھکڑیاں پڑی تھیں۔ اس کی زنجیر ایک سپاہی کے ہاتھ میں تھی۔ اسسٹنٹ جیلر اور دو سپاہی اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ ایک برآمدے میں سمیرا معروف جی اور وکیل باتیں کر رہے تھے اور اس کے منتظر تھے۔ پھر انہوں نے قیدی مراد کو دور سے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ مراد ہی دکھائی دے رہا تھا۔

اگر معلوم ہوتا کہ وہ محبوب ہے تو سیرا اور معروف دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتے چلے جاتے لیکن وہ جیل سے لے کر عدالت کے ریکارڈ تک ایک ملزم مراد قیدی نمبر سات سو سات تھا۔ سر جھکا کر آ رہا تھا۔

محبوب نے دور ہی سے سیرا اور معروف کو دیکھ کر سر جھکا لیا تھا۔ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ پہچانا نہ جائے۔

وکیل کو ملزم مراد سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے اصولاً صرف فیس کی رقم ملنے والی تھی وہ حرام کے لاکھوں روپے سے محروم ہو کر بدول ہو گیا تھا۔ اس کے مقدمے کو پہلی ہی پیشی سے کمزور بنانے والا تھا۔ اس کی بلا سے وہ مراد ہو یا محبوب ہو۔ رقم ملتی تو کسی کو بھی پھانسی چڑھانے کی آخری کوشش کر ڈالتا۔

محبوب سپاہیوں کے نرنے میں چلتا ہوا ان کے سامنے آ کر رک گیا۔ سیرا کو پہلے ہی لمحہ میں یوں لگا جیسے محبوب کو دیکھ رہی ہو۔ دل میں چور تھا۔ وہ بھی نظریں چرا رہا تھا۔

معروف نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو تمہیں عزت سے رہائی ملے گی۔ حوصلہ رکھو۔ یا خدا۔! تمہیں دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے روپوش ہونے والا ہم سے دور ہو جانے والا ہمارا محبوب سامنے آ گیا ہے۔“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”میں گدھا گاڑی والا ہوں۔ سامعین کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیا سامعین کہیں چلے گئے ہیں؟“

”ہم کیا بتائیں۔ تم خود جانتے ہو۔ تمہاری ماروی نے اسے کس طرح پاگل بنا دیا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہارا مقدمہ لڑتے رہیں گے۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ تمہیں قتل کے جھوٹے الزام سے ضرور بری کرائیں گے۔“

وکیل نے خاموش طنزیہ نظروں سے معروف کو دیکھا۔ دل میں کہا۔ ”ملزم کی لگام تو وکیل کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس لگام کو صرف میں ہی سزا یا جزا کی طرف موڑ سکتا ہوں۔“

اسٹنٹ جیلر محبوب کو ایک ذرا دھکا دے کر وہاں سے آگے لے گیا۔ سیرا نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ برآمدے کے ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے معروف سے کہا۔ ”اسے دیکھ کر ابھی تک میرا دل دھڑک رہا ہے۔ ضد کر رہا ہے کہ

میں مراد کو نہیں محبوب صاحب کو دیکھتی رہی ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”ایسی مشابہت ہے کہ مجھے بھی محبوب دکھائی دے رہا تھا۔“ وہ بولی۔ ”وہ ہم سے نظریں ملا کر نہیں بول رہا تھا۔“ ”یہی مراد کی پہچان ہے۔ وہ ہم سے بھی نظریں ملا کر باتیں نہیں کرتا۔ اس کی آنکھیں احسان مندی سے بھی رہتی ہیں۔“

وہ عدالت کے کمرے کی سمت جانے لگے۔ وہاں حشمت جلالی رابعہ اور رحمت پہلے سے موجود تھے۔ پچھلے دن برکت حادثے میں زخمی ہوا تھا۔ وہ موجود نہیں تھا۔ میں آرام کر رہا تھا۔

ان کا وکیل رابعہ سے کہہ رہا تھا۔ آج میں مقدمے کی تفصیلات پیش کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ آج آپ سے سوالات نہ کیے جائیں پھر بھی آپ ذہنی طور پر آمادہ رہیں۔“

رابعہ جب سے عدالت کے کمرے میں آئی تھی۔ تب سے کشمکش میں تھی۔ مراد کے معاملے میں اس کا ضمیر مردہ تھا۔ وہ اس کے خلاف بولنے والی تھی۔ اس کے برعکس یہ بھی جانتی تھی کہ مرحوم بیٹی مراد سے متاثر تھی۔

اس نے ماں سے کہا تھا کہ اسے معاف کر دے۔ اس نے حویلی کی شہزادی کو اس لیے ٹھکرایا تھا کہ گناہ گار بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے ایک رات کے بعد دوسری رات نہیں آیا۔ ایک جوان لڑکی کو اور مال و دولت کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کی پارسائی اور شرافت کا اسے انعام ملنا چاہیے۔

لیکن رابعہ اس لیے بھی مراد کے خلاف بولنے والی تھی کہ اپنے شوہر کو اور بیٹوں کو زلیخا کے متعلق اندیشوں میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی کہ بیٹی زندہ ہے۔ وہ کہیں ہے اور کسی دن بھی آکر ان کے جھوٹ اور فریب کا پردہ چاک کرنے والی ہے۔ پچھلے روز اسے معلوم ہوا تھا کہ شوہر اسے زہر دے کر مارنا چاہتا ہے۔ تب سے وہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ کئی بار سوچا کہ پہلی پیشی میں ہی ان باپ بیٹوں کے خلاف زہر اگل دے پھر دماغ نے سمجھایا۔ ”ابھی نہیں... ابھی دشمن کو زندہ رکھو اور اسی سے حاصل کیے ہوئے زہر سے روز اسے تھوڑی تھوڑی سی موت دیتی رہو۔ تھوڑا تھوڑا کر کے مارنے رہنے سے کچھا ٹھنڈا ہوتا ہے۔“

خوش نصیبی مراد تک آتے آتے نہیں آرہی تھی۔ صرف ایک ماں کہہ دیتی کہ کھیتوں میں پائی جانے والی لاش اس کی بیٹی کی نہیں تھی تو پہلی ہی پیشی میں مراد کو رہائی مل جاتی۔

یوں تو وہ سچ نہ بول کر مراد سے دشمنی کر رہی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عداوت اپنے شوہر اور بیٹوں سے کر رہی تھی۔ اس نے کئی بار قسمیں کھائی تھیں کہ ان کی نیندیں حرام کر دے گی اور اس روز ان کا سکون برباد کرنے کے لیے کچھ ایسے انتظامات کر کے آئی تھی کہ ابھی اسی عدالت کے کمرے میں باپ بیٹوں کا پسینا چھوٹنے والا تھا۔

سچ صاحب کے آتے ہی مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ مراد پر قتل کا جواز الزام تھا۔ اس کے بارے میں دونوں طرف کے وکیلوں نے اپنے اپنے طور پر وضاحتی بیانات دیے۔ پھر حشمت کے وکیل نے سچ سے درخواست کی کہ قاتل کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے۔

مراد کے وکیل نے کہا۔ ”جناب عالی! جب تک مراد پر قتل کا الزام ثابت نہ ہو جائے تب تک قاتل بیرسٹر سے کہا جائے کہ وہ اسے قاتل نہیں صرف ملزم کہیں۔“

سچ نے بیرسٹر سے کہا کہ وہ الفاظ کے استعمال میں محتاط رہے۔ پھر ملزم کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ سچ اور وکیلوں کی زندگی میں شاید وہ پہلا ملزم تھا جو حقیقتاً نہ مجرم تھا نہ ملزم تھا۔ انصاف کرنے والے اور انصاف دلانے والے سب ہی اندھے ہو گئے تھے۔ عجب عدالتی تماشا تھا۔ وہاں اس ملزم کے مقدمہ کی کارروائی جاری تھی جو وہاں تھا ہی نہیں۔

حشمت کے وکیل نعیم دڑانی نے محبوب سے کہا ”تمہارے خلاف ٹھوس ثبوت اور چشم دید گواہ ہیں۔ تم نے حشمت جلالی کی صاحبزادی زلیخا کو بڑی بیدردی سے قتل کیا ہے۔ کیا تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”اگر اغوا کرنے والوں نے ماروی کو مار ڈالا ہے تو پھر اقرار کرتا ہوں۔ میں نے زلیخا کو قتل کیا ہے میں سزائے موت پا کر اپنی ماروی کے پاس جانا چاہتا ہوں اور اگر ماروی زندہ ہے تو میں نے کسی زلیخا کو قتل نہیں کیا ہے۔“

سیرا اور معروف حیرانی سے اس دیوانے کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے محبوب بول رہا ہو۔ سچ نے پوچھا۔ ”یہ ماروی کون ہے اور زلیخا کے قتل سے اس کا کیا تعلق ہے۔ یہ کچھ بے معنی اور بے جوڑی باتیں کر رہا ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”جناب عالی! مقدمے کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔ مجھے کسی طرح یقین دلایا جائے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی ہے پھر میں آپ کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ کسی بھی زلیخا کے قاتل ہونے کا اقرار کر لوں گا۔“

سچ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ”یہ زلیخا کے قتل کو کسی ماروی کی زندگی یا موت سے مشروط کر رہا ہے۔ کیا اس کی دماغی حالت درست ہے؟“ وکیل نعیم دڑانی نے کہا۔ ”جناب عالی! یہ مکار ہے۔ خود کو دیوانہ پاگل ظاہر کر کے سزائے موت سے بچنا چاہتا ہے۔“

مراد کے وکیل احمد صدیقی نے کہا۔ ”جناب عالی! یہ مکار نہیں ہے۔ سچ الدماغ ہے۔ ماروی نامی ایک لڑکی کا دیوانہ ہے۔ اسے اغوا کیا گیا ہے شاید مار ڈالا گیا ہے۔ یہ اس کے ساتھ جینا اور اسی کے ساتھ مرنا چاہتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس کے طبی معائنے کا حکم دیا جائے۔“

سچ نے کہا۔ ”ملزم نے اپنی بے بسی باتوں سے اب تک عدالت کا وقت ضائع کیا ہے۔ آئندہ پیشی تک دماغی امراض کے ماہرین سے اس کا معائنہ کرایا جائے۔“

حشمت جلالی اپنی بیوی رابعہ اور بیٹے رحمت کے ساتھ بیٹھا مراد (محبوب) کا دیوانہ پن دیکھ رہا تھا۔ عدالت پر خاست ہو رہی تھی۔ ایسے وقت اس کے فون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے تنہی سی اسکرین پر انجانے کارل کے نمبر پڑھے۔ پھر بشن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو؟“

دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”میں بہت بیمار ہوں۔ آنکھیں سکتی۔ آج نہ سہی اگلی پیشی میں...“ وہ کہتے کہتے کھانسنے لگی۔ شاید بیمار تھی۔ فون بند ہو گیا۔ حشمت نے شدید حیرانی سے رابعہ کو دیکھا۔ وہ اسے چور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ پریشان ہو کر بولا ”پتا نہیں کون تھی؟“ ”آپ کچھ گھبرائے ہوئے سے ہیں۔“

”آں... نہیں۔ وہ اس کی آواز اس کا لہجہ زلیخا جیسا تھا۔“ رحمت نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے اچھی طرح سنا ہے؟ نہیں بابا جانی! وہ کہاں سے آجائے گی؟“

حشمت نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”ادھر وہ ماروی کے لیے کہہ رہا ہے کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکی ہے۔ ادھر زلیخا سوال بن کر پتچ رہی ہے کہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ اور مر چکی ہے تو یہ کس نے فون کیا تھا؟“

اس نے فون کرنے والی کے نمبر پتچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے پھر کھانسی کے ساتھ وہی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں باپ کہتے ہوئے شرم آتی...“

وہ کھانسنے لگی پھر گہری سانسیں لیتے ہوئے

ہولی۔ ”میں۔ میں اگلی پیشی میں تم سے نفرت کرنے آؤں گی۔ تب تک تم سے بولتے ہوئے بھی کھن آ رہی ہے۔ اب میرا فون بند رہے گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ فون ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے رہ گیا۔ وڈیرے نے پہلی بار محسوس کیا کہ صرف ہاتھ ہی نہیں دل بھی بڑی طرح کانپ رہا ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عدالتی کمرے سے جانے لگا۔ رحمت نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہی تھی؟“

وہ غصہ سے بولا۔ ”ہاں۔ ہاں وہی تھی۔ پھر سے مرنے کے لیے پیدا ہو گئی ہے۔“

رابعہ بھی ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میرا دل کہتا تھا کہ میری زلیخا زندہ ہے۔“

وہ چلتے چلتے رک کر ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”آہستہ بولو۔ اس کا نام نہ لو۔ کیا ڈنکا پیٹنا چاہتی ہو کہ وہ زندہ ہے؟“

رابعہ چپ ہو گئی۔ ہونٹوں کو سختی سے بھیج لیا۔ وہ باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ رحمت نے اسے اشارت کر کے آگے بڑھایا۔ رابعہ نے کہا۔ ”اب تو بول سکتی ہوں؟ یہاں کوئی نہیں سنے گا۔ مارنے والے سے بچانے والا قوی ہے۔ وہ آگئی ہے۔ اب آپ کیا کریں گے؟“

”میں اسے عدالت تک پہنچنے نہیں دوں گا۔“

”وہ نظر آئے گی تو آپ اسے روک سکیں گے۔“

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فون پر نہیں تھی۔ پتا نہیں کون دھوکا دے رہی تھی۔“

وہ بولی۔ ”آج تک آپ یہی کہہ کر خود کو دھوکا دیتے رہے کہ وہ مر چکی ہے۔ آج وہ فون پر زندہ ہو گئی ہے۔ میرا کیا ہے۔ آپ اسی طرح فریب میں مبتلا رہیں۔ اگلی بار عدالت میں سانس لیتی ہوئی آئے گی۔ پھر کیا کریں گے؟“

وہ اگلی سیٹ کی پشت کو لات مارتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے بھری عدالت میں گولی مار دوں گا۔ مرنے سے پہلے اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔ تم چپ رہو۔ بکو اس نہ کرو۔ تمہاری باتیں تمہاری آواز مجھے زہر لگ رہی ہے۔“

وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر خاموش ہو گئی۔ اس کی چال کامیاب رہی تھی۔ اس نے ایک فون کال کے ذریعے مردہ بیٹی کو دشمنوں کے درمیان زندہ کر دیا تھا۔

اس کی پلاننگ کے مطابق چچا زاد بھائی عظمت شاہ عدالت میں موجود تھا۔ اس کی بیٹی مہ ناز اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں تھی۔ زلیخا اور مہ ناز بچپن سے ساتھ ملی بڑھی تھیں۔ وہ کسی حد تک زلیخا کی آواز اور لہجے میں بول سکتی

تھی۔ عظمت شاہ نے دو روز پہلے بیٹی کو سمجھا دیا تھا کہ حشر کے ساتھ کس طرح ڈراما کرنا ہے۔

اس نے باپ کی ہدایات کے مطابق ابھی فون پر کھانستے ہوئے دو چار باتیں کی تھیں۔ یوں زلیخا کو اس کے دماغ میں زندہ کر کے فون بند کر دیا تھا۔

وہ باپ اور دونوں بیٹے تین برس گزر جانے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے کہ زلیخا کہیں جا کر مر کھپ گئی ہے۔ اب اتنے عرصہ بعد رابعہ نے ان کے اطمینان اور یقین کو متزلزل کر دیا تھا۔ ان کا سکون غارت ہو رہا تھا۔ آئندہ بھی دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں حرام ہونے والی تھیں۔

عدالت پر خاست ہونے کے بعد سپاہی محبوب کو وہاں سے لے گئے تھے۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وکیل جھنجھلا کر معروف ججلی سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ جسے الزام سے بری کرانے آئے ہیں وہ خود اپنے پاؤں پر کھلاڑی مار رہا ہے۔ اسے جج کے سامنے پاگل یا جھپٹی بننے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے ایک سیدھے سے سوال کا سیدھا اور مختصر سا جواب دینا تھا۔ لیکن وہ ماروی کا دیوانہ بن کر بول رہا تھا۔“

سمیرا نے خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ ”محبوب صاحب ماروی کی باتیں اسی انداز میں کرتے ہیں۔“

معروف نے کہا۔ ”محبوب اور مراد دونوں ہی پاگل ہیں۔ دونوں اسی انداز میں بولتے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عدالت میں ایسی بھکی بھکی باتیں کرے گا۔“

وکیل نے کہا۔ ”اگر دماغی امراض کا کوئی ماہر اسے پاگل قرار دے تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟“

دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وکیل نے کہا۔ ”وہ سزائے موت سے بچ جائے گا۔ لیکن اسے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا۔ اس کی باقی زندگی پاگلوں میں گزرے گی۔“

وہ بڑی ناگواری سے بول کر منہ پھیر کر چلا گیا۔ سمیرا اور معروف باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ معروف نے اسے اشارت کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یک نہ شد دوشد۔ دونوں ہی عاشق مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ ایک غائب ہو گیا ہے۔ دوسرا پاگل خانے میں جانے والی حرکتیں کر رہا ہے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”وہ جان بوجھ کر دکھاوے کے لیے پاگل نہیں بن رہا تھا۔ جب وہ کٹھرے میں کھڑا بول رہا تھا۔ تب میں اس کی آنکھوں اور چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس طرح محبوب صاحب بے اختیار دیوانوں کی طرح ماروی کی

طرح محبوب صاحب بے اختیار دیوانوں کی طرح ماروی کی

طرح محبوب صاحب بے اختیار دیوانوں کی طرح ماروی کی

طرح محبوب صاحب بے اختیار دیوانوں کی طرح ماروی کی

طرح محبوب صاحب بے اختیار دیوانوں کی طرح ماروی کی

باتیں کرتے ہیں۔ وہ مراد بھی۔ اسی طرح۔ اسی طرح...“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

معروف نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”مجھے وہ مراد نہیں لگ رہے تھے۔ میں کیا بتاؤں؟ آپ دل کے معاملات کو نہ اہمیت دیتے ہیں نہ سمجھتا چاہتے ہیں۔ اگر وہ مراد تھا تو میرا دل اُدھر کیوں کھینچا جا رہا تھا؟“

معروف نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن آنکھوں سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”جس طرح وہ دونوں چلتے پھرتے ماروی کو آنکھوں کے سامنے دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تمہیں مراد میں محبوب نظر آنے لگا ہے۔ پلیز سمیرا! میں دو پاگلوں کو جھیل رہا ہوں۔ تم تیسری کا اضافہ نہ کرو۔“

”پلیز آپ یقین کریں کہ میں پوری طرح اپنے حواس میں ہوں۔ آپ ایک بات سچ سچ بولیں کیا آپ کو کسی بھی لمحہ میں یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ مراد نہیں ہے۔ ہمارے محبوب صاحب ہیں؟“

”دونوں ہم شکل ہیں۔ ایک کو دیکھ کر ایسا ہی لگے گا کہ دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ بے شک مجھے کئی بار ایسا لگا کہ میری آنکھوں کے سامنے مراد نہیں محبوب ہے۔ لیکن سمیرا...! عقل بھی کوئی چیز ہے۔ جس جیل میں مراد ہے وہاں سے محبوب کیسے نکل کر عدالت میں آئے گا؟

کیا تم بچوں کی طرح سوچ رہی ہو کہ محبوب نے جیل میں جا کر مراد پر اور ایک احسان کیا ہے۔ اسے ماروی کے پاس جانے کی آزادی دیدی ہے اور خود اس کے حصے کی سزا بھگت رہا ہے؟

اور جیلر اور جیل کا تمام عملہ اندھا ہے۔ انہوں نے ایک کو جیل میں قیدی بننے اور دوسرے کو فرار ہوتے نہیں دیکھا ہے؟“

وہ ایسے حقائق کے سامنے کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ چپ چاپ ونڈا سکرین کے پار دیکھنے لگی۔ اس کا دل محبوب کو پکار رہا تھا۔ ”محبوب صاحب! میں کیا کروں؟ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میں دن رات آپ کو نگاہوں کے سامنے دیکھنے لگی ہوں۔ اب بھی یہ دل نہیں مان رہا ہے۔ کہہ رہا ہے میں ابھی مراد کو نہیں آپ کو دیکھتی رہی ہوں۔ کہاں ہیں آپ...؟ خدا کے لیے واپس آ جائیں۔“

اس نے ایک پیٹرول پمپ پر گاڑی روک دی۔ منگی فل کرنے کو کہا۔ پھر سمیرا کو دیکھ کر بولا۔ ”محبوب تین دنوں سے لاپتا ہے۔ پتا نہیں بے سرو سامانی میں کیسے جی رہا ہوگا۔“ وہ بولی۔ ”جبکہ وہ عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے

عادی ہیں۔ خدا جانے کیسے دکھ مصیبت میں جی رہے ہوں گے؟“

”ہم نے سوچا تھا۔ ماروی کو اس سے دور کر دیں گے، اسے یقین ہو جائے گا کہ وہ مرچکی ہے تو وہ رفتہ رفتہ نارمل ہو جائے گا اپنی کاروباری زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔“

وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”کیا سوچا تھا اور کیا ہو رہا ہے۔ یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی تلاش میں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر ہمیں اور زیادہ فکر میں مبتلا کر کے کہیں چلا جائے گا۔“

”ہماری پلاننگ ناکام رہی ہے۔ ماروی کو ان سے دور کر کے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ الٹا ہم نے محبوب صاحب کو بے گھر بے یار و مددگار کر دیا ہے۔“

”ان لمحات میں یہی بات سوچ رہا ہوں۔ ہم محبوب کو واپس لانے والے کے لیے اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعہ لاکھوں روپے کے انعام کا اعلان کر رہے ہیں۔ ادھر وہ دیوانہ ماروی کو نہ پا کر اپنی جان پر نہ کھیل جائے۔ وہ سر پھرا کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

سمیرا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”اللہ خیر کرے۔ اگر انہیں ماروی کی موت کی خبر ملے گی تو وہ اپنی جان دیدیں گے۔“ وہ معروف کی طرف گھوم کر بولی۔ ”اور ان کی موت ہماری غلط پلاننگ کی وجہ سے ہوگی۔“

”پلاننگ غلط نہیں تھی۔ اس دیوانے عاشق نے ہماری تدبیر الٹی کر دی ہے۔“

وہ کار کو پیٹرول پمپ سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں فوراً اخبارات اور چینلز کے ذریعہ محبوب تک یہ بات پہنچانی ہوگی کہ ماروی زندہ ہے۔“

”ہاں۔ محبوب صاحب کو زندہ سلامت رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں ماروی کی سلامتی کا یقین دلایا جائے۔“

معروف نے کار سڑک کے کنارے روک کر فون پر اپنی انڈسٹری کے پبلسٹی منیجر سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”تمام چھوٹے بڑے اخبارات اور چینلز کے ذریعہ محبوب کو مخاطب کرو اور اسے خوش خبری سناؤ کہ ماروی زندہ ہے۔ ہمارے رابطے میں ہے۔ وہ واپس آ کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا۔“

سمیرا نے فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”منیجر سے بولیں تمام کام چھوڑ کر پہلے یہ کام کرے۔“

اس نے رابطہ ختم کیا۔ ایک ذرا طمینان کی سانس لی پھر

کہا۔ ”تھینکس گاڈ! ہماری اس تدبیر سے وہ واپس آ جائے گا۔“

”ہماری پہلی تدبیر بھی ان کی بہتری کے لیے تھی۔ ہم نے انسانی مزاج کے پیش نظر سوچا تھا کہ کسی عزیز ترین رشتے دار کی موت پر بھی رفتہ رفتہ صبر آ جاتا ہے۔ ماروی کی موت کا یقین ہوگا تو محبوب صاحب کو بھی ایک دن صبر آ جائے گا لیکن ٹھوس انسانی نفسیاتی حقیقت کو ان کی دیوانگی نے جھٹلادیا ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”یہ بات ذہن میں رکھو کہ وہ آسانی سے ہماری بات کا یقین نہیں کرے گا کہ ماروی زندہ ہے۔ وہ اس سے فون پر بات کرنا چاہے گا۔“

وہ اپنے بیگ سے فون نکالتے ہوئے بولی۔ ”ماروی نے آج سے چار روز پہلے فون پر کہا تھا کہ چاچی اور چاچا کے ساتھ جیکب آباد پہنچ گئی ہے۔ آگے کوچ میں سفر نہیں کرے گی۔ ٹرین کے ذریعہ سی اور ریتی کی طرف جائے گی۔“

وہ ماروی کے نمبر سچ کرنے لگی۔ معروف نے پوچھا۔ ”کیا اس نے پھر فون کیا تھا؟“

”نہیں۔ اسے کرنا چاہیے تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں کتنی مصروف رہتی ہوں۔ میں بھی اب تک اسے نظر انداز کر رہی تھی۔“

اس نے فون کو کان سے لگا یا دوسری طرف سے ریکارڈنگ سنائی دی۔ ”فی الحال آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔“

سمیرا نے فون بند کر دیا۔ معروف نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس نے دس منٹ کے بعد پھر ری ڈائل کیا۔ پھر پندرہ منٹ کے بعد، پھر آدھے گھنٹے کے بعد ری ڈائل کرتی رہی۔ دوسری طرف ماروی نہیں تھی۔ اگر تھی تو بول نہیں رہی تھی۔

سمیرا نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یا اللہ خیر... وہ خیریت سے ہواور زندہ ہو۔“

پھر دو گھنٹے اور چھ گھنٹے بعد بھی اس سے رابطہ نہ ہوا۔ دوسری طرف سے ٹیل سنائی دیتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ فون زندہ ہے۔ یہ دھڑکا سا لگا کہ وہ اٹینڈ کرنے والی زندہ ہے یا نہیں...؟

☆☆☆

محبوب پھر جیل کی اسی کوشری میں پہنچ گیا تھا۔ ایک دیوار سے ٹیک لگائے سوچ رہا تھا۔ ”مجھے کیا ہو گیا تھا؟ وہاں جج کے سامنے بھی ماروی دل و دماغ میں ہی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وکیل کیا سوال کرے گا اور مجھے

کیا جواب دینا ہوگا۔ وہاں بھی میں نے بے اختیار وہی کہا جو میرے دل و دماغ میں تھا۔“

وہ دیوار سے ٹیک لگائے آہستہ آہستہ فرش پر بیٹھ گیا۔ خلا میں نکلتے ہوئے بولا۔ ”بولو ماروی! کہاں ہو... زندہ ہو...؟ کیا زندہ نہیں ہو...؟ مجھے کہاں ملو گی...؟ اس جہاں میں یا اس جہاں میں...؟“

مراد...! تم اسے ڈھونڈنے لگے ہو۔ دیکھو۔ اسی جہاں میں اسے ڈھونڈتے رہنا۔ اس جہاں میں تو میں ہی اس کے پاس جاؤں گا۔“

جیلر دلاور جان اس سے ملنے آ رہا تھا۔ وہیں راہداری کے موڑ پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ فرش پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بالکل مراد لگ رہا تھا۔ عدالت میں قانون کے محافظ اور منصف بھی دھوکا کھا گئے تھے۔

جب تک وہ عدالت سے جیل میں واپس نہیں آیا تھا۔ تب تک دلاور جان گھبرا یا ہوا تھا کہ کہیں فریب کھل نہ جائے۔ اس نے بیٹی کی خاطر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اب وہ مطمئن تھا کہ آئندہ بھی محبوب پہچانا نہیں جائے گا۔ یہ دعویٰ غلط ہو گیا تھا کہ قانون کے محافظ مجرموں کے اندر گھس کر انہیں پہچان لیتے ہیں۔

دھوکا تو بیٹی بھی کھا چکی تھی۔ مراد کو اندر سے پہچان نہیں پائی تھی۔ اس نے پچھلی رات فون پر کہا تھا کہ وہ سیدھا سادا سا بیوقوف نظر آنے والا مراد اسے الٹو بنا کر فرار ہو گیا ہے۔ اس نے باپ سے کہا تھا کہ اور چار چھ تیز طرار سچ آدمی بھیج دے تاکہ وہ بلوچستان کے اس ویران علاقے میں اسے تلاش کر سکے۔

جیلر نے ناگواری سے محبوب کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر آہنی سلاخوں کے پاس آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلاخوں کے پاس آ کر بولا۔ ”آپ نے دیکھا۔ مجھے یہاں سے عدالت تک کسی نے نہیں پہچانا۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ فی الحال خطرہ ٹل گیا ہے لیکن آگے کچھ بھی ہو سکتا ہے یہ بھیہد کھل سکتا ہے۔“

”نہیں کھلے گا۔ آپ پر کسی طرح کا الزام نہیں آئے گا۔“

”کبھی ایسا ہو جاتا ہے جیسا ہم سوچتے بھی نہیں ہیں۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ مراد جیسا غریب سیدھا سادا سا بیوقوف نظر آنے والا میری بیٹی کو دھوکا دے کر فرار ہو جائے گا۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

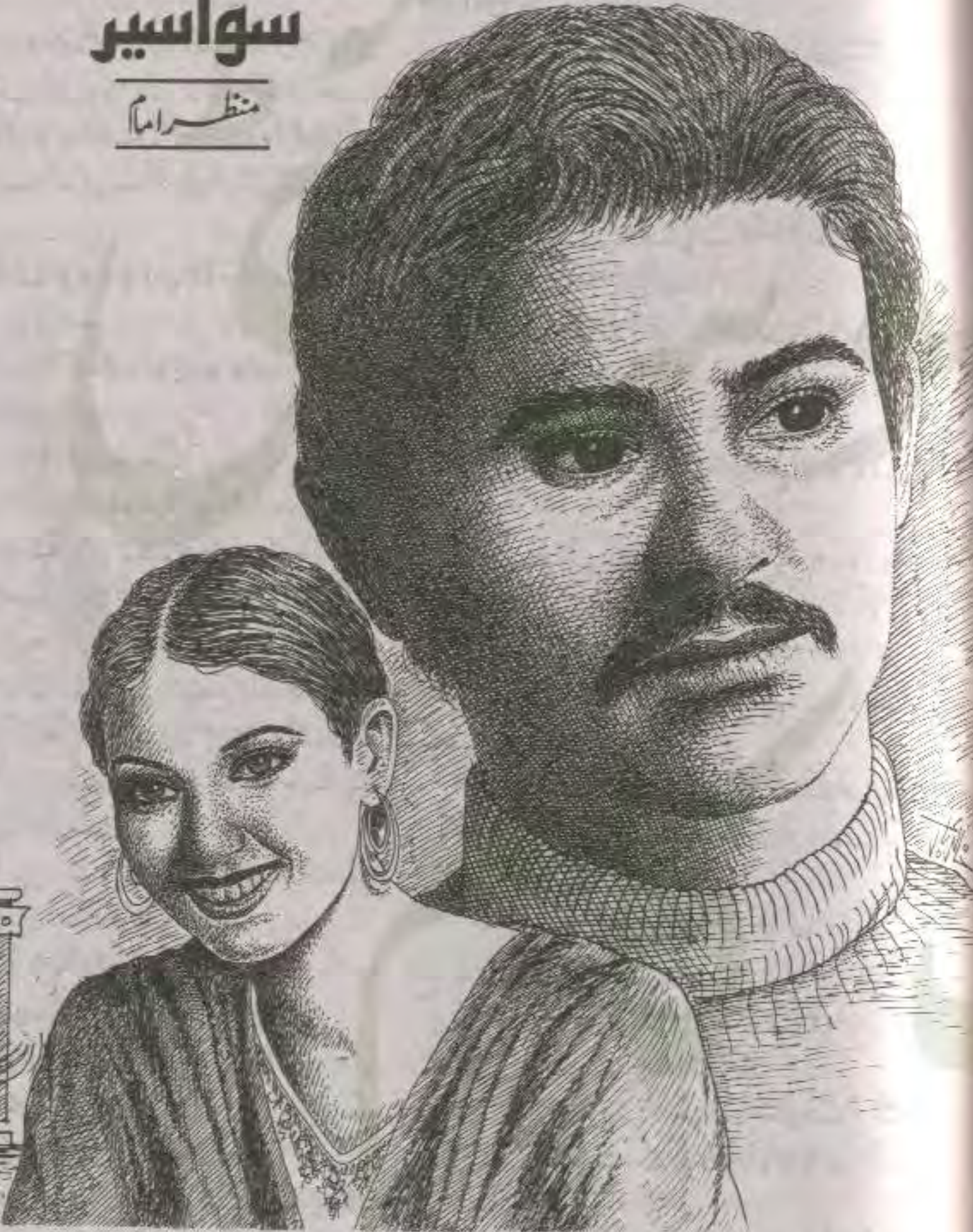
”تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ مرید نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تربیت حاصل کی ہے۔ وہاں بدترین مجرموں سے

بے چین طبیعت کے ہاتھوں مجبور ایک دلچسپ تراشا

قدرت کا سنہرا اصول... اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ وہ کسی کا ادھار نہیں رکھتی... اصولاً تو انسان کی فطرت بھی قدرت سے مطابقت رکھتی ہے مگر انسان اپنے مزاج میں توازن نہیں رکھ پاتا... بس یہی کج روی اس کی بنیاد ہلا دیتی ہے... اسے بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا تھا جب قدرت نے اس کے سامنے ایک اور ورق پلٹ دیا۔

سوا سیر

منظر امارا



اماں نے میرے سامنے ایک خوبصورت تصویر لا کر رکھ دی۔ وہ تصویر ایک ڈاکٹر کی تھی۔ اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔ آنکھوں پر ایک عینک لگی ہوئی، چہرے سے بردباری ظاہر ہو رہی تھی۔
”لیکن اماں یہ تو ڈاکٹر ہے۔“ میں نے کہا۔
”تو کیا ہوا، اس کا اتنا کلیک ہے۔“ اماں نے بتایا۔
”اچھی خاصی آمدنی ہے اس کی۔ تو اس کے ساتھ بہت خوش رہے گا۔“
”لیکن میری دینی شرط ہوگی یعنی ایک بار ملاقات جیٹا تیرے لیے یہ رشتہ لائی ہوں۔“

پھر وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ ہم بھی پکڑے جائیں گے۔“
محبوب نے اسے دیکھا کہ وہ آگے کیا کہنے والا ہے؟ اس نے کہا۔ ”مراد کہیں بھی پکڑا جائے گا تو بات حل جائے گی کہ وہ میری جیل سے نکلا ہوا قیدی ہے۔ وہ کجبت دوسرے علاقہ کی ایک بیچنس کے ہتھے چڑھ جائے گا تو میری شامت آجائے گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”اور ادھر ایک بیچنس والوں نے مراد کی تصویر اخباروں میں شائع کرادی تو ادھر میرے لوگ دھوکے کریں گے کہ وہ مراد نہیں محبوب علی چانڈیو ہے۔ مراد تو یہاں جیل میں ہے۔“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”اسی لیے میں بھی چپ ہوں اور مرید بھی اسے خاموشی سے تلاش کر رہی ہے۔“
”آپ بیٹی کو سمجھائیں کہ مراد سے کوئی توقع نہ رکھے۔ جسے ماروی کی ہوا لگ جائے وہ کسی اور ہوا میں سانس نہیں لیتا۔“

وہ بولا۔ ”تم لوگوں نے مرید جیسی ضدی لڑکی نہیں دیکھی ہے۔ ایک بار مراد اس کے ہاتھ آجائے تو اسے اس طرح زنجیروں سے باندھ کر رکھے گی کہ بھی آسمان دیکھنے نہیں دے گی۔“

محبوب نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ ”انسان محبت اور انصاف کے راستے پر کیوں نہیں چلتا؟ جو دولت سے طاقت سے نہ ملے اسے کیوں جبراً چھین لینا چاہتا ہے۔“
وہ بولا۔ ”ہم ہر حال میں اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ جو محبت سے محنت سے نہ ملے اسے عداوت سے چھین لینے ہیں۔ یہی دستور دنیا ہے۔“

وہ وہاں سے جانے لگا پھر راہداری کے موڑ پر رک کر بولا۔ ”وہ ہم سے زیادہ دیر چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ مرید اپنے شکار پر چھپنا جانتی ہے۔ وہ جلد ہی اسے برنارڈ کے ساتھ سمندر پار لے جائے گی۔ مسٹر محبوب علی چانڈیو تمہارے مقدر میں مراد کے حصے کی موت لکھی جا چکی ہے۔“

وہ پلٹ کر وہاں سے جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ محبوب آہنی سلاخوں کو تھامے خلا میں تک رہا تھا اور دعا میں مانگ رہا تھا کہ مراد مرید کے ہاتھ نہ لگے۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ممنٹی رہی ہے۔ یہاں برنارڈ جیسے خطرناک سیکرٹ ایجنٹ کو جیل سے فرار کرانے اور اس ملک سے باہر نکال لے جانے آئی ہے اور وہ مراد وہ کجبت میری ایسی چالاک اور جنگجو بیٹی کو دھوکا دے کر ماروی کے پیچھے چلا گیا ہے۔“
محبوب نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا ماروی اسے مل گئی ہے۔ وہ زندہ ہے؟“

”لغت ہے اس لڑکی پر۔ ہمارے لیے بھی مصیبت بن گئی ہے۔ اس کجبت کی لاش ہی مل جائے تو تم دونوں پانگل عاشقوں سے نجات مل جائے گی۔“
وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”میں کیا کروں وہ بہت مشکل میں ہے۔“

محبوب نے تڑپ کر پوچھا۔ ”کون؟ ماروی؟“
وہ غصہ سے چیخ کر بولا۔ ”اس کا نام نہ لو۔ میں اپنی بیٹی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ اندھیری رات میں اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد بیٹروں ختم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ میں اس سے تقریباً آٹھ سو میل دور بیٹھا ہوں۔ اس کے لیے بھلا کیا کر سکتا ہوں؟“

میرے پاس ایسے آدمی نہیں ہیں جو اتنی دور جا کر اس کی مدد کریں اور مراد کی گردن دیوچ کر یہاں لے آئیں۔ وہ ہاتھ آجائے گا تو مرید اس کی بوٹی بوٹی کر دے گی۔“

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ صرف گدھا گاڑی چلانا جانتا ہے پھر فرار کیسے ہوا؟ کیا پیدل گیا ہے؟“
”ہاں یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ پیدل کتنی دور گیا ہوگا؟ وہ آس پاس ہی کہیں چھپا ہوگا۔ دراصل اندھیری رات میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن...“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”وہ تو دن کے اجالے میں بھی دکھائی نہیں دیا۔ مرید اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ میں نے خضدار کے ایک جیلر کو فون پر کہا ہے کہ میری بیٹی وہاں دزدہ کالو کے ریٹ ہاؤس سے تقریباً سو کلومیٹر دور مصیبت میں ہے۔ کسی بھی طرح اس کی گاڑی میں بیٹروں پہنچایا جائے۔“

محبوب حیرانی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”مرید مراد کو بلوچستان لے گئی تھی یعنی وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد سندھ میں رہ کر ماروی کو تلاش کرے۔ اسی لیے وہ اس سے زنجیریں تڑا کر ادھر گیا ہے۔ جدھر ماروی مل سکتی ہے۔ خدا کرے وہ مرید کی گرفت میں نہ آئے اور ماروی کو ڈھونڈ نکالے۔“

وہ بولا۔ ”ہم باب بیٹی چاہیں تو چکی بج کر اسے گرفتار کرادیں۔ خضدار کی پولیس اور ایک بیچنس کو اس کے پیچھے لگا دیں۔ وہ چھپ نہیں سکے گا۔ جہاں جائے گا۔ پکڑا جائے گا۔“

کی۔ میں نے کہا۔ ”جب تک ملاقات نہ ہو میں شادی کے لیے ہاں نہیں بھر سکتا۔“

”ملاقات تو بہت مشکل ہے لیکن تو مریض بن کر اس کے پاس چلا جا۔“ اماں نے ترکیب بتادی۔

ڈاکٹر فرحانہ نام تھا اس کا۔۔۔۔۔ میں ایک شام اس کے کلینک پہنچ ہی گیا۔ مریض مرد اور عورتوں کی اچھی خاصی تعداد تھی وہاں۔

میں نے اپنا نام غلط لکھوایا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی میری بھی باری آگئی اور میں ڈاکٹر فرحانہ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی تصویر سے اچھی خاصی مختلف تھی تصویر سے وہ کم عمری لگ رہی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے پہلی ہی نظر میں اسے پسند کر لیا تھا۔

”جی فرمائیں کیا ہوا ہے آپ کو؟“ ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سچ تو یہ ہے کہ مجھے عشق ہو گیا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”کیا۔۔۔۔۔ کیا بکواس ہے یہ؟“

”آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کو صرف دیکھنے کے لیے آیا تھا اور آپ سے مل کر اطمینان ہو گیا ہے مجھے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک پڑی ”کون ہیں آپ؟“

میں نے جب ڈاکٹر فرحانہ کو اپنے بارے میں بتایا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی اس کے چہرے پر شرم اور خوشی کا ایسا حسین رنگ امنڈ آیا تھا کہ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔ اس نے فوراً اپنے پیوں سے میرے لیے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں منگوالی تھیں۔

”ڈاکٹر آپ رہنے دیں، یہ مریضوں کا وقت ہے آپ سے پھر اطمینان سے بات ہوگی۔“

”نہیں پلیز، مریضوں کو تو میں ششامی لوں گی۔ آپ تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔“

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا اور ”مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری لیے بہت مناسب رہے گی۔ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اس میں ایک خاص قسم کی انکساری اور نسوانیت تھی۔ بات بات پر شرمانے لگتی اور اس کا یہ شرمنا مجھے بہت اچھا لگا۔ پھر میں نے اس سے دوبارہ ملاقات کا وقت بھی لے لیا۔ ہماری دوسری ملاقات کسی اور جگہ ہونے والی تھی۔ گھر پہنچا تو اماں کسی اچھی خبر کے انتظار میں تھیں۔ میرے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ گئیں کہ میں مطمئن ہو کر واپس آیا ہوں۔

”ہاں اب بتا کیسی لگی ڈاکٹر؟“

”بس اماں ٹھیک ہی ہے۔“ میں نے مصنوعی طور پر ہنسنا شروع کیا۔

”مکاری کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے وہ پسند آگئی ہے تجھے۔“

”ہاں اماں۔“ میں نے گردن ہلا دی۔ ”ڈاکٹر فرحانہ بہت اچھی ہے۔“

”مبارک ہو۔ اب اس کے گھر والوں سے تفصیلی بات کرنی ہے۔“

”ابھی نہیں اماں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس سے ایک اور ملاقات کرنی ہے اس کے بعد بتاؤں گا۔“

دو چار دنوں کے بعد میں نے ڈاکٹر فرحانہ کو فون کیا تو اس نے فوراً میری آواز پہچان لی۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ کی آواز سن کر۔“ اس نے کہا۔

”یہ بتائیں پھر کب اور کہاں مل رہے ہیں۔“

”آپ کہیں میں حاضر ہوں۔“

اس نے ایک پارک کا نام بتا دیا۔ یہ ایک مشہور پارک تھا۔

میں نے اس کے لیے پھولوں کا ایک بو کے خرید اور بہت ہی رومانٹک موڈ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ڈاکٹر فرحانہ پارک میں پہلے سے موجود تھی اور بہت خوبصورت لباس میں بہت ہی خوشگوار موڈ میں تھی۔ میں نے جب اسے پھول پیش کیے تو وہ مسکرا کر بولی۔

”آپ نے یہ پھول محبت سے تحفے کے طور پر دیے ہیں لیکن کبھی کبھی اس کے ذریعے الرجی بھی ہو جاتی ہے۔“

”کیسی الرجی؟“ میں نے پوچھا۔

پھر اس نے الرجی پر ایک پتھر دیا کہ الرجی کیا ہوتی ہے کیوں ہوتی ہے اور کن کن چیزوں سے ہو جاتی ہے۔ اس کی اس طویل تقریر نے ذرا سی دیر میں مجھے بور کر دیا۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے اس سے کہا۔

”چھوڑیں فرحانہ، الرجی کی داستان نے تو مجھے بھی الرجی میں مبتلا کر دیا ہے۔ کیوں نہ ہم کوئی اور بات کریں۔“

”مثلاً۔۔۔۔۔؟“

”مثلاً کوئی بھی خوشگوار بات یا کوئی ہلکی پھلکی سی۔۔۔۔۔؟“ میں نے کہا۔ ”ہم پہلی بار مل رہے ہیں چلیں میں آپ کو کچھ شعر سناتا ہوں۔ اس طرح موڈ بن جائے گا۔“

”شاعری۔“ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

”ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

”شاعری دماغ کا خلل ہوتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہوتا یہ ہے کہ جب ایک خاص قسم کا بیکیٹر یا دماغ کی رکوں میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر جنونی کیفیت ہونے لگتی ہے اور اس کے نتیجے میں الفاظ بخارات بن کر۔۔۔۔۔“

”بس کرو خدا کے لیے۔“ میں نے اپنے کان بند کر لیے۔

”میں اب اس سے زیادہ گاڑھی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”قوت برداشت کی کمی کا اصل سبب خون میں سرخ ذرات کی کمی ہے اور اس کی وجہ سے اعصاب کمزور ہونے لگتے ہیں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

اس ڈاکٹر سے ملاقات میرے لیے اب عذاب بن گئی تھی۔ اس لیے میں اپنی جان چھڑا کر وہاں سے بھاگ نکلا اور گھر واپس آ کر میں نے اماں سے اس رشتے کے لیے انکار کر دیا۔

”نہیں اماں ڈاکٹر میرے بس کا روگ نہیں ہے۔“

”کیوں، کیا بات ہوگئی؟“

”ارے، اس نے ڈاکٹری زبان بول بول کر میری زندگی عذاب کر دی۔“ میں نے بتایا۔ ”تم خدا کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈ لو کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکوں گا۔“

اماں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں کسی بھی صورت اس ڈاکٹر سے شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اماں خاموش ہو گئیں۔

کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ایک اور تصویر میرے سامنے لا کر رکھ دی۔

”بیٹا اسے دیکھو یہ ایک انجینئر ہے۔“

”اماں آپ بھی میرے لیے کیسے کیسے رشتے لے کر آ رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب کیا میں کسی انجینئر سے شادی کروں گا؟“

”تو کیا ہو گیا انجینئر تو ہے لیکن بہت اچھی۔ ذہین، سمجھدار اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ صورت شکل کی بھی بہت معقول ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں پہلے اس سے ملاقات کروں گا اس کے بعد ہی کچھ سوچوں گا۔“ میں نے کہا۔

”جمل ٹھیک ہے میں بات کر دوں گی۔“

دو چار دنوں کے بعد اس انجینئر لڑکی سے ملنے کا وقت مقرر ہو گیا۔ وقت کیا مجھے۔۔۔ ان کے گھر جا کر اس سے ملاقات کرنا تھی۔ دوسری شام میں اپنے طور پر بن سنور کر ان

کے گھر پہنچ گیا۔

بہت معقول لوگ تھے گھر والے بہت مہذب تھے اور وہ لڑکی تو برا بھی بہت اچھی تھی جس سے میرا رشتہ طے ہونے والا تھا۔ اس کے گھر والے کچھ دیر کی باتوں کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف ہم دونوں ہی رہ گئے تھے یعنی میں اور نویرا۔

”نویرا صاحبہ، آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ میں نے بات کا آغاز کیا۔

”آپ کو معلوم ہے یہ خوشی کیا چیز ہوتی ہے؟“ نویرا نے پوچھا۔

”جی نہیں آپ بتا دیں۔“ میں ذرا سا شوخ ہو کر بولا۔

”خوشی دراصل ایک خاص قسم کی جیومیٹریکل اصطلاح ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جب آپ کے سارے زاویے ایک مرکز پر آ کر مل جاتے ہیں تو پھر خوشی کا آغاز ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہوگا لیکن اس وقت میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔“

”آپ جو بھی کہیں بہت بڑے تلے انداز میں کہیں گے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں جس طرح عمارتوں کا غیر متوازن ہونا برداشت نہیں کرتی اسی طرح گفتگو میں بھی توازن ہونا چاہیے ورنہ اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ انجینئر لڑکی کچھ اور کہتی میں وہاں سے بھاگ لیا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ اپنی فطرت میں یہ بھی اس ڈاکٹر سے کم نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر میڈیکل سے ہٹ کر نہیں دیتی تھی اور یہ انجینئرنگ کی جان نہیں چھوڑنے والی تھی۔

اماں نے جب یہ تفصیل سنی تو اپنا سر پیٹ لیا۔

”لگتا ہے تیری قسمت میں شادی نہیں ہے۔“

”اب تم ہی ایسے ایسے رشتے لا رہی ہو تو میں کیا کروں۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی ڈھنگ کی لڑکی لاؤ تب بات بنے گی۔“

”دیکھ میں تیرے لیے ڈاکٹر لا چکی، انجینئر لا چکی اب اور کیا چاہیے۔“

”نہیں اماں، کوئی سیدھی سادی لڑکی ہو جو ابھی پڑھ رہی ہو مجھے اتنی بقراط قسم کی لڑکی نہیں چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”اب دیکھ لینا، میں تیرے لیے کیسا رشتہ لے کر آتی ہوں۔“

اماں نے اس بار جو تصویر دکھائی وہ واقعی میرے مزاج

فیروز شاہ تغلق کے عہد میں جس رائے نامی چندو نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر خاندان والوں کی طرف سے لعنت ملامت کی بوجھاڑ پڑنے لگی۔ اس کے خاندان والوں نے کہا۔ ”جس رائے! تو مسلمان ہو گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون تجھے یاد رکھتا ہے۔ ہندو تو تجھے اس لیے بھلا دیں گے کہ تو نے ان سے بے وفائی کی ہے اور انہوں نے تجھ کو غیر سمجھ کر فراموش کر دیا ہے۔ رہے مسلمان تو وہ تجھے کبھی یاد نہیں سمجھیں گے کیونکہ اپنے دھرم اور خاندان سے غداری کرنے والا غیروں کی نظر میں بھی حقیر ہی رہتا ہے۔“

جس رائے نے جواب دیا۔ ”بھلا میں نے اسلام اس لیے نہیں اختیار کیا ہے کہ میں اس سے عہدہ و مرتبہ یا کسی قسم کی شہرت حاصل کروں، میں نے اسلام کو اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کی وجہ سے قبول کیا ہے اور میرا ضمیر مطمئن ہے۔“

جس رائے اپنے مخالفین اور متحزین کو اس قسم کے جوابات دیتے رہے۔

یہ نو مسلم خاندان دو صدی سے زیادہ عرصے تک گمنامی میں رہا اور اس میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو اس خاندان کو شہرت دوام عطا کر دیتا۔ عہد اکبری میں اس خاندان کے عثمان نامی ایک شخص نے دین داری میں علاقائی شہرت حاصل کر لی۔ لوگ اس کے

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیب کا علم سوائے اللہ کے کسی کے پاس نہیں ہوتا لیکن... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق کا کوئی نہ کوئی عکس مخلوق میں نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کسی نہ کسی صفات کے ذریعہ برابر حصے سے ہی سبھی اپنے مقبول بندوں کو بھی نوازا ہے... یہ اور بات کہ اس کے لیے اللہ نے اپنی عبادت اور ریاضت کی کڑی شرط رکھی اور ایک گھرا معیار رکھ دیا کہ جو اس پر پورا اترا وہی اس کا منظور نظر ٹھہرا... اور کسی خبر کہ اسے کس کی کب اور کیا اداسند آجائے... اور وہ اسے اس کی اوقات سے زیادہ نواز دے... آپ کا شمار بھی ایسے ہی ولیوں میں ہوا جنہیں اس غفور الرحیم نے اپنی بے حساب کرامتوں سے نوازا۔

باطن کی روشنی سے منور ایک صاحب کشف کا قصہ

ضیائیں بگماری
عالم باطن



صرف خاندانی اثرات اور تربیت کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ یہ ماں باپ کی دعاؤں کا اثر ہوتا ہے جو لڑکیاں اتنی صاف و شفاف ہوتی ہیں۔

خدا خدا کر کے شادی کا دن آ گیا اور خیر و خوبی کے ساتھ ہماری شادی ہو گئی۔ ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی اولاد ہوں۔ والد صاحب کا اپنا بڑا کاروبار ہے۔ میرے علاوہ دو بہنیں ہیں جو پڑھ رہی ہیں۔ غرض یہ کہ خدا نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے اور کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔ اسی لیے والدین کو میری شادی کی فکر تھی کہ میں جلدی سے شادی کر لوں۔ اخراجات کی تو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

شادی کی پہلی رات میں نے ندرت سے کہا۔ ”ندرت ہم اگلے ہفتے ہی مون کے لیے جا رہے ہیں۔“

”ہنی مون، یہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

میں نے شکر ادا کیا کہ قسمت نے مجھے ایسی بیوی دے دی تھی جو اس مکار اور بدکردار دنیا کے اثرات سے بالکل محفوظ تھی۔ میں نے جب اپنے والدین سے ہنی مون کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔

”ہاں، ہاں ضرور جاؤ خوب گھمانا پھرانا دلہن کو۔ اخراجات کی پروا مت کرنا۔ خدا نے ہم کو سب کچھ دے رکھا ہے۔ اس موقع پر خرچ نہیں ہوگا تو اور کب ہوگا۔“

میں اور ندرت اگلے ہی ہفتے مری کے لیے روانہ ہو گئے۔

وہاں ہم نے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ مری اگر ندرت بہت الجھی الجھی دکھائی دے رہی تھی۔

”کیا ہو گیا، خیریت تو ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کیا ہنی مون سے خوش نہیں ہو؟“

”آپ یہ بتائیں کیا اسی کو ہنی مون کہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں یہی ہنی مون ہے۔“

”تو اس میں کون سی نئی بات ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”میں اس قسم کے ہنی مون پر تو کئی بار آ چکی ہوں۔“

”کیا...“

چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور میں بے ہوش ہو گیا لیکن بے ہوش ہوتے ہوتے مجھے وہ ڈاکٹر اور انجینئر لڑکیاں بہت یاد آ رہی تھیں۔

اور ماحول کے مطابق معلوم ہوتی تھی۔ ایک سیدھی سادی اور پیاری سی لڑکی جس کے بارے میں اماں نے بتایا کہ وہ ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

”ہاں اماں یہ سچ رہے گی۔“ میں خوش ہو کر بولا۔ ”تم اس سے میری ملاقات کروادو۔“

”لیکن ملاقات کے بعد اس کو انکار مت کر دینا۔“

”اماں میں کوئی پاگل نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ انکار کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر یہ اچھی ہوئی تو میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”اماں بھی اس معاملے میں بہت تیز تھیں۔ انہوں نے دو چار دن... بعد اس سے میری ملاقات کروادی۔ یہ ملاقات بھی اس کے گھر پر ہوئی تھی۔ ندرت نام تھا اس لڑکی کا۔ بہت بھولی، شرمیلی شرمیلی سی، مجھے وہ پہلی ہی ملاقات میں پسند آ گئی تھی۔“

اس کے والدین نے بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع دے دیا تھا۔

”ندرت۔“ میں نے بہت رومانٹک موڈ میں اسے مخاطب کیا۔ ”یہ بتاؤ کہ مجھ سے پہلے بھی کبھی کسی لڑکے سے اس طرح باتیں کرنے کا اتفاق ہوا ہے؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ شرمناک ہوئی۔ ”ایک بار ایسا اتفاق ہوا تھا۔“

”اچھا، وہ کب؟“

”وہ شاید کسی کائیڈریس پوچھ رہا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اور میں نے اسے ایڈریس بتا دیا تھا۔“

یا خدا میرا دل اچھلنے لگا۔ کتنی معصوم لڑکی تھی اور وہ بھی اس دور میں۔ اس نے میرا دل موہ لیا تھا۔

”ندرت، تم واقعی بہت معصوم لڑکی ہو۔“ میں نے کہا۔

”شکریہ آپ کا؟“ اس نے شرمناک گردن جھکالی۔

”اب میں چلتا ہوں کیونکہ تمہارے بعد مجھے کسی اور کو نہیں دیکھنا۔“

میں نے گھر آ کر اماں کو بتا دیا۔

”ہاں اماں ندرت اچھی لڑکی ہے۔“

”چل شکر ہے کوئی تو پسند آئی۔“ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

پورا گھر میری اس شادی سے بہت خوش تھا اور میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ سب کچھ حاصل ہو رہا تھا مجھے۔

ندرت جیسی لڑکی قسمت والوں کو ہی ملا کرتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس قسم کی معصومیت اور پاکیزگی

زہد و تقویٰ سے بڑے متاثر رہتے۔ یہ شخص کپڑے بن کر روزی کھاتا تھا اور بقیہ وقت خدا کی عبادت اور ریاضت میں گزار دیتا۔ ان کی بود و باش لاہور میں تھی۔ اسی دوران ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ عثمان نے اس لڑکے کا نام حسین رکھ دیا۔

دین دار باپ نے سات سال کی عمر سے حسین کو حافظ ابو بکر نامی فاضل کے حلقہ درس میں بٹھا دیا اور استاد سے درخواست کی ”حسین کو قرآن پاک حفظ کرا دیجیے۔“

حافظ ابو بکر نے حسین میں جوہر قابل محسوس کر لیا اور نہایت شوق سے انہیں دینی تعلیم دینے لگے۔ حسین نے کچھ ہی عرصے میں چھ سات پارے حفظ کر لیے۔

حافظ ابو بکر درس و تدریس کا کام اپنی مسجد میں انجام دیتے تھے۔ انہی دنوں قادری سلسلے کے مشہور صوفی شیخ بہلول دریائی لاہور تشریف لائے۔ وہ ادھر ادھر رہتے پھرتے حافظ ابو بکر کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بہلول دریائی نے شریک درس لڑکوں کو دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا، بولے۔ ”لڑکو! تعلیم حاصل کرنے میں قال سے زیادہ حال پر توجہ دو، اگر کچھ حاصل کرنا ہے یا بنتا ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا مقصود حال ہی سے ہاتھ آئے گا۔“

حسین نے بہلول کی بات، دوسروں کے مقابلے میں زیادہ توجہ سے سنی اور پوچھا۔ ”حضرت! یہ قال اور حال کیا شے ہیں؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”ایک تو صرف باتیں بنانا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ آدمی اسے اپنے آپ پر طاری کر لے۔ پہلا قال ہے اور یہ دوسرا حال ہے۔“

حسین کو ان باتوں میں بڑا مزہ آیا۔

کچھ دیر بعد بہلول نے حسین سے کہا۔ ”بیٹے حسین! دریا سے وضو کے لیے پانی تولانا جا کر۔ خدا تیری عمر دراز کرے اور تجھے نیک رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

حسین ذرا سی دیر میں پانی لے آئے۔ بہلول نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد بہلول دریائی نے بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ ”اے خدا! حسین کو اپنا عاشق اور عارف بنادے۔ میری بڑی خواہش یہی ہے۔“

حسین نے یہ دعائی اور اسی دن آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔

بہلول، حسین پر خاص توجہ دے رہے تھے۔ ابھی بہلول کا قیام لاہور ہی میں تھا کہ رمضان آگئے۔ تراویح شروع ہو گئی۔ آپ نے حسین کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ رمضان شروع ہو چکے ہیں اور تراویح شروع ہو جائے گی۔“

حسین نے جواب دیا۔ ”جی حضرت! میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کوئی حکم؟“

بہلول نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں تراویح تو پڑھائے، میں تراویح میں امام تجھے بنانا چاہتا ہوں۔“

حسین نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”حضور مجھ پر جو کمر فرما رہے ہیں اس سے میں کس طرح عہدہ برآ ہوسکوں گا۔“

بہلول نے جواب دیا۔ ”تراویح میں امام میں اس لیے بننا ہوں کہ اس طرح میں تیرا قرآن بھی سن لوں گا۔“

حسین نے عرض کیا۔ ”جیسی حضور کی مرضی۔“

تراویح میں امام حسین کو بنادیا گیا اور بہلول دریائی مقتدی بن گئے۔

بہلول نے حسین کے حق میں دعا کی۔ ”اے میرے رب! میں حسین کا بھلا چاہتا ہوں، اسے اپنا عاشق اور عارف بنادے۔“

بہلول کی توجہ اور دعاؤں نے حسین کو چند ہی سالوں میں درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ حسین کو جو کچھ دینا تھا، دیا جا چکا ہے تو بہلول نے کہا۔ ”اب میں اپنے وطن چند یوٹ (چنیوٹ) واپس جاؤں گا۔“

حسین کو ملال ہوا، کہا۔ ”حضرت! اتنی جلدی! ابھی تو آپ ٹھہریے۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنا کام ختم کر چکا اس لیے مزید رکنا فضول ہے۔“

حسین نے بہ چشم پرہیز اپنے پیرومرشد کو رخصت کر دیا اور خود عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔



شیخ حسین نے اپنے پیرومرشد کے جاتے ہی ویرانے کی راہ لی اور وہاں ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہو گئے۔ ہاں، رات کو حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر آکر اعکاف میں بیٹھ جاتے۔ اسی دوران شیخ حسین نے کئی بار اعکاف کے دوران اپنے حجرے کو منور ہوتے دیکھا۔ یہ خوشی سے مست اور بے خود ہو جاتے کیونکہ انہیں اس عجیب و غریب روشنی کی بابت اچھی طرح

معلوم تھا کہ یہ ایک قسم کا فیضان ہے جو انہیں حاصل ہو رہا ہے۔ ایک دن تو بات کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ شیخ حسین نے اپنے حجرے میں دوران اعکاف ایک پیرومرشد کو داخل ہوتے دیکھا۔ انہوں نے استقبال کی خاطر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”حضرت! آپ؟“

پیرومرشد نے جواب دیا۔ ”ہاں میں، شیخ حسین یہ میں ہوں شیخ علی بھویری۔ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، مت پریشان ہو۔“

اب شیخ حسین نے شیخ سعد اللہ لاہوری کے گھر کا رخ کیا اور ان سے درخواست کی کہ تفسیر مدارک پڑھادیں۔ سعد اللہ لاہوری نے تپاک سے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں۔ آپ جب چاہیں تفسیر مدارک مجھ سے پڑھ لیں۔“

چنانچہ شیخ حسین نے سعد اللہ لاہوری کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا اور تفسیر مدارک پڑھنے لگے۔ شیخ حسین کی ایک عادت استاد کے لیے تکلیف دہ تھی۔ وہ یہ کہ شیخ حسین کو ہر بات کی تہ میں جانے کی عادت تھی، کیوں اور کیسے، وہ استاد کو عاجز کر دیتے تھے۔ ایک دن وہ قرآن کی آیت وما الحیوة والدنیا الا ہول و لعب پڑھ رہے تھے۔ شیخ حسین پڑھتے پڑھتے رک گئے، پوچھا۔ ”استاد محترم! ذرا اس کے معانی و مطالب تو بیان فرمادیجیے۔“

استاد نے شیخ حسین کی کیفیت سے یہ محسوس کر لیا کہ وہ عام حالت میں نہیں ہیں۔ جذب اور جلال ان کے چہرے سے عیاں تھا

استاد نے پوچھا۔ ”کون سے معانی و مطالب؟ قال کے یا حال کے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”میں قال نہیں چاہتا، حال چاہتا ہوں۔“

استاد نے کہا۔ ”حال میں نہیں جانتا۔“

شیخ حسین بیزاری سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اپنی کتابیں قریب کے کنویں میں پھینک دیں اور کہا۔ ”مجھے قال نہیں حال درکار ہے، جو آپ کے پاس ہے وہ مجھے درکار نہیں، جو مجھے درکار ہے اس سے آپ کو سروکار نہیں۔ میں تو چلا، خدا حافظ۔“

شریک درس دوسرے طلبہ نے شیخ حسین کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کہا۔ ”جناب! کتابیں کنویں میں پھینک کر کہاں چلے؟ اگر آپ کو درس گاہ سے بھاگنا ہی تھا تو کتابوں کو چاہہاں برد کرنے سے آپ کو کیا حاصل ہوا؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”میں ان کتابوں کا کیا کرتا؟ جب مجھے ان سے کچھ حاصل ہی نہیں ہو رہا تھا تو میرے نزدیک ان کا غرقِ چاہ کر دینا ہی بہتر تھا۔“

ایک طالب علم نے کہا۔ ”واہ جناب، یہ کیا دلیل دی؟ یہ کتابیں تمہارے لیے مخصوص تو نہیں تھیں۔ انہیں تم نہ پڑھتے، ہم لوگ پڑھتے لیکن کنویں میں ڈال دینے سے یہ کسی کے بھی کام کی نہیں رہیں۔“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”لوگو! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم سب محض کتاب کے کیڑے ہو، اگر تمہیں یہ کتابیں درکار ہیں تو میں انہیں کنویں سے ابھی نکالے دیتا ہوں۔“

کسی دوسرے لڑکے نے کہا۔ ”لیکن اب وہ کتابیں ہمارے کام کی نہیں رہیں، کیونکہ اول تو ان کا کاغذ ہی بھیک بھاگ کر تباہ ہو چکا ہوگا اور بغرض محال اگر کوئی کاغذ بچا بھی ہوگا تو اس کی سیاہی دھل گئی ہوگی۔ سادے کاغذ ہمارے کس کام کے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”لیکن میں پھر بھی ان کتابوں کو کنویں سے نکالے دے رہا ہوں۔“

اس کے بعد شیخ حسین کنویں میں اتر گئے اور کچھ دیر بعد ساری کتابیں لے کر اوپر آگئے۔ ان کے استاد اور دوسرے شریک درس طلبہ نے حیرت سے دیکھا کہ ساری کتابیں صحیح سلامت تھیں اور ان پر پانی کا اثر نہیں ہوا تھا۔ استاد نے حیرت سے پوچھا۔ ”شیخ حسین! یہ کیا ہے؟ یہ کتابیں بھیگی کیوں نہیں؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”آپ کو اس کا جواب میں قال میں نہیں دے سکتا، حال میں دے سکتا ہوں۔“

استاد نے حیرت سے پہلے تو کتابوں کی طرف نظر ڈالی، اس کے بعد شیخ حسین سے کہا۔ ”اب میں تجھ سے کیا سوال کروں، ہم دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔“

شیخ حسین نے خلاف معمول اور توقع کے برعکس ناچنا شروع کر دیا۔ استاد کو ان کی اس حرکت پر اور زیادہ حیرت ہوئی، دوڑ کر شیخ حسین کو سینے سے لگانے کی کوشش کی لیکن یہ اس سے پہلے ہی باہر نکل گئے۔ انہوں نے سر، ڈاڑھی، مونچھ اور ابرو کا صفایا کرادیا اور شراب پینے لگے۔ ناچ گانے کی محفلوں میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ کچھ لوگوں کو آپ کی اس حالت سے عبرت ہوئی اور آپس میں کہنے لگے۔ ”جناب! کتنے افسوس کی بات ہے کہ اچھا خاصا نوجوان ابہو و لعب میں پڑ گیا۔“

کسی دوسرے نے کہا۔ ”آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔“

لیکن تیسرے نے اس سے اختلاف کیا، کہا۔ ”نہیں جناب، آپ لوگ شیخ حسین کے ظاہر پر جا رہے ہیں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیخ حسین فرقہ ملائیہ میں داخل ہو گئے ہیں، جن کی بابت حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ ہر دعویٰ اور صاحب عزت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کی طرف سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں لیکن تکلف سے ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لوگ ان سے متغیر ہو جاتے ہیں اور ان سے دور دور رہنے لگتے ہیں اور انہیں برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ ان کا حلق فرقہ ملائیہ سے ہوتا ہے اور ان پر ہر طرف سے لعنت ملامت ہونے لگتی ہے۔“

کسی اور نے کہا۔ ”بھائی! لوگوں کا حال خدائی بہتر جانتا ہے لیکن یہ ظاہر شیخ حسین گمراہ نظر آتے ہیں۔“

کسی اور نے اپنے دونوں گال تھپتھپائے اور توبہ تلا کرتا ہوا بولا۔ ”جناب! یہ کیسی گستاخی فرما رہے ہیں آپ ایک عظیم المرتبت درویش کی شان میں۔ خدا سے ڈریے اور توبہ کیجیے۔“

بازاروں، گلی کوچوں اور گھروں میں شیخ حسین پر اسی قسم کے متضاد تبصرے ہو رہے تھے اور شیخ حسین ان سب سے بے نیاز لہو لعل میں مشغول تھے۔

یہ بات نہیں تھی کہ شیخ حسین تنہا رہتے ہوں، ان کا خاصا بڑا حلقہ احباب تھا اور یہ سارے دوست بھی انہی جیسے تھے۔ رقص و سرود کے عاشق، عورتوں کے رسیا، شراب کے عادی اور دلدادہ۔ یہ ان سب کے ساتھ ہا ہو کرتے رہتے۔ ان دنوں لاہور اور اس کے مضافات والے بارش نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ان کے دوستوں نے کہا۔ ”یار حسین! گرمی نے بہت پریشان کر رکھا ہے، چلو، راوی کی سیر کریں۔“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”ہم تو یاروں کے یار ہیں، جہاں کہو چلے چلیں گے۔ چلو ابھی چلو، دیر کس بات کی؟“

ان کے ساتھی تو تیار ہی بیٹھے تھے، وہ شیخ حسین کو ساتھ لے کر دریائے راوی کی طرف نکل گئے۔ گھومتے پھرتے موضع منڈیاں والہ میں داخل ہو گئے۔ لوگوں میں شور مچ گیا کہ شیخ حسین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آیا ہے، وہی شیخ حسین جو بھول دریا کی کا مرید ہے اور اپنے اعمال اور کردار کے اعتبار سے ملعون اور مطعون ہے۔

منڈیاں والہ کے زمیندار سردار بہادر خان کے کانوں میں بھی یہ آواز پہنچی۔ وہ بھاگا بھاگا آپ کے پاس آیا اور آپ سے خوشامداندہ درخواست کی۔ ”حضرت! جب آپ نے یہاں تک قدم رنج فرمایا ہے تو میرے غریب خانے تک بھی تشریف لے چلیں۔ بندہ بہت ہی شکر گزار ہوگا۔“

شیخ حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ساتم نے؟ یہ فریجی مجھے گرفتار کرنے کی فکر میں ہے۔“

سردار بہادر خان نے عاجزی سے درخواست کی۔ ”حضرت! آپ کے جی میں جو بھی آئے، فرماتے رہیں، میں درویشوں کی بات کا برا نہیں مانتا۔ اس وقت تو میں آپ کو اپنے غریب خانے تک لے کر ہی جاؤں گا۔“

شیخ حسین نے کہا۔ ”اچھا چل، میں تجھ پر اعتبار کرتا ہوں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔“

سردار بہادر خان انہیں ان کے ساتھیوں کے ہمراہ لے کر چلا اور پھر ان کے دوستوں کو دھوکے سے کسی جگہ قید کر دیا۔ شیخ حسین کو جس جگہ رکھا گیا تھا، ان کے دوست وہاں سے دور تھے۔ شیخ حسین دوستوں کی پروا کیے بغیر اپنے حال میں مگن مزے لیتے رہے۔ آخر ایک دن جو انہیں دوستوں کا خیال آیا تو سردار بہادر خان سے پوچھا۔ ”جناب! کیا بات ہے؟ میرے دوست احباب کہاں ہیں؟“

سردار بہادر خان نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”جناب والا! وہ تو میں یہ طے کر کے گھر سے نکلا تھا کہ جب آپ میرے ہتھے چڑھیں گے تو میں آپ کے دوستوں کو قید خانے میں ڈال کر آپ سے درخواست کروں گا کہ بارش کی دعا فرمائیے اور جب تک آپ دعا نہیں فرمائیں گے، آپ کے دوست میرے پاس پرغالب رہیں گے۔“

شیخ حسین نے داویلا کیا، فرمایا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں دعائے استسقا کروں اور تم لوگ مزے میں مجھ سے تفریح لیتے رہو۔“

”حضور! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، میں اور آپ سے تفریح لوں۔ ناممکن ناممکن۔“

آپ نے کہا۔ ”پھر یہ جو کچھ تو نے کیا، اس کا مقصد؟“

سردار بہادر خان نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”یہ کہ آپ دعائے استسقا فرمادیں۔“

اس کے باوجود کہ آپ کی زندگی تقویٰ سے دور، لہو لعل میں گزر رہی تھی۔ مرید ہونے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آپ کی خدمت میں دور دور سے لوگ آتے اور زیارت اور بیعت کر کے واپس جاتے۔ اس دوران حاجی یعقوب نامی ایک شخص مدینہ منورہ سے لاہور آیا۔ اس نے لوگوں سے شیخ حسین کی بزرگی اور کرامت کے بڑے قصے سن رکھے تھے۔ اس نے ایک شخص کو پکڑ لیا اور درخواست کی کہ مجھے شیخ حسین کے پاس لے چلو کیونکہ میں نے ان کا بڑا شہرہ سنا ہے۔

اس شخص نے جواب دیا۔ ”جناب میں شیخ حسین کے پاس آپ کو ضرور پہنچا دوں گا لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ کہاں سے تشریف لارہے ہیں؟“

حاجی یعقوب نے کہا۔ ”جناب والا! میں مدینہ منورہ سے آ رہا ہوں۔“

لوگوں نے حاجی یعقوب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ ”جناب والا! آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اقامت اور رہائش کے لیے دیار نبی ﷺ ملا ہوا ہے۔“

حاجی یعقوب نے جواب دیا۔ ”اتنا برا میں بھی نہیں سمجھتا اپنے آپ کو لیکن جب تک میں شیخ حسین کو دیکھ نہ لوں، ان کے بارے میں کسی قسم کی رائے نہیں دوں گا۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”میں آپ کو ان کے پاس پہنچائے دے رہا ہوں، آئیے میرے ساتھ۔“

جب یہ دونوں شیخ حسین کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ چند بارش حضرات شرفِ مریدی حاصل کرنے آئے ہوئے تھے اور شیخ حسین انہیں سمجھا رہے تھے۔ ”کیا تم لوگ میری شکل نہیں دیکھ رہے ہو؟“

ان دونوں نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں آپ کی شکل دیکھ رہے ہیں۔“

شیخ حسین نے کہا۔ ”جب تم دونوں میری شکل دیکھ رہے ہو تو یہ بھی دیکھ رہے ہو گے کہ میرے چہرے پر ڈاڑھی مونچھے ہے یا نہیں؟“

شیخ حسین کے مخالفوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک طرف تو ان کے مریدوں میں اضافہ ہو رہا تھا، دوسری طرف حاسدوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ حاسدوں نے آپ کا زور توڑنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ چند مخالفوں نے بادشاہ کے دربار کا رخ کیا۔ یہ اکبر اعظم کا زمانہ تھا۔ حاسدوں میں چونکہ بااثر لوگ بھی شامل تھے اس لیے بادشاہ نے انہیں طلب کر لیا۔ بادشاہ نے ان لوگوں سے پوچھا۔ ”آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ اور تم سب حسین نامی ملائی درویش سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟“

حاسدوں کے نمائندے نے جواب دیا۔ ”وہل اللہ! ہمیں شیخ حسین سے کوئی عداوت نہیں، ہاں اگر کسی بات کا دکھ ہے تو یہ کہ شیخ حسین درویشی کو بدنام کر رہا ہے۔ وہ اسلام کو ذلیل کر رہا ہے۔ جہاں پناہ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کسی درویش پر نماز اور روزہ کس طرح معاف کیا جاسکتا ہے۔ امر پرستی کس مذہب میں جائز ہے؟ غرض شیخ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے اور جب وہ سب شریعت کے مطابق نہیں ہے تو اسے درویش کس طرح مان لیا جائے؟“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”یہ امر دہشتی کا کیا چکر ہے؟“

جواب ملا۔ ”جہاں پناہ! مادھو نامی ایک ہندو حسین و جیل لڑکا ہر وقت شیخ حسین کے ساتھ رہتا ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مادھو نے شیخ حسین کی محبت میں اپنا مذہب ترک کر دیا ہے اور اسلام اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو ملک و ملت کے خلاف ہیں اور ان کا کسی نہ کسی طرح تدارک ہونا چاہیے۔“

اکبر نے جواب دیا۔ ”تم لوگ واپس جاؤ، میں شیخ حسین کے پاس آدی بھیجوں گا، وہ تمہاری بتائی ہوئی باتوں کی تحقیقات کرے گا اور اگر یہ باتیں درست نکلیں تو شیخ حسین پر حد شرعی جاری کر دی جائے گی اور اس کے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔“

حاسد خوش خوش واپس چلے گئے کہ چلو معاملہ نمٹا اور شیخ حسین کا کام تمام ہوا۔ انہوں نے آپس میں مبارکبادیں دیں کہ آخر انہوں نے اپنے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو نچا دکھائی دیا۔

اکبر نے مخدوم الملک قاضی عبداللہ سلطان پوری، قاضی لاہور کو ایک تحریری فرمان جاری کیا کہ وہ فرمان کے ملتے ہی وہاں کے مشہور صوفی شیخ حسین سے ملاقات کریں اور دیکھیں کہ ان کے بارے میں جو خبریں گشت کر رہی ہیں ان میں کتنی صداقت ہے اور شیخ حسین کس حد تک فتنہ و فساد پھیلانے کا موجب قرار پاتا ہے۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بے انتہا مال و زر رکھنے کے باوجود نہ تو حج کرتے ہیں، نہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان دونوں فرائض سے بچنے کا یہ حیلہ شرعی وضع کر لیا ہے کہ ہر سال رمضان سے پہلے ہی اپنا مال و زر اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتے ہیں اور دوسرے سال اسے اپنے نام منتقل کر لیتے ہیں اس طرح اس مال و زر پر نہ سال پورا ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر حج اور زکوٰۃ واجب آتا ہے۔ ان کی اس حرکت کا بہتوں کو علم تھا لیکن کوئی کچھ کہتا نہیں تھا۔

مخدوم الملک نے شاہی فرمان کے پاتے ہی سواری تیار کی اور شیخ حسین کے پاس روانہ ہو گئے۔ ابھی ان کی سواری بازاری میں تھی کہ انہوں نے بازار میں ایک جگہ ہجوم دیکھا۔ اس ہجوم میں ڈھول بج رہا تھا اور ہجوم کوئی تماشا دیکھنے میں مشغول تھا۔ مخدوم الملک نے اپنے خادم سے کہا۔ ”ذرا معلوم تو کرنا یہ کیا ہو رہا ہے؟“

خادم بھاگا بھاگا ہجوم میں داخل ہو گیا اور ذرا دیر بعد واپس آ کر جواب دیا۔ ”حضور والا! ہجوم میں یہاں کے مشہور درویش شیخ حسین رقص کر رہے ہیں اور یہ ڈھول ان کے حکم پر بجایا جا رہا ہے۔“

مخدوم الملک نے سواری کا رخ ہجوم کی طرف کر دیا۔ ہجوم نے قاضی شہر کی سواری کو دیکھ کر راستہ دے دیا۔ مخدوم الملک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شیخ حسین رقص میں مشغول ہیں۔ انہوں نے ڈانٹا۔ ”شیخ حسین! تو یہ کیا کر رہا ہے؟“

شیخ حسین رک گئے۔ رقص موقوف ہوا، مخدوم الملک کو دیکھ کر مسکرائے، کہا۔ ”خوش آمدید تارک حج و زکوٰۃ۔“

مخدوم الملک نے سختی سے سوال کیا۔ ”تو یہ جو کچھ برسر عام کر رہا ہے، کیا یہ تجھے زیب دیتا ہے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”جب تک یہ سب مجھے زیب دیتا ہے میں اس کا برسر عام اظہار کرتا رہوں گا اور جس دن یہ محسوس کروں گا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تو یہ کام نہ خلوت میں ہو گا نہ جلوت میں۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بھی دیکھ رہے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آپ چار ابرو کا صفایا کیے ہوئے ہیں۔“

شیخ حسین نے قدرے غصے سے کہا۔ ”جب تم دونوں سب کچھ دیکھ رہے ہو تو یہ اپنے اپنے چہروں پر موم چسپیں اور ڈاڑھیاں کیوں سجا رہی ہیں؟ انہیں صاف کرا کے میرے پاس آؤ۔“

ان دونوں کو تذبذب ہوا تو آپ نے مزید فرمایا۔ ”اور ہاں، ایک بات اور اپنے اپنے ذہنوں میں بٹھالو۔ میں رقص و سرود سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں شاہان بازاری کا بھی رسیا ہوں، ان کا بھی فوراً ہی انتظام کر دیا جائے۔“

ان دونوں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ ”واہ جناب! یہ تو ایک ہی رہی۔ اگر آپ کا یہی اصرار ہے تو ہم آپ کی ہر شرط پوری کر دیں گے۔“

انہوں نے کہا۔ ”اور میں شراب بھی پیتا ہوں۔“

دونوں مریدوں نے جواب دیا۔ ”شراب بھی فراہم کر دی جائے گی۔“

حاجی یعقوب یہ منظر دیکھتا رہا۔ جو شخص حاجی یعقوب کو لے کر آیا تھا، وہ حاجی یعقوب کے چہرے پر نظریں جمائے یہ اعزاز لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سامنے جو کچھ پیش آ رہا ہے اس کا حاجی یعقوب کے دل پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ آخر جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے حاجی یعقوب سے پوچھا۔ ”کیوں جناب، کیا اثر لیا آپ نے؟“

حاجی یعقوب کے چہرے پر حیرتوں کی پلنگا تھی، اس نے کہا۔ ”جناب میں بڑی دیر سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس وقت میری نظروں کے سامنے شیخ حسین نامی جو شخص ہے یہ وہی ہے جسے میں رسول مقبول ﷺ کے مزار اقدس میں محکف دیکھ چکا ہوں یا کوئی اور ہے۔“

حاجی یعقوب سے سوال ہوا۔ ”پھر آپ کس نتیجے پر پہنچے؟“

حاجی یعقوب نے جواب دیا۔ ”یہ دونوں ایک ہی ہیں مگر اب اس پر حیران ہوں کہ یہ دونوں ایک کس طرح ہو سکتے ہیں، اس شخص کا کردار اور اس کے اعمال ایسے تو نہیں ہیں کہ اسے مزار اقدس میں محکف ہونے کا شرف حاصل ہو سکے۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دونوں مرید اپنی ڈاڑھیاں اور مونچھیں صاف کرا کے آ گئے۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں شراب کے پیالے بھی تھے۔ شیخ حسین نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ ”واللہ تم دونوں نے میرا جی خوش کر دیا۔“

شیخ حسین نے ان دونوں کو مرید کر لیا، دونوں کے پیالوں سے تھوڑی تھوڑی شراب پی اور پھر یہ جھوٹی شراب دونوں مریدوں کو پلا دی اور جوش مسرت میں اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے مرید بھی ہو لیے۔ بازار میں شیخ حسین کو نشے میں چور دیکھ کر ڈھول تاشے والوں نے بجانا شروع کر دیا۔ ڈھول تاشے کی آواز نے شیخ حسین کو اور زیادہ بدست کر دیا۔ اس کی آواز پر رقص کرنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے مریدوں نے بھی رقص کرنا شروع کر دیا۔

حاجی یعقوب یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ یہ اس کا خواب ہے یا واقعہ؟ آخر حاجی یعقوب برداشت نہ کر سکا، شیخ حسین کے قریب جا کر پوچھا۔ ”جناب! گستاخی معاف، مجھے تو آپ صریحاً فاسق و فاجر نظر آ رہے ہیں لیکن میں نے آپ کو کہیں اور بھی دیکھا ہے اور جب ان دونوں کو نیکیا کرتا ہوں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے حق جانوں اور کسے جھوٹ؟“

شیخ حسین نے سر کو جھٹک دیا اور آنکھیں کھول کر حاجی یعقوب کی طرف دیکھا، بولے۔ ”اے شخص! تیرا نام حاجی یعقوب ہی ہے نا؟“

حاجی یعقوب نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ کو میرا نام بھی معلوم ہے؟“

شیخ حسین نے کہا۔ ”ہاں، میں تیرے نام سے واقف ہوں اور اس شخص کو بھی جانتا ہوں جس کو تو میری ذات میں تلاش کر رہا ہے۔“

حاجی یعقوب نے پوچھا۔ ”میں آپ کی ذات میں کس کو تلاش کر رہا ہوں؟“

آپ نے حکم دیا۔ ”اپنی آنکھیں بند کر لے۔“

حاجی یعقوب نے آنکھیں بند کر لیں لیکن اسی وقت دل کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ شیخ حسین کو مدینہ منورہ میں روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر محکف دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے کہا۔ ”تو اس شخص کو مجھ میں تلاش کر رہا تھا شاید؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”اس کو فوراً ہی پھانسی دے دی جائے، کیونکہ اگر وہ چھوٹ گیا تو لوگوں کو پہلے سے زیادہ ہنگ کرے گا۔“

کوٹوال حکم پا کر جانے لگا تو بادشاہ نے اسے روک لیا اور کہا۔ ”ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔“

کوٹوال نے عرض کیا۔ ”حضور کی ہر بات خاص خیال میں رکھنے کے لائق ہوتی ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”جب تو عبد اللہ بھٹی راہزن کو پھانسی دینے لگے تو اس وقت اس کی مزاحیہ کیفیت بالکل مختلف ہوگی۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ جو کچھ کہے تو انہیں من و عن لکھ کر میرے پاس بھیج دے گا۔“

کوٹوال نے جواب دیا۔ ”جیسا حضور کا حکم۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اور اس کام سے فارغ ہو کر تو شیخ حسین کو گرفتار کرے گا پھر میں جو حکم دوں گا تو اس کی تعمیل کرے گا۔“

کوٹوال چلا گیا۔ اس نے عبد اللہ بھٹی راہزن کو قید خانے سے نکالا اور طنزاً کہا۔ ”اوبد بخت انسان! کیا تجھے معلوم ہے کہ بادشاہ نے تیرے لیے کیا حکم دیا ہے؟“

راہزن نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا پتا؟ جب تو بتائے گا تبھی تو میں جانوں گا۔“

کوٹوال نے کہا۔ ”بادشاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فوراً ہی تجھے پھانسی دے دوں کیونکہ تیری زندگی میں ہمیشہ یہ اندیشہ موجود رہے گا کہ اگر تو کسی طرح رہا ہو گیا تو اللہ کی مخلوق پر پہلے سے کہیں زیادہ ظلم و جور کرے گا۔“

راہزن سزائے موت کا حکم سن کر سناتے میں آ گیا، بولا۔ ”اکبر کہنے کو تو بادشاہ ہے لیکن ہے بڑا کمین۔ اتنا بڑا بادشاہ اور ایک راہزن کے وجود سے یوں گھبراتا ہے گویا میں اس سے بھی بڑا راہزن ہوں۔ خدا چھوٹے راہزن جیسا بڑے راہزن کا بھی حشر کرے۔“

کوٹوال نے راہزن کے آخری کلمات لکھ لیے اور اسے پھانسی دے دی۔ بادشاہ کو ساری روداد لکھ کر روانہ کر دی اور اس کے فوراً بعد شیخ حسین کی طرف متوجہ ہوا۔ شیخ کا کہیں پتا نہ تھا۔ آخر ایک بازار میں اس نے لوگوں کا جھوم دیکھا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا۔ ”یہ جھوم کیسا ہے؟“

کسی نے جواب دیا۔ ”جناب کوٹوال صاحب! اپنے شیخ حسین حالت وجد میں رقص فرما رہے ہیں۔“

مارے خوشی کے کوٹوال کی باپاں کھل گئیں۔ اپنے سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا اور جھوم کو منتشر کر دیا۔ کوٹوال نے شیخ حسین کو لکارا۔ ”حسین! خبردار جو بھاگنے کی کوشش کی۔ میں بادشاہ کے حکم پر تجھے گرفتار کرنے آیا ہوں۔“

شیخ حسین نے ہنس کر کوٹوال کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”حیرت کہ مردہ زندہ کو گرفتار کر رہا ہے۔ غلام، آزاد کو پکڑ رہا ہے۔“

کوٹوال پر ان کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا، بولا۔ ”جو کچھ کہنا سننا ہے خوب اچھی طرح کہہ سن لے، پھر بولنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔“

شیخ حسین نے پوچھا۔ ”کیا تو گرفتار کر کے میری قوت گویائی بھی چھین لے گا؟“

کوٹوال نے جواب دیا۔ ”میں کیوں چھیننے لگا تیری قوت گویائی، یہ اختیار تو بادشاہ کو ہے، وہ جو حکم دے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔“

شیخ حسین نے پوچھا۔ ”یہ اختیار کس کی ذات کو ہے؟ تیرے بادشاہ کو یا کل جہان کے بادشاہ کو؟“

کوٹوال نے جواب دیا۔ ”سردست تو میں اکبر بادشاہ کو جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے تیرے بارے میں کیا حکم دیا ہے یا کیا حکم دے گا؟“

شیخ حسین نے ہنس کر کوٹوال کا مذاق اڑایا۔ ”کوٹوال! تیرا دماغ چل گیا ہے، یہاں ایک ہی بادشاہ کا حکم چلتا ہے، اکبر بادشاہ کا نہیں۔ اکبر بادشاہ تو خود نہیں جانتا کہ اس سے بڑے بادشاہ نے کیا حکم دے رکھا ہے۔“

کوٹوال نے کہا۔ ”مجھے لوگوں نے پہلے ہی سے یہ بتا دیا ہے کہ تو شعبدے باز بھی ہے اور باتیں بھی پر اسرار اور چکر میں ڈال دینے والی کرتا رہتا ہے۔“

شیخ حسین نے کہا۔ ”اچھا پھر جو تیری سمجھ میں آئے، کر۔“

کوٹوال نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انہیں زنجیروں سے جکڑ دیا جائے۔

سپاہی زنجیر لے کر آگے بڑھا اور شیخ حسین کو زنجیروں سے جکڑنے لگا لیکن جیسے ہی زنجیر ان کے جسم سے لگی، ٹوٹ کر نیچے گر

مخدوم الملک نے پوچھا۔ ”کیا تو درویشی کا دعوے دار ہے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”میں کسی بات کا بھی دعوے دار نہیں، نہ درویشی کا نہ قلندری کا۔“

مخدوم الملک نے کہا۔ ”مجھے آج ہی فرمان شاہی موصول ہوا ہے اور اس میں مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تیرے اقوال، افعال، احوال اور اعمال سے بادشاہ کو مطلع کروں۔“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”اقوال تو تو نے سن لیے کہ میں نے تجھے دیکھتے ہی خوش آمدید تارک حج و زکوٰۃ کہہ کر مخاطب کیا۔ اب رہا افعال کا مسئلہ تو میرا ایک فعل تو تیرے سامنے ہے تو بقیہ کا بھی کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ رہا میرے اعمال اور احوال کا مسئلہ تو

یہاں تک تیری رسائی نہیں، ان پر پردہ ہی بڑا رہنے دے۔“

مخدوم الملک نے غصے میں کہا۔ ”شیخ حسین! میں قاضی شہر ہوں۔ مجھ سے تمسخر نہ کر اور میری باتوں کے صحیح صحیح جواب دے۔“

شیخ حسین نے مخدوم الملک کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور پوچھا۔ ”عبد اللہ! تو قاضی شہر ہے اور خوب جانتا ہوگا کہ ارکان اسلام کتنے ہیں؟ اگر نہ معلوم ہوں تو مجھ سے پوچھ لے۔“

مخدوم الملک نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ارکان اسلام کتنے ہیں؟ یہ بچکانا سوال مجھ سے مت کر۔“

شیخ حسین نے پھر سوال کیا۔ ”ارکان اسلام کتنے ہیں قاضی شہر؟ ان کی تفصیل تو سناتا۔“

مخدوم الملک نے جواب دیا۔ ”پانچ، اول کلمہ توحید، دوم اقرار، رسالت حضرت سرور کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم، سوم صوم و صلوٰۃ، چہارم زکوٰۃ، پنجم حج۔“

شیخ حسین نے سینے میں اتر جانے والی نظروں سے مخدوم الملک کو دیکھا اور کہا۔ ”مخدوم الملک! ابتدائی دور کن کلمہ توحید اور اقرار رسالت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہم دونوں ہی شریک ہیں لیکن بقیہ میں سے نماز اور روزے کا میں تارک ہوں اور حج و زکوٰۃ کا تو۔ اگر کوئی تعزیر ہے تو صرف مجھ پر ہی نہیں تجھ پر بھی ہے۔ تو بادشاہ کو لکھ دے کہ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں، یکساں ہیں۔“

مخدوم الملک اس جواب سے چکرا گیا، پھر مسکرایا اور اپنے گھر واپس چلا گیا۔ اس نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ میں نے شیخ حسین سے ملاقات کی، وہ ایک مست و مدہوش درویش ہے اور مستوں پر کوئی تعزیر نہیں۔ اس ناچیز کی ذاتی رائے کے مطابق شیخ حسین کو اس کے

حال پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔

حاسدوں کا یہ حربہ بے کار گیا تو انہوں نے پھر بادشاہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے حسین ابن منصور حلاج کی مثال دی اور بادشاہ پر واضح کیا کہ عہد بنو عباس کا حسین بھی تو مست و مدہوش تھا۔ اس پر بھی حد شرعی جاری کر دی گئی تھی، پھر شیخ حسین کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟

اکبر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ شیخ حسین کے خلاف کوئی کارروائی کس طرح عمل میں لائی جائے؟ اس نے یہ مسئلہ اس وقت تک کے لیے التوا میں ڈال دیا جب تک کہ وہ خود لاہور نہ پہنچ جائے۔

لاہور میں داخل ہوتے ہی بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ دو آدمیوں نے لاہور کے اہل ایمان اور شرفاء کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”وہ دو کون کون سے؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”عبد اللہ بھٹی راہزن اور شیخ حسین درویش۔ ایک تو لوگوں کے مال و زر کو لوٹ رہا ہے اور اس کی موجودگی میں کسی بھی شخص کا مال و زر محفوظ نہیں ہے اور دوسرے کی وجہ سے اہل اللہ اور اہل ایمان کے عقائد محفوظ نہیں ہیں۔“

بادشاہ نے شہر کے کوٹوال کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تو عبد اللہ بھٹی راہزن کو گرفتار کیوں نہیں کر پاتا؟“

کوٹوال نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”حضور کے اقبال سے یہ راہزن کئی بار قابو میں آتے آتے رہ گیا لیکن حضور کے قدم جیسے ہی لاہور میں داخل ہوئے، یہ ناچیز عبد اللہ بھٹی راہزن کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ میری قید میں ہے اور اس کے بارے میں حضور جو حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔“

حسین نے بادشاہ سے پوچھا۔ ”میری بے نوشی بادشاہ نے ملاحظہ فرمائی؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایک ہی صراحی سے یہ تین چیزیں کس طرح برآمد ہو سکیں؟“
شیخ حسین نے کہا۔ ”اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں اور نہ ہی شاعی قانون مجھ سے مواخذہ کر سکتا ہے کہ میں نے اس سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”بیشک آپ نے جو کچھ فرمایا، بجائے لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے خود کو بدنام کیوں کر رکھا ہے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”بادشاہ! میں اپنے آس پاس عقیدت مندوں کا اثر و حام نہیں پسند کرتا۔ میں چاہتا ہوں، لوگ میری پرستش نہ کریں۔ پرستش کے لیے خدا کی ذات کافی ہے۔ میں خود کو بدتر از خلق اس لیے ثابت کرتا ہوں کہ میں بندہ ہوں اور بندہ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مخلوق کا کیا ہے یہ گھڑی بھر میں خالق بنا سکتی ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے، جب تک میں اچھی طرح تحقیق اور غور نہ کر لوں، شیخ حسین کو نہ تو کوئی سزا دے سکتا ہوں اور نہ ہی رہا کر سکتا ہوں۔“

بادشاہ کا یہ حکم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ عام اور خاص، سب کا یہی خیال تھا کہ بادشاہ کے دل پر شیخ حسین کی کرامت اور باتوں کا اثر ضرور ہوا ہوگا اور بادشاہ ان کے احترام اور رہائی پر مجبور ہو جائے گا لیکن جب بادشاہ نے شیخ حسین کو داخل زنداں کرنے کا حکم دیا تو حیران رہ گئے۔

بادشاہ شیخ حسین کو داخل زنداں کرا کے زنان خانے میں چلا گیا۔ وہاں بادشاہ بیگم کے پاس اس نے کسی کو کھڑے دیکھا۔ زنان خانے میں کسی غیر مرد کا کس طرح گزر ہو سکتا تھا۔ بادشاہ غصے میں آگے بڑھا اور بادشاہ بیگم سے پوچھا۔ ”بادشاہ بیگم! یہ کون کھڑا ہے تیرے پاس؟“

بادشاہ بیگم نے مڑ کر بادشاہ کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ بادشاہ نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ شیخ حسین تھے جو چپ چاپ بادشاہ بیگم کے پاس کھڑے تھے۔ بادشاہ تو انہیں داخل زنداں کر آیا تھا، پھر یہ یہاں کس طرح آگئے؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔ وہ زنان خانے سے باہر چلا گیا اور حکم دیا کہ میں قید خانے میں شیخ حسین سے ملنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ کو اسی وقت قید خانے کا معائنہ کرایا گیا۔ وہاں شیخ حسین موجود تھے۔ بادشاہ نے کہا۔ ”شیخ حسین! تم جو کچھ بھی ہو میں جانتا ہوں، پھر اس کرامت کی کیا ضرورت تھی؟“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”اگر تو مجھ سے واقعی واقف ہوتا تو مجھے اس کرامت کی ضرورت نہ پیش آتی۔ بادشاہ! سچ بتا، کیا تو نے مطمئن ہونے کے بعد بھی مجھے اس خیال سے داخل زنداں نہیں کرایا تھا کہ تیرے دل میں یہ ذرا سا شبہ اس وقت بھی موجود تھا کہ اگر میں واقعی کچھ ہوں تو زنداں میں ڈال دیے جانے کے بعد کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار ہو جائے گا۔“

بادشاہ نے شرمندگی سے کہا۔ ”بیشک، میں نے آپ کی بابت کچھ اسی طرح سوچا تھا اور اب اس پر شرمندہ ہوں۔“

شیخ حسین نے کہا۔ ”اب اپنی شرمندگی دور کر لے اور اپنا اور میرا وقت نہ ضائع کر۔ مجھے جانے دے۔“

بادشاہ نے اسی وقت شیخ حسین کو رہا کر دیا۔
اس واقعے کے بعد چاروں طرف یہ بات مشہور ہونے لگی کہ شیخ حسین نے صراحی توڑ دی، پیالہ پھینک دیا۔ رقص و سرود سے منہ موڑ لیا اور صوم و صلوة کے پابند ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے آپ کے ارد گرد میلا سا لگا دیا لیکن آپ نے انہیں منع کیا کہ اگر خود کچھ نہیں کرتے تو ایک درویش کے اوقات بندگی میں خلل بھی نہ ہوں۔

اسی دوران عبدالرحیم خان خاناں کو ٹھنڈ کی تسخیر پر مامور کر دیا گیا۔ خان خاناں سید حالہ اور پنچا اور آپ کی خدمت میں حاضری دی، بولا۔ ”حضرت! میرا خیال ہے مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ کی خدمت میں کیوں حاضر ہوا ہوں۔“
شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”اپنا کام بتا، میرا وقت نہ برباد کر، جہاں اور جس مقصد سے جا رہا ہے، چلا جا لیکن ایک بات میری بھی یاد رکھ۔“

گئی۔ کوتوال نے حکم دیا۔ ”دوسری زنجیر سے جکڑ دیا جائے۔“
دوسری زنجیر لائی گئی اور شیخ حسین کو اس سے جکڑنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ بھی ٹوٹ گئی۔ اب سپاہیوں کو خوف محسوس ہونے لگا اور وہ پیچھے ہٹ گئے، بولے۔ ”جناب! ہم اس درویش کے عتاب میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔“

کوتوال نے ان سب کو ڈانٹا اور کہا۔ ”تم سب ہٹ جاؤ، تم وہی ہو، حالانکہ تمہیں یہ بات پہلے سے معلوم ہونا چاہیے تھی کہ شیخ حسین لاہور کا بہت بڑا شہیدے باز ہے۔“ پھر شیخ حسین سے کہا۔ ”تو اپنے شہیدوں سے جو چاہے کر لیکن میں تجھے بھانسنے نہیں دوں گا، میں تیرے پاؤں میں میخیں ٹھونک دوں گا اور اسی حالت میں تجھے بادشاہ کے روبرو پیش کروں گا۔“

شیخ حسین مسکرائے بولے۔ ”خوب! جو بات تیرے ساتھ پیش آنے والی ہے اس کو تو مجھ سے منسوب کر رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے خدا سے یہ درخواست کی ہے کہ خدا یا تو شہر کوتوال کے جسم میں میخیں ٹھنکوا دے اور تیرا اسی صدمے سے انتقال ہو۔ تو اپنے بادشاہ سے اس قسم کی کوئی درخواست کر، مجھے یقین ہے کہ وہ تیری درخواست نہیں مانے گا لیکن میرا بادشاہ جو کل جہانوں کا اور سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے میری درخواست نہیں رد کرے گا کیونکہ میں جو کچھ درخواست کرتا ہوں اس کی ایما اور خواہش پر کرتا ہوں۔“
کوتوال نے ہنس کر کہا۔ ”تو واقعی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ مخدوم الملک نے بادشاہ کو لکھا تھا کہ شیخ حسین مست و مدہوش انسان ہے، اب میں تجھے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے وقت عرض کروں گا کہ تو دیوانہ تو ہے لیکن ایسا دیوانہ جو بکار خویش ہو شیار ہوتا ہے اور جس پر تعزیر ضروری ہو جاتی ہے۔“

کوتوال نے شیخ حسین کو قید کر دیا۔ وہ ابھی اسی فکر میں تھا کہ بادشاہ کو شیخ حسین کی گرفتاری کی خبر بھیج دے اور معلوم کرے کہ انہیں کیا سزا دینی ہے کہ بادشاہ کا ہر کارہ ایک دوسرا فرمان لے کر حاضر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا اور اس شخص کے پیچھے شاہی سواروں کا ایک دستہ تھا۔ شاہی ہر کارے نے بادشاہ کا فرمان کوتوال کو پڑھ کر سنایا۔

”اس تحریر کے جرم میں جو کوتوال نے عبداللہ بھٹی کے آخری کلمات کے طور پر ہمیں لکھ بھیجا ہے، ہم کوتوال کو معزولی اور سزائے موت کا حکم دیتے ہیں۔ کوتوال کو اتنی عقل اور شعور تو ہونا ہی چاہیے کہ شاہوں کو یوں نہیں لکھا جاتا۔ وہ غور کرے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے مابودلت کو سخت ذہنی کوفت ہوئی ہے اور وہ کوتوال کو سزائے موت دینے میں خود کو قحط بجانب خیال کرتے ہیں۔“

شاہی ہر کارے کے ساتھ جو شخص آیا تھا، اسے کوتوال مقرر کیا گیا تھا۔
سابق کوتوال کو عبداللہ بھٹی راہزن کی جگہ پر لے جا کر اس طرح ہلاک کر دیا گیا کہ اس کے سارے جسم میں میخیں ٹھونک دی گئی تھیں۔ اس کے بعد نیا کوتوال شیخ حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا۔ ”شیخ حسین! تجھے بادشاہ نے طلب کیا ہے۔“

شیخ حسین نے جواب دیا۔ ”بابا میرا کیا ہے جہاں چاہو بھیج دو لیکن میں بھی اپنی مرضی کا مالک ہوں، وہیں رہوں گا جہاں میرا جی چاہے گا۔“

کوتوال کی سمجھ میں ان کی بات نہیں آئی لیکن اس نے انہیں بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا۔
شیخ حسین اس انداز میں بادشاہ کے روبرو گئے کہ ان کے ایک ہاتھ میں صراحی تھی اور دوسرے میں پیالہ تھا۔ بادشاہ نے دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”شیخ حسین! تو بھلول دریا کی کامرید ہے اور وہ سلسلہ قادر یہ کے بزرگ ہیں۔ کیا تیرے ہیرو و مرشد نے تجھے شراب نوشی کی اجازت دے رکھی ہے؟ اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تو امر دہرست بھی ہے؟“

اس وقت شیخ حسین کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور پورا جسم نشے سے چور محسوس ہو رہا تھا۔ شیخ حسین نے بادشاہ سے کہا۔ ”کیا تو میری شراب نوشی اور امر دہرستی میں گواہ پیش کر سکتا ہے؟“

بادشاہ نے اس کی صراحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے اور تیری سرخ آنکھیں اور مخمور جسم اس بات کے گواہ ہیں کہ تو بے نوشی کرتا ہے، رہا امر دہرستی کا معاملہ تو اس کے بھی گواہ مل جائیں گے۔“

شیخ حسین نے صراحی کو پیالے پر جھکا دیا اور پیالہ بھر کے بادشاہ کو پیش کیا، کہا۔ ”ذرا اس کا ذائقہ تو ملاحظہ فرمائیں۔“

بادشاہ نے اسے چکھا تو یہ شخص سرد پانی تھا۔
اس کے بعد اس صراحی سے دوسرا پیالہ بھر اور بادشاہ کی طرف بڑھا دیا، کہا۔ ”اور ذرا اسے تو چکھیے۔“

بادشاہ نے اسے چکھا تو یہ شربت نکلا۔
شیخ حسین نے تیسرا پیالہ پیش کیا۔ اس میں دودھ تھا۔ بادشاہ کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے کیا سنا تھا اور کیا واقعہ تھا۔ شیخ

مجھے خوب صورت لگا ویسے بھی تجھے کی قیمت نہیں دیکھی جاتی۔ اصل اہمیت نیت کی ہوتی ہے اور وہ مجھ سے سرد مہری سے پیش آرہی ہے۔ اس نے مجھے فون کیا اور نہ ہی ای میل کا جواب دے رہی ہے۔ کاش میں اس کا گلا گھونٹ سکتی۔

”ساری غلطی سائنس کی ہے۔ اسے یہ بات تمہیں نہیں بتانی چاہیے تھی۔“ ماری نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ سائنس کو ان سے الگ ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ ان کی ایک پوتی تھی جو اپنی گہری سیاہ آنکھوں کی وجہ سے بہت پیاری لگتی تھی۔ وہ بچی ان کی آنکھوں کا تارا تھی اور حال ہی میں اس کی چوٹی سا لگرہ ہوئی تھی۔

”وہ بڑی تیزی سے بڑھی ہے۔“ ساندرا نے کہا۔

جذبات و احساسات اور رشتوں کے الٹ پھیر کا دلچسپ گورکھ دھندا

کبھی کبھی بہت خوب صورت رشتے بھی کسی غلط فہمی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں... اور ساس بھوکا رشتہ تو ویسے ہی سات پردوں میں چھپا عجب کھیل ہے۔ جو اچھا نظر آتا ہے وہی دنیا بھر کا گند جھولی میں ڈال دیتا ہے اور جو دشمن کے روپ میں نظر آئے... کبھی کبھی اس سے اچھا دوست کوئی نہیں ہوتا مگر... جان پہچان کے اس دورانیے میں اکثر بہت دیر ہو جاتی ہے... اتنی دیر کہ دوست تو کہیں گم ہو جاتا ہے بس اس کی دوستی کی مہک کسی کو اپنے حصار میں لیے رکھتی ہے۔

غلط فہمی

شعبہ سس



ساندرا گولڈ مین خود کو ایسی شخصیت سمجھتی تھی جو لوگوں سے جلد گھل جاتی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بھو بھی ایسی ہی ہوتی لیکن وہ کچھ عرصے سے اس کے رویے میں تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ جب کبھی اپنے شوہر ماری سے اس کی شکایت کرتی تو وہ یہ کہہ کر اسے ٹال دیتا کہ ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

تازہ واقعہ یہ پیش آیا کہ جولی نے سالگرہ کے موقع پر دیے جانے والے تحفے کے بارے میں انتہائی گھٹیا تبصرہ کرتے ہوئے ان کے بیٹے سائنس سے کہا کہ وہ ایک سستا تحفہ تھا۔

”میں نے اس جیسی ڈرامے باز عورت نہیں دیکھی۔“ ساندرا نے ماری سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے وہ بیگ میسی کے اسٹور پر دیکھا تھا جسے جنگلی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ وہ

خان خاناں نے پوچھا۔ ”کیا بات پھر ورسڈ؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بات کہ تیرے پیر جو کام کیا گیا ہے اس کے صلے میں تجھے بہت کچھ ملے گا؟“

خان خاناں نے عرض کیا۔ ”حضرت! میری کچھ میں آپ کی بات نہیں آرہی ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تیرے ذمے جو کام کیے گئے ہیں ان کا معاوضہ تو تجھے ملتا ہی ہوگا؟“

خان خاناں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔ ان کا معاوضہ ملتا ہے اور اگر اس مہم میں کامیاب ہوا تو اور بہت کچھ ملے گا۔“

شیخ حسین نے فرمایا۔ ”پھر میں نے بھی پانچ سو روپوں میں یہ معاملہ کیا۔ ٹھٹھہ کا ملک میں نے پانچ سو روپوں کے عوض دیا۔“

خان خاناں نے پانچ سو روپے دینا چاہے لیکن آپ نے نہیں لیے، فرمایا۔ ”جاؤ مظفر و منصور ہو گے لیکن کسی اور ولی سے مدد نہ مانگنا۔“

خان خاناں نے پوچھا۔ ”اور پانچ سو روپے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”واپسی میں دے دینا۔“

خان خاناں نے ٹھٹھہ جاتے ہوئے ملتان میں بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کے بعد شیخ کبیر بالا پیر سجادہ نشین بارگاہ کی خدمت میں ایک سو روپے بہ طور نذرانہ پیش کیے۔ شیخ کبیر بالا پیر نے یہ رقم نہیں لی۔ خان خاناں نے پوچھا۔ ”حضرت! نذرانہ قبول نہ کرنے کا سبب؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”مجھے نذرانہ قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ بات بزرگوں میں مشہور ہو چکی ہے کہ شیخ حسین نے پانچ سو روپوں کے عوض ٹھٹھہ پہلے ہی آپ کے حوالے کر دیا ہے اس لیے نذرانہ قبول کرنے کی حاجت نہیں رہی۔“

خان خاناں ٹھٹھہ گیا اور کامیاب ہوا۔

لیکن اب شیخ حسین شریعت کی پابندی کر رہے تھے۔ اب تک ان کے مریدوں کی تعداد نو ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں سے سولہ خلفائے بڑی شہرت پائی۔ آپ نے ان میں چار چار کو الگ الگ خطابات دے رکھے تھے۔ چار کا خطاب غریب تھا، مثلاً پہلا شاہ غریب۔ ان کا مزار موضع رتی ٹھٹھہ وزیر آباد کے قریب واقع ہے۔ دوسرا شاہ غریب۔ موضع مشکوالی تحصیل وزیر آباد۔ تیسرا شاہ غریب، بمقام اچیل پور دکن۔ چوتھا شاہ غریب ہزاروی۔ ان کا مزار آپ کے مزار سے متصل ہے۔

چار کو دیوان کا خطاب ملا تھا۔

پہلا دیوان مادھو۔ یہ وہی مادھو ہیں، جن کی بابت یہ مشہور تھا کہ شیخ حسین کے منظور نظر ہیں۔ یہ قوم کے برہمن تھے لیکن شیخ حسین کی رغبت سے مسلمان ہو گئے تھے۔ شاہدہ میں رہتے تھے۔ 983 ہجری میں پیدا ہوئے۔ 1052 ہجری میں وفات پائی۔ دوسرا دیوان گورکھ لاہور۔ ان کا مزار آپ کے مزار کی چوکھنڈی میں ہے۔ تیسرا دیوان بخش۔ بمقام بیجا پور۔ چوتھا دیوان، اللہ دیوان۔ لاہور میں مدفون ہے۔

چار کو خاکی کا خطاب عطا ہوا تھا۔

پہلا مولانا بخش خاکی۔ دوسرا خاکی شاہ لاہوری۔ ان کا مزار آپ کے مزار کے قرب و جوار میں ہے۔ تیسرا خاکی شاہ وزیر آباد۔ چوتھا حیدر بخش خاکی۔ ان کا مزار دکن میں ہے۔

چار کو بلاول کا خطاب بخشا گیا تھا۔ اول شاہ رنگ بلاول۔ دوم بدھو بلاول۔ سوم شاہ بلاول۔ یہ تینوں شیخ حسین کے مزار کے قرب و جوار میں دفن ہیں۔

چارم شاہ بلاول۔ یہ دکن میں مدفون ہیں۔

شیخ حسین کی پیدائش 945 ہجری اور کن وفات 1008 ہجری ہے۔ آپ پنجابی پراکت کے شاعر بھی تھے اور آپ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔ تقریباً اہتر سال بعد شیخ حسین کی عظمت اور بزرگی کا مشہور صوفی شیخ محمد طاہر لاہوری نے اس طرح اعتراف کیا۔

”اگر مجھے علمائے ظاہر کے طعنوں کا خدشہ نہ ہوتا تو میں ضرور شاہ حسین لاہوری کے مزار پر جاتا اور استمداد کرتا۔“

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ معارج الولاہی، قلمی بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ حقیقۃ الفقر، بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ مفتاح العارفین (قلم)، عبدالفتاح بن نعمان۔ حسنات العارفین، شہزادہ داسرا شکوہ

ماخذات

”اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہوں۔“

☆☆☆

ساندرہ سے برداشت نہ ہوسکا اور اس نے ڈینور جانے کے لیے جہاز کی سیٹیں بک کروالیں اور وہ جولائی کے وسط میں اپنا آرام وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گئے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے جہاز ہچکولے لے رہا تھا۔ ساندرہ نے اپنے بیگ سے ایک شیشی نکالی اور مارٹی کو بلڈ پریشر کی دوا دیتے ہوئے بولی۔ ”یہ ایک معجزہ ہے کہ اس طوفان بادوباراں میں ہمیں دل کا دورہ نہیں پڑا۔“

”تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ گرمیوں میں جہاز سے سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔“ مارٹی نے اپنی سیٹ ٹیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

ایئرپورٹ پر سائنمن اپنی بیٹی اولیویا کے ساتھ انہیں لینے آیا۔ پوتی پر نظر پڑتے ہی ساندرہ سفر کی تکلیف بھول گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر پوتی کو گلے لگا لیا اور اس کے گال چومنے لگی۔ اس دوران سائنمن ان کا سامان کار کی ڈکی میں رکھ چکا تھا۔ جولائی کو ان کے ساتھ نہ دیکھ کر ساندرہ کو بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ سائنمن کے بال بڑے اور بے ترتیب ہو رہے تھے جنہیں اس نے ایک پوتی ٹیل کی طرح باندھ رکھا تھا۔ ساندرہ کو اس کا یہ حلیہ پسند نہیں آیا۔ حالانکہ انہوں نے اسے بہترین اسکولوں میں پڑھایا تھا لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے باپ کے جیولری اسٹور پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ وہ سیلانی ٹائپ آدمی تھا اور اسے گھومنے پھرنے کا کام پسند تھا۔

سائنمن نے ان کی آمد سے پہلے ہی کئی پروگرام ترتیب دے لیے تھے۔ جس میں شاپنگ کے علاوہ قابل دید مقامات کی سیر بھی شامل تھی۔ ایک دن انہیں نیشنل پارک کی پہاڑیوں پر جانا تھا اور ایک دن وہ دریا میں بیڑے کی سیر کرتے۔

”بیڑے کی سواری؟“ ساندرہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارے ساتھ گائڈ ہوگا۔“ سائنمن نے گردن پیچھے موڑتے ہوئے کہا۔ ”اس سال بہت کم جوڑوں کے ڈوبنے کی اطلاع ملی ہے اور تم تو ویسے بھی اسکول کے زمانے میں تیراکی کی چیپ پیٹن رہ چکی ہو۔“

”یہ بہت پرانی بات ہے اور وہ سوئمنگ پول تھا۔ مجھے دریا میں تیرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کیا جولائی اور اولیویا بھی ہمارے ساتھ جائیں گی؟“

”میں نے پانچ ٹکٹ خرید لیے ہیں تاہم جولائی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ اس وقت بھی کمپیوٹر پر بیٹھی ہوئی

ہے اور بہت کم باہر جاتی ہے۔“

ساندرہ نے سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ جولائی ہوم ویب سائٹ پر کام کرتی ہے اور بہت کم اپنے لیپ ٹاپ سے ملحدہ ہوتی ہے۔ موسم خشک تھا اور گرم ہوا چل رہی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر ساندرہ نے بیگ کھولا اور وہ چیزیں نکالنے لگی جو وہ اولیویا کے لیے لائی تھی۔ ان میں بسکٹ اور چاکلیٹ کے پیکٹ شامل تھے۔ جب اولیویا نے ہاتھ بڑھا کر وہ پیکٹ لیے تو ساندرہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”مجھے امید ہے کہ ان میں کارن سیرپ شامل نہیں ہوگا۔“ سائنمن بولا۔ ”جولائی اس کی اجازت نہیں دے گی۔“

”تھوڑے سے کارن سیرپ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ سے ابھی تک ہم میں سے کسی کی موت واقع نہیں ہوئی۔“ ساندرہ نے جل کر کہا۔

”لیکن یہ بچوں کے لیے مضر صحت ہے۔“ سائنمن نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اولیویا کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے بچی کو یہ چیزیں کھانے سے منع کر دیا تو وہ رونے لگی۔ اس کے آنسو دیکھ کر ساندرہ کا دل کٹ کر رہ گیا، اس نے اولیویا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ مارٹی کی طبیعت بھی مکدر ہو گئی۔ سائنمن جھینپتے ہوئے بولا۔

”میں تم لوگوں کے کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔“ اولیویا اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں جولائی لیپ ٹاپ پر جھگی اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”میں ابھی فارغ ہوئی ہوں۔“

ساندرہ نے کمرے کا جائزہ لیا، دیوار پر مختلف تصاویر آویزاں تھیں۔ صوفے پر کئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں جن میں بانسری، چھوٹے ڈرم اور اولیویا کے کچھ کھلونے شامل تھے لیکن ساندرہ کو وہ بیگ کہیں نظر نہیں آیا جو اس نے تحفے میں دیا تھا۔

”تصویریں پسند آئیں؟“ جولائی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ساندرہ جل کر بولی۔ اسی وقت سائنمن ہاتھ میں ایک ٹرے پکڑے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک گلاس اپنی ماں کو پکڑا دیا۔ مارٹی بھی اس کے ساتھ تھا۔ جب وہ سب اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو جولائی لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے سائنمن سے بولی۔

”فرنج میں کچھ کھانے کی چیزیں بھی رکھی ہیں کیا وہ تمہیں نظر نہیں آئیں؟“

سائنمن کی اسپرنگ کی طرح اچھلا اور بچن کی جانب چل دیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چھپس کا پیکٹ اور ایک پیار تھا

جس میں سوپ نما کوئی سیال مادہ نظر آ رہا تھا۔

”میں نے اس کی ترکیب نیٹ سے لی تھی۔“ جولائی فخریہ انداز میں بولی پھر اس نے ساندرہ سے پوچھا۔ ”تمہارا سفر کیسا رہا؟“ اس کے بعد وہ سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

جولائی نے بتایا کہ وہ پڑوسی کے کتے کی وجہ سے بہت پریشان ہے جو ساری رات بھونکتا رہتا ہے۔ وہ کئی بار مکان تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ چکے ہیں لیکن یہاں کا کرایہ بہت مناسب ہے اور سائنمن بلڈنگ کی صفائی کا سارا کام کر کے کرایے میں کچھ بچت کر لیتا ہے۔

ان کے گھر میں کھانا نہیں جتا تھا بلکہ وہ چند قدم کے فاصلے پر واقع کینے میں کھانے کے لیے چلے جاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ کینے گا بکوں سے بھرا ہوا تھا لیکن تھوڑے سے انتظار کے بعد انہیں بیٹھنے کے لیے جگہ مل گئی۔ سائنمن اور جولائی نے اپنے لیے بچنے ہوئے پارچوں جبکہ اولیویا کے لیے مکرونی کی چھوٹی پلیٹ منگوائی گئی، البتہ ساندرہ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ کیا کھائے۔ ان دنوں وہ اپنا وزن کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ صرف موٹی ہی نہیں ہوئی بلکہ اس کے کپڑے بھی تنگ ہوتے جا رہے تھے لیکن اسے مینو میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس میں کم کیلوریز ہوں لہذا اسے بھی میکرونی پر اکتفا کرنا پڑا۔

”تم کل صبح اپنے والدین کو دریا کی سیر کے لیے لے جاؤ۔“ جولائی نے سائنمن سے کہا تو ساندرہ کو پٹنگے لگ گئے۔ وہ انہیں مئی ڈیڈی بھی کہہ سکتی تھی لیکن اسے رشتوں کے تقدس کا کوئی خیال نہیں تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس خاندان کی فرد ہے۔ ساندرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا الزام کس کو دے لیکن جب ان کے دوست اس بارے میں سوال کرتے تو وہ شرمندہ ہو جاتی۔

مارٹی کا کہنا تھا کہ دنیا کا یہی دستور ہے۔ جولائی سے پہلے سائنمن کی منگنا اب روک لین میں رہنے والی ایک خوب صورت لڑکی سے ہوئی تھی لیکن عین وقت پر سائنمن نے یہ کہہ کر مٹنی توڑ دی کہ منگیتر سے اس کے اختلافات ہو گئے ہیں۔ ساندرہ کے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ ان اختلافات کی وضاحت نہ کر سکا۔

کبھی کبھی ساندرہ سوچتی کہ کاش اس کا ایک بیٹا اور ہوتا تاکہ سائنمن کے جانے کے بعد وہ اسے اپنی امیدوں کا مرکز بنالیتی لیکن سائنمن کی پیدائش کے بعد اس کے اندرونی نظام میں کوئی ایسی خرابی ہو گئی کہ وہ دوبارہ ماں نہ بن سکی۔

گھر آنے کے بعد وہ بستر پر لیٹتے ہی بولی۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں۔“

”میرے پیٹ میں بھی گڑبڑ ہو رہی ہے۔“ مارٹی نے

شکایت کی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ کھانے میں مرچیں زیادہ تھیں۔“

”میں نے اسی لیے انہیں ہاتھ نہیں لگا یا اور صرف سلاڈ ہی کھاتی رہی۔ اب مجھے بھوک لگ رہی ہے لیکن سائنمن اور اپنی پوتی سے ملنے کی خوشی میں سب کچھ گوارہ ہے۔ میں کل اس کے لیے ایک چھوٹا سا ساگرہ کیک خریدنا چاہتی ہوں۔ مجھے یاد دلادینا۔ ہم اس کی ساگرہ میں تو شریک نہ ہو سکے لیکن جانے سے پہلے میں اس کی تلاقی کرنا چاہتی ہوں۔“

دوسری صبح وہ ٹھیک چھ بجے اٹھ گئی۔ پہلے اس نے کافی بنائی اور کپڑے بدل کر آئینے کے سامنے اپنے بال سنوارنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سائنمن ان کے کمرے میں آیا۔ اس نے ٹیکر اور لونگ شووز پہن رکھے تھے۔ ماں کو دیکھ کر تعریفی انداز میں بولا۔ ”تم تو کسی میگزین کا اشتہار لگ رہی ہو۔“

”ہمیں قریبی بیکری تک جانا ہے۔“ مارٹی نے ساندرہ کو یاد دلادیا۔

ساندرہ نے جلدی جلدی اپنی چیزیں اکٹھی کیں اور انہیں ایک بڑے سے بیگ میں رکھ کر پارکنگ لائٹ کی طرف چل دی۔ جب اس نے سائنمن اور مارٹی کو پک اپ کے پاس کھڑے دیکھا تو جھلاتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری گاڑی کہاں ہے اور جولائی..... کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گی؟“

”رات کھانے کے بعد اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور اسے اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ میں نے کھانا چیک کیوں نہیں کیا۔“

”میں جانتی تھی کہ ہمیں کرایے کی کار لینا پڑے گی لیکن اب سارا دن اس چھوٹی سی پک اپ میں سفر کرنا پڑے گا۔ میری گردن میں ویسے ہی تکلیف ہو رہی ہے۔ تمہارے گھر کے نیچے آرام دہ نہیں ہیں۔“

”ہم زیادہ دیر ٹرک میں نہیں رہیں گے۔ ہم پہلے دریا پر جائیں گے اس کے بعد تھوڑا سا پیدل چلیں گے۔“

”اولیویا کہاں ہے، کیا آج اس سے ہماری ملاقات ہو سکے گی؟“

”سہ پہر سے پہلے ممکن نہیں۔“ سائنمن نے جواب دیا۔

”آج جمعہ ہے اور وہ اسکول گئی ہے۔“

”کیا اسے ایک دن کی چھٹی نہیں کروائی جاسکتی تھی۔“ ساندرہ نے غصے سے کہا۔ ”جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم صرف اس سے ملنے یہاں آئے ہیں۔“

ساندرہ نے بیکری پر رک کر پیئر کے کیک کا آرڈر دیا جبکہ مارٹی نے اپنے لیے نیویارک ٹائمز کا تازہ شمارہ خریدا۔

”تمہیں کچھ دن اور یہاں رکنا چاہیے۔“ سائنمن نے

”وہ نئے زمانے کی لڑکی ہے۔“ ماری نے کہاں میں مشروب انڈیلے ہوئے کہا۔ ”دعا کرو کہ شام کو کوئی بدحالی نہ ہو۔“ شام کو سائمن انہیں لینے آیا تو ساندرا مطمئن ہوئی کہ اب وہ کار میں واپس جائے گی۔

ان کی گاڑی ایک پرسکون علاقے میں واقع ریسٹوران کے سامنے رک گئی۔ ایک سیاہ فام عورت نے ان کا استقبال کیا اور انہیں ایک مخصوص میز پر لے گئی۔ ان سب نے اپنی اپنی پسند کا کھانا منگوایا۔ اس دوران جولی خاموش بیٹھی رہی البتہ جب سائمن تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر گیا تو وہ ساندرا سے بولی۔ ”تم نے جو چاندی کے بندے پہن رکھے ہیں وہ سائمن نے تمہارے لیے گزشتہ کمرس پر خریدے تھے جس کے لیے اسے بھاری رقم خرچ کرنا پڑی۔“ اس سے پہلے کہ ساندرا کوئی جواب دیتی، ماری نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ واپس آنے کے بعد ساندرا اور ماری مکان کے عقبی حصے میں واقع چھوٹے سے صحن میں کرسیوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگے جبکہ جولی اور سائمن اندر کمرے میں اولیو یا کو سلا رہے تھے کہ اچانک ہی اندر سے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں جولی کی آواز نمایاں تھی گوکہ وہ نہیں سمجھ سکے کہ ان کے درمیان کس بات پر بحث ہو رہی ہے۔

”میں جانتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔“ ماری نے کہا۔ ”اس کا اندازہ مجھے ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت ہی ہو گیا تھا۔“ ”یا خدا، مجھے ہمت دے۔“ ساندرا نے کہا۔ ”مجھے حاجت ہو رہی ہے۔“ ”اس کے لیے تمہیں گھر کے اندر جانا ہوگا۔“

ساندرا نے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا وہ اندر سے بند تھا جبکہ ساندرا کی برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس نے زور زور سے دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد سائمن نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

ساندرا اس کی حالت پر غور کیے بغیر گھر کے اندر چلی گئی جب وہ واپس آ رہی تھی تو اسے بیڈروم سے اولیو یا کے بولنے کی آواز آئی۔ اس نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک تو ہے؟“ ”میں بہت جلد چلی جاؤں گی۔“ جولی نے غصے سے کہا۔ ”ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی۔“ وہ خاموشی سے باہر چلی آئی جہاں ماری سائمن کو مشورہ دے رہا تھا کہ انہیں صلح کر لینی چاہیے۔ اسی وقت جولی بھی باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے گیرج کے ایک

ماری سے کہا۔ ”جے جے کیل کا شو ہونے والا ہے۔“ ماری نے کوئی جواب نہیں دیا اور اخبار کے صفحے پلٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ ساندرا کے لیے یہ ایک تکلیف دہ سفر تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن کا درد اور بڑھ جاتا۔ خدا خدا کر کے وہ منزل مقصود پر پہنچے اور سائمن نے اپنا ٹرک مخصوص جگہ پر پارک کر دیا۔ ماری نے سہارا دے کر ساندرا کو نیچے اتارا تو اسے اپنی کمرسیدگی کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنی گردن کو دائیں بائیں گھمایا تب کہیں جا کر اسے سکون ملا۔ سائمن نے کھانے کا سامان اور پانی کی بوتلیں اپنی کمر پر لٹکے تھیلے میں رکھیں اور ایک ٹیلے پر لگے ٹیلے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”ہمیں وہاں تک جانا ہے۔ اس سے اوپر سبز نشان ہے جو اگلی چڑھائی ہے۔“

”مجھے تو دیکھ کر ہی متھکن محسوس ہو رہی ہے۔“ ساندرا نے کہا۔ ”امید نہیں کہ ہم وہاں تک جا سکیں گے۔“ کچھ دور چلنے کے بعد ساندرا ایک لکڑی کی بیچ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”مجھ میں مزید اوپر جانے کی ہمت نہیں۔ تم دونوں جاؤ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔“

سائمن نے اسے پانی کی ایک بوتل پکڑادی۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان جوڑا بھی وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ ساندرا کی نظر ایک عورت پر گئی جو ٹیلے پر کھڑی دریا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساندرا نے سوچا کہ اتنی اونچائی سے گرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے ماری اور سائمن واپس آتے دکھائی دیے۔ سائمن نے اپنے بیگ سے کھانا نکال کر اسے دیا تو وہ بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ کچھ دیر سستانے کے بعد وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے تو سائمن نے انہیں ہوٹل پر اتار دیا تاکہ وہ نہادھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ اس نے انہیں مطلع کیا کہ وہ رات کا کھانا اس کے اور جولی کے پسندیدہ ریسٹورانٹ میں کھائیں گے۔

”کیا تم اس ریسٹورانٹ کا نام بتانا پسند کرو گے؟“ ساندرا نے پوچھا۔

”نیلز۔“ سائمن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک تھی۔

”مجھے وہاں جانے کا شدت سے انتظار رہے گا۔“ سائمن کے روانہ ہونے کے بعد اس نے ماری سے کہا اور تیاری میں مصروف ہو گئی۔ اس نے غسل کرنے کے بعد سیاہ پینٹ اور سفید سوئی بلاؤز پہنا اور بولی۔ ”مجھے یہیں کمر اکرایے پر لے لینا چاہیے تھا۔ وہ لڑکی تو بھی کھانا نہیں بنائے گی۔“

کونے میں ووڈ کا... خالی بوتلوں کا ایک کریٹ نظر آ گیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے کہا کہ ”ان کا بیٹا نشے کا عادی ہے اور اس کی محنت کی کمائی پیازوں پر چڑھنے اور برف پر پھسلنے میں خرچ کر دیتا ہے۔“

جولی کی ناراضی ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ انہوں نے بیک وقت سائمن کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا لیکن وہ بے بسی کے عالم میں خلا کو گھور رہا تھا۔

”اچھا ہوا کہ تمہیں بھی معلوم ہو گیا۔“ یہ اطلاع دینے کے بعد جولی کا غصہ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

”میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں۔“ ماریٹی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔“

”سائمن، یہ سب کیا ہے؟“ سائندر نے پوچھا۔ ”تم ہمیں بتا سکتے تھے، اس میں کوئی شرم نہیں ہونی چاہیے۔“

سائمن کو اس کی بات سے کچھ حوصلہ ملا اور وہ بولا۔ ”جولی کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں شراب نہیں پیتا اور نہ ہی میں نے کنسرٹ کا ٹکٹ خریدا ہے۔ میں نے تو یہ بوتلیں کچرے کے ڈھیر سے جمع کی ہیں تاکہ انہیں بیچ کر کچھ کماسوں۔“

☆☆☆

اپنے کمرے میں آنے کے بعد سائندر نے ماریٹی سے کہا۔ ”میں نے بھی اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا۔“

”مجھ میں نہیں آتا کہ دونوں میں سے کس کی بات کا یقین کیا جائے۔“ ماریٹی بولا۔

”میں نے بھی اس طرح کا ڈراما نہیں دیکھا۔“

”اگر وہ سچا ہے تو جولی اسے شرابی بننے پر مجبور کر رہی ہے۔“ ماریٹی نے کہا۔

”دعا کرو کہ کل کا دن خیریت سے گزر جائے۔“

دوسری صبح سائمن ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ رات والا واقعہ بھول گیا ہے۔ اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ”ہمیں براؤن کے آبی درہ کی طرف جانا ہے جو دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔“

”میں تمہاری پک اپ میں نہیں جاؤں گی۔“ سائندر نے کہا۔

”ہم کار میں جائیں گے۔ جولی ابھی تیار نہیں ہوئی۔“

اس لیے میں وقت بچانے کے لیے یہاں چلا آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آخری منٹ تک باہر نہیں آئے گی۔ اسے باہر جانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور اسے تیرنا بھی نہیں آتا۔“

”حیرت ہے، آج کل تو بچے چھوٹی عمر میں ہی تیرنا سیکھ جاتے ہیں۔“

اولیویا بھی تیار ہو کر آچکی تھی اور وہ باہر صحن میں بیٹھنے جولی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب کافی دیر ہو گئی تو سائندر نے کہا۔ ”وہ کیوں نہیں آ رہی۔ اگر زیادہ دیر ہو گئی تو ہم وقت پر نہیں پہنچ سکیں گے۔“

”ہمیں اندر جا کر دیکھنا چاہیے۔“

سائندر نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ جولی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور سائمن اسے غصے سے گھور رہا تھا پھر اس کی آواز سنائی دی۔

”میں نے اس ٹرپ کے لیے دو سو ڈالر ادا کیے ہیں اور اب وہ مجھے واپس نہیں مل سکتے۔ اس لیے تمہیں چلنا ہوگا۔“

سائندر، جولی کے برابر میں بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے محبت سے بولی۔ ”کیا ہم ایک ساتھ گھومنے کے لیے نہیں جاسکتے؟“

”میرے روحانی مشیر کا کہنا ہے کہ آج کا دن سفر کے لیے ٹھیک نہیں۔“ جولی بولی۔

”مہی، کیا مسئلہ ہے؟“ اولیویا بولی۔

جولی نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہنی، تمہاری مہی کو تیرنا نہیں آتا۔“

”اگر کوئی مسئلہ ہوا تو وہاں غوطہ خور موجود ہوں گے۔“ سائمن نے سمجھایا۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد جولی چلنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ دریا کے کنارے بہت گرمی تھی اور سائندر پوری طرح پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگانے اور آبشار کے نیچے پانی کی بوچھاڑ میں اسے کچھ سکون ملا۔ سائمن اور جولی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ان کا گانڈ آیا اور

اس نے سب لوگوں کو جمع کر کے حفاظتی اقدامات سے آگاہ کیا۔ ان کے گروپ میں دس بیڑے تھے اور جیسے ہی پہلا گروپ واپس آتا تو ان کا سفر شروع ہو جاتا۔ گانڈ نے اولیویا کا قدناپا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”یہ بھی اپنی ماں کی طرح لمبی ہے۔“

وقت مقررہ پر گانڈ نے انہیں گہرے پانی میں دھکیل دیا۔ جولی کچھ دیر پریشان رہی پھر اولیویا کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ”یہ اتنا زیادہ برا تجربہ نہیں ہے۔“

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ساحل پر واپس آ گئے۔ اس دوران سائندر نے اپنے کمرے سے سب کی تصویریں اتاریں۔ جولی کا موڈ بھی اچھا ہو گیا تھا۔ کشتی سے اترنے کے بعد سائندر اور ماریٹی ناگلیں پھیلا کر ساحل پر لیٹ گئے۔ انہوں نے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے

ہوئے تو جوانوں کی اس ٹولی کو دیکھنے لگے جو پانی میں غوطے لگا رہے تھے۔ سائمن بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔

جولی اور اولیویا بھی ان کے پاس آ گئیں۔ سائندر بولی۔ ”مجھے لیڈ یز روم میں جانا ہے۔“

جولی بولی۔ ”مجھے بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ پھر اس نے ماریٹی سے کہا۔ ”اولیویا کا خیال رکھنا کہیں یہ دور نہ نکل جائے۔“

ماریٹی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم بالکل فکر مت کرو۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔“

جولی اور سائندر کسی پرائیویٹ جگہ کی تلاش میں چل دیں۔ کافی دور جانے کے بعد انہیں صنوبر کا بہت بڑا درخت نظر آیا۔ جولی نے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو، میں پہلے فارغ ہو جاؤں۔“

ہوشیار رہنا اس علاقے میں شیر بھی پائے جاتے ہیں۔“

”مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔ میں خود کسی شیر سے کم نہیں ہوں۔“

جولی کے بعد سائندر کی باری آئی اور جب وہ اپنا لباس درست کرتے ہوئے واپس آئی تو اس نے جولی کو ایک نیلے پر کھڑے ہوئے دیکھا جہاں سے وہ تشویش کے ساتھ آبشار کا نظارہ کر رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ سائندر نے پوچھا۔

”میں ابھی تک سائمن سے ناراض ہوں کہ اس نے مجھے ایسی جگہ پر آنے پر مجبور کیا وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ میں آج تک اس کے ساتھ کسی ایسی جگہ پر نہیں گئی۔“

”کوئی بات نہیں، اب تمہارا خوف ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گا۔“ سائندر نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں عجیب خیال آیا کہ یہاں سے اسے دھکا دینا کتنا آسان ہوگا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ اس کا پاؤں پھسل گیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہونے لگی۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”بعض اوقات تم اپنے خوف پر قابو پا کر ہی اس سے نجات حاصل کر سکتی ہو بعد میں تمہیں خود حیرت ہوگی کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔“

سائندر نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے کیس میں سے کیمرا نکالا اور جولی سے کہا کہ وہ تھوڑا سا دائیں جانب ہو جائے تاکہ پس منظر میں دریا بھی آجائے۔

جولی نے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے دائیں جانب قدم بڑھایا تو سائندر بولی۔ ”دو قدم اور۔“

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سائندر کے تصور سے بھی زیادہ دہشت ناک تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا اچھا گیا اور

وہ اپنے حواس کھو بیٹھی جب ہوش میں آئی تو شریف اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سائندر سے کچھ سوالات کرنے کے بعد کہا کہ یہ پہلا واقعہ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی ایسے واقعات ہوتے رہیں۔ دریا میں پانی کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا ہے کہ غوطہ خوروں کے لیے بھی ڈوبنے والے کی جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔“

اس واقعے کو بد قسمت حادثہ قرار دے کر فائل بند کر دی گئی۔ تین دن کی تلاش کے بعد جولی کی لاش آبشار سے چند میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ملی۔

اس واقعے کے بعد سائندر اور ماریٹی ایک ہفتہ وہاں رہے۔ اولیویا بار بار ماں کو یاد کر کے پوچھتی رہی۔ سائندر کے لیے زیادہ دیر وہاں رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے روزمرہ کے معمولات بری طرح متاثر ہو رہے تھے مثلاً برج کلب جانا، دوستوں سے ملنا اور جیولری شاپ کا حساب کتاب رکھنا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو سائمن نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد نیویارک آجائے گا۔

سائندر کو بھی امید تھی کہ بالآخر اسے آنا ہی پڑے گا۔ وہ مکان کا کرایہ اور اولیویا کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اولیویا کو کچھ چیزیں سکھادی تھیں تاکہ جب اسے بھوک لگے تو وہ اپنی مرضی کا کھانا بنا سکے۔ اولیویا بہت ذہین لڑکی تھی۔ اس نے بہت تھوڑے وقت میں آلیٹ اور آلو کے چپس بنانا سیکھ لیے۔

گھر واپس آنے کے بعد اس کی پڑوسن نے وہ ڈاک لا کر دی جو ان کی غیر موجودگی میں وہ اپنے پاس رکھتی رہی تھی۔ سائندر اپنا کام چھوڑ کر وہ ڈاک دیکھنے بیٹھ گئی۔ پہلے اس نے بل علیحدہ کیے پھر ایک ایک کر کے دوسرے لفافے کھولنے لگی۔ اس کی نظر ایک نیلے رنگ کے لفافے پر پڑی جس پر لکھی ہوئی تحریر وہ نہیں پہچان سکی۔ اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ یہ جولی کا خط تھا جس میں اس نے بیگ اور سالگرہ کارڈ بھیجے پر سائندر کا شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ دم بخود بیٹھی میز پر رکھی جولی اور سائمن کی تصویر دیکھنے لگی جس میں انہوں نے اولیویا کو گود میں لیا ہوا تھا۔ یہ تصویر اس کی پیدائش کے موقع پر لی گئی تھی۔ سائندر کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اس نے جولی کو کھینچنے میں کتنی غلطی کی تھی۔ ایک معمولی سی غلط فہمی نے اس کے دل میں جولی کے لیے نفرت کا بیج بو دیا جو رفتہ رفتہ تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا جس کا نتیجہ.....!

اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور شریف کا نمبر ملانے لگی۔ ضمیر کے بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے جرم کا اعتراف کرنا بہت ضروری تھا۔

227

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2014ء

226

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2014ء

227

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2014ء

226

سپینس ڈائجسٹ

اپریل 2014ء

227

آلبی

جب آنکھوں میں الجھے خوابوں کا جال اور...
 تہنوں میں الجھی گتھیوں کا وبال ہو تو تھکاوٹ،
 طویل مسافت اور منزل کی گمشدگی کا شدید احساس
 دلوں کو لا دیتا ہے۔ انسان کتنا ہی عہد جدید کے تقاضوں
 کو پورا کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا جائے مگر ماضی
 کے تعاقب سے پھر بھی نہیں نکل سکتا۔ کوئی کتنی ہی نظر
 چرائے ہمیشہ آنے والا کل جانے والے کل کا آئینہ بن کر حال کے
 خدوخال واضح کر دیتا ہے... اور پھر یہی حقیقت پسندی اسے
 ایک مبہم سنی ہے چینی کا شکار کر دیتی ہے۔ وہ بھی ماضی پر بڑے
 پرے کو چاک کرنے کے لیے کس قدر اندیت میں مبتلا تھی مسلسل ایک
 ادھورے سائے کے پیچھے بھاگتی جا رہی تھی مگر... اس کی ہر کوشش
 بڑے تسلسل سے ناکام ہوتی رہی، البتہ اس کی مستقل مزاجی نے ایک دن
 اچانک ہی بھولی بسری ایک کتاب اس کے آگے ڈال دی جس کی سطر سطر
 کسی کی ابلہ پائی کی گواہی دے رہی تھی... دل میں جذبات کا طوفان اور
 آنکھوں میں آنسوؤں کے تلاطم نے رشتوں کی ڈوری کو ایسی آگ لگائی کہ ہر
 گرہ خاکستر ہو کر رہ گئی... اور یہ ثابت ہو گیا کہ محبت اور ضد میں زمین آسمان
 کا فرق ہوتا ہے۔ جس طرح منزل رستوں کے بغیر نہیں ملتی... آنکھ خوابوں کے بغیر
 کسی منظر میں رنگ نہیں بھر سکتی اسی طرح اخلاص کے بغیر چاہت بے معنی
 ہے۔ پانے کی ضد میں سب کچھ تباہ کرنے والے بھی اسی محبت کے زعم میں مبتلا ہو کر
 دھوکے میں رہتے ہیں... جبکہ کچھ لوگ ملنے نہ ملنے کے غم میں مبتلا ہوئے بغیر بھی خود کو
 برباد کرتے اور پھر بھی شاد رہتے ہیں... بس یہی فرق بڑے آدمی کے چھوٹے سے دماغ میں بہت
 دیر سے سمجھ آتا ہے۔

برقانی موسم کے وحشت منظر میں بچپن، گڑیا اور گھڑ تاش کرنے والی دو شیرازہ کی آبلہ پائی کی روداد



سوچا۔ ”مجھے اسے بھول جانا چاہیے۔“
 وہ کال اسے چار روز پہلے رسیو ہوئی تھی وہ پرانے

کار قدر کے ست رفتاری سے چل رہی تھی۔ زیب کی
 دو روپے بڑک کے ارد گرد بنے دیدہ زیب مکانات کا
 سڑک لے رہی تھیں۔ ابھی شام کے صرف سات بجے تھے
 شہر پر آلود موسم کی وجہ سے اندھیرا خاصا گہرا ہو رہا تھا۔ مکمل
 آبی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان سڑکوں پر ٹریفک کی
 آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بنگلوں کے مرکزی دروازوں
 پر لگے بلب اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی خاموش منظر کو کچھ اور
 مجسم بنا رہی تھی۔ وہ مشینی انداز میں ساتویں اسٹریٹ پر مڑ
 گئی۔ ایک بلاک آگے جا کر اس نے بنگلوں پر لگے نمبر دیکھنا
 شروع کر دیے۔ آخر کار گلی کے آخر میں بنے کارنر کے مکان
 کے سامنے پہنچ کر اس نے بریک لگایا۔

”ہاں... یہی ہے وہ۔“ اس نے سوچا۔ ”بندگی کے
 انتقام پر بنا خوبصورت مکان... پیارا گھر۔“ وہ دونوں
 ہاتھوں سے اسٹیرنگ تھامے گھر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب
 بھی بالکل ویسا ہی تھا جسے اسے یاد تھا۔ لکڑی کے نقش مین
 گیٹ کے ایک حصے کو چنبیلی کی تیل نے چھپا رکھا تھا۔

اسلام آباد سے دو گھنٹے کی فاصلہ، ائر پورٹ پر کار کے
 پہنچنے کے لیے مزید آدھا گھنٹہ انتظار، ائر پورٹ سے کنٹینر تک کا
 سفر اور درمیان میں کچھ ضروری شاپنگ نے اسے خاصا تھکا دیا
 تھا۔ اسے اس وقت آرام کی اشد ضرورت تھی مگر اس کے باوجود
 وہ گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے ہنسی بکپا رہی تھی۔

”شاید یہ اس احقانہ فون کال کا نتیجہ ہے۔“ اس نے



جیتل پر اس کی ملازمت کا آخری روز تھا۔ وہ کافی کے بڑے سے مگ سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے پرانے ساتھیوں سے الوداعی کپ شپ کر رہی تھی تب آپریٹر نے اسے وہ فون کال دی تھی۔

”میں اسے بتا بھی رہی ہوں کہ زینب علی احمد یہاں سے ملازمت چھوڑ چکی ہیں مگر یہ احمق تم سے بات کرنے پر منحصر ہے۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ آدی لگتا ہے، کیا تمہیں لائن دوں؟“

”ہاں۔“ زینب کے کہنے پر آپریٹر نے لائن ملا دی تھی۔ ”زینب علی احمد..... تمہیں کسی صورت کراچی نہیں جانا چاہیے۔ تم کو دو من ان پاور والا پروگرام بھی نہیں کرنا چاہیے اور تمہیں اس گھر میں تو بالکل بھی نہیں رہنا چاہیے۔“ وہ چپکتی ہوئی مردانہ آواز عجیب سی سرگوشی کے انداز میں اس کی سماعت کو جھنجھوٹتی تھی۔ زینب ایک لمحے کو لرز گئی۔

”کون ہو تم اور اس کو اس کا مطلب کیا ہے؟“ وہ خود کو سنبھال کر غصے سے بولی۔

”میں رحم کا فرشتہ ہوں، کام نمٹانے والا۔ لوگوں کو ان کے بوجھ سے بچانے والا۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جو تم سے کہا جا رہا ہے وہ کرو ورنہ..... تم خود ذمے دار ہوگی۔“ وہ سرد سرگوشی کے انداز میں بولا اور پھر لائن کٹ گئی۔

زینب نے اس کال کو اس جیسی دیگر احمقانہ یا گیڈر بھبکیوں سے بھرپور کالز کے مانند سمجھ کر بھولنے کی بہت کوشش کی مگر پریشان نہ ہونا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کے ملک کے ایک ممتاز جیتل کے کراچی آفس میں ملازمت کی اطلاع کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی۔ اس کے آنے والے ڈاکیومنٹری پروگرام ”دو من ان پاور“ کی خبر کئی اخباروں میں آچکی تھی مگر وہ کراچی میں کہاں رہے گی یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کال کا خیال اس کے ذہن کو اب بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ جس انداز میں اس پراسرار شخص نے اس مکان کا ذکر کیا تھا وہ قابل فراموش نہیں تھا۔ وہ کون تھا جو اس مکان کے بارے میں کچھ یا سب کچھ جانتا تھا؟ یہ سوال ہی اسے پریشان کر رہا تھا۔

ماحول میں بڑھتی ہلکی سی سختی گویا اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ اس نے اتر کر گیٹ کھولا اور گاڑی کو اندر لیتی چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ گھر کے اندر تھی۔ سامان کے نام پر اس کے ساتھ دو سوٹ کیس اور کچھ کھانے پینے کا سامان تھا جو وہ راستے سے لیتی آئی تھی۔ گھر بہت صاف ستھرا تھا، آخری کرایہ داروں دن قبل ہی گھر کو خالی کر گئے تھے۔ مکان مکمل طور پر فرشتہ تھا۔ وہ اپنے پیچھے لکڑی کے بڑے دروازے کو بند کرتی آگے بڑھی۔ اوپری منزل تین

کشاہد بیڈروم اور خوب صورت ٹیرس پر مشتمل تھی۔

وہ فریج آن کر کے ناشتے کا سامان اس میں رکھ کر لیونگ ایریا کی طرف بڑھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لیونگ روم کے سامنے پہنچ کر اسے اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ کیا وہ کچھ حماقت کر رہی تھی۔ کیا اس کا یہاں آنے کا فیصلہ درست تھا؟

اس یاد کو دہرانے کی یہ کوشش جسے شاید بھلا دینا ہی بہتر تھا۔ ان سوچوں سے بچنے کی کوشش میں اس نے ڈور تاب کھینچا اور دروازے کے ساتھ موجود دیوار کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اسے نہ جانے کس طرح یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ سوچ بورڈ اسی دیوار پر ہے۔ بلب جلنے ہی کمراروشی سے بھر گیا تھا۔ لیونگ روم کے انتہائی بائیں جانب لمبی فریج ونڈو کے سامنے وہ پیانو اسی طرح موجود تھا۔ پیانو کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کے ہاتھ پیر لرنے لگے تھے۔ اس کا دل اس کے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ بہ مشکل سامنے بے فریج ڈور تک پہنچی اور اسے کھول دیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس پلٹنے کے قابل ہو پائی تھی۔

کئی سالوں سے اس کے ذہن کی آسکرین پر گزرے دنوں کی بکھری یادیں تیرتی رہتی تھیں۔ پچھلے دو تین سال سے وہ اکثر خواب میں خود کو ایک چھوٹی سی بچی کے روپ میں اس مکان میں پائی تھی۔ ہر رات خوف سے کانپتے ہوئے، روتے ہوئے جاگنا ایک عذاب مسلسل تھا جس سے وہ گزر رہی تھی۔ یہ صرف خوف نہیں تھا بلکہ اس سے بھی آگے کی کوئی چیز تھی..... اسے کئی سوالوں کے جوابات کی تلاش تھی۔ وہ سچ جو اسے ان خوابوں اور اس خوف سے نجات دلا سکتا تھا اسی گھر میں چھپا ہوا تھا اور اسی سچ کی تلاش اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ اس رات وہاں کیا ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب اس کی زندگی کے لیے آسکین کے مانند اہم تھا۔ کیا واقعی اس کے پیارے بابا نے وہ سب کچھ کیا تھا؟ اور کیوں؟ وہ جو کچھ بھی ہوا تھا یہیں ہوا تھا۔ کیا، کیوں، کیسے اور کس طرح کے الفاظ سوالیہ نشانوں کی لمبی لمبی عبا میں پہنے برسوں سے اس کے سامنے رقصاں تھیں اور اب وہ اس انہونی کو سمجھنے اور جاننے کے لیے یہاں آئی تھی۔

”ممتاز اور مشہور بزنس مین سردار احمد شیرازی کی اپنی خوب صورت بیوی ثنا شیرازی کو قتل کرنے کے بعد خودکشی..... ان کی چار سالہ بیٹی موت وزیست کی کھٹکھٹ میں جلا..... بچی کی کئی ہڈیاں فریج پر.....“ زینب نے گزشتہ دو سالوں میں انہیں اتنی بار پڑھا تھا کہ وہ اسے ازبر ہو گئی تھیں۔

سامنے پر صدر اور وزیراعظم کا اظہار افسوس، شیرازی صرف ایک ممتاز بزنس مین ہی نہیں تھے انہیں جلد ہی وفاقی حکومت میں اعلیٰ اور اہم عہدہ بھی ملنے جا رہا تھا۔ ایسے میں ایک کامیاب، دولت مند، مشہور و مقبول بزنس مین کو کس چیز نے قتل اور خودکشی تک پہنچا دیا؟ اس بارے میں کئی افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میاں بیوی میں طلاق ہونے والی تھی، کیا شیرازی طلاق نہیں دینا چاہتے تھے؟ ان دونوں میں یقیناً جھینٹا چھٹی بھی ہوئی تھی کیونکہ پستول پر دونوں کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ ان کی چار سال کی بچی پیانو کے پاس زمین پر بڑی مڑی سی حالت میں پائی گئی تھی، اس کا سر پیٹا ہوا تھا اور اس کی دائیں ٹانگ میں کئی فریکچر تھے۔

زینب نے جھک کر اپنی دائیں ٹانگ پر نظر ڈالی۔ اس کی چال میں ہلکا سا رنگ اسی حادثے کی نشانی تھا۔ عام حالات میں یہ اس قدر محسوس نہیں ہوتا تھا مگر ٹینشن میں اس کے لیے چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔

اس نے ہوش سنبھال کر دردانہ اور علی احمد کو بی ماں باپ کی جگہ دیکھا تھا۔ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ اس کے سگے ماں باپ نہیں ہیں اور گریجویشن کے بعد اس کے اصرار پر اسے حقیقت بتادی گئی تھی۔ دردانہ اس کی والدہ کی کزن تھیں۔ اس نے سکتے کی سی حالت میں سب کچھ سنا اور وہ پہلا موقع تھا جب اسے اپنے خوابوں کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

”تم ایک سال تک اسپتال میں رہی تھیں۔ کئی ماہ تو کوما میں تھیں۔ جب تمہیں اسپتال سے چھٹی ملی تو تم ساڑھے پانچ سال کی تھیں مگر اس کے باوجود تم گود کی بچی کے مانند لگتی تھیں۔“ دردانہ جنہیں وہ امی کہا کرتی تھی نے اسے تفصیل سے بتایا۔ ”جب تم اسپتال میں تھیں تب ہی احمد نے اخباروں میں تمہاری موت کی خبر لگا دی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ ثنا اور شیرازی کا اسکینڈل زندگی بھر تمہارا پیچھا نہ کرے۔ ہم اس وقت فیصل آباد میں تھے۔ ہم تمہیں ساتھ لے گئے اور سب کو یہی بتایا تھا کہ تمہیں گود لیا گیا ہے۔“

ان کا خیال اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا تھا جب ایک دو ماہ قبل اس نے انہیں اپنے کراچی جانے اور اپنے گھر میں ٹھہرنے کا پروگرام بتا کر مکان خالی کروانے کے لیے کہا تھا تو وہ بری طرح بھڑک اٹھی تھیں۔

”تمہیں وہاں ہرگز نہیں جانا چاہیے۔“ وہ سختی سے بولی تھیں۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ مناسب نہیں ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہماری غلطی ہے، ہمیں ان سالوں میں دیگر

جانے کے بعد

قرض خواہ لو کرے۔ ”تمہارے صاحب کب گھر ہوتے ہیں۔“

لو کر۔ ”آپ کے جانے کے بعد“

دال میں

بچہ۔ ”پاپا پاپا..... آپ کی دال.....“

باپ نے بچے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کتنی بار کہا ہے کہ کھانے کے دوران نہ بولا کرو۔“ بچہ خاموش ہو گیا۔

جب باپ کھانا کھا چکا تو بولا۔ ”اب بولو۔ کیا کہنا چاہتے تھے۔“

بچہ۔ ”پاپا اب کیا قائمہ۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کی دال میں کھٹی گرمی ہے۔“

مرسلہ ریاض بیٹ، حسن ابدال

چیزوں کی طرح اس مکان کو بیچ کر تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال دینا چاہیے تھا۔ زینب اب تم ٹیلی وژن اور میڈیا میں جانی پہچانی جانی ہو، تمہارا ایک نام ہے ایسا نہ ہو کہ وہ ناخوشگوار یادیں تمہارے کام پر اثر انداز ہوں۔“ وہ گویا اسے ڈرانا چاہ رہی تھیں۔

”پلیز امی، آپ بالکل پریشان مت ہوں اور ناراض تو بالکل بھی نہیں..... گناہ ملتا ہے اس سے۔“ وہ ان کو چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”دیکھیں میرا کام ہی حقائق سے پردہ اٹھانا ہے اگر میں دوسروں کی زندگی کے اچھے برے واقعات سامنے لا سکتی ہوں تو میں خود اپنے بارے میں جانے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس کے باوجود اسے ان کو منانے میں کئی دن لگ گئے تھے وہ تو امریکا سے آنے پر بھی تیار تھیں۔ ان کے خیال میں اگر وہاں جانا اتنا ضروری تھا تب بھی اسے اکیلے نہیں جانا چاہیے مگر زینب وہاں اکیلے ہی جانا چاہتی تھی، کچھ جنگلیں انسان کو خود ہی لڑتی پڑتی ہیں۔ یوں بھی اسے اکیلے رہنے کی عادت تھی۔ تین سال سے وہ اسلام آباد میں بھی اکیلی ہی رہ رہی تھی۔ علی احمد صاحب کے انتقال کے بعد دردانہ کافی بیمار رہنے

دو ہفتے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سپینس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III سسٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی من کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

مرتے ہوئے سامنے لگے آئینے میں اپنے عکس کو طمانیت سے دیکھا۔ دروازہ اسے اکثر میری صوفیہ لورین کے نام سے پکارا کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کی مٹی بہت خوب صورت تھیں۔ ”کم تو خیر شیرازی بھی نہیں تھا مگر شتا تو بہت ہی پیاری تھی۔ یہ خوب صورت رنگت، دسکتے سیاہ بال، یہ بڑی بڑی آنکھیں اور دلکش مسکراہٹ تمہیں اس سے ہی ملے ہیں بس قد میں تم زیادہ لمبی ہو۔“ وہ اکثر کہا کرتیں۔ اسے کئی بار بیسٹ پرسنائی کا ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔

عامم آدھے گھنٹے میں ہی پہنچ گئے تھے، وہ طویل القامت اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ گزشتہ دو سال میں کام کی زیادتی ان پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہو پائی تھی۔ ان کے گہرے براؤن بال، جاذب نظر شخصیت اور کچھ کھوجتی ہوئی بھوری آنکھیں مخاطب کو اپنی جانب متوجہ رکھنے کا ہنر جانتی تھیں مگر زینب کو پہلی نظر میں ہی ان آنکھوں میں چھپی محنت نظر آتی تھی۔

”اگر میں غلط نہیں ہوں تو شاید یہ وہی گھر ہے.....؟“

”جی ہاں۔“ وہ چند لمحوں میں باہر نکل آئے تھے۔

”زینب، مجھے کہنے دو کہ تم خود پر ظلم کر رہی ہو، جو گزر گیا ہے وہ ختم ہو چکا ہے اب اسے کریدنے کی کوشش سے حاصل کیا ہے؟“

”عامم نے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

”میرے لیے وہ سب ماضی نہیں بن پارہا یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ سب میرا پیچھا کر رہا ہے۔ حقیقت کو جانے بغیر مجھے

سکون نہیں مل پائے گا یہ میں جانتی ہوں، ان سب سے بچنے کے لیے مجھے ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”کن کا..... کون تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟“ وہ حیرانی سے بولے۔

”آوازیں، ابھی ہوئی تصویریں، مناظر، خواب جب

میں جاتی ہوں تو وہ سب بہت واضح ہوتا ہے مگر میں اسے یاد رکھ سکوں اس سے قبل سب کچھ غائب ہو جاتا ہے میں نے حال ہی میں کہیں پڑھا ہے کہ بہت سے لوگ بہت بچپن یعنی دو سال

تک کی عمر کے واقعات کو یاد رکھ پاتے ہیں اور ایک ریسرچ کے مطابق بھولی ہوئی باتوں یا یادداشت کے کسی حصے کو واپس لانے کے لیے اسی ماحول کو واپس لانا لازمی ہوتا ہے۔“

”پھر بھی یہ حماقت ہے۔“ عامم نے ڈوہرایا۔

ریٹورنٹ میں بیٹھنے اور آرڈر دینے کے بعد عامم پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”اب تم مجھے ان دو سالوں کی رپورٹ پیش کرو..... اور کچھ مت چھوڑنا۔“

”یہ تو ایک بہت لمبا آرڈر ہو گیا۔“ وہ مسکرائی پھر وہ انہیں اپنے کام، پروگرامز اور اب مسز نور جہاں شاہ کے متعلق پروگرام کے بارے میں بتاتی رہی۔

کانفرنس کے سلسلے میں ان کے ساتھ گزارے تین دن اس کی زندگی کا قیمتی اثاثہ تھے، انہوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ وہ واحد انسان تھے جو اس کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ انہوں نے بھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا تھا؟ ان کی اہلیہ آمنہ بیرون ٹی ٹی پر ایڈیٹر کا شکار تھیں اور یہ بھی کہ ان کے لیے یہ بہت اہم تھا کہ آمنہ کو ان کی جانب سے کوئی غم یا تکلیف نہ پہنچے۔

زینب لمحوں میں ان کی بات کی گہرائی میں پہنچ گئی تھی۔

اس لمحے وہ بہت اداس اور دھکی نظر آ رہے تھے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ہی اس نے عامم جعفری سے رابطہ بالکل کم کر دیا تھا۔ آپ جن لوگوں سے محبت کرتے ہیں ان کا خوش رہنا ہی دل کے اطمینان اور جینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ

اس بات کی قائل تھی۔ گزشتہ سال اسے ان کی اہلیہ کے گزر جانے کی خبر ملی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ان کو فون نہیں کر پائی تھی۔ عامم مستقل طور پر کراچی میں ہی قیام پذیر تھے، یہاں آتے ہوئے اس نے بہت بار ان کے متعلق سوچا تھا مگر اسے یہ یقین ہرگز نہیں تھا کہ کراچی پہنچ کر ریسو ہونے والی پہلی کال ان ہی کی ہوگی۔

”ہمارے شہر میں خوش آمدید۔ تمہارے یہاں آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“

”بہت شکریہ۔“ اس نے خود کو کپڑ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو میرے آنے کا علم کیسے ہوا، کیا آپ نے شہر بھر میں کیمرے لگا رکھے ہیں؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

”دیکھ لو۔“ جواب میں ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ ”دراصل

نور نے مجھے بتایا کہ وہ کل تم سے ملنے والی ہے پھر میں نے تمہارے چیمبل فون کر کے ان سے تمہارا نمبر کفرم کر لیا۔“ وہ

سادگی سے بولے۔

”اوہ۔“ وہ کچھ مایوس سی ہوئی تھی۔ مسز نور جہاں شاہ

ملک کی ممتاز صنعت کار تھیں انہیں بااثر ترین شخصیات میں شمار کیا جاتا تھا، ان کے شوہر بھی ملک کے اچھے سیاست دانوں میں

شامل تھے ان کی موت کے بعد مسز نور جہاں ان کی سیٹ پر ہی قومی اسمبلی میں پہنچی تھیں، وہ نمبر بھی رہ چکی تھیں اور اب بتایا جا رہا تھا کہ انہیں انتہائی اہم ذمے داری سونپی جانے والی تھی۔

زینب ان کے بارے میں ہی ڈیو میٹری بنانے والی تھی۔

”اب تم مجھے اپنا ایڈریس دو، میں آ رہا ہوں آج تم میری مہمان ہو۔ ہم تمہارا پسندیدہ باری کیوڈز کرنے چلیں گے اور نو بجٹ پلیز..... اوکے؟“

”ٹھیک ہے۔“ زینب نے ایڈریس سمجھا کر فون بند

لگی تھیں۔ تین سال پہلے مسز نور جہاں کی اکلوتی بیٹی تھی، انہیں اپنے ساتھ امریکا لے گئی تھی، درمیان میں وہ دوبارہ پاکستان آئی تھیں مگر مسز نور جہاں اب ان کے پیروں کی زنجیر تھی۔ یوں بھی نیشنلسٹی ہونے کی بنا پر انہیں وہاں علاج معالجہ کی بہترین سہولیات میسر تھیں۔ ان کی نظر میں اس مسئلے کے دو آسان ترین حل موجود تھے۔ زینب ان کے ساتھ امریکا چلی چلے یا پھر وہ شادی کر لے مگر زینب ان دونوں کے لیے تیار نہیں تھی۔ یوں وہ اسے ڈانٹتی ڈھکی واپس امریکا چلی جاتی تھیں اور اب بالآخر وہ یہاں تھی۔ اس نے موبائل نکال کر ان کا نمبر ملا یا۔ فون پہلی ہی گھنٹی پر ریسو ہو گیا تھا۔

”میں خیریت سے گھر پہنچ گئی ہوں۔“ وہ سلام دعا کے بعد شوخی سے بولی۔

”تم پریشان تو نہیں ہو وہاں؟“ وہ اس کی ہنسی سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھیں۔

”نہیں، بالکل نہیں۔“

”میں اب بھی یہی سوچتی ہوں کہ اگر وہاں جانا اور رہنا اتنا ضروری تھا تو مجھے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔“

”دیکھیں امی میں بالکل ٹھیک ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب میں خاصی بڑی ہو چکی ہوں اتنی کہ مجھے آپ کا خیال رکھنا چاہیے، ہے نا؟ پھر دوسری بات یہ ہے کہ مجھے اپنے نئے

ڈاکیومنٹری پروگرام کے لیے بے حد کام کرنا پڑے گا۔ آپ کی زینب اتنی کمزور نہیں ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب میں

سونے جا رہی ہوں کل کال کروں گی آپ کو۔“

”اوکے، ڈیل لاک ضرور لگا لیتا۔“ وہ پھر بھی ہدایت کرنا نہیں بھولی تھیں۔ اگلے دس منٹ میں زینب اپنا سامان اندر

لا کر تقریباً سیٹ کر چکی تھی، وہ الماری میں کپڑے ٹانگ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

”ہیلو.....“

”ہیلو زینب..... کیا حال ہے تمہارا؟“ اس آواز کو تو وہ

نیند میں بھی صاف پہچان سکتی تھی۔ فون پر عامم علی جعفری

تھے۔ ایک کامیاب بزنس مین، نہایت کامیاب سیاست دان،

سوشل ورکر اور اصولوں کے پابند انسان۔ وہ عام سیاستدانوں

سے بالکل مختلف تھے اور یہی ان کی کامیابی اور مقبولیت کی وجہ

بھی تھی۔ وہ عامم کو کئی سالوں سے جانتی تھی۔ پہلی ملاقات نے

ہی اسے ان کا مدارج بنادیا تھا۔ ان کی اور اس کی عمر میں خاصا

فرق تھا اور پھر وہ شادی شدہ بھی تھے۔ یہ سب جانتے بوجھے

بھی یہ پسندیدگی نہ جانے کب اور کس طرح محبت کے جذبے

میں ڈھل گئی، یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ کھنڈ و میں ایک

”مگر مسز نور جہاں ہی کیوں؟“ عامم نے پوچھا۔
 ”کیونکہ اس وقت وہ ملک کی سب سے بااثر عورت گردانی جا رہی ہیں۔ کاروبار میں نمبرون، سیاست دانوں میں کافی آگے ویسے آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“
 ”بہترین انتخاب ہے مگر وہ بے حد مصروف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بہت اگھڑ مزاج ہے۔ اسٹاف اور دیگر لوگوں کے ساتھ قدرے بد مزاجی سے پیش آتی ہے مجھے تو حیرت ہے کہ وہ کیسے مان گئی؟“
 ”سچ بات یہ ہے کہ اس پر میں بھی حیران ہوں۔ میں نے چار ماہ پہلے ان کو اس پروگرام کا پروپوزل بنا کر بھیجا تھا مگر انتہائی خشک الفاظ میں صاف انکار کا جواب ملا تھا۔ ایک ماہ قبل چینل کے ڈائریکٹر عباسی خود اسلام آباد آئے انہوں نے مجھ سے ملاقات کی اور بتایا کہ مسز نور جہاں نے انہیں میرا خط دکھایا تھا اور وہ خود بھی اس پروگرام میں دلچسپی لے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ملازمت اور پروگرام دونوں آفر کیے اور میں نے ہامی بھر لی مگر میں خود بھی حیران ہوں کہ وہ آخر کیسے تیار ہو گئیں۔“ وہ بولی۔
 ”دراصل ایک انتہائی اہم ذمہ داری کے حوالے سے کچھ ہونے والا ہے۔ نور جہاں اس دوڑ میں سب سے آگے رہنا چاہتی ہے اور میڈیا کی طاقت تو تم جانتی ہو۔ عباسی نے ہی اسے اس بات کے لیے راضی کیا ہے یہ صاف صاف کچھ لو اور کچھ دو کا معاملہ ہے۔ نور جہاں آگے آجانی ہے تو عباسی اور اس کے چینل کے وارے تیارے ہو جائیں گے۔“ وہ کچھ تلخ لہجے میں بولے۔
 ”اب میرے بارے میں بھی تو کچھ پوچھو..... میں نے کیا کیا کیا؟“
 ”مجھے معلوم ہے سب۔“ وہ مسکرائی۔ ”میڈیا کی طاقت آپ تو جانتے ہی ہیں۔“
 ”پھر بھی کوئی رابطہ نہیں.....“
 ”بس..... آمنہ جی کے جانے پر بہت بار فون اٹھایا کہ آپ سے افسوس کروں مگر مجھے شاید افسوس کرنا بھی نہیں آتا، کر ہی نہیں پائی آپ کے لیے وہ سب کچھ بہت مشکل رہا ہوگا۔“
 ”ہاں..... بہت مشکل۔“ وہ گہری سانس لے کر بولے۔
 ”آپ بھی تو مجھے کال کر سکتے تھے۔ ملنے کے لیے آسکتے تھے؟“ بالآخر اس کے دل کا سوال زبان پر آ گیا تھا اس کا جواب سننے کے لیے وہ سرتاپا ساعت میں ڈھل گئی تھی۔
 ”میں نے سوچا..... کئی بار.....“ وہ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔ ”مگر میں سمجھتا ہوں سب زینب اور یہی مسئلہ ہے۔“
 ”کیسا مسئلہ؟“

”میری عمر اڑتالیس سال ہے اور تم صرف انتیس برس کی ہو۔“
 ”تو کیا اڑتالیس سال کی عمر میں لوگ محبت کرے چھوڑ دیتے ہیں؟“
 ”نہیں مگر میں تم سے اتنی محبت ضرور کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری عمر کے کسی شخص سے ملنے اور خوش رہنے دوں۔“
 ”اور آپ اپنی عمر کے کسی شخص سے مل کر خوش ہو رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں..... مجھے تمہائی کی عادت ہے۔“ وہ مسکرا دیے۔
 ”اوکے۔“ زینب بھی جو اب مسکرائی۔ ”اب جب ہم نے سارے حساب کتاب کر لیے ہیں تو آپ میرے لیے ایک اچھا سا میٹھا پان بھی منگوادیں۔“ اس کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد جب عامم اسے اس کے دروازے پر اتار کر جا رہے تھے تو وہ بہت مطمئن تھی۔ اس نے انہیں اس پراسرار فون کال کی بابت بھی بتا دیا تھا۔ اب اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر گنگنائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظر سب سے پہلے سیاہ ماربل فرش پر پڑے سفید لٹافے پر پڑی۔ جس پر سیاہ روشنائی سے اس کا نام لکھا گیا تھا۔ اس نے جبکہ کر لٹافہ اٹھایا۔ اس میں صرف ایک کاغذ تھا۔ اس فل اسکیپ کاغذ پر بڑے بڑے حرف میں ایک جملہ تحریر تھا۔
 ”میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا..... اب تم خود ذمہ دار ہو۔“

☆☆☆

اگلی صبح الارم کی آواز نے اسے ٹھیک چھ بجے جگا دیا تھا۔ وہ تقریباً پوری رات سوئی جا رہی تھی۔ ٹھکن جہاں اسے تھپک کر سلا رہی تھی وہیں نئے پرانے خوف یکجا ہو کر عجیب عجیب منظر دکھا رہے تھے۔ کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے تھا یہ احساس ہی اسے بے چین کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ کوئی کون تھا اور اسے کیوں روکنا چاہتا تھا؟ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس سوال کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ یہ عام میڈیا اسٹنٹ، گنڈر بھیگی یا نور جہاں کے کسی مخالف کی چال نہیں ہے بلکہ اس کا سراور کہیں اس کے بچپن اور اس کے والدین کی موت کے ساتھ جڑا ہوا تھا مگر اس کے پاس اس یقین کو خود اپنے سامنے ثابت کرنے کے لیے بھی کوئی ثبوت نہیں تھا۔
 آنکھ کھلتے ہی وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے آج مسز نور جہاں سے ملنا تھا۔ مگر اس سب سے پہلے وہ پیچھے اسٹور میں موجود اپنے بابا کے محفوظ کاغذات، تصاویر وغیرہ کو لاہریری میں منتقل کرنا چاہتی تھی۔ اسٹور کے دروازے پر لگا تالا خاصا

زنگ آلود ہو رہا تھا۔ دروازہ نے اسے چابیاں دیتے ہوئے صاف الفاظ میں بتا دیا تھا۔
 ”مجھے بالکل نہیں معلوم کہ تمہیں وہاں کیا کیا ملے گا کیونکہ ہم نے ان کی ان ذاتی چیزوں کو بھی نہیں دیکھا بس اسی وقت تمہاری مانی نے انہیں پیک کروا کر اسٹور میں مقفل کر دیا تھا جس کے بعد اسے کبھی نہیں کھولا گیا۔“
 اور اب سالوں بعد زینب اس دروازے کو کھول رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی گرد، دھول اور سیکن کی تیز بو نے اس کا استقبال کیا۔ سامنے دیوار کے ساتھ دو بڑی فائلنگ کپینس تھیں جنہیں گرد اور جالوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی کارٹن باکسز موجود تھے جن پر مختلف لیبل لگے ہوئے تھے ان لیبلوں پر اس کے بابا کے نام کے ساتھ سامان کی تفصیلات درج تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر تصاویر، کتابیں اور کاغذات الگ الگ کر کے رکھے گئے ہیں۔ ”سرور احمد شیرازی۔“ اس نے بہ آواز بلند اس نام کو دہرایا۔ وہ اس کے بابا تھے جن کی محبت کو وہ اب بھی محسوس کر سکتی تھی مگر اس نے اخبارات میں چھپنے والی اس ایک آخری تصویر کے علاوہ ان کی کوئی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔ دردانہ نے اسے اس کی ماما کی بہت تصاویر دکھائی تھیں۔ گرد اور دھول کی وجہ سے اسے مسلسل چھٹکیں آ رہی تھیں مگر اس نے ان تمام کارٹن اور فائلوں کو لاہریری میں پہنچا کر دم لیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کارٹن بکس پر لگے لیبل اتار لیے تھے۔
 ”شاید یہ امی کی ہدایتوں کا اثر ہے۔“ یہ سوچ کر اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ لے آئی تھی۔
 ”تمہیں اس سب سے دور رہنا چاہیے کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہیے زینب اپنے دماغ سے کام لو، کل تمہاری شادی ہوگی، بچے ہوں گے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ انہیں معلوم ہو کہ تمہاری لنگر اہٹ کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے باپ نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“ فون کی گھنٹی نے اسے اس کے خیالوں سے چونکا دیا تھا۔ فون پر مسز نور جہاں کی سیکریٹری تھی۔ اس کا اپائنٹ کا وقت یا دولا رہی تھی۔

☆☆☆

زینب پورے ساڑھے گیارہ بجے اس نومنز لہ عمارت کے باہر کھڑی تھی۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی۔ یہاں ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بہت ممتاز تاجروں کے عظیم الشان دفاتر تھے۔ چند لمحوں بعد وہ مسز نور جہاں کے دفتر کے استقبال پر موجود تھی۔ ”میڈم اس وقت ایک میٹنگ میں ہیں مگر اب وہ فارغ ہونے ہی والی ہیں۔“ ریسپشنسٹ معذرت خواہانہ

انداز میں بولی۔
 ”کوئی بات نہیں میں انتظار کروں گی۔“ زینب خوش دلی سے مسکرائی اور سامنے موجود آرام دہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ یہ ایک انتہائی شاندار دفتر تھا۔
 چند لمحوں بعد ہی مسز نور جہاں اپنے کمرے سے نکلتی نظر آئیں۔ ان کے ساتھ موجود مہمان زینب کے لیے اجنبی نہیں تھا وہ اطلاعات کے وفاقی وزیر تھے اور اس وقت انتہائی توجہ سے میڈم نور جہاں کی باتیں سن رہے تھے۔
 وہ دونوں لابی کے اسی جانب بنے دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ غالباً وہاں اس دفتر کے لیے خصوصی لفٹ موجود تھی۔ میڈم نور جہاں کی واپسی چند لمحوں بعد ہوئی تھی اس بار ان کا رخ زینب کی طرف تھا۔ زینب انہیں غور سے اپنی جانب آتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھی قامت کی مالک تھیں غالباً پانچ فٹ چھ انچ۔ زینب نے اندازہ لگایا۔ وہ اڑتالیس کے لگ بھگ تھیں مگر دیکھنے میں چالیس اکتالیس سے زیادہ نہیں لگتی تھیں۔
 ”ہیلو مس علی احمد، آپ اندر آجائیے۔ کیا میں آپ کو زینب کہہ سکتی ہوں۔ عباسی نے آپ کا اتنا ذکر کیا ہے کہ آپ میرے لیے اجنبی نہیں رہیں۔“
 ”بالکل، کیوں نہیں اور میرے لیے آپ کا تکلف نہیں صرف تم کیسے۔“ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”زبردست..... آپ کا آفس اور ذوق دونوں بہت شاندار ہیں۔“ وہ تعریفی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”شکریہ، مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں تمہیں اپنی مصروفیات کے باعث کم وقت دے پاؤں گی۔ ویسے کیا تمہیں عباسی نے بتایا کہ مجھے اس پروگرام کا آئیڈیاز زیادہ پسند نہیں آیا تھا؟“
 ”جی مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے نتائج سے بہت خوش ہوں گی۔“
 ”مجھے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے بھی سوچا کہ یہی بہتر ہے کہ میں عباسی اور تمہیں یہ پروگرام کرنے دوں ورنہ کوئی اور مجھ سے اجازت لیے بغیر کر ڈالے گا۔“ وہ مسکرائیں۔ ”میری اس حوالے سے عامم جعفری سے بھی بات ہوئی تھی تم جانتی ہونا اسے؟ اس نے بھی مجھے یقین دلایا کہ میرے پروگرام کو تم سے بہتر انداز میں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ تم بہت مختلف ہو۔“
 ”یہ ان کی مہربانی ہے۔“ زینب نے سرسری انداز میں

کہا۔ ”کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ کو اس پروگرام کے حوالے سے کیا خدشات ہیں؟ اصل میں اگر مجھے ان باتوں کا علم ہوگا تو غلطی کی گنجائش کم سے کم ہوگی۔“

”مجھے تو یہ ڈر ہے کہ میرے بارے میں پروگرام میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی کیونکہ میرے پاس کوئی خاص دلچسپ کہانی نہیں ہے۔ میں تیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے کام سے محبت ہے یہی میری زندگی ہے، میں اسکرین پر آنسو بہاتے ہوئے یہ نہیں بتا سکتی کہ میرے بیٹے کا اسکول میں پہلا دن کیسا گزرا کیونکہ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ لوگوں کو عموماً سیدھی سادی کہانیاں میں کم دلچسپی ہوتی ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”مگر آپ اپنے کالج میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں، آپ کو اس وقت ایک مشہور ہدایت کار نے فلم کی آفر کی تھی۔“

”مگر میں وہ ذکر اپنی ڈاکیومنٹری میں بالکل نہیں چاہتی، بالکل بھی نہیں۔“ وہ قدرے سختی سے بولیں۔
”لیکن آپ یہ سب اپنی زندگی سے کیسے نکال سکتی ہیں؟“ زینب کو اپنی کہانی کا اسکرین لے لے بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

”بہت آسانی سے..... کیونکہ میں نے اس کی وجہ سے صرف اور صرف نقصان ہی اٹھائے ہیں۔ جب میرے شو ہر کا انتقال ہوا تو کسی ستم ظریف نے وہ سب اخبار میں لگا کر میری ایوارڈ والی تصویر چھاپ کر کینیشن لگایا کہ اصل انعام تو اب ملے گا یعنی مرحوم شو ہر کی سینیٹ میں سیٹ۔ جس کے بعد میرے راستے میں ہزاروں مشکلات اور رکاوٹیں آگئی تھیں۔ اس لیے زینب وہ قصہ نہیں آئے گا۔ تم پروگرام کی ابتدا وہاں سے کرو گی جب میں یونیورسٹی میں ایشیائی کمیٹی کی سربراہ تھی اور شہر یار سے میری شادی ہونے والی تھی۔ میں اس کی انتخابی مہم میں اس کے ساتھ دن رات کام کر رہی تھی۔ میری اصل زندگی وہیں سے شروع ہوئی تھی۔“ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”مگر آپ اپنی زندگی کے 24 سال کیسے مناسکتی ہیں اور کیوں؟ مجھے آپ کے بچپن کی ایک تصویر ملی تھی جس میں آپ اپنے ملتان والے گھر کے باہر کھڑی ہیں۔ شاہ ہاؤس والی اس تصویر کوئی میں نے پروگرام کی ابتدا بنانے کے بارے میں سوچا تھا۔“

”زینب، وہ میرا گھر نہیں تھا میں صرف وہاں رہتی تھی۔“ مسز نور جہاں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولیں۔ ”میری ماں شاہ ہاؤس میں میجر تھیں اور ہم پچھلے حصے میں بنے اپارٹمنٹ

میں رہتے تھے۔ میں اس حوالے سے اپنی بچپان نہیں چاہتی۔“ نور جہاں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک دیلا ہوا بربد بار شخص اندر داخل ہوا۔ ”میڈم آپ کی میٹنگ کا وقت ہونے والا ہے گاڑی تیار ہے۔“

”اوکے۔“ مسز نور جہاں فوراً کھڑی ہو گئیں۔ ”زینب معاف کرنا مجھے اب جانا ہوگا۔ ان سے ملو یہ صدف حیات ہیں ہمارے ایڈمنسٹریشن ہیڈ۔ انہوں نے اور شمشیر نے ہماری ڈاکیومنٹری کے لیے خاصا مواد تیار کیا ہے جس میں خبروں کے تراشے، خطوط، تصویریں وغیرہ ہیں۔ تم ان سب کو دیکھ لو۔ اپنی تیاری کر لو پھر ہم چند دنوں بعد دوبارہ مل لیتے ہیں، اوکے۔“

زینب کے پاس اتفاق رائے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ڈاکیومنٹری کے حوالے سے عباسی صاحب سے بات کرے گی۔

”شمشیر تمہیں گھر چھوڑ دے گا، وہ ہے کہاں..... صدف؟“
”یہیں پر ہوں مگر ہماری میڈم خیالوں میں کہیں اور پہنچی لگتی ہیں، واپس آ جاؤ یا۔“ اس شوخ جملے پر زینب نے پلٹ کر دیکھا وہ پہلی نظر میں ڈرائیور کے بجائے کوئی باکسر لگ رہا تھا۔ کسرتی جسم اور مضبوط چہرے کا مالک۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گہرائی تک اترنے کی عادی لگ رہی تھیں، اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت میں سب سے انوکھی اور حیرت انگیز چیز اس کے ہاتھ ہی تھے۔

”زینب، یہ شمشیر ہے یہ تمہیں راستے میں اپنے کام کے بارے میں بتا دے گا۔ یہ میرے ساتھ 25 برسوں سے ہے اور ۲۱ سال کا بھی ملتان میں ہمارے علاقے سے رہا ہے۔ اب مجھے چلنا ہے۔“ وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئی تھیں۔ زینب بے بسی سے انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پروگرام کو کامیابی سے کر لینا تو ہے کے چنے چبانے سے کم مشکل ثابت نہیں ہونے والا تھا۔

اس کی توجہ شمشیر اور اس کے رویے کی جانب مبذول ہوئی تھی۔ شمشیر کو وہ بچپن سے جانتی تھی مگر اس کے رویے سے زینب حیران رہ گئی تھی۔ نور جہاں اور اس کے شو فر کے درمیان کیا تھا؟ یہ ابھرنے سے گھر جاتے ہوئے راستے میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس نے سوچا۔

☆☆☆

راستے میں خاصا ٹریفک تھا، گاڑی بار بار رک رہی تھی۔ ”شمشیر آپ میڈم صاحبہ کے ساتھ خاصے بے تکلف

ہیں۔“ سنگل پر گاڑی رکی تو اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”جی ہاں مگر میں لوگوں کے درمیان ایسا بہت کم کرتا ہوں۔ اصل میں وہ اس پروگرام کو لے کر قدرے ابھی ہوئی ہے۔ عباسی صاحب اور میں نے اسے اس کی اہمیت پر مشکل سے قائل کیا ہے اسی لیے بس فیشن کم کرنے کے لیے مذاق کیا ورنہ میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔“ وہ زینب کو بیک مرر میں دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ دونوں ملتان میں ہی رہتے تھے نا، آپ کا بچپن ساتھ گزرا ہے؟“

”کسی حد تک، نور مجھ سے دو سال سینئر تھی۔ میں جب پندرہ سال کا ہوا تو میں نے گاڑی چلانا شروع کر دی تھی اور جزوقتی ڈرائیور کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ نور نے آپ کو بتایا ہوگا کہ وہ وہاں شاہ ہاؤس میں رہتی تھی؟ میں شاہ ہاؤس سے چار کوٹھیاں آگے والے مکان میں ان کی گاڑی پر کام کر رہا تھا کہ میں نے نور کی چیخوں کی آواز سنی۔ شاہ ہاؤس کے سامنے والی کونٹری میں ایک سنگی ریٹائرڈ آرمی آفیسر رہتا تھا اس کے پاس ایک بڑا جرمن شیفرڈ کتا تھا۔ وہ بہت خطرناک تھا اور اسے وہ لوگ باندھ کر رکھتے تھے اس روز ان کا گیٹ کھلا تھا اور وہ گدھا باہر نکل آیا۔ عین اسی وقت نور سڑک پر سامنے سے آ رہی تھی۔“

”پھر آپ نے انہیں بچایا؟“ زینب دلچسپی سے سن رہی تھی۔
”خوب اب سمجھ میں آیا کہ مسز نور جہاں آپ پر اتنا بھروسہ کیوں کرتی ہیں۔ ایک چھینی کہاوت ہے کہ آپ جس کی جان بچاتے ہیں پھر آپ اس کی حفاظت کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ کیا آپ میڈم کی حفاظت کی ذمے داری محسوس کرتے ہیں؟“

”شاید ایسا ہی ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ وہ اس دور اور ملتان کے شاہ ہاؤس کے بارے میں زیادہ باتیں پسند نہیں کرے گی۔“
”مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اس قصے کا ذکر ضرور کریں گی۔“

آخر آپ نے ان کی جان بچائی تھی۔“
”نور اس وقت بھی بہت شکر گزار ہوئی تھی۔ میرے بازو سے خون بہہ رہا تھا وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور پھر ہم ہمیشہ کے لیے دوست بن گئے۔“ وہ اپنے بازو پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اور مس زینب میں نے دوست کہا ہے صرف اچھے دوست..... اس سے زیادہ کچھ نہیں، ہم روز ملتے تھے وہ میری انگریزی درست کرنے کی بہت کوشش کرتی تھی۔ مجھے پڑھانی مگر آپ مجھے مشین کا کوئی ٹکڑا دے دیں میں اسے دو

لکھوں میں کھول کر ٹھیک کر لوں گا مگر چار جملوں کا مضمون لکھنا..... تو یہ تو یہ۔“ وہ ہلکا سا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”بس پھر نور باہر پڑھنے چلی گئی۔ آ ابھی گئی۔ میں نے مختلف نوکریاں کیں پھر جوئے کے چکر میں اچھا خاصا مقروض ہو گیا۔ انہی دنوں میں نے اخبار میں پڑھا کہ نور اور شہر یار ٹریفک کے ایک بہت بڑے حادثے سے بال بال بچے ہیں ان کا ڈرائیور نشے میں تھا۔ میں نے یہ پڑھ کر اسے خط لکھا اور انہوں نے مجھے اپنا شو فر مقرر کر لیا..... کیجیے مس زینب، ہم ساتویں اسٹریٹ پر آگئے آپ کا دولت خانہ کس طرف ہے؟“

”وہ اگلے بلاک کا آخری مکان ہے۔“

”وہ گھر.....؟“ شمشیر حیرت سے چونکا۔

”ہاں، کیوں؟“

”بس کچھ یاد آ گیا تھا۔ مس نور اور شہر یار صاحب کو اس گھر میں اکثر پارٹیز میں لایا کرتا تھا۔ وہاں پہلے سردار احمد شیرازی رہا کرتے تھے۔“ وہ بولا۔ ”کیا آپ کو کسی نے نہیں بتایا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو قتل کر کے خودکشی کر لی تھی؟“

”میرے والد کے وکیل نے مجھے یہ مکان کراپے پر دلایا ہے۔ انہوں نے کچھ ذکر تو کیا تھا مگر کچھ خاص تفصیل نہیں بتائی تھی۔“ زینب نارمل رہنے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔
”اچھا جی ہے کہ اس سانحے کو بھلائی دیا جائے۔ انہوں نے تو اپنی سچی سی بچی کو بھی مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شدید زخمی ہوئی تھی بعد میں وہ بے چاری بھی چل بسی۔ بہت پیاری بچی تھی، اس کا نام رباب تھا مجھے اب بھی یاد ہے..... یہ کیجیے آپ کا گھر آ گیا ہے۔“

زینب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ شمشیر نے اتنی دیر میں اتر کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ ”آئیے میڈم!“

”اوہ ہاں، شکریہ۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے بچپن کو اس گھر کو جانتا تھا وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر یہ وقت مناسب نہیں تھا وہ یقیناً مشکوک ہو جاتا۔ شمشیر ڈاکیومنٹری سے متعلق مواد کا باکس اٹھائے اس کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔

”اس میں سب کچھ ہے، تصویریں، خبریں، خطوط کی کاپیاں..... میں انہیں کہاں رکھوں؟“

”اسے اندر لائبریری میں لے آئیے۔“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ”شکریہ شمشیر، مجھے یقین ہے کہ ہم سب مل کر ایک انتہائی بہترین پروگرام بنا سکیں گے اور میڈم اس سے خوش ہوں گی۔“

”اگر وہ خوش نہ ہوئی تو ہم دونوں کو خود ہی اچھی طرح پتا چل جائے گا۔“ وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ”اچھا میں چلتا ہوں مس زینب۔“

”صرف زینب..... تم میڈم کو بھی تو نام سے پکارتے ہو۔“

”ان کے اسٹاف میں صرف میں ہی یہ کر سکتا ہوں۔“ وہ پھر ہنسا۔ ”کیا پتا کہ کل مجھے آپ کی جان بچانے کا بھی موقع مل جائے۔“

”پلیز ایسا موقع آئے تو سوچنا مت۔“ وہ بھی جواباً مسکرائی۔ شمشیر کے جانے کے بعد وہ چند لمحے وہیں کھڑی سوچتی رہی پھر گیٹ بند کر کے گھر میں گھس گئی۔

☆☆☆

وہیں اس گھر سے چند مکانات کے فاصلے پر ایک چھوٹی سفید کار موجود تھی، اس میں موجود شخص شمشیر کو گاڑی موڑتے ہوئے یہ غور دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر غصہ تحریر تھا۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر سختی سے جھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دبلا پتلا طویل القامت اسٹارٹ شخص تھا اس کے بال بالکل سفید تھے جو اس کے جھریوں سے پاک چہرے پر کچھ... عجیب سے لگ رہے تھے۔

”وہ اب بھی یہاں ہے..... میرے سمجھانے کے باوجود..... اور اس پروگرام پر کام کیے جا رہی ہے۔ یہ یقیناً نور جہاں کی گاڑی ہے اور یہ..... شمشیر.....“ غصہ ضبط کرنے کی وجہ سے اس کے گالوں کی ہڈیاں سختی سے جھنجھی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ ”تو وہ نہیں سمجھے گی اسی طرح جیسے اس کا باپ نہیں سمجھا تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس کی یادداشت میں سالوں پہلے کی ایک روشن دوپہر آگئی۔ کلب کے سونٹنگ پول کے پاس پڑی ایک میز پر وہ سردار احمد شیرازی بیٹھے ہوئے تھے۔

”تم بکواس کر رہے ہو، اول تو ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو تم کونہ ہوتے ہو یہ سب کہنے والے.....“ شیرازی کا سرخ و سفید چہرہ اس کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

”میں آپ سے جو کہہ رہا ہوں اس پر توجہ دیں..... نور جہاں بہت شاطر عورت ہے، وہ آپ کی زندگی برباد کر دے گی۔“ اس نے خود کو کہتے سنا۔

”تم واقعی پاگل تو نہیں ہو..... بہر حال یہاں سے فوراً چلتے پھرتے نظر آؤ اور دوبارہ میرے یا نور جہاں کے قریب بھی نظر مت آنا ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

سردار احمد شیرازی غصے سے یہ کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگر بھرتے وہاں سے نکل گئے تھے، پھر اسے وہ سب کرنا پڑا جو وہ نہیں چاہتا تھا، جس کا انجام کسی کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا، زینب کے گھر کے سامنے پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اس کے ذہن میں سالوں پہلے کی رات کا وہ منظر اب بھی تازہ تھا۔ خون میں نہایا ہوا مرد کافی ٹھیل اور صوفے کے درمیان زمین پر پڑا تھا۔ عورت کی کھلی آنکھیں بغیر جھپکے جھپکے کھل رہی تھیں۔ وہ پیانو کے سامنے پڑی تھی اور وہ چھوٹی سی بچی جس کے بال اور جسم خون میں نہائے ہوئے تھے۔ پیانو سے ذرا پہلے زمین پر بکھری پڑی تھی، اس کی ایک ٹانگ عجیب سے انداز میں اس کے جسم کے نیچے دنی ہوئی تھی.....

وہ بند دروازے کو چند لمحے کھولا پھر آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

زینب اس وقت کافی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ وہ کچن میں داخل ہی ہوئی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ ”زینب علی احمد۔“ ایک سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”جی، آپ کون؟“ وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچان گئی تھی۔

”میڈم نور جہاں کے پروگرام کو بھول جاؤ۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا مگر تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔ جانتی ہونا کہ موت بہت بھیانک ہوتی ہے لڑکی، بہت تکلیف دہ..... خود کو بچالو..... بچالو خود کو۔“ اور پھر لائن ساکت ہو گئی۔ زینب چند لمحے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

”یہ کوئی پاگل ہے جو کسی عورت کو آگے آتا نہیں دیکھ سکتا یا پھر میڈم نور جہاں کا کوئی رقیب رویا۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔ ”اور زینب علی احمد اب ایسی دھمکیوں سے ڈر کر میدان چھوڑ کر بھاگنے لگی تو اس کا کیریئر کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔“

کھانے کے بعد وہ لائبریری میں کام میں لگ گئی تھی۔ وہ جوں جوں میڈم کی چیزوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کے لیے اس کی پسندیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

”نور جہاں نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ واقعی اپنے کام سے عشق کرتی ہے۔“ اس نے سوچا۔ رات گئے وہ لائبریری سے نکلی، وہ بہت تھکی ہوئی تھی اس کی ٹانگ بھی خاصی تکلیف دے رہی تھی مگر پھر بھی اسے معلوم تھا کہ آج نیند آسانی سے نہیں آئے گی۔ وہ کوئی اچھا سا منظر سوچتے ہوئے سو جائے گی۔ یہ اس کی پسندیدہ اور آزمودہ تھراپی تھی۔ جو آپ چاہتے ہیں، جو آپ کا پسندیدہ منظر ہو سکتا ہے اسے خواب کے مانند دیکھتے ہوئے

سو جانا آسان تھا اور وہ..... وہ آج صرف غاصم جعفری کو سوچنے کی، وہ مسکرائی اور بستر پر جا گری۔

☆☆☆

زینب مطلوبہ ٹی وی نیٹ ورک کے دفتر میں داخل ہوئی تو عباسی صاحب اسے استقبالیہ پر ریسو کرنے خود موجود تھے۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر اچھا لگا زینب، آؤ میں تمہیں سب سے ملاؤں۔“ نیوز روم، ایڈیٹنگ ایریا، اسٹوڈیو، میک اپ روم، کیمیرے، لائٹس اس نے جو کچھ دیکھا اس سے اسے خوشی ہو رہی تھی۔ یہ ملک کا سب سے بڑا چینل تھا اور اب وہ اس کا حصہ تھی۔ ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اسے اپنے فیصلے پر اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اب وہ عباسی صاحب کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ عباسی اس چینل کا روح رواں اور چیف ایگزیکٹو تھا۔ وہ متاثر کن اور نہایت متحرک طبیعت کا مالک تھا۔ لوگ اسے کام کے معاملے میں ہائپر قرار دیتے تھے مگر اس کا یہ جنون ہی اس کی کامیابی کی وجہ تھا اس کی قدرے لمبی باہر کی جانب کھنچی آنکھیں، نوک دار ناک اور پتکے پتکے ہونٹ دیکھ کر زینب کو ہمیشہ عقاب کا خیال آتا تھا۔ وہ انڈسٹری میں اپنے فائدے کے حوالے سے لپکنے، پلٹنے اور جھپٹنے کے لیے ہی مشہور تھا۔ کامیابی کسی بھی قیمت پر اس کا اصول تھا۔

”مبارک ہو تم نے میڈم نور جہاں پر کل بہت اچھا تاثر چھوڑا۔ وہ تمہارے انتخاب پر خوش ہیں اور ہاں یہ بتاؤ کہ چائے یا کافی؟“

”کافی۔“ وہ بولی۔ ”میں بھی ان سے متاثر ہوئی۔ میرا مطلب ہے جتنی دیر مجھے ان سے ملنے کا موقع ملا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ نور جہاں بہت مصروف رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ جس قدر ممکن ہو سکے اپنے بارے میں چیزیں جمع کر کے تمہیں دے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ 27 تاریخ کو یہ پروگرام آن ائر چلا جائے۔“

”27 تاریخ یعنی صرف پندرہ دن بعد..... آخر اتنی جلدی کیوں ہے؟“ ڈیڈ لائن سن کر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

”جلدی ہے۔“ عباسی مسکرایا۔ ”کیونکہ ہم ایک عام ڈاکیومنٹری نہیں بنائے یہ بادشاہ گروگرام ہے زینب بی بی۔“

”یعنی.....؟“

”یعنی اگلے ماہ کے اوائل میں بین الاقوامی طور پر ایشیا کے لیے سماجی بہبود کے ایک بہت بڑے فنڈ کا آغاز ہو رہا ہے۔ پہلے چار سالوں کے لیے اس کی چیئر پرسن کا انتخاب پاکستان سے ہونا ہے اور اس عہدے کے لیے بہ ظاہر دو ہی خواتین مقابلے میں ہیں، نور جہاں اور میڈم فشن آرا..... ہمیں اس

پروگرام کے ذریعے ملک میں اور بیرون ملک لوگوں کی رائے نور جہاں کے حق میں ہموار کرنی ہے، اس حد تک کہ ان کے حق میں لاکھوں تار اور پیغامات آنے لگیں، اس پروگرام کو نور جہاں کے لیے سازگار فضا بنانی ہے۔“

”اگر ہم اسے اس انداز میں بنائیں گے جیسے وہ چاہتی ہیں تو شاید آپ دس پندرہ ٹیلی گرام بھی نہیں پاسکیں گے۔“ زینب حتی انداز میں بولی۔ ”اس ڈاکیومنٹری پر سوچتے اور میڈم کو اس کے لیے خط لکھنے سے پہلے میں نے اس بارے میں پورا سروے کیا تھا تاکہ جان سکوں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔“

”لوگ انہیں ذہین، زیرک، باحوصلہ اور قابل خاتون سمجھتے ہیں مگر بحیثیت انسان انہیں کوئی قریب سے نہیں جانتا۔ نو جوانوں کے لیے یہ بات دلچسپی کا سبب بنی تھی کہ وہ طالب علمی کے دور میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ جیت چکی ہیں مگر وہ ان کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے اب اگر ہم ان کی زندگی کے 24 سال اس پروگرام سے نکال دیں گے تو پھر یہ کتابی قسم کی خشک ڈاکیومنٹری بن جائے گی اور لوگ ریموٹ کا بٹن دبانے میں لمحہ بھی نہیں لگائیں گے۔“

”ہوں..... بات تو ٹھیک ہے مگر وہ شاید یہ بالکل پسند نہیں کریں گی۔“ عباسی پر سوچ انداز میں بولا۔

”اگر آپ مطلوبہ نتائج چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے۔“

عباسی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے حساب کتاب میں مصروف تھا۔ میڈم نور جہاں یہ بالکل پسند نہیں کرے گی۔ اگر ایسا کیا گیا اور یہ کاوش بیک فائر کر گئی تب کیا ہوگا؟

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں اس پروگرام کے حوالے سے کیا ہے؟ تم اس کی کیا اپروچ چاہتی ہو؟“

”پہلے ملتان.....“ وہ بولی۔ ”میں خود وہاں جا کر پورا ہوم ورک کرنا چاہتی ہوں۔ میڈم کی ماں شاہ ہاؤس میں شیجر تھیں۔ میڈم محنت کر کے آگے آئیں یہ سب باتیں ان کے حق میں جائیں گی پھر ان کی شادی اور اس کے ابتدائی سال.....“

”ہاں، ان کی اس دور کے سب ہی مشہور لوگوں کے ساتھ تصاویر موجود ہیں تم وہ ٹیکس بھی استعمال کر سکتی ہو جب شہر یار کی تدفین ہوئی تب بھی سب وہاں موجود تھے اور شہر یار کا خاندان..... شہر یار اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی یاں نے اپنی بہو کو بھی پسند نہیں کیا، وہ اسے آسیب یا ڈاکو سمجھتی تھی جس نے اس کے بیٹے پر قبضہ کر لیا تھا مگر وہ نور جہاں کو آگے آنے سے نہیں روک

تھی۔ اسے اس سال کا سب سے بڑا ایوارڈ بھی ملا تھا اور فلم میں مرکزی کردار بھی۔ اخبارات میں تصویریں چھپی تھیں مگر پھر اس نے انکار کر دیا۔

”ہاں ہاں اس زمانے میں بہت لوگ اس کے پیچھے تھے، یاد ہے کسی ایک لچر کا تو سرشمیر نے پھاڑ دیا تھا۔“ فیروز بولا۔

”شمیر ملک؟“ زینب نے پوچھا۔

”ہاں وہی، وہ نور جہاں کا باڈی گارڈ مشہور تھا۔“

”اب وہ میڈم کا شو فر ہے۔“ زینب نے پوچھا۔

”ارے کیا سچ میں؟“ فیروز سر ہلا کر بولا۔ ”میرا سلام کیسے گا اسے اور پوچھیے گا کہ کیا اب بھی وہ گھوڑوں اور پتوں پر قسمت آزماتا ہے؟“

زینب ٹھکن کے باوجود بارہ سے پہلے بستر پر نہیں لیٹ پائی تھی۔ عرشہ اور فیروز نے جس طرح بیاہنگ دہل ریکارڈنگ کروائی تھی اور اپنے فون نمبر دیے تھے اس سے اسے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ میڈم کی ماں شاہ ہاؤس کی کلک تھیں۔ نور جہاں کی شادی سے کافی عرصہ قبل مسز شاہ نے انہیں نوکری سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد وہ نئی ملازمت حاصل نہیں کر پائی تھیں۔ وہ ایک خاصی بھاری بھر کم خاتون تھیں۔ خود نور جہاں ان دنوں اسکا لرشپ پر لندن پڑھنے جا چکی تھی۔ اسی حالت میں تقریباً کسمپرسی اور تنہائی کی حالت میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد نور جہاں وہاں بھی نہیں گئی تھی۔ عرشہ اور فیروز سے گفتگو کے بعد جو نیا اہم نام اس کے سامنے آیا تھا وہ مراد شاہ کا تھا۔

”نور جہاں خوش قسمت تھی کہ اس سے اس کی شادی نہیں ہوئی۔ وہ کسی کام کا نہیں ہے وہ تو شکر ہے کہ اس کے پاس جائیداد وغیرہ ہے ورنہ تو بھوکا ہی مرتا اور چڑچڑا بھی تو اتنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیوی اپنا زیادہ وقت شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ گزارتی ہے۔“

”بس آج کے لیے اتنا ہی۔“ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ کل اسے میڈم کے اسکول کی ریکارڈ پر پریل مسز بلگرامی سے بھی ملنا تھا۔ جن کی سفارش پر اس نے نبیلہ شاہ کو ملازمت دی تھی۔ اس کے بعد مراد شاہ سے ملاقات اب اس کے شیڈول کا حصہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

صبح ساڑھے گیارہ بجے وہ شاہ ہاؤس کے باہر موجود تھی۔ اس کی دونوں اپائنٹمنٹس آگے پیچھے ہو گئی تھیں۔ مراد شاہ کی سیکرٹری نے اسے ٹھیک پونے بارہ بجے کا وقت دیا تھا لہذا اس

نے پرنسپل صاحبہ سے ڈیوٹی کے بجائے ملاقات کا کہا تھا اور اب وہ وہاں موجود تھی۔ شاہ ہاؤس ایک کافی بڑا اور شاندار بنگلا تھا۔ مین گیٹ پر کئی گارڈز موجود تھے مگر ان کے پاس زینب کی آمد کی اطلاع پہلے سے موجود تھی۔

بنگلے کے باہر سے اس کی اندرونی شوکت کا صحیح اندازہ مشکل تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ پر طویل و عریض لان تھا اور دوسری جانب خاصا بڑا پورچ تھا جہاں چھ سے آٹھ بڑی گاڑیاں پارک کی ہو سکتی تھیں۔ لان کے عین درمیان میں سوئنگ پول بنا ہوا تھا جس کا صاف شفاف پانی سورج کی روشنی میں جگمگاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لکڑی کے بڑے سے منتقل اندرونی دروازے کے پاس مراد شاہ کی سیکرٹری اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”خوش آمدید مس زینب، شاہ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی تھی۔

مراد شاہ ایک عالی شان لائبریری میں تھا وہ ایک فرہ اندام عام سے نقوش والا شخص تھا۔ بڑھاپا اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ زینب کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے کھڑا ہوا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پھر صوفے پر گویا گر پڑا تھا۔

”آپ کیالیس گی چائے، کافی یا ٹھنڈا؟“ سلام دعا کے بعد وہ زینب کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی آواز اس کی شخصیت کے مقابلے بہت متاثر کن تھی۔ زینب نے کافی کا کہتے۔۔۔۔۔

”تو مس علی احمد آپ نور جہاں پر ڈاکیومنٹری بن رہی ہیں؟“ اس کا لہجہ کسی حد تک استہزائیہ تھا۔ زینب بخورا سے دیکھ رہی تھی۔ ”آپ کے پاس کوئی ٹیپ ریکارڈ نہیں ہے؟“

”ہے مگر اگر آپ اجازت نہیں دیں گے تو میں اسے استعمال نہیں کروں گی۔“

”کیوں نہیں، میں تو چاہتا ہوں کہ آپ میرا ہر لفظ ریکارڈ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ کل میڈم نور جہاں کسی مزید بڑے عہدے پر فائز ہوں اور پھر بھی ان کے نام کی کوئی لائبریری یا میوزیم بن جائے تو لوگوں کو کم از کم ایک بٹن تو ایسا ملے جسے دبا کر وہ ان کی حقیقت کے بارے میں جان سکیں۔“

”تو آپ کی ان کے کیریئر پر مکمل نظر ہے؟“ وہ ٹیپ ریکارڈر آن کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں اس وقت سے جب وہ اٹھارہ سال کی تھی اور اپنی ماں کی ڈیوٹی میں بڑی لگن سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتی تھی، میں اس وقت سے اس کی صلاحیتوں کا قائل ہوں۔ وہ

بہت ذہین اور موقع سے فائدہ اٹھاتا جانتی ہے۔“

”مگر اپنی ماں کی مدد کرنا موقع پرستی یا ذہانت تو نہیں؟“

”ہے اگر آپ اپنی ماں کی مدد اس لیے کر رہے ہوں کہ شاہ خاندان کا وارث ان کا اکلوتا بیٹا چھٹیوں پر گھر آیا ہوا ہے تو پھر اسے ذہانت ہی کہیں گے نامس زینب؟“

”یعنی آپ.....؟“

”جی، میں وقتاً فوقتاً اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھتا رہتا ہوں مگر تصاویر دھوکا بھی دیتی ہیں وہ اب دیکھنے میں کیسی ہے؟“

”بہت خوب صورت۔“ زینب نے سچائی سے کہا۔

”ہوں.....“ وہ قدرے مایوس سا نظر آیا۔ ”اور شمیر ملک، کیا اب بھی وہ نور جہاں کی حفاظت اور غلامی کر رہا ہے؟“

”شمیر میڈم کے لیے کام کر رہا ہے۔“ وہ محتاط لہجے میں بولی۔

”مجھے یقین ہے کہ اب بھی وہ ایک دوسرے کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر ایک دوسرے کو بچاتے پھرتے ہوں گے۔“

”میں اس بات کا مطلب پوچھ سکتی ہوں؟“

”ہاں کیوں نہیں، شاید تمہیں بتایا گیا ہو کہ اس نے نور جہاں کو کتے سے بچایا تھا مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ خود نور جہاں بھی اسے بچاتی رہی ہے۔ اس نے تمہیں اس رات کا قصہ سنایا جب وہ چوری کی اسپورٹس کار میں گھوم رہا تھا؟“

”نہیں، مگر یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں۔“

”ہے اگر پولیس اس چوری شدہ کار کے پیچھے ہو اور کار آؤٹ آف کنٹرول ہو کر راستے میں کھڑی ایک عورت اور اس کے دو بچوں کو پھینک ڈالے۔ اس گاڑی سے فرار ہونے والا شمیر سے ملتا جلتا تھا مگر نور جہاں نے بیان دیا کہ وہ اس وقت اس کے ساتھ انگریزی پڑھ رہا تھا۔ اس کی گواہی نے شمیر کو بچالیا۔“ وہ ناک سیکڑ کر بولا۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میڈم نے شمیر کے لیے جھوٹ بولا؟“

”یہ میرا مطلب نہیں ہے یہاں سب یہی کہتے ہیں۔“

”آپ کا گھر بہت خوب صورت اور شاندار ہے کیا اسے آپ کے خاندان نے خود بنوایا تھا۔“ زینب نے موضوع بدلا

تاکہ کچھ ایسی گفتگو حاصل ہو سکے جو اس کی ڈاکیومنٹری میں استعمال بھی ہو سکے پھر یہ مکان اس لحاظ سے اہم تھا کہ میڈم یہیں ملی بڑھتی تھیں مگر جب مراد شاہ اپنے خاندان اور گھر کے بارے میں انتہائی فخر سے آدھے گھنٹے تک مسلسل بولتا رہا تو

اسے اپنے سوال پر تھوڑا سا افسوس ہونے لگا تھا۔

”تم بہت اچھی سامع ہو میرا خیال ہے کہ ہمیں لٹچ ساتھ کرنا چاہیے۔“ وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ زینب جواباً مسکرا دی تھی۔

”ہمیں آج تک قمر جہاں جیسی بہترین کلک دوبارہ نہیں مل پائی اب جو ہیں وہ بس ٹھیک ہی ہیں۔ تم جانتی ہونا کہ وہ نور جہاں کی والدہ تھیں..... بہت ذائقہ تھا ان کے ہاتھ میں۔“

”کیا نور جہاں کھانا بناتی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ زینب محذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

”یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ میڈم سے بہت ناراض ہوں۔“

”ناراض..... اس سے؟“ مراد شاہ کی آواز قدرے دھیمی ہو گئی تھی۔ ”کیا آپ کسی ایسے شخص سے ناراض نہیں ہوں گے جس نے آپ کو انتہائی کامیابی سے مکمل طور پر بے وقوف بنایا ہو؟“ اس کی آواز میں اب غصے کے ساتھ ساتھ درد بھی شامل تھا۔ ”قابل عزت زینب صاحبہ آپ کو آپ کی میڈم نور جہاں کے سابق منگیتر سے گفتگو کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔“

”آپ..... آپ ان کے منگیتر رہے ہیں؟“ زینب واقعی حیران رہ گئی تھی۔

”بہت تھوڑی دیر کے لیے سہی مگر ہاں کیونکہ یہی اس کی پلاننگ کا حصہ تھا وہ لندن پڑھنے جانا چاہتی تھی مگر اس کے نمبر اس قابل نہیں تھے کہ اس کو اسکا لرشپ مل پائی البتہ داخلہ اسے مل گیا تھا۔ وہاں جانے کے لیے اسے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ میں اسی وقت باہر سے گریجویشن کر کے واپس آیا تھا، والد صاحب کا بزنس اور سیاست دونوں میرا انتظار کر رہے تھے جن سے مجھے دھچکی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے ایک قریبی دوست کی بیٹی سے میری منگنی طے کر رکھی تھی جس سے میں خوش نہیں تھا۔ ان مایوس کن حالات میں نور جہاں میرے سامنے آ گئی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔“

اس نے مجھے بہت سہارا دیا آخر کار وہ لحو آ گیا جب میں نے اسے شادی کے لیے پروپوز کر دیا۔ اس نے ہامی بھری اور میں نے اسی روز اس کے لیے ایک قیمتی انگوٹھی خریدا کر سب دوستوں کے سامنے اس کی انگلی میں پہنا دی۔ ہم رات گئے گھر لوٹے۔ اگلے روز میرے جاگنے سے پہلے یہ خبر ماں اور اباجی تک پہنچ چکی تھی پھر تم سوچ ہی سکتی ہو کہ کیا ہوا ہوگا۔ میری ماں جو ملازموں کو اپنے استعمال ہونے والے دروازے سے گزرنے کی اجازت تک نہیں دیتی تھیں کیسے بری ہوں گی۔ میرے اباجی کا خاندانی جاہ و جلال کتنے خطرے میں آ گیا ہوگا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں نور جہاں نے ملتان چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پرس میں اباجی کا سرٹیفائڈ چیک تھا جس سے اس کے

کیا تم جانتی ہو کہ اسکول کے زمانے میں اس پر شاپ لٹنگ کا جو مقدمہ بنایا گیا تھا اس میں چوری شدہ چیز کی مالیت کیا تھی؟“ وہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں۔“

”پچپن روپے، اس کی زندگی صرف پچپن روپے کے پاڑی فریشز کی وجہ سے برباد ہو گئی۔ کیا کبھی تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ تم غلطی سے کوئی چیز بغیر ادائیگی کیے لے کر دکان سے باہر آ گئی ہو؟“

”ہوا ہے۔“ زینب نے جواب دیا۔ ”اور سب کے ساتھ ہوتا ہے مگر یہ کوئی ایسی بات تو نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ صرف پچپن روپے کی وجہ سے کسی کو جیل میں ڈال دیا جائے۔۔۔۔۔ وہ بھی ایک نوجوان لڑکی کو۔“

”ہو سکتا ہے اگر شہر میں چوریوں کی بھرمار ہو رہی ہو ایسے میں نبیلہ کو جس جج کے پاس لے جایا گیا وہ انتہائی خطی بڑھا تھا جس نے اسے تیس دن کے لیے بچوں کی جیل میں بھیج کر دم لیا جب واپس آئی تو وہ بالکل بدل چکی تھی، وہ کھو گئی تھی۔ بے چاری لڑکی۔۔۔۔۔ میرے علاوہ کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ چور نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس پر پختہ تھے مگر میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتی ہوں یقین سے کہ وہ چور نہیں تھی۔ وہ تو کلاس میں کبھی شرارت تک نہیں کرتی تھی۔“ وہ گویا سانس لینے کے لیے رکیں۔ ”وہ بے چاری لڑکی اکثر شاموں میں میرے پاس آ جاتی تھی۔ اس کی کوئی دوست نہیں تھی اور جب اس کا گریجویٹ ہو گیا تب میں نے ہی نور جہاں کو خاص فون کر کے کہا تھا کہ اگر گنجائش ہو تو وہ اسے اپنے دفتر میں کوئی کام دے دے۔“

”اور پھر اس نے میڈم کے دفتر میں انتخابی فنڈ کی رقم چرائی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میں ان دنوں ایک سال کے لیے ملک سے باہر تھی اور جب۔۔۔۔۔“ وہ ٹھکے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”میں واپس آئی تب تک یہاں سب کچھ ہو چکا تھا۔ نبیلہ کو جیل بھیجا جا چکا تھا۔ وہ کراچی جیل میں تھی میں نے اس دوران اس کو کئی خط لکھے مگر کسی کا کوئی جواب نہیں آیا پھر اسے طبی وجوہات پر پیرول پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ غائب ہو گئی۔ اس بات کو اب نو سال ہو گئے ہیں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”پھر آپ کا اس سے کبھی کوئی رابطہ نہیں ہوا؟“ اس سوال پر وہ چند لمحے خاموش رہی تھیں پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

”کیا انہیں اسے کچھ بتانا چاہیے؟ کہیں اس طرح وہ

سارے خواب پورے ہو سکتے تھے۔ اسے ہارورڈ میں داخلہ تو پہلے ہی مل چکا تھا۔ ساری کاغذی کارروائی مکمل تھی بس پیسے کی کمی تھی اور وہ اب مل گیا تھا۔ میں لندن تک اس کے پیچھے گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے ڈرایا دھمکایا گیا ہے مگر وہاں اس نے انتہائی سرد مہری سے اباجی کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کر دی تھی اور مجھے اپنا پیچھا نہ کرنے کا حکم دیا۔ میرے اباجی نے مجھے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہیں بھولنے دیا کہ میں کتنا بڑا احمق تھا۔ اماں نے چند روز بعد ہی اس کی ماں کو کام سے نکال دیا جس کے بعد وہ بے چاری عورت کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر گئی۔“

زینب جب شاہ ہاؤس سے باہر نکلی تو وہ متضاد سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔ میڈم نور جہاں کیا تھی؟ مراد شاہ کے بیان کے مطابق ایک جھوٹی، چال باز، مفاد پرست عورت یا اس کی سخت اصول پرست اور ایماندار ہونے کی شہرت؟ سچ کیا تھا۔۔۔۔۔؟

☆☆☆

مسز قدسیہ بلگرامی ہلکی سی گھبراہٹ محسوس کر رہی تھیں جب بھی ان پر یہ کیفیت طاری ہوتی انہیں سب سے زیادہ سکون اپنے پھولوں سے بھرے چھوٹے سے لان میں بیٹھ کر آتا تھا۔ اب بھی وہ وہیں موجود تھیں۔ وہ تہتر سال کی ایک دہلی پتلی عورت تھیں۔ ان کے چہرے پر دانشمندی جھلکتی تھی۔ ان کی نیلی آنکھیں مسکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہلکے سبز رنگ کی ساری میں وہ ہمیشہ کی طرح باوقار لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے بلاؤز پر لگے طلائی بروج پن کو آہستگی سے چھوا۔ سونے کی یہ پن انہیں اسکول سے ریٹائرمنٹ پر تحفے کے طور پر ملی تھی۔ اس پن پر 45 کا ہندسہ سنہرے حروف میں لکھا تھا جو اسکول میں ان کے بحیثیت ٹیچر اور پرنسپل گزارے 45 سالوں کی نشاندہی کرتا تھا۔ وہ اس وقت زینب علی احمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ تین بجے جب انہیں یقین ہو چلا کہ زینب علی احمد نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے اور وہ نہیں آئے گی تب ہی انہیں وہ اندر آتی نظر آئی۔

”میں سخت معذرت خواہ ہوں کہ مجھے کچھ دیر ہو گئی میڈم۔“

”اوہ کوئی بات نہیں، آئیے اندر چلتے ہیں۔“ کچھ ہی دیر بعد وہ ٹیبل کے آگے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز بلگرامی کی گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ انہیں یہ پیاری سی لڑکی پسند آئی تھی، وہ چیزوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت سے مالا مال نظر آ رہی تھی۔ وہ اس سے بہ آسانی نبیلہ شاہد کے حوالے سے گفتگو کر سکتی ہیں۔ انہوں نے سوچا۔

”اصل میں جب انتخابی فنڈ کے پیسے چوری ہوئے تو سب نے صرف نبیلہ پر انگلی اٹھائی جیسے وہ کوئی ہسٹری شیٹر ہو۔“

نبیلہ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا دیں گی؟“ انہوں نے ایک لمحے کو سوچا پھر مرکز زینب کی جانب دیکھا۔ وہ منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں ایک منٹ رکو۔“ ان کی واپسی چند لمحوں بعد ہوئی تھی اور ان کے دونوں ہاتھوں میں ایک مڑا ہوا کاغذ تھا۔

”نبیلہ نے دوسرے لمحے سے رابطہ کیا تھا۔ یہ اس دن لکھا گیا تھا جس دن وہ رقم چوری ہوئی تھی۔“ انہوں نے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ کاغذ شکنوں سے پڑھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے بہت بار پڑھا گیا ہو۔ اس پر گیارہ سال پہلے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ اس میں نبیلہ نے ان کے بیرون ملک دورے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ انہیں لطف آ رہا ہوگا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنے دفتر کے کام سے بہت خوش ہے۔ اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ بھی ہوا ہے اور اس نے پینٹنگ کی کلاسز میں داخلہ بھی لے لیا ہے۔ اور یہ کہ اسے ایک بہت اچھا دوست مل گیا ہے وہ نہ صرف بہت اچھا پینٹر ہے بلکہ آرٹ کی کلاسز بھی لیتا ہے، اس نے ایک پورا پیرا گراف اس شخص کی تعریف میں لکھا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ ان کی واپسی پر وہ دونوں ان سے ملنے آئیں گے۔ اس خط کے ایک پیرا گراف کو مس بگرا می نے ہائی لائٹر سے اجاگر کیا ہوا تھا۔

”آج میں پینٹنگ کلاسز میں نہیں جاسکی میڈم نور جہاں اپنے ہیرے کی انگوٹھی کہیں بھول گئی تھیں ان کا خیال تھا کہ وہ سیف میں رکھی ہے مجھے اسے دیکھنا پڑا۔ جابی آئی تو سیف کھولا مگر وہ وہاں نہیں تھی مگر میں دو گھنٹے لیٹ ہو گئی۔“

”تم نے دیکھا زینب، نبیلہ نے یہ خط اس رات لکھا ہے جب یہ چوری ہوئی۔ اگر اس نے کچھ بھی کیا ہوتا تو وہ سب کیوں لکھتی۔“

”کہا جاسکتا ہے کہ یہ جان بوجھ کر لکھا گیا ہو۔ ایک سوچی سمجھی چال۔۔۔۔۔۔ وہ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی تیاری۔۔۔۔۔۔“

”اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کسی ایسے شخص کو خط نہیں لکھتا جو دو مہینوں تک وہ خط نہ پڑھ سکے والا ہو خیر۔۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں یہ سب اس لیے بتایا کہ اگر اس کا ذکر آئے تو تم اس کے بارے میں کھلے دل سے سوچ سکو۔ میں اس کی مشکلات میں اضافہ نہیں چاہتی، بہتر تو یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔“

”اور یہ دوسرا خط۔۔۔۔۔۔ کیا یہ اس نے اپنی گمشدگی کے بعد لکھا تھا؟“

”ہاں یہ مجھے چھ سال پہلے ملا تھا۔“ انہوں نے دوسرے

ہاتھ میں موجود کاغذ زینب کی طرف بڑھا دیا۔

”ڈائری میڈم، پلیز آپ برا مت مانئے گا اس وقت میرے لیے مناسب یہی ہے کہ میں اپنے کسی پرانے جاننے والے کو اپنا پتہ بتاؤں۔ میں بہت ڈرتی ہوں اگر میں پکڑی گئی تو وہ مجھے پھر جیل بھیج دیں گے میں قسم کھاتی ہوں میڈم کہ میں نے اس رقم کو چھوایا تک نہیں۔ میں کافی عرصے بہت بیمار رہی ہوں۔ اگر آذر میری زندگی میں نہ ہوتا تو شاید میں اب تک مر چکی ہوتی۔ آپ کو یاد ہے نا، میں نے ایک خط میں آذر کا ذکر کیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ میرے ساتھ ہے اور اب میں اپنی زندگی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر آپ یہ یاد رکھیے کہ آپ میری زندگی میں روشنی دکھانے والی امید ہیں۔۔۔۔۔۔ میرا حوصلہ۔ بس اپنا خیال رکھیے گا۔ میں آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔“

زینب چند لمحے خاموشی سے ان سطروں کو دیکھتی رہی۔ سادہ سے الفاظ سچائی کی مہک میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کاش وہ اس بے چاری لڑکی کی مدد کر سکتی۔

”ہم اس کیس کو پروگرام میں شامل کر رہے ہیں میڈم۔“ وہ چند لمحے بعد بولی تو اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ ”اگر نبیلہ کا سراغ مل گیا تو میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس کی ضمانت میں خود دوں گی تاکہ اسے اس طرح چھپ کر اور ڈر کر نہ رہنا پڑے۔ اگر اس نے کوئی قصور کیا بھی تھا تو وہ اس کی کافی زیادہ سزا جھگت چکی ہے۔“

”مجھے بہت خوشی ہوئی۔“ قدسیہ بگرا می کی پلکوں پر ایک آنسو ٹپکا رہا تھا۔ ”وہ مجھے اپنے بچے کی طرح عزیز تھی۔ کاش میں اسے اپنی زندگی میں دوبارہ دیکھ پاؤں۔ رکو، میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتی ہوں۔“ انہوں نے سامنے رکھی شلف پر لگے اسکول کی سالانہ میگزین میں سے پہلا میگزین نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو ہر سال طالب علموں کے بارے میں ہم چیزیں چھاپتے رہے ہیں۔ یہ دیکھو کیا یہ پیاری نہیں؟“

وہ خوب صورت کالے بھورے ٹھٹھکے بالوں اور معصوم آنکھوں والی لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ہلکی سی اداسی کی آمیزش اسے خاص بناتی تھی۔ نیچے کنکشن میں لکھا تھا۔

”نبیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”کیا میڈم نور جہاں کے حوالے سے بھی کچھ موجود ہے؟“ بالکل اسی رسالے میں ہے۔ ”اس تصویر میں نور جہاں کے بال بوائے کٹ انداز میں کٹے ہوئے تھے وہ اس تصویر میں بھی بلا کی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ کنکشن میں تحریر

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے مگر اس کے پالنے کچھ ویٹو پاور بہر حال موجود ہے اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ ہم یہ سب اس کے بارے میں نہیں کر رہے بلکہ اس کے ساتھ اور اس کے لیے کر رہے ہیں۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

”نیلہ شاہد، مشاغل پینٹنگ۔ پچھلے پچھلے سیکریٹری۔ ایکٹیوٹی، موسیقی۔ پیش گوئی، بہترین سیکریٹری بن سکتی ہے۔“

شمشیر ملک میڈم کے خوب صورت جھگٹے کے بڑے سے کچن میں موجود ڈیزائنر ٹیبل کی کرسی پر بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ کچن نہایت نفاست اور خوب صورتی سے تیار کیا گیا تھا۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ میڈم نور جہاں بہت اچھا کھانا بنانا جانتی تھیں۔ درحقیقت مزیدار کھانے تیار کرنا گویا اس کے لیے سکون کا باعث ہوتا تھا۔ وہ خود بہت کم کھاتی تھی اور شمشیر ان باتوں کی وجوہات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ نور جہاں اپنی ماں کی طرح نظر آنے سے ڈرتی تھی۔ اس کی اماں بہت زیادہ موٹی تھیں یوں بھی باور چین کی بیٹی کہلاتا ہمیشہ سے اس کے لیے انتہائی شرم کا باعث رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ نور جہاں کسی بھی وقت کچن میں داخل ہو سکتی تھی۔ وہ وقت کی بہت پابندی اور آج تو اسے جمیر آف کا مرس اینڈ انڈسٹریز کے ایک خصوصی سیمینار میں بجٹ کے حوالے سے تقریر بھی کرنا تھی۔ سات میں بیس کم پر نور جہاں کچن میں موجود تھی اور سات میں پندرہ منٹ کم پر وہ گھر سے نکل چکے تھے۔

”کیا تم رات میں ٹھیک سے سوئیں پائیں نور جہاں؟“ وہ اسے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے بولا۔ کاسنی رنگ کے خوب صورت سوٹ میں وہ بہت تازہ دم لگ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں ذہنی دباؤ اور ٹینشن کی چٹکی کھا رہی تھیں۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں اس ٹی وی پر پروگرام کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ بیک فائر نہ کرے۔“

وہ جواب میں بالکل خاموش رہا تھا۔ ابھی تو اس نے میڈم کو یہ نہیں بتایا کہ زینب علی احمد سردار احمد شیرازی کے مکان میں رہ رہی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بات نور جہاں کی پریشانی میں اضافہ کر دے گی۔ وہ یوں بھی خاصی وہمی تھی اور شمشیر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود بھی اب اس پروگرام کے حوالے سے مختلف اندیشے ستارہ ہے تھے۔

☆☆☆

زینب ساڑھے چھ بجے تک بالکل تیار ہو چکی تھی۔ آج اس نے سیاہ پر عذ سوٹ پہنا تھا جو اس پر خوب بیچ رہا تھا۔ یہ تجربے کے اوائل کے دن تھے موسم بدل رہا تھا، راتیں قدرے بہتر ہو جاتی تھیں مگر دن کافی گرم تھے اور آج تو اتنی صبح بھی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اس کے کانوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے گھبرا کر مرکز دروازے کی جانب دیکھا۔ سب کچھ ویسے کا دیا تھا مگر زینب کے کانوں میں کسی بچے کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”میں رو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ بیڑھیوں سے نیچے دوڑ دوڑ کر اتر

رہی تھی۔ بہت..... بہت ڈر لگ رہا ہے، بہت ڈر.....
ایک لمحے کے لیے اس کا دماغ کسی اور دنیا میں کھوسا گیا۔ ”اوہ، پھر یہ ہو رہا ہے۔“ وہ تیزی سے سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے اور جسم پسینے میں جھپک رہا تھا مگر وہ رک نہیں تھی۔ وہ تیزی سے گھر سے باہر نکل آئی اور اب اپنے خوف سے بچنے کے لیے تیز تیز چل رہی تھی۔ آخر اب اسے کس بات کا ڈر ہے؟ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟ اس نے کیا کیا دیکھا تھا..... کچھ تھا جو اس کی یادداشت کی چلن سے لگا بیٹھا تھا، جو نہ چھپتا تھا اور نہ ہی کھل کر سامنے آ رہا تھا۔

☆☆☆

زینب میڈم کے دفتر پہنچی تو سات بجنے میں تین منٹ باقی تھے وہاں صفدر اس کے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھا۔
”ہم نے یہ سوچا کہ اگر آپ پورا ایک دن میڈم کے ساتھ گزاریں تو ان کے کام کو بخوبی سمجھ جائیں گی۔ میں نے ان کے کمرے میں آپ کے لیے ایک چھوٹی ڈیک رکھوا دی ہے اور اگر کوئی ایسی ملاقات ہوگی جہاں رازداری شرط ہوگی تو پھر آپ کو باہر آنا پڑے گا۔“ وہ محذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ زینب خاموشی سے سختی رہی۔ ٹھیک سات بج کر دس منٹ پر میڈم نور جہاں دفتر میں داخل ہوئی۔
”آئیے کام شروع کریں۔“ اس نے آتے ہی کہا تھا۔ زینب اس کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہو کر اپنے لیے مخصوص ڈیک پر جا بیٹھی۔ چند لمحوں میں ہی میڈم صفدر کے ساتھ بحث میں مصروف ہو گئی تھی۔ موضوع ایک ہفتے کی تاخیر سے اس کے میز پر پہنچنے والی ایک فائل تھی۔
”کیوں؟“ اس نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔
”اصل میں ڈیٹا دیر سے تیار ہوا تھا ان دنوں کام کچھ زیادہ ہی رہا ہے میڈم۔“

”اگر دن میں کام زیادہ تھا تو شام میں یا رات میں کام ہو سکتا تھا۔“ نور جہاں غرائی۔ ”اگر میرے اسٹاف میں کوئی گھڑی دیکھ کر کام کرنے والا آگیا ہے تو مجھے بتاؤ۔“ وہ غرائی۔
آٹھ بجے سے میڈم کی ملاقاتیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس دوران وہ زینب کو تقریباً بھول گئی تھی۔ آئل انڈسٹری کے لوگ، ماحولیات پر کام کرنے والے ادارے اور دو مختلف این جی اوز کے وفد نے اس سے ملاقات کی تھی۔ لچ کے فوراً بعد اس نے بحث کے حوالے سے جیمبر میں تقریر کرنا تھی۔ زینب بھی نور جہاں اور اس کے اسٹاف کے ہمراہ وہاں پہنچی تھی۔ وہاں میڈم نور جہاں کے علاوہ بھی سینیٹ، قومی اسمبلی کے ممبران بھی

موجود تھے جن میں سعدیہ سیف بھی تھی جو قومی اسمبلی کی ممبر بھی تھی اور نائب سربراہ کے عہدے کے لیے اس کا نام بھی لیا جا رہا تھا اس حوالے سے وہ میڈم نور جہاں کی خاصی مدد و معاونت کی ضرورت تھی۔ دوسری رو میں بیٹھی زینب اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ وہ پچاس سال کی پروقار عورت تھی۔ سعدیہ چہرے سے خاصی ہنس مکھ اور طنز نگار لگ رہی تھی۔ نور جہاں کا تاثر اس سے بالکل مختلف تھا وہ سنجیدہ اور لیے دیے رہنے کی عادی تھی۔

”اسے اس پروگرام سے اس کے تاثر میں کچھ تبدیلی لانے کی کوشش کرنی ہوگی۔“ اس نے سوچا۔
میڈم کی تقریر زبردست تھی۔ اس کے اختتام پر ویرنک تالیوں کی آواز فضا میں گونجتی رہی مگر اس کے فوراً بعد سوال جواب کے سیشن کا پہلا سوال ہی میڈم کو الجھا گیا تھا۔
”میڈم میں آپ کی کچھ تصحیح کرنا چاہتا ہوں آپ نے صنعتی ترقی اور ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے جو اعداد و شمار بیان کیے ہیں وہ قدرے پرانے ہو چکے ہیں۔“
”جی.....“ نور جہاں ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ سعدیہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”نور جہاں میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں میرے پاس اس حوالے سے تازہ ترین ڈیٹا موجود ہے۔“ وہ اعداد و شمار کی تفصیل بیان کرنے لگی۔ اس دوران نور جہاں نے کئی بار زینب کے پیچھے والی روکی جانب دیکھا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں غصے کے شرارے سے لپک رہے تھے۔ زینب نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی تو وہاں نور جہاں کی اسسٹنٹ شہر زادگی۔ یقیناً یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ شرمندگی اور خوف سے پیلا ہو رہا تھا۔ جیسے ہی سعدیہ کی بات مکمل ہوئی تالیاں بجنے لگیں۔

”میں شرمندہ ہوں کہ میرے پاس تازہ اعداد و شمار نہیں تھے۔ میں سعدیہ صاحبہ کی مدد کے لیے بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ نور جہاں نے سیشن دوبارہ شروع کرنے سے پہلے کہا اس کے بعد اس نے شہر زادگی کی طرف دیکھا۔ زینب نے اس کے ہونٹوں کو بے آواز انداز میں ہلٹے دیکھا، اس نے کہا تھا۔
”یو آر فار ڈ۔“ اس اشارے کو سمجھتے ہی وہ لڑکی کانفرنس روم سے نکل گئی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو پھسل رہے تھے۔ کانفرنس سے دفتر واپسی تک میڈم بالکل چپ رہی تھی۔ دفتر میں بھی غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زینب کو اس وقت نور جہاں کے کمرے میں بیٹھنا غیر مناسب لگ رہا تھا مگر اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا اور پھر صفدر کی

جانب بیٹھی۔
”تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے؟“ وہ غرائی۔
”میڈم میں نے دوسری لڑکیوں سے بات کی ہے اصل میں شہر زادگی کا شوہر اسپتال میں ہے اس لیے وہ بہت اپ سیٹ رہی ہے۔ وہ ہماری بہترین اسٹاف میں سے ایک ہے، میں درخواست کروں گا کہ اس کی پہلی غلطی معاف کر دی جائے..... اسے اس نوکری کی بہت ضرورت ہے۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”ضرورت..... اگر ضرورت ہوتی تو وہ ٹھیک طریقے سے کام کرتی۔ اس نے آج مجھے سیکڑوں لوگوں کے سامنے شرمندہ کروایا ہے۔ مجھے تو وہ سعدیہ کی جاسوس لگتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لڑکی پندرہ منٹ میں اس دفتر سے باہر نظر آئے..... رہے تم تو تم اپنی خیر مناد۔ اس سب کی نگرانی کرنا تمہارا بھی کام ہے۔ تم خود کو خوش قسمت سمجھو کہ تم نوکری پر ہو۔ اس دفتر میں کسی کو دوسرا چانس نہیں ملتا۔ اب تم وہ ہی کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔“ وہ غصے میں پھری ہوئی تھی۔

”جی اوکے میڈم۔“ وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔
شام پانچ بجے تک نور جہاں اپنی میز پر موجود کاغذات کو نمٹاتی رہی تھی۔ اس دوران اسے مسلسل فون کا لڑ بھی آتی رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کال اس کی پرانی کارکن کی تھی۔
”بالکل..... سلطانی تم جانتی ہو کہ میں تمہارے لیے کبھی مصروف نہیں ہوتی۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ زینب خاموشی سے میڈم کی پیشانی پر پڑتے مل دیکھ رہی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ اسپتال والے تمہاری ماں کو ڈسچارج کر رہے ہیں جبکہ وہ نیکی سے سرائیٹھانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اوکے، تم کیا چاہتی ہو..... کتنے عرصے کے لیے..... چھ ماہ، مجھے تو ڈیڑھ وقت دو میں تمہیں کال کرتی ہوں۔“

”یہ چیزیں انسان کو پاگل کرنے کے لیے کافی ہیں۔“ وہ فون ہٹتے ہوئے بولی۔ ”سلطانی بیوہ ہے۔ اپنی تین بچیوں کی پرورش کے لیے دن رات محنت کر رہی ہے اور اسپتال والے اس کی بیمار اور قریب المرگ ماں کو اسپتال میں رکھنے کو تیار نہیں ہیں۔“ 20 منٹ اور چند فون کالز کے بعد نور جہاں نے نہ صرف ایک اور سرکاری اسپتال میں سلطانی کی ماں کے لیے کمرے کا بندوبست کر دیا بلکہ ایک ایمبولینس کو انہیں شفٹ کروانے پر مامور بھی کر دیا تھا۔

زینب نے سلطانی کا نام اسٹوری بورڈ میں شامل کر لیا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے فون کی گھنٹی پھر بجی تھی۔ نور جہاں نے ایک لمحے بعد ہی فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”تمہاری کال ہے میڈم، عاصم جعفری کے دفتر سے، شاید اس کا اسسٹنٹ بات کرنا چاہتا ہے۔“
”ہیلو زینب، تمہارا موبائل کیوں بند آ رہا ہے؟“ دوسری جانب چند لمحے بعد عاصم جعفری خود موجود تھا۔
”اوہ عاصم..... سوری غالباً چارج ختم ہو گئی ہے۔“
”اوکے یہ بتاؤ کیا آج ہم ڈنر ساتھ کر سکتے ہیں؟“
”کر سکتے ہیں اگر ڈنر جلدی اور تیز کیا جائے تو..... کیونکہ آج مجھے بہت کام کرنا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ اسے نور جہاں کی تیز نگاہیں خود پر جمی محسوس ہو رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے میڈم جیسا آپ کا حکم، میں سات بجے چاندنی میں انتظار کروں گا۔“
”اوکے۔“ زینب نے بات کر کے ریسیور نور جہاں کی جانب بڑھا دیا وہ اسے ہی غور سے دیکھ رہی تھی۔
”کیا تم نے ان ویڈیوز کا جائزہ لے لیا ہے جو میں نے تمہیں بھجوائی تھیں؟“
”نہیں۔“

”ان میں سے کچھ کا؟“
”نہیں۔“ زینب نے کہا۔ ”در اصل بالکل وقت نہیں مل پایا اب آج میں انہیں دیکھوں گی۔“ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ اس خاتون کے لیے کام نہیں کرتی۔
”میں نے سوچا تھا کہ آج ہم ایک ساتھ ڈنر کرتے اس دوران میٹرل کے بارے میں بات بھی ہو جاتی مگر یہ تمہارے اس مواد کو دیکھ لینے کے بعد ہی ممکن ہو گا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم جعفری کو اتنی اچھی طرح جانتی ہو۔“
”نہیں، کچھ خاص نہیں۔“ زینب نے دھیرے سے جواب دیا۔ اپنے تاثرات چھپانے کے لیے وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ بڑی سی شیشی کی دیوار کے پرے کراچی شہر دور تک کی پینٹنگ کے مانند نظر آ رہا تھا۔

”زبردست..... یہاں سے سارا شہر نظر آتا ہے۔“
”ہاں یہ منظر مجھے احساس دلاتا ہے کہ یہ میرا شہر ہے، مجھے اس کے لیے کچھ کرنا ہے۔ جب آپ کسی کے لیے کچھ کرتے ہیں تو کس قدر طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔“ نور جہاں سنجیدگی سے بولی۔ زینب کو اس کے جذبے پر یقین تھا وہ اسے پوری تندی سے کام کرتا دیکھ رہی تھی مگر وہ یہ دیکھ کر حیران تھی کہ اس نے کتنی آسانی سے شہر زادگی، اس کی پریشانی اور اس کے آنسوؤں کو بھل دیا تھا۔

☆☆☆

وہ ٹھیک وقت پر ریٹائرمنٹ پہنچ گئی تھی۔ اس نے ڈنر کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے آج واقعی کافی کام نمٹانا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے عاصم کو ملتان کی روداد سنائی۔

”انسان پیاز کے مانند ہی ہوتا ہے تو دور تک کیا چھپا ہے، اس کا اندازہ برسوں بعد بھی کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔“ وہ تفصیلات سن کر صرف یہی کہہ کر رہ گیا۔ ”ہاں نبیلہ کے بارے میں ہمیشہ سے مجھے یہ احساس رہا ہے کہ شاید اس کے ساتھ تھوڑی زیادتی ہو گئی ہے مگر آپ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ دس میں سے نو مجرم ہمیشہ اپنی بے گناہی کی قسمیں کھاتے نہیں تھکتے اور ان میں سے آٹھ ہر صورت جھوٹ ہی بول رہے ہوتے ہیں۔“

جواب دیا۔ ”کیا کہہ سکتے ہیں اگر وہ سامنے آجائے تو کچھ سوچا جاسکتا ہے۔ تم سناؤ، دوبارہ کوئی دھمکی تو نہیں ملی؟“ ڈنر سے واپسی پر عاصم نے اس سے پوچھا۔

”ہاں ایک فن کال اور پریم پتر۔“ وہ مسکرائی۔ ”مجھے یہ سب میڈم صاحبہ کی مقبولیت کا نتیجہ لگ رہا ہے۔“

”جو بھی ہو یہ اس طرح نظر انداز کر دینے والی بات نہیں ہے۔ ایف آئی اے میں میرے کچھ دوست ہیں، میں ان سے بات کروں گا کہ وہ اس معاملے پر نظر رکھیں اور اگر تم یہاں اکیلے رہنے پر مصر ہو تو بہت محتاط رہو۔“

”شکریہ جناب، آپ اتنا پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔ ہمارے پیشے میں دھمکیاں معمول کی بات ہیں۔“

”نہیں اب یہ اتنی بھی معمول کی بات نہیں۔ دروازے ٹھیک سے لاک کر لیتا..... سمجھیں؟“

”جی سر۔“ وہ مسخرے انداز میں سیلیوٹ مار کر بولی۔ اس کے جانے کے بعد وہ چند لمحوں میں کھڑی رہی تھی۔ عاصم جعفری کے چہرے پر اپنے لیے فکر دیکھنا ایک اچھا تجربہ ہے۔ اس کی یاسیت اور دن بھر کی چٹکن گویا ہوا ہو گئی تھی۔ وہ اندر جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ ایک بلند نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”مس زینب۔“ اس نے مڑ کر دیکھا، اس کے مکان سے کچھ فاصلے پر بیٹے کا رزم مکان کے باہر ایک لڑکی اس کی جانب لپکتی ہوئی آرہی تھی۔

”جی فرمائیے۔“

”آپ زینب علی احمد ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی، میڈم آج ہر صورت آپ سے ملنا چاہتی تھیں۔“

”میڈم.....؟“

”جی ہاں شاید آپ نے ان کا نام سنا ہو۔ مسز سارہ وسیم۔ وہ پیراناٹل پر کتابیں لکھتی ہیں۔“

”ہاں، ہاں۔“ زینب کو یاد آ گیا۔ سارہ وسیم پر اسرار طاقتوں اور نظر نہ آنے والے معاملات پر کئی کتابوں کی نگار تھی۔ اور چھٹی حس کے حوالے سے وہ بین الاقوامی شہرت کی مالک تھی کئی بار وہ پولیس کی کامیاب مدد بھی کر چکی تھی۔

”وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ یہ ان کا ہی گھر ہے اور میں ان کی اسسٹنٹ ہوں۔“ وہ دبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی۔ ”کیا آپ ان سے فون پر بات کرنا پسند کریں گی؟“ زینب کا جواب اثبات میں پا کر اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نمبر ملا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

”جی میں زینب علی احمد ہوں۔“

”شکریہ تم آگئیں، زحمت کی معافی چاہتی ہوں مگر کیا تم تھوڑی دیر کے لیے میری طرف آ سکتی ہو؟ مجھے تم سے ایک بہت اہم بات کرنا ہے جسے جاننا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“

”ضرور، میں آرہی ہوں۔“ زینب نے فون بند کر کے ان کی اسسٹنٹ کے حوالے کیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ سارہ وسیم کے مکان کی طرف جاتے ہوئے اسے عجیب اضطراب اور بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ سارہ جو بات اسے بتانے والی تھی وہ کوئی اچھی خبر نہیں ہوگی۔

☆☆☆

سارہ وسیم قدرے فربہ اندام، سفید بالوں والی خاتون تھی۔ اس کی آنکھیں عجیب پر اسرار سی کشش کی مالک تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر گرم جوش مسکراہٹ دکھ رہی تھی۔

”زینب خوش آمدید، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تمہارے میڈم نور جہاں والے پروگرام کی تیاری کیسی جارہی ہے؟“

”بہت اچھی ابھی تک تو۔“ وہ بھی جواباً مسکرائی۔

”میری دعا ہے کہ سب اچھا رہے۔“ وہ گلے میں سنہری چین سے لٹکے چشمے سے کھیلے ہوئے بولی۔ ”مجھے کل ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانا ہے مگر میں تم سے بات کیے بغیر نہیں جانا چاہ رہی تھی۔ کیا تم جانتی ہو کہ جس گھر میں تم رہ رہی ہو وہاں پچیس سال پہلے گل اور خود کشی کی واردات

ہوئی تھی؟“

”جی کچھ کچھ معلوم ہے۔“

”تم اس سے پریشان نہیں ہوئیں؟“

”مسز وسیم..... یہاں موجود ہر گھر سالوں پرانا ہے اور ہر گھر میں لوگ حادثوں کا شکار بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔“ زینب قدرے بے زاری سے بولی۔

”یہ وہ بات نہیں ہے۔“ سارہ کی آواز اس کے اضطراب کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔ ”میں اس سانحے سے ڈیڑھ سال پہلے یہاں شفٹ ہوئی تھی۔ دس ماہ بعد سے ہی مجھے اس گھر کے ارد گرد بڑھتا ہوا پر اسرار اندھیرا محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ شیرازی اور ثنا کو میں اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ دونوں بہت خوب صورت تھے۔ صحیح معنوں میں چاند سورج کی جوڑی تھی مگر مزاجاً بھی ان میں اتنا ہی فاصلہ تھا۔ شیرازی مقناطیسی کشش کا مالک تھا لوگ اسے گھرے میں لیے رہتے تھے جبکہ ثنا مختلف تھی۔ خاموش طبع، وہ بہ مشکل بے تکلف ہو پاتی تھی۔ شیرازی مجلسی آدمی تھا، دعوتیں، میٹنگز، سفر، لوگ اس کے کام اور کامیابی کے لیے شرط اول تھے جبکہ ثنا کو محفلوں میں جانے سے وحشت ہوتی تھی۔ اس سب کے باوجود وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ ان کے رشتے کو جوڑے رکھنے والی سب سے مضبوط کڑی ان کی لاڈلی بیٹی رباب تھی۔ وہ بھی بہت پیاری اور وہ دونوں اس پر جان چھڑکتے تھے۔“ زینب خاموشی سے سن رہی تھی۔

”اس حادثے سے چند ہفتے قبل ثنا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رباب کو لے کر اپنی ماں کے پاس فیصل آباد جانے کی سوچ رہی ہے۔ ہم اس وقت اس کے گھر کے سامنے ہی کھڑے تھے اور میں نہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے اس وقت شدید خطرے اور رکاوٹوں کا کیسا عجیب احساس ہوا تھا۔ میں نے ثنا کو اس بارے میں بتانے کے بارے میں بہت سوچا مگر جب میں فیصلے پر پہنچی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب وہی احساس دوبارہ ہو رہا ہے، مجھے نہیں معلوم کیوں مگر اب یہ پر اسرار اندھیرا تمہیں اپنی لپیٹ میں لیتا محسوس ہو رہا ہے۔ تمہیں اس گھر میں رہنا چاہیے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”کیا اس احساس کی کوئی دوسری وجہ بھی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ چھٹی حس کے علاوہ کوئی اور ظاہری وجہ؟“ زینب نے مخاطب انداز میں پوچھا۔

”ہاں، تین دن پہلے میری ماسی نے کسی شخص کو ہماری باڑھ کے پیچھے کھڑے دیکھا تھا۔ اس کی نظریں تمہارے گھر پر تھیں پھر دو دن پہلے بھی ہماری پچھلی گلی میں پیروں کے نشان

بہترین معلومات

☆ کون سی بے جان چیز ہے جس نے ”خانہ کعبہ“ کا طواف کیا؟

○ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی

☆ کون سے دو پانی ہیں جن کو کھڑے ہو کر پینا چاہیے؟

○ آب زم زم اور وضو کا بچا ہوا پانی۔

☆ کون سے چار جاندار ہیں جو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے؟

○ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حوا علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی، حضرت ابراہیم علیہ السلام والا دنبہ۔

☆ وہ کون سی زمین ہے جس کو ایک بار دیکھا گیا ہے اب قیامت تک نہیں دیکھا جائے گا؟

○ دریائے نیل کی زمین۔

مرسلہ: رضوان تنولی کرپڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

تھے جہاں عموماً کوئی آتا جاتا نہیں ہے اور آج بھی ایک مشکوک شخص نیم کے بڑے درخت کے پاس گھوم رہا تھا، اس کی خاصی بڑی اور مضبوط شاخیں تمہارے ٹیسر تک جاتی ہیں۔“

سارہ وسیم اپنی بات مکمل کر کے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کی آنکھیں یوں پھیلیں جیسے وہ کوئی خوف ناک منظر دیکھ رہی ہوں۔ جب زینب وہاں سے نکلی تب بھی وہ اسے اس مکان میں نہ رہنے کی ہدایت کر رہی تھی۔

گھر واپس آتے ہوئے زینب خود کو پرسکون رہنے کی تلقین کرتی آئی تھی۔ آج اسے بہت کام کرنا تھا اور یہ سب..... وہ سر جھٹکتی ہوئی لائبریری میں گھس گئی۔ اسے آج میڈم کی ویڈیوز دیکھنی تھیں، باکسز میں کئی سی ڈیز اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان میں سے تیسری پر نور جہاں، شہریار احمد شادی لکھا تھا اس نے اسے ہی ابتدا کے لیے منتخب کیا۔ وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی اور وہیں وہ دوستی اور محبت کے رشتے میں بندھ گئے تھے۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی شہریار نے اپنا پہلا الیکشن لڑا اور جیتا تھا۔ نور جہاں اس کی انتخابی مہم کی انچارج اور اس کی دست راست تھی۔

ویڈیو کا آغاز ایک وسیع و عریض لان کے لانگ شاٹ سے ہوا تھا۔ جہاں عمومی طرز کے مطابق ڈھیر ساری گول میزیں

سعادت مند

ایک سردار دوست کے گھر گیا اچانک بارش ہوئی۔
دوست: ”آج میرے پاس ہی رک جاؤ بارش بہت تیز ہے۔“
سردار: ”چلو ٹھیک ہے۔“
دوست نے بستر لگایا اور دیکھا کہ سردار غائب ہے۔
ایک گھنٹے بعد سردار بھاگتا کانپتا ہوا آیا۔
دوست: ”کہاں تھے تم؟“
سردار: ”یار ہم گھر بتانے گیا تھا کہ آج ہم بارش کی وجہ سے گھر نہیں آسکتا۔“
مرسلہ: رضوان تنولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

”پریس اس گڑیا کی تصویریں ضرور استعمال کرے گا۔“
لیکھت اس کی پیشہ ورانہ حس نے اسے چونکا دیا۔ دروازے کی گھنٹی نے اسے فوری فیصلے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی گڑیا کو دو انگلیوں سے اٹھا کر لائبریری کی طرف بڑھی۔ اس کا اسپرن خون سے تر تھا۔ اس لیے اس نے اسپرن اتار کر دروازے میں ڈالا اور گڑیا کو باکس میں گھسا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دروازہ کھولنے کے لیے پئی۔
دونوں پولیس والے قدرے نوجوان اور جذبہ خدمت سے معمور نظر آ رہے تھے۔ زینب نے وہ خط ان کے حوالے کر دیا۔ آخری دھمکی والے جملے نے مزید تفتیش کا راستہ کھولا اور زینب کو پہلی کال سے اب تک کی کہانی بیان کرنا پڑی۔
”یہ کوئی سخت کھمکا ہوا دماغ لگتا ہے۔“ اے ایس آئی نے تمام تفصیلات نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر آپ پریشان نہ ہوں، کیا آپ یہیں رہیں گی یا کسی عزیز.....“
”نہیں میں یہیں رہوں گی۔“ زینب نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے پھر اس پورچ والے دروازے کے اندرونی دروازے کو ڈبل لاک کریں۔“ وہ انگلیوں کے نشانات اور قدموں کے پرنس وغیرہ لے کر کچھ دیر بعد رخصت ہو گئے تھے۔ زینب کو کمرے کی صفائی میں مزید ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ اس کی داغیں ٹانگ میں اب شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ویکيوم الماری میں رکھا اور خود کو کھینچے ہوئے سیزھیال چڑھنے لگی۔

”آج آٹھ بجے اس کی آنکھ ٹیلی فون کی آواز سے کھلی تھی۔ دوسری جانب عباسی تھا۔ زینب گہری نیند سے بے دار ہوئی تھی مگر وہ اس حالت میں بھی صرف ہیلو سے ہی ان کے غصے کا اندازہ کر سکتی تھی۔“
”تم آج فرنٹ بیچ کی خبر ہو اور کیا سرخی ہے..... ٹی وی کی مقبول میزبان کی جان خطرے میں..... ٹھہرو میں تمہیں پہلا پیرا گراف سناتا ہوں۔ کل رات کوئی پراسرار شخص ٹیلی وژن کی مقبول میزبان زینب علی احمد کے گھر میں جا گھسا۔ انہیں گزشتہ ماہ سے مسلسل دھمکیاں مل رہی ہیں جس کی وجہ میڈم نور جہاں کی زندگی پر تیار کیا جانے والا پروگرام ہے جو 27 ستمبر کو دکھایا جائے گا، کیا خیال ہے میڈم کو ایسی پالیسی کی ضرورت تھی نا، اب اسلام آباد میں یہ بحث شروع ہو چکی ہوگی کہ میڈم سے اتنی نفرت کون کرتا ہے اور کیوں۔“ عباسی کھیلے لہجے میں بولا۔
”مجھے افسوس ہے مگر میں نے تو رپورٹ میں بھی اور پولیس والوں سے درخواست کی تھی کہ خبر پریس میں نہ

سارہ وسم کی آواز اس کے کانوں میں اب تک گونج رہی تھی۔ اس لیے اس نے سونے سے قبل تمام کھڑکیوں اور دروازوں کو چیک کرنے کا سوچا۔ ہال، کچن اور بیڈروم کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ وہ مطمئن ہو کر پلٹ گئی مگر پھر اسے لیونگ روم کا خیال آیا۔ وہ اس وقت وہاں نہیں جانا چاہتی تھی مگر پھر خود پر قابو پا کر لیونگ روم میں داخل ہوئی۔ سب کچھ ٹھیک ہی نظر آ رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا مگر ایک عجیب سے احساس نے اسے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے پر مجبور کیا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ ششدر رہ گئی تھی۔ پورچ میں کھلنے والا شیشے اور لکڑی سے بنا آرائشی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصے کے شیشے کو کاٹ کر دروازہ کھولا گیا تھا۔ شیشے کا ٹکڑا قالین پر پڑا ہوا تھا اور پھر اسے وہ نظر آ گئی.....!

بیانو سے قبل صوفے سے ذرا آگے وہ عجیب طرح سے بڑی تھی۔ اس کی سیدھی بانگ عجیب سے انداز میں اس کے جسم کے نیچے مڑی پڑی تھی۔ اس کا ہلکا سا پیلا سا فراک اور سفید اسپرن خون میں بھرا ہوا تھا۔ وہ کپڑے کی ایک قدرے پرانی گڑیا تھی۔ زینب ساکت سی کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ کسی نے نہایت مہارت سے مسکراتے ہونٹوں کو سرخ رنگ سے نیچے کی طرف موڑ دیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے رنگین آنسو بنائے گئے تھے یوں وہ مسکراتی گڑیا روئی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ زینب کانپ سی گئی۔

”یہاں کون تھا، کیوں؟“ گڑیا کے سر کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ زینب نے اسے باہر نکالا وہ ہی سفید سستا کاغذ اور سیاہ روشنائی سے لکھی گئی عجیب سی تحریر۔

”یہ تمہارے لیے آخری دھمکی ہے..... میڈم نور جہاں کا پروگرام چھوڑ دو اور یہاں سے واپس چلی جاؤ ورنہ.....“ ایک ہلکے سے کھکنے نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔ آواز باہر سے آئی تھی۔ کیا کوئی ابھی بھی موجود ہے؟ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی مگر وہ صرف ہوا تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا مگر اس کا کچھ خاص فائدہ نہیں تھا۔ شیشے کے پتیل کے نکل جانے کی وجہ سے اسے بہ آسانی کھولا جاسکتا تھا۔ پولیس کو کال ملاتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پولیس کے پہنچنے کے انتظار میں اس نے اس خط کو کوئی بار پڑھا۔ اس میں پروگرام نہ کرنے کی ہدایت ہے تو کیا یہ نور جہاں کے کسی مخالف کی حرکت ہو سکتی ہے؟ پھر اس کی توجہ کپڑے کی گڑیا کی جانب گئی اسے دیکھتے ہوئے زینب کے ذہن میں سرسراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی، اس نے پیشانی کو گرزا۔

اور کرسیاں سجائی گئی تھیں دلہا، دلہن کے لیے شاہانہ اسٹیج تھا۔ نور جہاں گہرے مرون رنگ کے لباس عروسی میں انتہائی خوب صورت نظر آ رہی تھی اس کے برابر میں کھڑے شہر یار بھی آف وائٹ شیروانی میں سچ رہے تھے۔ دلہن کی دوسری جانب ایک خوب صورت مغلی نقوش والی ادھیر عمر خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر اس خوشی کے موقع پر بھی سخت تناؤ اور برہمی نظر آ رہی تھی وہ یقیناً شہر یار کی ماں تھیں جو نور جہاں کے مطابق اسے قطعی پسند نہیں کرتی تھیں۔

اس وقت ان تینوں میں سے نور جہاں سب سے زیادہ مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھی۔ یکدم مسز شاہ میڈم کا تناؤ زدہ اور کھنچا ہوا چہرہ مسکراہٹ سے بھر گیا تھا۔ ایک لمبا بھورے بالوں اور چوڑے شانوں والا شخص ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمر اس کی پشت پر تھا اس کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی تھیں اور گرم جوشی سے اسے گلے لگالیا تھا پھر اس نے جھک کر دلہا، دلہن کو مبارک باد دی تھی اس کے بعد وہ کمرے میں فوکس ہوا۔ زینب نے غیر ارادی طور پر پوز کاٹن دبا دیا تھا۔ وہ اس کے بابا تھے سردار احمد شیرازی.....!

”اس ویڈیو میں وہ کس قدر نوجوان لگ رہے تھے۔“ اس نے سوچا۔ وہ بے حد بینڈم لگ رہے تھے گویا پورے منظر پر چھا گئے ہوں۔“ اس میں، میں کہاں ہوں، ماما کہاں ہیں؟“ زینب نے سوچا پھر اسے یاد آیا کہ یہ تو ان کی شادی سے بھی پہلے کی ویڈیو ہے اس وقت اس کی ماں غالباً کالج میں پڑھ رہی ہوں گی۔ اس نے پلے کاٹن دبا دیا۔ بابا ہنسی مذاق کر رہے تھے شہر یار شاہ کی ماں اب ان کے ساتھ تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ انہیں اپنے بیٹے کے مانند چاہتی تھیں۔ اب وہ قدرے پرسکون نظر آ رہی تھیں۔ ویڈیو ختم ہو گئی تو زینب نے اسے دوبارہ چلا کر پروگرام کے لیے قابل استعمال شائس الگ کئے۔ عباسی کے کہنے کے مطابق سردار شیرازی والے سین پروگرام میں شامل نہیں ہونے تھے۔ اس کے بعد اس نے انتخابی جلسوں، ریلیوں، تقریروں کے کئی ویڈیوز دیکھے۔ آخری فلم شہر یار احمد کے جنازے کی تھی۔ شہر یار کی ماں کو اس کے بابا ہی سپارا دے کر لا رہے تھے۔ اس فلم میں اس کی ماں بھی موجود تھیں۔ اس نے ان کی بہت سی تصاویر دیکھی تھیں مگر انہیں چلتے پھرتے دیکھنا الگ ہی تجربہ تھا۔

سب کچھ بند کر کے وہ وہیں کرسی پر چند لمحے بیٹھی رہی تھی۔ اس کے پاس کافی میٹرل موجود تھا۔ اب وہ اسٹوری بورڈ پر کام شروع کر سکتی تھی مگر اس سے پہلے کچھ نیند ضروری تھی۔

جائے۔“ وہ کمزور لہجے میں بولی۔
”کیا تمہیں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم پولیس کے بجائے مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔ ہم اس معاملے کو کسی اور طرح سلجھا لیتے۔“ وہ شاید درست ہی کہہ رہا تھا، زینب نے سوچا۔
”مجھے واقعی افسوس ہے مگر جب آپ کو ڈر ہو کہ کوئی آپ کے گھر میں چھپا بیٹھا ہے تو گھبراہٹ میں پہلا خیال پولیس کا ہی آتا ہے۔“
”اب اس مسئلے پر بحث کا کوئی فائدہ نہیں، دیکھنا یہ پڑے گا کہ اس کا رد عمل کیا آتا ہے۔“ زینب کی معذرت نے عباسی کے لہجے کو نرم کر دیا تھا۔ ”تم نے نور جہاں کی ویڈیوز دیکھیں؟“

”ہاں اور اس میں کافی میٹرل ایڈٹ بھی کر لیا ہے۔“
”تم نے کل نور جہاں کو اپنے ملتان جانے کے حوالے سے کچھ بتایا تو نہیں؟“
”نہیں۔“ زینب نے جواب دیا۔
”اگر تم ذرا بھی سمجھدار ہو تو بتانا بھی مت۔“ اس نے اتنا کہہ کر بغیر خدا حافظ کہے فون بند کر دیا تھا۔
☆☆☆

یہ شمس الدین کا روز کا معمول تھا۔ وہ دودھ والے کی دکان سے دودھ لیتا اور پھر نیوز اسٹینڈ سے اخبار خریدتا ہوا گھر واپس آ جاتا۔ آج اس کا معمول الٹ گیا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے سخت بے چین تھا کہ کل رات کے اس کے آپریشن کے

بارے میں اخبارات میں کچھ آیا بھی ہے کہ نہیں اور چند لمحوں میں وہ خبر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ اخبار کے پہلے صفحے کے نچلے حصے میں موجود تھی۔ اس نے سرخی پڑھی پھر بقیہ خبر کو وہیں کھڑے کھڑے غور سے پڑھ ڈالا۔

”گڑیا..... گڑیا..... کپڑے کی گڑیا کا ذکر کہیں نہیں ہے۔“ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ”وہ اتنی اہم بات نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ گڑیا تو اس نے خاص طور پر وہاں رکھی تھی تاکہ جاننے والے سمجھ سکیں کہ یہ گھر تشدد اور موت کا گھر ہے، یہاں جو پہلے ہو چکا ہے وہ پھر دوبارہ بھی ہو سکتا ہے مگر پتا نہیں کیا کڑ بڑ ہوئی ہے۔“ اس نے سر جھٹکا، اخبار کو بغل میں دبایا اور دودھ لے کر اپنے اپارٹمنٹ کی جانب چل پڑا۔

یہ جگہ شہر کے پوش علاقے سے بہ مشکل آدھا گھنٹے کی دوری پر تھی۔ یہاں فلیٹس کی بھرمار تھی۔ اچھے وقتوں میں اس نے وہاں دو فلیٹ بک کرائے تھے جو اب ان کے کام آرہے تھے، ایک میں وہ رہ رہے تھے جبکہ دوسرے کا کرایہ بچن کے اخراجات اور یوٹیلیٹی بلوں کی مد میں کافی ہو جاتا تھا یوں وہ خود ایک دفتر میں ملازمت بھی کر رہا تھا اور مہینے میں دو تین پینشننگز بنا کر فرضی ناموں سے دکانوں پر رکھوا دیا کرتا تھا، حالات کی وجہ سے وہ برسوں پہلے اپنے نام سے پینشننگز بنانا ترک کر چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو اور وہ اس کے ذریعے سے صائمہ تک پہنچ جائے..... صائمہ کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی..... وہ اس کی زندگی تھی اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو معمول کے مطابق میز پر ناشتے کا سامان سجا ہوا تھا۔ صائمہ بچن میں چائے تیار کر رہی تھی۔

”تم آج دفتر نہیں جا رہیں؟“ وہ غور سے اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بولا۔

”نہیں آؤں..... دل نہیں چاہ رہا.....“

”تو ٹھیک ہے ہم گھر میں مزے کریں گے..... طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟“

”ہاں..... مجھے بس ڈر لگ رہا ہے اور پھر جب سب ختم ہی ہوتا ہے تو پھر اب کچھ بھی کرنے کا فائدہ کیا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”پھر وہی..... میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور کچھ بھی غلط نہیں ہوگا۔ تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے.....“ اس نے غصے سے اسے گھورا۔

”ہے.....“ وہ دیر سے بولی۔ ”تمہاری یہی تو فکر ہے مجھے، کب تک میری وجہ سے اتنی پریشانیاں سہتے

رہو گے؟“

”دیکھیے مسز آذر..... صبح خالی پیٹ تو بچوں بھی عشق نہیں فرما سکتا..... پھر اتنی مشکل باتیں میری سمجھ میں کیسے آئیں گی..... چلیے ناشتا کرتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

جواب میں وہ مسکرا کر رہ گئی۔

ناشتے کے بعد صائمہ بچن میں چلی گئی اور وہ بستر پر جا لیٹا۔ صائمہ پھر بکھر رہی تھی۔ اسے ہر اسات دیکھ کر وہ خود پریشان ہو جاتا تھا اور آج تو وہ یوں بھی بہت تھکا ہوا تھا، کل کی رات اس کے لیے کافی مشکل رہی تھی۔ اتنے سالوں بعد دوبارہ اسی گھر، اسی کمرے میں جانا، بالکل اسی جگہ صائمہ کی گڑیا کو اسی طرح ڈالنا جیسے اس رات وہ پڑی تھی۔ وہ سب کچھ اس قدر ایک جیسا تھا کہ ایک لمحے کو تو اسے لگا جیسے وہ ابھی مڑے گا تو اسے دونوں کی لاشیں بھی اسی طرح نظر آئیں گی۔

شاید وہ سب اسی طرح ہوتا تھا۔ اس نے سوچا۔ نور جہاں ایک بددعا کی طرح ہے، وہ جس کے قریب گئی اس نے اسے تباہ کر ڈالا تھا، اسے تو شخص اتفاق سے ہی اس کے اور سردار احمد شیرازی کے تعلق کے بارے میں علم ہوا تھا۔ ان دونوں وہ شہر کے ایک ممتاز اور دولت مند تاجر کی ادھیڑ عمر بیوی کا پورٹریٹ بنا رہا تھا، اس عورت کے دو ہی شوق تھے، بن ستور کر پارٹیوں میں گھومنا اور بولنا..... اس کی زندگی کے دوران نور جہاں کی برائیاں کرتے ہوئے اس نے ہی آذر کو بتایا تھا کہ آج کل وہ سردار احمد شیرازی کے چکر میں ہے۔ ”وہ چڑیل ہے ہی اتنی خوب صورت کہ احمد شیرازی اس کا دیوانہ بن گیا ہے۔ بیوی سے پہلے ہی اس کی کم بنتی ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ وہ آج کل میں نور جہاں سے شادی کر بیٹھے گا۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

آذر کے لیے اس کے بعد وہاں بیٹھنا، کام کرنا اور اس عورت کی کچر پھر سنتے ہوئے مسکرانا دو بھر ہو گیا تھا۔ ان کی خوشیوں کو آگ لگا کر نور جہاں اپنے خوابوں کا محل تعمیر نہیں کر سکتی تھی..... ہرگز نہیں..... وہ ایسا نہیں ہونے دے گا..... کسی بھی قیمت پر نہیں ہونے دے گا..... اسے بھی معلوم ہونا چاہیے کہ منزل کے قریب پہنچ کر مایوسی کیسی تکلیف دیتی ہے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا تھا۔ اسے احمد شیرازی اور اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں صرف ایک دن لگا تھا۔ اس کا ایک اچھا دوست شہر کے ایک موثر اخبار میں کرائم رپورٹر تھا، اس نے ٹھوڑی سی دیر میں ساری تفصیل مع اس کے فون نمبرز اور پتے کے اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ آذر نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ شیرازی کا بیٹا بنانا چاہتا ہے مگر شیرازی سے ملاقات بے کاری ثابت ہوئی تھی۔ وہ نور جہاں کے خلاف

کچھ بھی سننے پر آمادہ ہی نہیں تھا مگر وہ خود بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ نور جہاں کو اس بار کامیابی نہیں ملے گی، وہ تہیہ کر چکا تھا۔ اگلی کوشش میں وہ پہلی بار میں ہی کامیابی کے قریب پہنچ گیا۔ شیرازی کی بیوی ثنا کو کیا گیا اس کا پہلا فون ہی کام کر گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ آذر شیرازی اور نور جہاں پر نظر رکھے اور اسے ان کے بارے میں سب کچھ بتائے۔ اس کے لیے وہ اسے پیسا دینے کو بھی تیار تھی۔ آذر نے اسے دو دن میں ہی ان دونوں کی چند تصاویر بھی پہنچا دی تھیں۔

اس رات اس نے اسے انتہائی غصے کی حالت میں فون کیا تھا۔

”تم..... تم ابھی یہاں میرے گھر آ سکتے ہو.....“

”ابھی..... اس وقت..... مگر کیوں؟“

”مجھے وہ تصویریں نہیں مل رہیں تم مجھے ان کی کاپی لا دو..... تم ڈرو مت، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“ وہ ملتی جلتی انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔“

مگر اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اس کی یادداشت کی اسکرین پر سالوں پہلے کی اس رات کا منظر لہرایا۔ شاید اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے ایمبولینس، فلیش لائٹس کے جھماکے، پولیس اور نوکر کی چیخ و پکار جس نے ان لاشوں کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ آذر اسپتال کے عملے کے ساتھ جیزی سے اندر گھس گیا۔ جلدی میں وہ دروازے پر کھڑے کانسٹیبل سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ اسے اسپتال کے عملے میں ہی شامل سمجھا تھا۔

”آرام سے..... انہیں اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا جملہ اسے اب بھی یاد تھا۔

اندر کا منظر ناقابل دید تھا، احمد شیرازی پشت کے بل زمین پر گر پڑا تھا۔ گلے میں بیوست گولی اس کی فوری موت کی وجہ بنی تھی۔ پستول ثنا اور اس کے درمیان زمین پر پڑا تھا۔ ثنا شیرازی کروٹ کے بل پڑی تھی، اس کے سینے سے نکلنے والے خون کا چھوٹا سا تالاب سا بن گیا تھا۔

آذر اندر آ کر سب سے پہلے اس ننھی سی بچی کے پاس رکا تھا۔ اس کے خوب صورت بال خشک خون میں سرخ ہو رہے تھے۔ اس کی سیدھی ٹانگ عجیب وحشت ناک اور غیر قدرتی انداز میں اس کے جسم کے نیچے دبئی ہوئی تھی، اس کے ارد گرد بھی خون بکھرا ہوا تھا۔

”تینوں لاشوں کو اٹھوانے کا انتظام کرو.....“ پولیس کے سینئر انسپکٹر کی ہدایات جاری تھیں۔

”یہ..... یہ زندہ ہے.....“ آذر کا ایک زور سے چلا یا۔

ڈاکٹر اور اسٹاف اس کی جانب لپکے تھے، فوراً ہی اس کے ننھے سے چہرے پر آکسیجن ماسک لگا دیا گیا اور اسے آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ اس قدر خون بہہ جانے، سر پر گہری چوٹ لگنے اور ٹانگ کی ہڈی کٹی جگہ سے ٹوٹنے کے باوجود اس بچی کا زندہ رہنا ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا، چند گھنٹوں میں اس کی مانی اسپتال پہنچ گئی تھی۔ جب انہیں علم ہوا کہ آذر نے اس کی جان بچائی ہے تو وہ اس کی انتہائی شکر گزار ہوئی تھیں، بیٹی داماد کی خوف ناک موت، خبروں، لوگوں کی باتوں اور پھر بچی کی حالت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ آذر پر وہ یکا یک بہت اعتماد کرنے لگی تھیں۔ وہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اسپتال کا چکر لگاتا، اسے کسی ننھی سی گڑیا کی طرح بستر پر پڑے دیکھتا، اس کی حالت کافی دنوں بعد کچھ بہتری ملتی تھی۔ جب وہ قدرے بہتر ہوئی تو اس کی مانی دل کے عارضے کا شکار ہو چکی تھیں۔ بچی کو دردانہ کے حوالے کرنے سے پہلے انہوں نے آذر سے اس کا ذکر کیا تھا۔ ”آذر میں مرتے دم تک تمہاری احسان مند رہوں گی۔ تم نہ ہوتے تو میں اپنی بیٹی کی نشانی کو بھی کبھی نہ دیکھ پاتی۔ اس کے اپنے باپ نے اسے مار ڈالا تھا مگر تم نے اسے بچایا..... اب میری اپنی حالت ٹھیک نہیں رہتی۔ میں تو اس کے ساتھ ہوں ہی مگر مستقبل کے لیے کوئی مضبوط انتظام ضروری ہے، دردانہ میری بہن کی بیٹی ہے، لا ولد ہے..... اسے اپنانا چاہتی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا بہت خیال رکھے گی، سوچتی ہوں کہ اس طرح رباب کو بھی پہچان مل جائے گی ورنہ لوگ اسے ہمدردی کر کر کے ہی مار دیں گے۔“ وہ دھکی انداز میں بول رہی تھیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں احمد علی بہت اچھے انسان ہیں اور دردانہ باجی رباب کو بہت چاہتی ہیں۔“ وہ ان کی تائید میں بولا۔ آذر ان دنوں میں ان دونوں سے کئی بار مل چکا تھا۔ ”میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ رباب کا نام بھی بدل دیجیے۔ اسے دیے بھی کچھ یاد نہیں ہے وہ ان دونوں کو ہی اپنے ماں باپ سمجھے گی۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ ان کی بوڑھی آنکھوں میں تردد لہرایا۔ وہ یقیناً کچھ سوچ رہی تھیں۔ دو دن بعد ان کی سوچ اخبار کی چھوٹی سی خبر بن کر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ پریشان ہو کر ان کے پاس پہنچا..... وہ اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

”میں تمہیں فون کرنے والی ہی تھی.....“ وہ اسے دیکھ کر بولیں۔ ”میں نے اسے دردانہ کے ساتھ بھیج دیا ہے آذر..... ثنا کی بیٹی رباب مر چکی ہے۔ جواب زندہ ہے وہ زینب ہے۔ احمد علی اور دردانہ کی بیٹی..... اور اس راز سے صرف ہم چار لوگ ہی واقف ہیں مجھے امید ہے کہ یہ فیصلہ اس

کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔“

”آپ نے بالکل درست کیا ہے۔“ آذر نے انہیں تسلی دی۔ جب تک وہ زندہ رہیں کبھی کبھار اس کی ان سے بات ہوتی رہی تھی مگر پھر اس کا ان سب سے رابطہ ٹوٹ گیا، وہ خود اپنی الجھنوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ایک ماہ قبل صائمہ وقت سے پہلے ہی دفتر سے لوٹ آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں ”کیا..... کیا ہوا ہے؟“ وہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”سب ختم ہونے والا ہے آذی.....“ وہ رو پڑی ”میں..... مجھے جیل جانا ہوگا وہ مجھے پکڑ لیں گے..... سب کو..... دفتر میں..... ہر جگہ سب پتا چل جائے گا.....“ وہ ہسٹریائی انداز میں بولے جا رہی تھی۔

”کیا کہے جا رہی ہو..... بیٹھو یہاں.....“ اس نے اسے پکڑ کر زبردستی بٹھایا، پانی پلایا اور پھر اخبار کی جانب متوجہ ہوا۔ یہ دو دن پرانا اخبار تھا۔ ممتاز بزنس وومن، سیاستدان، سابقہ میڈم اور سوشل ورکر نور جہاں کی زندگی پر بننے والے ڈاکیومنٹری پروگرام کی خبر نے اسے بھی چکرا دیا تھا۔ تفصیل کے مطابق یہ مشہور ٹی وی انکر زینب احمد علی کا آئیڈیا تھا، وہی اسے بنا رہی تھی۔

اس نے یہ مشکل صائمہ کو تسلی دے کر مطمئن کیا مگر وہ غلط نہیں تھی۔ اگر اس ڈاکیومنٹری میں اس کا نام اور تصویر دکھادی گئی تو سب کچھ یقیناً ختم ہو جائے گا..... اسے شاید پھر جیل جانا پڑے اور یہ طے تھا کہ صائمہ یہ سب برداشت نہیں کر پائے گی۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا..... سب سے پہلے اس نے زینب علی احمد کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ تھوڑی سی تحقیق نے ہی اسے ششدر کر دیا۔ ماضی ایک بار پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا..... زینب علی احمد وہی تھی جسے برسوں پہلے اس نے بچایا تھا اور اب وہ اسی کی زندگی ختم کرنے جا رہی تھی۔ یہ بالکل غلط تھا، اس نے سوچا۔ وہ اسے اپنی اور صائمہ کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

وہ چار مرتبہ زینب علی احمد کو موقع دے چکا تھا مگر وہ اس ڈاکیومنٹری کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی..... ”بس اب بہت ہو چکا.....“ اس کی مٹھیاں بھجھک رہی تھیں ”اب کوئی پانچواں موقع نہیں ملے گا۔“

☆☆☆

زینب نے فیصلہ کیا تھا کہ اس پروگرام کے دو اسٹوری بورڈ تیار کرے گی، ایک کی ابتدا ملتان کے شاہ ہاؤس سے ہوگی اور دوسرے کی نور جہاں کی شادی کی دعوت سے۔ وہ صبح عباسی

سے گفتگو کے بعد سے ہی کام میں لگی ہوئی تھی۔ عباسی نے اسے نبیلہ شاہد کے مقدمے کے حوالے سے تفصیلات اور میڈم کے انٹرویو کی ریکارڈنگ بھی بھجوا دی تھی۔ مقدمے کے فیصلے کے بعد لیے گئے اس انٹرویو میں اس نے کہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے مگر جو کچھ کوئی کرتا ہے اسے اس کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ اب کم از کم نبیلہ کو بتا دینا چاہیے کہ وہ رقم کہاں ہے۔“

”مگر وہ تو اپنے بیان پر ڈٹی ہوئی ہے کہ اس نے چوری نہیں کی۔ آپ کے شوٹر نے اسے فون کر کے دفتر کی تجوری کو کھول کر آپ کے ہیرے کی انگوٹھی تلاش کرنے کو کہا تھا۔“

”میرا شوٹر اس وقت مجھے ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں حیدر آباد لے جا رہا تھا اور وہ انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔“ اس نے سختی سے کہا۔ ”میں نے نبیلہ کے ماضی کو جانتے ہوئے بھی اسے دوسرا موقع دیا مگر.....“

ایک اور ویڈیو میں میڈم کو یونیورسٹی کے طالب علموں سے خطاب کرتے دکھایا گیا تھا۔ عباسی کے بھجوائے ہوئے میٹرل میں عدالت میں انٹر لائن سیٹھی کے حوالے سے مشہور مقدمے میں بیان دے رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے حادثے کے بعد سے مسلسل یہ کہتی آئی تھی کہ اس کے شوہر نے ایک نا تجربے کار پائلٹ اور کم بہتر جہاز پر اعتماد کیا اور یہی اس کے بیوہ ہونے کی وجہ بنے۔ اس حوالے سے وہ باقاعدہ ہم چلائی رہی تھی۔

زینب اس پروگرام میں نبیلہ اور پائلٹ والے سیکشنس شامل نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ اس پروجیکٹ میں کریٹو کنٹرول کا اسٹیئرنگ اپنے ہاتھ میں رکھنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف عاصم جعفری تھا۔

”میں نے اخبار پڑھ لیا ہے اور یہاں اپنی بلڈنگ میں بات بھی کر لی ہے۔ جب تک وہ پکڑا نہ جائے تم یہیں رہو گی۔“ وہ حتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”یہ ممکن نہیں ہے عاصم..... میں یہاں کام پھیلا چکی ہوں۔ وقت بہت کم ہے، میں اب خاصی محتاط بھی ہوں اور وہ بھی کہ بجلی ایک جگہ بار بار نہیں گرتی۔“ وہ ہنسی۔ ”میں تو اب اس بارے میں سوچ بھی نہیں رہی فی الحال تو میں اس الجھن میں ہوں کہ گورنر کے عشائے میں کیا پہنوں؟“ عاصم کو سمجھا بھجا کر فون بند ہی کیا تھا کہ گھنٹی بھجج رہی تھی۔ اس بار دوسری طرف میڈم نور جہاں تھی۔

”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوئی اس طرح پروگرام پر برا

اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ کوئی اس پروگرام کو سیوتا ڈ کرنا چاہتا ہے حالانکہ مجھے تو اس میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہو رہی۔ زینب تم نے سارا میٹرل دیکھ لیا؟“

”جی ہاں اور مجھے کافی اچھا میٹرل مل گیا ہے مگر قلموں میں موجود لوگوں کے نام اور ان کے بارے میں معلومات کے لیے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”اوکے شمشیر اس حوالے سے مدد کر سکتا ہے وہ ایک گھنٹے میں تمہاری طرف پہنچ جائے گا۔ بس جلد سے جلد یہ کام مکمل ہو جائے تو اچھا ہے۔“ وہ فون بند کرتے ہوئے بولی۔

شمشیر پورے ایک گھنٹے میں زینب کے سامنے تھا۔

”کاش میں یہاں ہوتا تو اس کس بیٹی کی چٹنی بنا دیتا۔“ وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھ لہرا کر بولا۔

”مجھے یقین ہے اس بات پر۔“ زینب مسکرائی۔ ان کا کام ختم ہوا ہی چاہتا تھا کہ زینب کا فون بج اٹھا۔

”جب سے یہ خبر لگی ہے فون بجے ہی جا رہا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو کیسی ہو تم زینب؟“ زینب کو اس بہترین آواز کو پہچاننے میں ایک لمحہ لگا تھا۔

”ہیلو مراد شاہ صاحب میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیے کیا ہو رہا ہے؟“ الفاظ منہ سے نکلنے کے بعد اسے غلطی کا احساس ہوا تھا۔ شمشیر، مراد شاہ سے بخوبی واقف تھا وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”سگنل نہیں آرہے پلیز ہولڈ..... شمشیر میں ابھی آرہی ہوں۔“ وہ معذرت کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ شمشیر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ دوسری جانب شاہ ہاؤس کا وارث ہی بول رہا ہے مگر وہ زینب علی احمد کو کیوں فون کر رہا ہے؟

”کہیں وہ نور جہاں کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہا؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”تم نے شمشیر کہا تھا..... کیا یہ شمشیر ملک تو نہیں ہے؟“ ”جی ہاں وہ پروگرام کے سلسلے میں کچھ مدد کر رہا ہے، آپ فرمائیے۔“ وہ قدرے خشک لہجے میں بولی۔

”ہاں وہ ہی تو کر سکتا ہے۔“ مراد شاہ استہزاء سے انداز میں بولا۔ ”زینب میں نے تم کو اس لیے فون کیا ہے کہ شاید اس دن میں زیادہ بہک گیا تھا اور کچھ زیادہ ہی بول گیا تو اگر.....“

”آپ فکر نہ کریں میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں کروں گی جس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچے۔“

”گڈ..... ویسے میں تمہیں نور جہاں کے بارے میں

بلکہ پا

مزید چٹنی چیزیں دے سکتا ہوں۔“

”شکریہ اپنا کام خود کرنا جانتی ہوں اور اگر آپ برائہ مانیں تو میں فون بند کر رہی ہوں۔“ زینب کو اس کے انداز اور لہجے پر غصہ آ گیا تھا۔ ”واقعی کسی کام کا بندہ نہیں ہے یہ۔ بڑبولا اور بزدل۔“ اس نے سوچا۔ وہ لائبریری میں واپس آئی شمشیر اپنی جگہ پر ہی بیٹھا تھا مگر اس کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا وہ خاصا الجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور پھر وہ جلد ہی وہاں سے نکل گیا۔ شمشیر دفتر پہنچا تو صفر خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”میڈم سخت غصے میں ہیں، شام کے اخبارات میں چھپنے والی خبر نے ان کا موڈ خراب کر دیا ہے۔ تمہاری زینب علی احمد سے ملاقات کیسی رہی؟“

”ٹھیک ٹھاک۔“ وہ اپنے اندیشوں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی اس نے صفر کو زینب علی احمد کے گھر کے ایگریمنٹ کے حوالے سے معلومات حاصل کرنے کو کہہ دیا تھا اور خود سیدھا میڈم کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ میڈم صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے کئی اخبارات بکھرے ہوئے تھے اور خوب صورت آنکھوں میں انگارے دھک رہے تھے۔

”اسے دیکھو۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا اخبار شمشیر کے سامنے پیش دیا۔ وہ ایک مشہور کالم نگار کا کالم تھا۔ اس نے گوہر افشانی کی تھی کہ ”یہ جملہ اور دھمکیاں دراصل مقبولیت اور مزید شہرت حاصل کرنے کی کوششیں ہیں اور خوب صورت میڈم ہر کام پوری تفصیلات کے ساتھ کرنے کی عادی ہے۔“

”پاگل ہو گئے ہیں یہ سب۔“ میڈم نے سارے اخبار ردی کی ٹوکری میں ڈالتے ہوئے کہا۔ شمشیر خاموشی سے اس کے لال بھوکا چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

عاصم جعفری عادت کے مطابق وقت سے قدرے پہلے ہی تیار ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے نویں منزل کے اپارٹمنٹ کی کشادہ کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ شہر کے بہترین اور قیمتی اپارٹمنٹس کی بلڈنگ تھی۔ آمنہ کی موت کے بعد اس ایک ہزار گز کے پتکے میں اس کے تمہار بنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اکلوتی بیٹی فاطمہ اپنے شوہر کے ساتھ ترکی میں مقیم تھی۔ اس وقت وہ گورنر کے عشائے کے لیے تیار تھا مگر اس کے ذہن پر زینب کی فکر سوار تھی۔ اس نے اسے ملنے والے دھمکی آمیز خط کو ایف آئی اے میں موجود دوست کے توسط سے بینڈ رائٹنگ اسپیشلسٹ کو دکھایا تھا۔

”مجھے یہ کوئی سائنسی لگتا ہے دیوانہ ناپ کا انسان اور ایسے لوگ انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کی تحریر اس کے ذہنی انتشار کا پتہ دیتی ہے اور اس وقت اس کی انرجی تمہاری زینب علی احمد کے خلاف کام کر رہی ہے۔“

”تمہاری زینب۔“ وہ مسکرایا۔ وہ زینب کے جذبات کو اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا سالوں سے مگر وہ آمنہ سے بھی پیار کرتا تھا اور عاصم کی کوشش یہ تھی کہ وہ اسے خوش رکھ سکے۔ آمنہ کے جانے کے بعد سے وہ خود کو بہت تنہا، تنہا ہارا اور بوڑھا محسوس کر رہا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بڑھاپا عمر کا نہیں کیفیت کا نام ہے اور اس کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ زینب سے محبت کرتا تھا مگر اس سے زیادہ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے چاہنے کے باوجود اس سے رابطہ نہیں کیا پھر اس نے سنا کہ وہ کراچی آ رہی ہے تو وہ خود کو فون کرنے سے نہیں روک پایا۔ پسندیدگی کی دہلی چنگاری زینب کی محبت کی ہوا پا کر پھر سے سلگنے لگی تھی۔ جو وہ چاہتی تھی وہ اسے معلوم تھا مگر وہ خود کیا چاہتا تھا؟ ”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ یہ آواز بلند بڑبڑایا۔ سلمان کی سمجھ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”اگر زینب کو کچھ ہو گیا؟“ اس کے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، اسی وقت اس کے شو فر نے دروازے پر دستک دی۔

”گڈ..... میں آ رہا ہوں۔“ اس نے اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ سوچ اسے طمانیت بخش رہی تھی کہ کچھ ہی دیر میں زینب اس کے ساتھ ہوگی۔

☆☆☆

زینب نے اس موقع کے لیے گہرے سرخی مائل بھورے رنگ کے لباس کا انتخاب کیا تھا۔ یہ رنگ اس کے بالوں اور آنکھوں کے ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔

”اس وقت تو تم کہیں سے صحافی نہیں لگ رہیں۔“ عاصم اسے دیکھ کر بولا۔

”ہنا نہیں اسے تعریف سمجھنا چاہیے کہ تنقید۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے گھورا۔

”تعریف میڈم۔“ وہ مسکرایا۔ ”کوئی اور خط یا فون کال؟“ ”نہیں۔“ زینب نے اسے گڑیا کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی اس وقت وہ یہ ذکر چھیڑنا چاہ رہی تھی۔

”گڈ..... یہ پروگرام ہو جائے تو اس طرف سے اطمینان ہو۔“

دوسری طرف وہ عباسی جو ایک ڈاکیومنٹری کو تقریبی پروگرام بنانے پر مصروف ہے۔ ”زینب کدھے اچکا کر بولی۔“ ”اور تم..... تم اس حوالے سے کیا کر سکتی ہو؟“ ”چھوڑ سکتی ہوں یہ پروگرام مگر چھوڑوں گی نہیں، اس طرح تو میرا سارا منہ برباد ہو جائے گا۔“

گورنر ہاؤس میں شہر کے ممتاز ترین لوگ جمع تھے۔ مہمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ عاصم جعفری اسے سب سے ملتا رہا تھا یہ گویا نے شہر میں اس کا سب سے باقاعدہ تعارف تھا۔ پندرہ منٹ بعد اسے میڈم نور جہاں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ آج بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔

”کیسا رہا سب؟“ واپسی کے سفر میں عاصم نے اس سے پوچھا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں کہ وہاں مجھے تمہارے ساتھ زیادہ دیر رہنے کا موقع نہیں مل سکا، ویسے میں دیکھ رہا تھا تمہیں پوری توجہ مل رہی تھی۔“

”تو آپ بھی تو میڈم کے ساتھ مصروف تھے۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”اوہ..... زینب کیا تم ناراض ہو؟“ ”نہیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔“

”ارے میں تمہیں ایک اہم بات بتانا ہی بھول گیا۔“ عاصم نے اچانک کہا۔ ”میں کل صبح ترکی جا رہا ہوں۔ قاطر کی سسرال میں ایک اہم تقریب ہے۔ مجھے کئی دن لگ جائیں گے مگر فون پر ہر وقت دستیاب ہوں گا۔“ وہ خاموشی سے سنی رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کے باہر گاڑی سے اترنے لگی تب عاصم نے اسے روک لیا۔

”زینب پلیز سمجھنے کی کوشش کرو، تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم ایک نوجوان خاتون ہو اور میرا وقت گزر چکا ہے یوں بچوں کی طرح ناراض ہو کر مت جاؤ۔ میں تمہاری زندگی کو برباد نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”کاش آپ سمجھ سکتے کہ اس احمقانہ ضد کی وجہ سے آپ خود اسے برباد کر رہے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں اس پر یقین نہیں رکھتا زینب۔ اپنا خیال رکھنا۔“ زینب کے جواب دینے سے قبل وہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

نیند اس کی آنکھوں سے جیسے اڑی گئی تھی۔ آدھے گھنٹے کروٹیں بدلنے کے بعد آخر اس نے بستر سے کھڑے ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ شاید گرم دودھ مدد کر سکے۔ وہ میز صیال اترتے ہوئے درمیان کی لینڈنگ کے پاس آ کر رک گئی۔

”وہ یہاں بیٹھا کرتی تھی اور پیچھے آنے والے لوگوں کو دیکھا کرتی تھی۔ اس دن بھی وہ یہیں بیٹھی تھی مگر پھر وہ ڈر گئی اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔“

پھر..... پھر کیا ہوا تھا پتا نہیں۔ وہ سوچتی رہی۔ خود سے سوال جواب میں الجھی رہی۔ گرم دودھ بھی اس کی نیند کو نہیں مٹا پایا۔ آخر زینب اپنا دھوا استوری بورڈ اٹھالائی۔ اگر نیند نہیں تو کام ہی سہی۔ اس نے سوچا یہ دوسرا والا استوری بورڈ تھا جو تقریباً مکمل تھا۔ اس میں پروگرام کا آغاز میڈم، زینب اور عباسی سے ہوتا تھا جو نور جہاں اور شہریار کی شادی کی ایلارنج تصویر کے سامنے بیٹھے دکھائے جاتے تھے۔ جس کے بعد پس منظر میں ان کی شادی کی فلم چلتی رہتی ہے اور میڈم اس دوران شہر یا احمد شاہ سے ملاقات، دوستی اور پھر شادی کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ اس کے بعد انتخابی جلسوں اور میڈم کے شوہر کے الیکشن جیتنے کے مناظر دکھائے جاتے تھے جس میں میڈم اس کے شانہ بشانہ نظر آ رہی تھی۔ آخر میں جنازے والی فلم استعمال ہوتی تھی۔ نور جہاں کی سیاست میں آمد، انتخابات میں حصہ لینے، انتخابی فنڈ کی چوری، نیلہ شاہد کے مقدمے اور انٹر سیسٹی کے حوالے سے میڈم کی مہم کا ذکر آتا تھا۔ پروگرام کا اختتام رات گئے دفتر سے گھر جاتے ہوئے دکھانے پر ہو رہا تھا۔ بیک اپ کے لیے جو جملے عباسی نے تجویز کیے تھے وہ اس نے بھی نیم دلی سے بورڈ میں شامل کر لیے تھے۔

”میڈم نور جہاں ملک کے لیے اپنا سب کچھ کھونے کے بعد ملک کو ہی اپنا سب کچھ بھجھتی ہیں۔ ان کا کام ہی ان کا خاندان، ان کی خوشی اور ان کی زندگی ہے۔“

پروگرام بہ ظاہر مکمل تھا مگر اسے کچھ کی سی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر اس نے عباسی کو فون کیا۔

”ٹھیک ہے میڈم نور جہاں سے کچھ اور تصاویر اور میٹرل منگوا لیتے ہیں۔ تم..... یا تم چھوڑو میں خود ہی بات کرتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد شمشیر کا فون آ گیا، اس نے بتایا تھا کہ وہ دوپہر تک مزید میٹرل پہنچا دے گا یعنی اب اس کے پاس فراغت کے کم از کم دو گھنٹے موجود تھے۔ اسے بابا کی چیزیں دیکھنے کا اب تک موقع نہیں مل پایا تھا، اس دوران وہ یہ کام کر سکتی ہے۔ زینب چائے کا کپ لے کر دوبارہ لائبریری میں کھس گئی۔

پہلے تو اس نے مختلف کارڈن کھول کر خطوط، تصاویر اور دیگر چیزوں کو الگ کیا۔ اس سارے کام میں اس کے ہاتھ دھول مٹی میں اٹ گئے تھے۔ سب سے پہلے ایک تصویر نے

اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ ایک وجہ یہ مرد اور دہلی پتلی نازک سی خاتون کی تصویر تھی۔ اس کے پیچھے سردار محمد اور شائستہ شیرازی کے نام تحریر تھے یعنی یہ اس کے دادا اور دادی تھے۔ وہ غور سے ان کے چہرے اور مسکراہٹ کو دیکھتی رہی پھر خطوط کے بندل کو کھول کر پہلا خط نکالا۔

”ڈیئر امی، بہت بہت شکریہ اس سوئیٹر کا جو آپ نے بٹن کر بیجا ہے۔ آپ کی ان قربانیوں کا جو آپ نے میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے دی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کتنے ہی لباس تھے جو آپ خریدنا چاہتی تھیں مگر آپ نے نہیں خریدے۔ سیر و تقریب کے مواقع، کتنی خواہشات جو آپ نے میری خوشی کے لیے سج دیں۔ آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے پاپا جیسا بنوں گا۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، میں کامیابی کو جیت کر آپ کے پاس آؤں گا۔ میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میری ہر کوشش اور کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہی پیار ہے اور ہاں ڈاکٹر کے پاس جانا مت بھولیے گا۔ فون پر آپ کی کھانسی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

آپ کا بیٹا احمد!“

اس خط کے ساتھ کسی دوست کا تعریفی خط موجود تھا جو ان کی ماں کی وفات کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ دوسرے خط پر پہلے خط سے صرف چھ ماہ آگے کی تاریخ تھی۔ زینب کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس نوجوان شخص کے لیے جو اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس محبت کی گہرائی اور شدت کا کچھ اندازہ اور تجربہ اسے بھی تھا۔ جب وہ گھر آتے تو وہ بابا، بابا کرتی پھرتی تھی۔ وہ بازو جو اسے جھولا جھلاتے تھے، ہوا میں لہراتے تھے۔ اس کے بابا..... اس کا ذہن دھند میں کھوسا رہا تھا اور اس دھند میں اسے ایک ہنسی مسکراتی بچی بھانپتی نظر آ رہی تھی۔

ڈورنیل کی تیز آواز اسے خیالات کے طوفان سے باہر کھینچ لائی۔ وہ چونک کر یکدم کھڑی ہو گئی۔ اس کی گود میں رکھے کاغذات پھسل کر پینے جا گئے تھے۔ زینب نے جلدی جلدی سب سمیٹا۔ کھنٹی پھر بچی تھی۔ اس بار بچانے والا کھنٹی پر سے ہاتھ ہٹانا بھول گیا تھا۔ اس نے تیزی سے کارڈن کو اپنی طرف کھینچا۔ اس پر رکھی کپڑے کی گڑیا اٹھائی، تمام سامان اس میں ڈالا اور گڑیا کو اوپر رکھا اور اسے میز کے نیچے کھسکا دیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو شمشیر تیسری بار کھنٹی پر انگلی رکھ چکا تھا۔

”میں تو سمجھا کہ آپ گھر پر ہیں ہی نہیں۔“ وہ مسکرایا پھر جیسے ہی اس کی نظریں زینب کے ہاتھوں پر پڑیں تو وہ بولا۔ ”ارے کیا آپ مٹی سے کھیل رہی تھیں؟“ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ زینب نے کوئی جواب

نہیں دیا تب شمشیر نے کندھے اچکا کر زمین پر رکھے باکس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”اسے کہاں رکھنا ہے؟“

”لاہیریری میں۔“ زینب مختصر سا جواب دے کر سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ کافی دیر قالین پر بیٹھی رہی تھی، اس لیے اس وقت اس کے لیے چلنا کچھ دو بھر ہو رہا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”ارے زینب آپ اس طرح کیوں چل رہی ہیں؟ کوئی چوٹ لگی ہے، کہیں گرتو نہیں گئیں؟“

”اس آدمی کی نظر سے کچھ بھی بچنا ممکن نہیں ہے۔“ اس نے چڑ کر سوچا۔ ”نہیں کچھ سن ہو گئی ہے آپ باکس اس ٹیبل پر رکھ دیں۔“ وہ اب بھی زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ”اوکے، میں چلتا ہوں۔“ وہ ہاتھ جھٹک کر بولا جب وہ باہر نکل گیا تو اس نے دروازے کو لاک کر دیا۔ ابھی وہ مڑی ہی تھی کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ شمشیر دوبارہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”یہ تالاکسی کو اندر گھسنے سے نہیں روک سکتا زینب بی بی۔“ اس پر اعتبار مت کریں اور ہر بار ڈبل لاک لگائیں۔“ وہ یہ کہہ کر واپس باہر نکل گیا۔ زینب سشدرنگا ہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

میڈم کے گھر سے آنے والے باکس میں بے شمار تصاویر موجود تھیں مگر ان میں سے زیادہ تر سیاسی لوگوں سے ملاقاتوں وغیرہ کی تصویریں تھیں اس میں اسے شہر یار شاہ اور نور جیاں کی ایک فیملی تصویر ملی تھی وہ غالباً کسی پکنک کی تصویر تھی۔

”یہ کام آسکتی ہے۔“ اس نے سوچا۔ لاہیریری کا کارپٹ تصویروں سے بھر گیا تھا، پہلے زینب سے وہاں بابا کے سامان سے خطوط کا بنڈل گر کر بکھر گیا تھا۔ جلدی میں اس کے چند کاغذات رہ گئے تھے۔ وہ انہیں بھی ساتھ ساتھ سمیٹتی جا رہی تھی۔ میڈم کی تصاویر دیکھتے ہوئے اسے قیمتی لیٹر پیڈ کا ایک کاغذ یاد آیا ہوا ملا۔ اس نے اسے کھولا۔

”احمدی ڈارلنگ..... تم آج دوپہر کی میٹنگ میں بہت زبردست لگ رہے تھے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں احمدی اور تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کی خاطر ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا، تمہارے ساتھ کام کرنا اس سے اچھی زندگی کیا ہو سکتی ہے۔ میری جان ہم اس دنیا میں بہت کچھ بدل سکتے ہیں۔“ اس خط پر 13 مئی کی تاریخ تھی اور شہر یار احمد شاہ 20 مئی کو ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوا تھا۔

”کیا زبردست ریسیپ اپ ملا ہے۔“ زینب اچھل پڑی۔ وہ جس سچ کی تلاش میں تھی جو ناظرین کے دلوں پر براہ راست اثر کر سکے وہ اسے مل گیا تھا۔ یہ ایک بہترین اعتماد تھا۔ ”احمدی ڈارلنگ۔“ اس نے یہ آواز بلند دہرایا۔ اچانک اسے خود کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا۔

”مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ یہ سب سنا سنا ہے۔ یہ لفظ شناسا کیوں لگ رہا ہے..... کیوں؟“

☆☆☆

شمشیر اس شام خاصا مصروف رہا تھا۔ سات بجے کے قریب وہ دفتر میں داخل ہوا تو میڈم کی آواز نے اس کے کمرے کے باہر ہی اس کا استقبال کیا تھا وہ فون پر گرج رہی تھی۔

”عباسی میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ پروگرام کا چکر بکواس ہے مگر تم نے اصرار کیا۔ اب یہ پروگرام میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ میرے پاس اس کے لیے وقت نہیں ہے ہر روز ایک نئی پریشانی سامنے آ جاتی ہے۔ اب یہ مت کہو کہ تم نے یہ سب میرے لیے کیا ہے۔ تم صرف مجھے اپنا مشکور بنانا چاہتے تھے اور اس کی وجوہات تم خود بھی جانتے ہو۔“

”کیا بات ہے؟“ اس نے اندر جانے کا پروگرام بدلتے ہوئے صفر سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ ”تمہیں کچھ نیا معلوم ہوا ہے؟“

”ہاں بس یہ کہ زینب ملتان گئی تھی اس نے وہاں کچھ پرانے اخبارات لکھوائے۔ اس ریٹائرڈ پرنسپل سے ملی، شاہ باؤس بھی گئی تھی اور وہاں اس چیکو مراد شاہ نے اس سے جو بھی کہا ہو گا وہ تم سمجھ سکتے ہو۔“

”اوہ، وہ کرنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”پتا نہیں، دیکھتے ہیں۔“ شمشیر بولا۔ ”تم نے اس مکان اور ایگریمنٹ کے حوالے سے معلومات کیں؟“

”تھوڑی بہت، اس مکان کو جو ایجنٹ کرائے پر دینے کا ذمہ دار ہے اس بار اسے منع کر دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ خاندان میں سے کوئی وہاں رہنے والا ہے۔“

”خاندان میں سے کوئی.....“ شمشیر نے دہرایا۔

”مگر کون؟“

”شاید زینب علی احمد۔“

”اندازے یا تجزیے نہیں صفر پوری حقیقت معلوم کرو۔“ شمشیر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”معلوم کرو کہ

کون اس کا مالک ہے اور کون رشتے دار یہاں رہنے والا ہے۔“

☆☆☆

زینب ساری شام لاہیریری میں ہی رہی تھی۔ پروگرام کا اسٹوری بورڈ مکمل ہو چکا تھا، اب وہ اطمینان سے اپنے بابا کے بقیہ سامان کا جائزہ لے سکتی تھی۔ وہ قدرے ٹھکن بھی محسوس کر رہی تھی۔ گزشتہ رات اول تو اسے نیند بہت دیر سے آئی تھی اور پھر جتنی دیر وہ سوئی تھی اس دوران بھی خوابوں کے مناظر اسے ڈسٹرب کرتے رہے تھے۔ کیا اسے واقعی اپنی ماما اور بابا کے چہرے یاد ہیں یا وہ تصویروں کی وجہ سے انہیں اس طرح دیکھتی ہے۔ بابا کی محبت اور ان کے لمس کو تو وہ آج بھی محسوس کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے تھے مگر پھر اسے ہسٹریکل انداز میں رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

سردار احمد شیرازی کی تصویریں اور خطوط کو دیکھتے ہوئے اس کا ذہن عجیب تانے بانے بننے لگا تھا۔ اسے اپنی نانی کا ایک خط بھی ملا تھا جو انہوں نے اس سانچے سے چار ماہ قبل اس کی ماما کو لکھا تھا۔

”شامیرا بچہ، خط میں تمہارا انداز مجھے پریشان کر رہا ہے کہیں تم دوبارہ ڈپریشن محسوس تو نہیں کر رہیں۔ اگر ایسا ہے تو پلیز فوراً ڈاکٹر سے ملو۔“ یہ خط ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ اس کی نانی اسے بتاتی آئی تھیں کہ اس کے بابا غیر مستقل مزاج و طبیعت کے انسان تھے مگر ماما کے بارے میں یہ سب انہوں نے کبھی نہیں بتایا تھا۔

زینب کو اپنے بابا کا لکھا ایک خط بھی ملا تھا جو انہوں نے اس کی ماما کو حادثے سے گیارہ مہینے پہلے لکھا تھا۔

”ڈیئر شاہ، میری کانفرنس ختم ہونے والی ہے اور میں کل رات ہی گھر لوٹ آؤں گا۔ میں تمہارے اس فیصلے سے سخت پریشان ہوں کہ تم اگلے ماہ اپنی امی کے گھر جا کر رہو گی۔ میں مانتا ہوں کہ اسلام آباد تمہیں پسند نہیں ہے اور میں زیادہ مصروف ہو جاؤں گا مگر اگر تم اور باب میرے ساتھ ہو گے تو میرے لیے سب آسان ہوگا۔ میں تم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم اپنی امی کو انوائٹ کیوں نہیں کر لیتیں؟ اس طرح تم بور نہیں ہو گی اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ کسی تقریب پر چلنے پر اصرار نہیں کروں گا۔ پلیز اس بات پر غور کرو، میری خاطر۔“

زینب آنکھوں میں آنسو لیے ایک ایک تصویر کو دیکھتی جا رہی تھی۔ ایک ایک تحریر پڑھتی جا رہی تھی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پرانے زخم سے پٹیاں اتار رہی ہو۔ جوں جوں

”شاید میں کوئی بہت ہی خطرناک اور ہیبتناک قسم کا انسان بننا جا رہا ہوں۔“ پریشان حال نوجوان نے اپنے ڈاکٹر سے کہا۔ ”میری بیوی مجھ سے اتنی خوفزدہ رہتی ہے کہ میرے سامنے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالتی اور میں جس کام کے لئے لکھتا ہوں، فوراً بڑی وفاداری سے بجالاتی ہے۔ اور یہ کچھ بھی نہیں ہے ڈاکٹر! تمہیں پسین کر حیرت ہو گی کہ میری ساس جو پچھلے نو سال سے ہمارے ہاں تھی، آج صبح میرے پاس آئی اور کہنے لگی ”بیٹا! میرا کہنا معاف کر دینا میں کبھی واپس نہ آنے کے لئے جا رہی ہوں۔“ اور تب وہ حقیقت میں میرے گھر سے چلی گئی۔“

ڈاکٹر نے جھک کر سرکوشی کے انداز میں کہا۔ ”دو باتیں بتاؤ کیا کوئی دوسرا شخص بھی تمہاری طرح خطرناک اور ہیبتناک بن سکتا ہے اور اگر کوئی تم سے خطرناک اور ہیبتناک بننے کا طریقہ دے گا تو تم سے کم کتنے ہزار میں وہ طریقہ اسے بتا دو گے؟“

زخم قریب آتا جا رہا تھا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ بالآخر وہ لاہیریری سے نکل آئی۔ تازہ ہوا کی خواہش میں وہ پورج میں ٹہل رہی تھی کہ اسے دروازے پر لگے لیٹر بکس میں کچھ نظر آیا پہلا خیال اسی سفید سے کاغذ اور اس پر بکھری ٹینشن کا آیا تھا مگر اس نے ہمت کر کے لفافہ کھول لیا۔ لفافے کی پشت پر طارق روڈ کراچی کا ایڈریس تحریر تھا۔ خط باقاعدہ ٹائپ کیا گیا تھا۔

”ڈیئر مس زینب میں نے سنا ہے کہ آپ میڈم نور جہاں پر ڈاکو میٹری پروگرام بنا رہی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس پروگرام کی وجہ سے آپ کو عدالتی نوٹس کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اگر میڈم نے اس پروگرام میں یہ دعویٰ کیا کہ اس کا شوہر پائلٹ کی عطی سے مرے تو میں ہر جانے کا دعویٰ ضرور کروں گی۔ وہ پائلٹ یعنی میرا شوہر بھی اس کے شوہر کے ساتھ ہی مر چکے ہیں اور میرا یقین کیجئے کہ وہ ایک دھکی بیوہ یا جانے والی بیوی بھی نہیں رہی تھی۔ خدا جانے اس قدر جھوٹ وہ کس طرح بول لیتی ہے۔ اگر آپ مزید تفصیلات جانتا چاہیں تو پلیز مجھے فون کر لیں۔“ اس کے بعد شائستہ جمال کے گھر کے اور سیل نمبر درج تھے۔ زینب نے فوری طور پر نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں جب وہ مایوس ہو کر لائن کاٹنے ہی والی تھی تو فون ریسو کر لیا گیا۔

شائستہ جمال بوتیک چلاتی تھی اس روز اس کے بوتیک میں سیل لگی ہوئی تھی لہذا انہوں نے ملاقات کے لیے اگلے روز

خانہ کعبہ

☆ دنیا کی سب سے پہلی اور پرانی عمارت ہے۔
☆ دنیا کی سب سے منفرد عمارت اور پاک
عبادت گاہ ہے۔

☆ دنیا کی سب سے بڑی مسجد، مسجد الحرام ہے۔
☆ دنیا کی واحد عمارت ہے جسے غسل دیا جاتا ہے۔
☆ دنیا کی واحد عمارت ہے جسے کپڑے سے
ڈھانپا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی واحد عمارت جس کے اوپر سے کوئی
جہاز نہیں گزرا۔

یہ ہے اللہ پاک کے گھر خانہ کعبہ کی شان مبارک
سبحان اللہ دین اسلام پاک ہے اور سچا ہے۔ تمام دنیا
کے انسانوں کے لیے بھلائی دین اسلام ہے۔ اللہ
تعالیٰ ہر انسان کے باطن کو اسلام کے نور سے منور
فرمائے۔ آمین۔

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

☆☆☆

زینب الماری کے سامنے کھڑی ناقدانہ انداز میں
اپنی وارڈروب کو گھور رہی تھی۔ آج صبح سارہ وسیم نے اسے
فون کیا تھا۔

”زینب آج شام کو تم مصروف تو نہیں، شاید تمہیں معلوم
ہو کہ ہماری لائن میں سب سے پہلے پینگو میں سابق ایمپلیڈر
صاحب کی رہائش ہے انہوں نے آج کچھ خاص مہمانوں کو
عشاء کے لیے دعوت دی ہے میں نے انہیں تمہارے بارے میں
بتایا تھا انہوں نے درخواست کی ہے کہ میں تمہیں ضرور ساتھ
لاؤں، اس دعوت میں تمہارے سوائے موجود ہیں، تمہیں بھی
چلنا چاہیے۔“

”شکر یہ سارہ جی۔“ زینب کی شام یوں بھی اکیلے گھر پر
ہی گزرتی تھی۔ ”میں ضرور چلوں گی۔“

وہ تھوڑی دیر میں تک سب سے درست ہو کر تیار ہو گئی
تھی۔ ٹھیک چھ بجے سارہ اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔

”اگر کچھ وقت ہو تو کافی کا ایک کپ چلے گا؟“ زینب
اس وقت اپنے لیے کافی بنا رہی تھی۔

”ہاں..... کیوں نہیں۔“ وہ بے تکلفی سے اندر آئی تھی۔
”یہاں تمام سیٹنگ بالکل پہلے ہی کی طرح ہے۔“ وہ

کر سکتی کیونکہ اب میرا بیٹا خود پائلٹ ہے۔ اس نے اپنے
باپ کو نہیں دیکھا مگر اب میں اسے اس عورت کے جھوٹ کی
وجہ سے شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔ اگر ضرورت پڑی تو
میں عدالت بھی جاؤں گی اور ساری دنیا کو اس کی مکاری کی
کہانی سناؤں گی۔“

”مسز جمال، میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے
شوہر کا نام غلط انداز میں نہ آئے ویسے میں نے اب تک جو
مٹریل دیکھا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ شہریار اور
نور جہاں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔“

”کاش تم یہ بات آئی کے سامنے کہتیں اور پھر ان کے
چہرے کے تاثرات دیکھ پاتیں۔ کچھ جھوٹ سچ پر بھاری پڑ
جاتے ہیں زینب۔“

واپسی کے سفر میں زینب کا ذہن شائستہ جمال کی باتوں
میں الجھا رہا تھا، وہ جھوٹ بولنے والی عورت نہیں لگتی تھی اور اس
کا عزم بتا رہا تھا کہ جو وہ کہہ رہی تھی سچ تھا۔

”نور جہاں کے پاس اپنی وجوہات رہی ہوں
گی۔“ اس نے سوچا۔

شہریار سے طلاق اسے دوبارہ گمنامی کے اندھیروں میں
پھینک سکتی تھی۔ شہریار کی موت اور پھر اس کی ماں کی وفات
کے بعد اس کی ساری جائیداد بھی نور جہاں کو ملی تھی۔ اگر یہ سب
سچ تھا تو نور جہاں جس سانچے کا ذکر ہوتے ہی غم سے بے حال نظر
آتی ہے وہ اسے مصیبت و پریشانی سے بچانے والی ڈھال بن
گیا تھا۔

☆☆☆

شمشیر آج کی رات اپنے ڈھب سے گزارنا چاہتا
تھا۔ کئی دن سے مسلسل ذہنی تناؤ نے اسے الجھا رکھا تھا۔ وہ شہر
میں کھلنے والے ایک نئے پرائیویٹ کیسینو کے بارے میں
جاننے کے باوجود وہاں کا چکر نہیں لگا پایا تھا مگر انسان سوچتا کچھ
ہے اور ہوتا کچھ۔ ابھی وہ وہاں پہنچا بھی نہیں تھا کہ نور جہاں کی
چٹنی چنگھاڑتی فون کال نے اسے دوبارہ گھر کا رخ کرنے پر
مجبور کر دیا۔

”ابھی ابھی صفدر کا فون آیا تھا۔ میری اور اماں کی وہ
تصویر جو ہم نے ایوارڈ ملنے کے بعد شاہ ہاؤس کے باہر بنوائی تھی
شام کے اخبارات میں لگی ہوئی ہے اور وہ یقیناً کل دن کے
اخبارات میں بھی موجود ہوگی۔“ وہ غصے کی انتہا پر تھی۔

”کس طرح..... یہ تصویر انہیں کس طرح ملی، کون ہے
جو مجھے تباہ کرنا چاہتا ہے؟“

”مسز جمال آپ کے خط نے مجھے حیران کر دیا۔ آپ
نے نیٹ ورک کے بجائے مجھے خط لکھنا کیوں مناسب سمجھا؟“
زینب نے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

”میں نے بتایا نا کہ میں نے تمہاری کئی ڈاکیومنٹریز اور
پروگرامز دیکھے ہوئے ہیں مجھے یقین ہے کہ تم سچ کا ساتھ دو گی
اور جان بوجھ کر اسے اس جھوٹ کو دہرانے کا موقع نہیں دو گی کہ
شہریار احمد شاہ کی موت پائلٹ کی غلطی کی وجہ سے ہوئی۔ میرا
شوہر اپنے کام کا ماہر تھا جس وقت اس نے ایئر لائن سیفٹی
ریگولیشن کا مسئلہ کھڑا کیا تھا مجھے تب ہی اس کے خلاف بولنا
چاہیے تھا۔“

”تو آپ اس وقت کیوں نہیں بولی تھیں؟“

”کئی وجوہات تھیں حادثے کے چند ہفتے بعد میرا بیٹا
پیدا ہوا تھا پھر مجھے شہریار کی والدہ کا خیال تھا۔ جمال، شہریار
صاحب کے ساتھ برسوں سے تھا۔ وہ اچھے دوست تھے وہ
اپنے کام میں کتنا ماہر تھا یہ آئی اچھی طرح جانتی تھیں۔ حادثے
کی اطلاع ملنے کے بعد وہ اپنی بہو کے پاس نہیں میرے پاس
آئی تھیں۔ ہم نے یہاں بیٹھ کر قدرت کے فیصلے کا انتظار کیا تھا۔
نور جہاں کے خلاف جو ثبوت میرے پاس تھے اگر میں انہیں
استعمال کرتی تو وہ ایک لفظ بولنے کے قابل نہیں رہتی مگر اس
سے آئی کو بہت دھچکا لگتا۔ کوئی بھی ایسکینڈل ان کے لیے تباہ کن
ثابت ہوتا۔“

”کیسا ثبوت..... کیسا ہتھیار؟“ زینب کی پیشہ وارانہ
حس پھرک اٹھی۔

”میں میڈم صاحبہ کی ساری عزت خاک میں ملا سکتی
تھی۔ شہریار اس سے، اپنی شادی سے اور سیاست سب سے
بے زار ہو چکا تھا۔ جس دن وہ حادثہ ہوا اس روز وہ واپس آ کر
ایکشن میں حصہ نہ لینے کا اعلان کرنے والا تھا۔ ایئر پورٹ پر
نور جہاں اور اس کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ وہ
اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ استعفیٰ نہ دے اور شہریار نے میرے
اور جمال کے سامنے اسے باقاعدہ تین بار طلاق دی تھی اور کہا
تھا کہ اب سب بے کار ہے۔ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا
کیونکہ میں سیاست میں رہوں یا نہ رہوں ہم ہر صورت میں
الگ ہو چکے ہیں۔“

”یعنی ان دونوں میں طلاق ہو چکی تھی؟“ زینب نے
بے یقینی سے پوچھا۔

”جی ہاں، یہ سارا ڈھونگ جو وہ دنیا کے سامنے کرتی
آئی ہے صرف ایک جھوٹ ہے مگر اب میں یہ برداشت نہیں

دو پہر ایک بجے کا وقت طے کر لیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی پھیلی
ہوئی تھی۔ صائمہ بستر پر نہیں تھی وہ تیزی سے کھڑا ہوا مگر پھر
ٹھیک کر رک گیا، وہ دروازے کے قریب پڑی آرام کرسی پر
بیٹھی تھی۔

”تم کیوں اٹھ گئیں آدھی رات کو.....؟“ اس نے پوچھا۔
”میں سوئی نہیں..... میری گڑیا نہیں مل رہی ہے آؤی
اور مجھے اس کے بغیر نیند نہیں آ رہی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اوہ.....“ آؤر بڑبڑایا۔ ”صائمہ آج کل ذہنی طور
پر بہت الجھی ہوئی ہے اور ایسے میں وہ گڑیا اس کے لیے ضروری
تھی..... یہ اس سے کیسی غلطی ہو گئی۔“ اس نے سوچا۔

”تم تھوڑی دیر لیو تو..... نیند آ جائے گی..... میں صبح
گڑیا ڈھونڈ لوں گا.....“

”وہ مل جائے گی نا.....؟“ صائمہ بچوں کی طرح پوچھ
رہی تھی۔

”بالکل مل جائے گی۔“ وہ اسے چادر اوڑھاتے
ہوئے بولا۔

”کل مجھے زینب علی احمد کے گھر جانا ہوگا، صائمہ کو اس
کی گڑیا واپس چاہیے تھی۔ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تو اسے اس
کی گڑیا ملنی ہی چاہیے.....“ اس نے سوچا۔

☆☆☆

زینب ڈیڑھ بجے سے قبل شائستہ جمال کی بوتیک پر نہیں
پہنچ پائی تھی۔ راستے میں ملنے والے ٹریفک اور پھر بند راستوں
نے اس کا وقت ضائع کر دیا تھا۔ شائستہ نے بوتیک سے باہر
آ کر اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ پچاس سال کی ایک دبلی چکی
خاتون تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں کے گرد بنے حلقے اس کی کم
خوابی کی چٹخی کھاتے تھے۔ اس کے بال سیاہ تھے مگر ایش
گولڈن رنگ کی ہائی لائٹس نے اس کی شخصیت کو چمکادیا تھا۔ وہ
زینب کو اندر لے آئی۔

”میں نے تمہارے کئی پروگرامز دیکھے ہیں تم اپنے کام
میں بہت اچھی ہو۔“ وہ سادگی سے اس کی تعریف کر رہی
تھی۔ ”یہ میرا بوتیک ہے یہاں ایک کمرالمنٹیک چیزوں کا بھی
ہے اور اوپر کی منزل پر میں رہتی ہوں۔ آج بوتیک بند ہے پھر
بھی اپنی ایک پرانی کلاسٹ کی وجہ سے میں نے آج بوتیک
کھولی ہے، تم چائے پیو گی نا؟“

”ضرور، شکریہ۔“ زینب نے بیٹھے ہوئے کہا۔

کافی کا کپ لیتے ہوئے بولی۔ زینب تھوڑی دیر بالکل چپ رہی مگر پھر بالآخر بولی۔

”آپ جانتی ہیں..... آپ جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟“ اس کا انداز سوالیہ ہرگز نہیں تھا۔

”ہاں۔“ سارہ بھی پرسکون لہجے میں بولی۔ ”شاید میں جانتی ہوں کہ تم نے گھر کو بالکل اسی انداز میں سجایا ہے اپنی ماں اور باپ کے انداز میں مگر زینب، سوال یہ ہے کہ کیا یہ عقلمندانہ فیصلہ ہے؟“

”عقلمندانہ کا تو پتا نہیں مگر میرے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“

”تمہیں کیا کیا یاد ہے؟“

”مکڑوں میں سب کچھ بنا ہوا ہے مکمل تصویر نہیں بنتی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”میں اس سب کے بعد تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے اسپتال فون کرتی رہی تھی تم کئی ماہ کو بے کسی حالت میں رہیں پھر ہمیں تمہاری موت کی اطلاع ملی تھی۔“

”میری ماما کی کزن نے مجھے گود لے لیا تھا اور نانی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ معاملات زندگی بھر میرا پیچھا کریں۔“

”اچھا اسی لیے انہوں نے تمہارا نام زینب کر دیا۔“

زینب تم کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟“

زینب اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ بے چینی اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ وہ پیانو چیئر پر جا بیٹھی اور پیانو کی کیز پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگی۔

”تم بجاتی ہو؟“

”تھوڑا بہت۔“

”یہ تمہاری ماں کا شوق تھا وہ موسیقی کی دلدادہ تھی۔“

”جی مجھے نانی نے اور پھر امی نے بھی بتایا تھا۔ سارہ جی میں یہ جانتا چاہتی ہوں کہ اس رات ہوا کیا تھا؟ جب سے مجھے ان باتوں کا علم ہوا ہے میں اپنے بابا سے نفرت کرنے لگ گئی ہوں۔ یہ سب دکھ، تکلیف، ماں سے جدائی یہ سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا۔ شاید میں یہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ ان میں کیا کمی تھی؟ کیا وہ ذہنی مریض تھے جیسا کہ نانی نے بتایا مگر جو کچھ مجھے یاد آتا ہے وہ مکڑے کچھ اور کہانی سناتے ہیں۔“ اس نے بے بسی سے سر جھٹکا۔ ”مگر مجھے کچھ پورا یاد نہیں آتا۔ میرے کانوں میں آوازیں گونجتی ہیں مگر میں سچ کی تلاش میں دوڑ رہی ہوں سارہ جی۔“ وہ مڑ کر اس جگہ کے پاس کھڑی ہو گئی جہاں اس کے بابا اور ماما کی لاشیں ملی تھیں۔

”یہ ابھن مجھے توڑ رہی ہے۔ میری خالہ اور نانی نے

مجھے بتایا کہ میرے باپ نے میری ماں کا کیریر اور پھر اس کی زندگی برباد کر دی مگر بابا کے بارے میں کہ..... ان کے ساتھ کیا ہوا؟“

”زینب کچھ سوال کبھی جواب نہیں پاتے۔“ سارہ کی آنکھیں پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، اسے اپنے ہاتھ نہایت گرم ہوتے لگ رہے تھے، کچھ تھا جو اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا وہ سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

”چلو زینب اب ہمیں نکلنا چاہیے۔“

☆☆☆

اس گھر سے تھوڑا آگے پرانے درخت کی ایک جانب باڑھ اور پودوں کے درمیان بیٹھا مس الدین، زینب اور سارہ ویم کو گھر سے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ گھر کی تمام لائٹس روشن تھیں وہ دیکھ رہا تھا کہ پورچ والے دروازے میں نئے اور مضبوط تالے لگوا لیے گئے تھے اب اس راستے سے اندر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا نیم کے درخت کی کئی مضبوط شاخیں عمارت کی اوپری منزل کے ٹیرس پر پہنچ رہی تھیں۔ اس بار اسے اس راستے کا انتخاب کرنا تھا۔ چند لمحوں میں وہ مکان کے اندر پہنچ چکا تھا۔ اسے صائمہ کی گڑیا تلاش کرنی تھی مگر وہ شروع کہاں سے کرے۔ اس نے زینب کی الماری اور کمرہ احتیاط سے چھان مارا گڑیا یہاں نہیں تھی۔ سیزھیوں پر پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ پورے مکان کی بتیاں کھلی چھوڑ کر گئی تھی۔

”کیسی جہالت ہے یہ۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”یہاں جہاں لوگ بجلی کی کمی سے پریشان ہیں اور یہ اس طرح بجلی ضائع کر رہی ہے۔“ وہ نیچے اترا سامنے ڈانٹنگ ٹیبل پر کافی کا گم اٹا ہوا تھا اور ٹیبل پر کافی گری ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے تاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے پاس پڑے ڈسٹر سے کافی صاف کر دی۔ اب اسے لائبریری کا جائزہ لینا تھا۔ وہاں اسے میز کے نیچے رکھے کارڈن سے گڑیا مل گئی تھی۔ اس کا ایپرٹ غائب تھا مگر اب اس کے پاس اسے تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا اور اسے فوراً یہاں سے نکلنا تھا۔

☆☆☆

تقریباً واقعی بہت اچھی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ہر کام وقت پر ہو گیا تھا۔ ساڑھے نو بجے زینب گھر کے لیے نکل گئی تھی۔ تقریب کے دوران اس کا فون بند ہو گیا تھا۔ اس نے آتے ہی فون چارج پر لگا دیا۔ فون آن ہوتے ہی ایس ایم ایس کی پیس بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ عباسی کی کئی مس کالز کی نوٹیفکیشن اور پیغامات موجود تھے۔

”کیا ہو گیا؟“ زینب نے بڑبڑاتے ہوئے میج کھولا۔

”زینب میں عباسی، ایک بڑا مسئلہ ہو گیا ہے تم چاہے کتنی دیر میں یہ میج دیکھو فوراً میڈم کے گھر آ جاؤ۔ میں نہیں ہوں اور ہمارا آج تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔“

زینب نے میڈم کے گھر فون کیا۔ دوسری طرف شمشیر تھا۔

”شمشیر کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟“

”ہاں، کیا آپ گھر پر ہیں اپنے؟“

”ہاں۔“

”عباسی کی کار باہر موجود ہے وہ دس منٹ میں وہاں پہنچ جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ میڈم کے گھر پر تھی۔ شمشیر نے کچھ کہے بغیر اسے لیونگ روم تک پہنچا دیا جہاں سب خاموشی سے اس کے منتظر تھے۔ میڈم نور جہاں پتھر لیے سکوت سے سجا چہرہ لیے کینڈے تو نظروں سے اسے آر پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وقار صاحب کا رنگ اڑا ہوا تھا حد یہ کہ ہمیشہ نہایت نفاست سے جسے بال بھی آج اڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ عباسی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ان کی عدالت میں ایک ایسی مجرم داخل ہوئی ہو جس کا جرم کسی کارروائی کے بغیر ثابت ہو گیا ہو مگر کیسا جرم؟ ہوا کیا ہے؟“ زینب کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔

”کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ کیا ہو گیا ہے؟“ آخر اس نے ہی پوچھا۔

اس کے سوال کے جواب میں صفدر نے شام کا رنگین اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ تصویر انہیں کہاں سے ملی؟“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

تصویر میں میڈم نور جہاں اپنی حد سے موٹی ماں کے ساتھ شاہ ہاؤس کے باہر کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں ایک ایوارڈ تھا اور دونوں ماں بیٹیاں انتہائی خوش نظر آرہی تھیں نیچے کمپین تحریر تھا۔

”کل کی بہترین اداکارہ آج کی نائب سربراہ بن پائے گی؟“

”تو کیا آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ میں نے ان کو دی ہے؟“ زینب نے تیز آواز میں پوچھا۔

”ٹھہرے، کوئی بھی جھوٹ بولنے سے پہلے میری بات سن لیجئے مس علی احمد۔ میں جان چکا ہوں کہ آپ ملتان گئی تھیں۔ وہاں ملاقاتوں کے علاوہ آپ نے اخبار کے دفتر کا دورہ

بھی کیا تھا۔“ شمشیر نے زہریلے انداز میں کہا۔

”میں نے میڈم کو بتا دیا ہے کہ تم میری مرضی کے بغیر ملتان گئی تھیں۔“ عباسی نے کہا، زینب سمجھ گئی کہ اسے میڈم کو کیا نہیں بتانا ہے۔

”میڈم میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ کس طرح محسوس کر رہی ہوں گی۔“ اس نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ نور جہاں گرج پڑی۔

”واقعی..... کیا میں تم کو بتا نہیں چکی تھی کہ مجھے اس شہر میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحے سے نفرت ہے۔ عباسی اور شمشیر نے مجھے سب بتا دیا ہے کہ تم ملتان گئیں وہاں اس منحوس مرادشاہ سے ملیں۔ تم نے ہی یہ تصویر ریلیز کی اور میں جانتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا۔ تم میرا پروگرام اپنی مرضی کے مطابق بنانا چاہتی ہو۔ تم سٹر پلاننگ کہانیاں پسند کرتی ہو اور تم اس پروگرام میں بھی وہی سب کرنا چاہتی ہو خواہ اس سے مجھے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔“

”کیا آپ حقیقت میں اس بات پر یقین کرتی ہیں کہ میں نے یہ تصویر ان کو دی ہے، کیا عباسی نے آپ کو میرا دوسرا اسٹوری بورڈ نہیں دکھایا۔“

”دوسرا اسٹوری بورڈ؟“ صفدر نے پوچھا۔

”ہاں، جس طرح میں پروگرام بنانا چاہتی ہوں اور اس میں یہ سب نہیں ہے یعنی اداکاری کا ایوارڈ وغیرہ۔ میڈم آپ درست کہہ رہی ہیں میں پروگرام کو اپنے انداز سے بنانا چاہتی ہوں مگر اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ میں آپ کی صلاحیت اور محنت کی مداح ہوں اور آپ کے لیے ایک زبردست پروگرام بنانا چاہتی ہوں۔ ایسا پروگرام جو آپ کا تاثر بدل ڈالے اور لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے جس کی ٹی آر پی سب سے اوپر ہو اور مجھے اپنی بات مکمل کرنے دیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر شمشیر کو بولنے سے روکا۔ ”آپ کے ساتھ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ لوگ آپ کو ایک سرد مہر اور کام کی مشین ٹائپ عورت سمجھتے ہیں۔ پبلک لائف جذبات مانگتی ہے یہ تصویر آپ کے اس تاثر کو بدل ڈالتی ہے۔ آپ اس پر شرمندہ ہیں مگر اپنی والدہ کے تاثرات دیکھنے خوشی اور اپنی بیٹی پر فخر کا احساس ان کی آنکھوں سے جھلک رہا ہے۔ ہاں وہ بہت موٹی ہیں مگر کیا یہ چیز آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو لوگوں کو خوشی سے بتاتی کہ میں نے اپنی ماں کی خوشی کے لیے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا یہ ان کا خواب تھا جو آپ نے بحیثیت بیٹی پورا کیا، میں نہیں سمجھتی کہ دنیا کی کوئی ماں ایسی نہیں ہوگی جو اس بات پر آپ کو مزید پسند نہ کرے۔ عباسی اس حوالے سے آپ کو میری تجاویز بتا سکتے

ہیں۔ میں آپ کو اس وقت صرف ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ اگر آپ نائب سربراہ نہیں بن پائیں تو اس کی وجہ یہ تصویر نہیں ہوگی اس پر آپ کا رد عمل ہوگا اور اب آپ مہربانی فرما کر ڈرائیور سے کہیے کہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔ عباسی صاحب، آپ مجھے صبح یہ بتا دیجیے گا کہ مجھے اس پروگرام پر کام کرنا ہے یا چھوڑ دینا ہے۔ وہ دروازے کی جانب مڑی ہی تھی کہ عباسی کی آواز نے اسے روک لیا۔

”شمشیر پلیز کافی پلو او یار..... اور زینب بیٹھ جاؤ تم، ہمیں مل کر اسٹریٹیجی بنانا ہوگی۔“

☆☆☆

وہ ڈیڑھ بجے کے بعد گھر پہنچی تھی۔ چائے کا کپ لے کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے وہ میڈم کی تصویر کے معاملے پر غور کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے پیچھے مراد شاہ کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ حرکت وہ ہی کر سکتا تھا اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور بستر پر جلتے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ شام کے کافی کے کپ بھی ٹیبل پر موجود تھے۔ انہیں سمیٹتے ہوئے ایک خیال اسے چونکا گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کافی ٹیبل پر بکھر گئی تھی اس نے اس وقت سوچا تھا کہ وہ آکر صاف کر لے گی مگر اب صاف ستھری ٹیبل پر دونوں کپ سیدھے رکھے تھے۔ کیا اسے غلط فہمی ہوئی تھی؟ اس نے سوچا پھر کندھے اچکا کر بیڈروم کی طرف چل پڑی۔

☆☆☆

شمشیر سے زیادہ میڈم نور جہاں کے موڈ شاید ہی کوئی اور سمجھتا ہو مگر آج ناشا کرتے ہوئے وہ خود یہ سوچ کر الجھ رہا تھا کہ آج وہ کیا کرے گی۔

گزشتہ رات زینب کے جانے بعد وہ، میڈم، عباسی اور صفدر مزید ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے تھے اس دوران نور جہاں کئی مرتبہ عباسی پر برسی تھی۔ شمشیر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس قدر فحش و پکار پر بھی عباسی کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی تھی بعد میں صفدر نے اس کی انجمن دور کر دی تھی۔

”ارے یہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ وہ ملک میں ٹی وی انڈسٹری کا بادشاہ ہے اور اب وہ وزارت اطلاعات و نشریات کی امید میں ہے۔ اگر آج وہ میڈم کے لیے کچھ کرے گا تو وہ بھی اس کے لیے کرے گی، سمجھتا۔“

اس سب کے باوجود شمشیر، عباسی کی باتوں سے متفق تھا۔

”زینب لوگوں کی توجہ کھینچنے کا فن جانتی ہے ٹی آر پی کیسے بناتی ہے اور ناظرین کو ریوٹ سے کیسے دور رکھتا ہے یہ

اسے آتا ہے، آپ اس کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔“

”ہم اس مشکل سے نکل آئیں گے شمشیر؟“

کے جانے کے بعد نور جہاں نے کمرے سے نکلتے ہوئے شمشیر سے پوچھا۔

”یقیناً۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ ”نور، اب تمہیں آرام کرنا چاہیے کل کی ڈنر پارٹی بہت اہم ہے اور تمہیں اس کے لیے تازہ دم ہونا چاہیے۔“

اگلی صبح نور جہاں کے یقین کے مطابق وہ تصویر تقریباً ہر اخبار میں موجود تھی۔ کئی ٹی وی چینل اس پر اس سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ دفتر کے سامنے اپنی کار سے اتری تو رپورٹرز نے اسے گھیرے میں لے لیا۔

”آپ اس تصویر کی اشاعت سے پریشان ہیں؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ وہ گرم جوشی سے بولی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دم رکھی تھی۔ شمشیر اس کی پرکار منس پر اس اش کر اٹھا تھا۔ ”آخر میں کیوں پریشان ہوں گی۔ اس نے مجھے اپنی ماں کی خوشی یاد دلادی۔ ان کے خواب کو پورا کرنے کے لیے تو میں نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ وہ بیوہ تھیں اور انہوں نے یقیناً میری پرورش کی۔ وہ میری سب سے اچھی دوست تھیں۔“ بات مکمل کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی تھی، آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ کمرے سب کچھ ریکارڈ کر رہے تھے اور براہ راست نشر کر رہے تھے۔ کئی گھروں میں خواتین کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ شو کے زمانے میں حقیقت نہ جانے کہاں تھی۔

☆☆☆

زینب دیر سے سو کر اٹھی تھی ناشتے کے دوران اس نے فون چیک کیا، پہلا ایس ایم ایس عامم جعفری کا تھا۔

”میں آج رات کی فلائٹ سے نکل رہا ہوں کل نور جہاں کے ڈنر میں تم سے ملاقات ہوگی انشا اللہ۔“

دوسرا پیغام عباسی کا تھا۔ ”مبادلہ اسٹوری پر کام مکمل کر لو اور میڈم کے گھر تین بجے تک پہنچ جانا۔“

تیسرا پیغام قدسیہ بلگرامی کا تھا۔ ”میں قدسیہ ہوں زینب، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ نیلہ نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔“

اس نے فوراً ان کا نمبر ملا یا دوسری کھنٹی پر ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

”زینب کل اس کا فون آیا تھا اتنے سالوں بعد میں نے اس کی میٹھی، شرمیلی آواز سنی۔ اس نے ہیلو کہا اور پھر ہم دونوں رونے لگے۔“

”میڈم وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟“

”اس نے نہیں بتایا مگر اس نے کہا کہ اب وہ بہت بہتر ہے اور یہ کہ اب وہ مزید چھپنا نہیں چاہتی۔ وہ جیل جانے کی تاکہ جج معنوں میں آزاد ہو سکے۔“

”جیل..... آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے اسے تم سے بات کرنے کو کہا ہے۔ زینب پلیز ناراض مت ہونا، میں نے اسے تمہارا نمبر بھی دیا ہے مجھے یقین ہے کہ تم اس کی مدد کرو گی۔ پلیز زینب اسے دوبارہ جیل مت جانے دینا پلیز۔“ ان کی آواز بھر رہی تھی۔

”میں پوری کوشش کروں گی۔“ زینب نے وعدہ کیا۔

”میرے ایک دوست ہیں وہ اس کی مدد کر سکتے ہیں میں ان سے بات کروں گی۔“

”مجھے معلوم تھا تم بہت اچھی ہو۔“

فون رکھتے ہوئے زینب، نیلہ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ اس کی واپسی اس کے حوصلے اور سچ کی دلیل ہوگی مگر نور جہاں کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا ہوگا۔ نہ جانے آنے والے دن کس کے لیے کیلانی والے تھے؟

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی آڈر کو کسی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ کمرے میں گلاب کی ہلکی سی دلدلیر مہک موجود تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر دو لمبی موم بتیاں موجود تھیں اور پکن سے اس کے پسندیدہ مشربلاؤ کی خوشبو آ رہی تھی۔ ”ارے واہ..... کیا پک رہا ہے بھی..... کوئی خاص مہمان آ رہا ہے کیا.....؟“

”میری زندگی میں تم سے زیادہ خاص کون ہو سکتا ہے آڈی.....؟“ صائمہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ کئی دنوں بلکہ ہفتوں بعد اتنی خوش اور نارمل نظر آ رہی تھی۔

”آج تو تمہیں دیکھ کر میری ساری تھکن اتر گئی۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہیں خوش دیکھنا میرا کتنا خون بڑھا تا ہے تو شاید تم بھی اداس نہ ہو۔“ وہ اس کے قریب آ کر دھیرے سے بولا۔

”ہاں اب میں خوش ہوں ہم پہلے کھانا کھائیں گے پھر اچھی سی چائے اور پھر باتیں کریں گے۔“

”زبردست مینو ہے۔“ وہ مسکرایا۔

کھانے کے بعد صائمہ نے اسے ایک پکٹ لاکر دیا..... ”یہ کیا ہے.....؟“ آڈر نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”کھول کر دیکھ لو نا.....“

آڈر نے پکٹ کھولا، اندر سفید لمبل کا ہاتھ سے کڑھا ہوا کرتہ تھا۔

”یہ تمہارے لیے ہے، تم نے کافی دنوں پہلے کہا تھا نا کہ تمہیں اس طرح کے کرتے پسند ہیں۔“

”تو یہ میرا تحفہ ہے..... بہت اچھا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ارے ہاں..... میرے پاس بھی تمہارے لیے کچھ ہے.....“ اسے یاد آیا تو وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کپڑے کی وہ گڑیا تھی۔

”اوہ میری گڑیا..... شکر ہے مل گئی..... کہاں سے ملی۔“

میں نے پورا گھر جھان لیا تھا.....“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”بس مل گئی.....“ وہ ہنسا۔ ”اب کرو باتیں.....“ وہ چائے کا کپ اٹھا کر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آڈی میں جو کہہ رہی ہوں، پلیز اسے سمجھنے کی کوشش کرنا۔“ وہ سنجیدگی سے بولی، اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا جس نے آڈر کو بے چین کر دیا تھا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور اس فیصلے نے ہی مجھے یہ اطمینان دیا ہے۔“

”کیسا فیصلہ.....؟“ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”اگر بدھ کو نور جہاں والے اس پروگرام میں میری تصویر ہوئی تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی کیونکہ اب میں اس خوف کے ساتھ نہیں جی سکتی کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے اور نہ ہی تمہیں ایک بار پھر در بدری کی مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہوں۔“

”صائمہ.....“

”پلیز آڈی..... میری بات سنو..... یہی درست ہے..... بس تم پریشان مت ہو.....“

”میں پریشان نہیں ہوں اور تم مجھ سے پوچھتے بغیر کچھ نہیں کرو گی..... ہرگز نہیں..... وعدہ کرو مجھ سے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دیوانوں کی طرح کہہ رہا تھا۔

”اوکے..... میں وعدہ کرتی ہوں۔“ وہ بولی، اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

آڈر کو بھی اب بدھ کا انتظار تھا۔

☆☆☆

کیمرا مین اور باقی عملہ تین بجے میڈم نور جہاں کے گھر پہنچ گیا تھا۔ زینب اور عباسی بھی آگے پیچھے وہاں آئے تھے۔ زینب نے آج سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور ہمیشہ کھلے رہنے والے بالوں کو لپیٹ کر جوڑا بنایا تھا۔ شمشیر ان کی مدد کر رہا تھا۔ وہ قدرے الجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ زینب کا چہرہ آج اسے کسی کی یاد دل رہا تھا مگر کس کی؟ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

”شمشیر تم کب آئے یہاں؟“ عاصم نے اسے گھورا۔
 ”میڈم آپ کو ڈھونڈ رہی تھیں، انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو تلاش کر کے لے آؤں۔“
 ”اوکے میں گاڑی خود نکال لوں گی شمشیر اور.....“ اس نے دروازے میں راستہ روکے کھڑے عاصم کو دیکھا۔ ”کیا میں جاسکتی ہوں؟“

”اوہ ہاں۔“ وہ ایک طرف ہو گیا۔ ”میں آرہا ہوں۔“ زینب مڑ کر دیکھے بغیر سیدھی چلتی چلی گئی۔
 گھر پہنچ کر وہ کچھ دیر صوفے پر ساکت بیٹھی رہی۔ سوچیں اس کے دماغ پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ عاصم جعفری اور نور جہاں دو سوالیہ نشان سے اس کے ذہن کی اسکرین پر چمک رہے تھے۔

”وہ کیا کرے مگر کیا کچھ کرنا اس کے ہاتھ میں ہے بھی؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”اگر نہیں تو جو کرنا ہے اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔“

اسے دوسرا اسٹوری بورڈ مکمل کرنا تھا۔ ٹپس اور بیانات کو اس کے ساتھ ملانا تھا اور سب سے پہلے پیٹ پوجا کرنی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب ڈور بیل بجی۔

”سوری زینب، میں جلدی نکل ہی نہیں پایا۔“ یہ عاصم تھے۔ ”مگر وعدہ نبھانا ضروری تھا۔“

”شکریہ۔“ وہ مسکرائی۔ ”آئیے آپ کو چائے پلاتے ہیں۔ کیسی رہی تقریب؟“

”ویسے ہی نارمل، بس صدر صاحب نے نور جہاں کو فون کیا تھا۔ تم سناؤ پروگرام کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟“

”ٹھیک..... مگر نبیلہ اور مسز جمال کے بیانات اسے الجھا سکتے ہیں۔“ اس نے عاصم کو نبیلہ کے حوالے سے پریپل کی فون کال اور مسز شائستہ جمال کے خط کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ ”میں نبیلہ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے عباسی سے کہا بھی تھا کہ اسے اس پروگرام میں شامل نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ دونوں معاملات میڈم کے لیے مسائل کھڑے کریں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس موقع پر اسے ہر اختلاف سے بچنا چاہیے وہ خود بہت ڈسٹرب ہے۔ پارٹی میں تو سب نارمل تھا مگر جب سب چلے گئے تو وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔“

”یعنی آپ سب کے جانے کے بعد ہی آئے ہیں۔“
 ”نور جہاں نے بہت اصرار کیا تھا۔“ وہ سادگی سے بولے۔
 ”اوکے۔“ زینب کا دل ڈوب رہا تھا یعنی وہ جو کچھ سوچ

عباسی نے جب سے یہ بتایا تھا کہ دعوت کا کھانا خود نور جہاں نے تیار کیا ہے تو زینب اس کے کچن میں کام کرتے ہوئے شائس لینا چاہ رہی تھی۔ نور جہاں کو سب کے اصرار پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ مختلف سین شوٹ کرتے رہے تھے، چھ بجے کے قریب پہلے مہمان کی آمد ہوئی۔ یہ ایک پرانے ریٹائرڈ بیورو کریٹ تھے۔

”کیا حال ہے میڈم وائس پریذیڈنٹ صاحبہ؟“ وہ مسکرائے۔

”آپ کے منہ میں گھی شکر۔“ وہ ہنسی۔ ”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔“

عاصم ساڑھے چھ بجے آئے۔ میڈم خود ان کا استقبال کرنے باہر تک آئی تھی۔ عباسی کیمرامین کو ان کی فوجی کے لیے ہدایات دے رہا تھا۔ زینب کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ نور جہاں نے جھک کر کچھ کہا اور پھر دونوں زور سے منے لگے۔

”بہترین شاٹ مس زینب۔“ کیمرامین زینب کو دیکھ کر بولا۔ ”میڈم نور جہاں اس طرح ہر ایک سے نہیں ملتی، لوگ ایسے شاٹ پسند کریں گے۔“
 ”یقیناً۔“ وہ بولی۔

”بس اب بہت ہو گیا زینب۔“ عباسی نے ان کی جانب آتے ہوئے اعلان کیا۔ ”کافی ریکارڈنگ ہو گئی۔ تم کل صبح ساری ٹپس میڈم کے دفتر لے آنا پھر دیکھیں گے کہ کیا باقی ہے۔“ یہ گویا خدا حافظ تھا۔ زینب مہمانوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ہال وے اور پھر دروازے کے قریب موجود کمرے تک پہنچی جہاں اس کا سامان موجود تھا۔

”ارے زینب..... کیا حال ہے، کیا تم جا رہی ہو؟“
 عاصم جعفری شاید اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا تھا۔ ”پارٹی تو ابھی ٹھیک سے شروع بھی نہیں ہوئی۔“
 ”مجھے کسی نے مدعو نہیں کیا ہے۔“
 ”اوہ..... تم گھر جا رہی ہو؟“

”ہاں، کیوں؟“ اس نے ایک ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں پھر ہم ڈنر پر چلیں گے۔“
 ”شاید دعوت اتنی جلد ختم نہیں ہوگی۔“
 ”مگر میں آجاؤں گا کیونکہ میں یہی چاہتا ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

”مس زینب، اگر چاہی دیں تو میں آپ کی کار باہر نکال لاؤں۔“ شمشیر نہ جانے کب خاموشی سے وہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔

رہی تھی وہ سچ تھا۔

”تم ان دونوں کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ نبیلہ شاہد کے معاملے کو میں دیکھتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اس کی ضمانت ہو جائے پھر کیس کو کوئی اچھا وکیل سنبھال سکتا ہے۔ جہاں تک مسز جمال کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایک بات اور..... کہیں وہی تو تمہیں دھمکیاں نہیں دے رہی تھی؟“

”نہیں وہ کسی سردی آواز تھی۔“ زینب نے جواب دیا۔
”اوکے، کوئی دھمکی وغیرہ؟“

”نہیں۔“ زینب نے اسے گڑیا کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اب بتانا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں تم بھی بہت تھک گئی ہوگی۔“ وہ کپ ٹیبل پر رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ کو کچھ اور بھی بتانا ہے۔“ زینب نے سر دلچے میں کہا۔ ”آج میڈم کے گھر سے واپسی اور بعد میں بھی میں نے بہت سوچا ہے۔ کراچی آتے ہوئے میرے ذہن میں تین مقصد تھے ایک تو میں ایک مشہور اور کامیاب عورت کی زندگی پر ایک اچھوتی اور زبردست ڈاکیومنٹری بنانا چاہتی تھی۔ دوسرے میں جاننا چاہتی تھی کہ اس گھر میں کیا ہوا تھا؟ بابا نے میری ماما اور میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا؟ اور جو آوازیں اور خواب مجھے تنگ کرتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور تیسرے.....“ زینب ایک لمحے کو خاموش ہوئی اور پھر بولی۔ ”میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید آپ کو بھی میرا انتظار ہو مگر ہوا کیا؟ ان تینوں میں سے کوئی بھی مقصد پورا نہیں ہو پایا۔ میڈم نور جہاں ایک کامیاب سیاست دان اور بزنس وومن ہیں مگر ان کی ذاتی زندگی میں بہت تضاد ہے جس سے مجھے خوف آ رہا ہے۔ مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری ماں بھی فرشتہ نہیں تھیں اور اس رات شاید ان کا اتنا ہی قصور تھا جتنا کہ بابا کا..... اس سے آگے میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور جہاں تک ہمارا معاملہ ہے مجھے آپ سے معذرت کرنی چاہیے۔ میں یہ سمجھتی رہی کہ شاید میں آپ کے لیے ایک عام تعلق سے زیادہ اہمیت رکھتی ہوں مگر اب میں حقیقت کو سمجھ گئی ہوں اور آپ کو میرے جذبات کی وجہ سے کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔ آنکھیں کھولنے پر صاف نظر آ رہا ہے کہ آپ اور میڈم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے زینب۔“
”ہو سکتا ہے کہ آپ ابھی سمجھ نہ ہوں مگر ایسا ہی ہے۔ میڈم آپ کو پسند کرتی ہیں آپ بھی تو اپنا پروگرام بدل کر کام

چھوڑ کر ان کی دعوت میں شرکت کے لیے واپس آئے ہیں۔

آپ میری فکر نہ کریں۔“
”میں فکر نہیں کر رہا ہوں احقر خاتون صرف سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولے۔

”ایسا ہی ہے شاید ان کی فکر میں ہی آپ میرا اتنا خیال رکھ رہے ہیں تاکہ ڈاکیومنٹری میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

”اب یہ برداشت سے باہر ہے۔“ عاصم کا چہرہ غصے اور برداشت کرنے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”اس عزت افزائی کا بے حد شکریہ زینب۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے چھ بجے میڈم نور جہاں اپنے دفتر کی جانب جا رہی تھی۔ شمشیر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا، وہ کافی خوش نظر آ رہی تھی۔

”سربراہ نے مجھے فون کیا میں خوش ہوں، بہت خوش۔ پہلی نائب سربراہ بننا کوئی معمولی بات نہیں ہے بس اب صرف ایک مسئلہ ہے کاش میں عباسی اور تمہاری باتوں میں آکر اس پروگرام کے چکر میں نہ پھنستی۔“

”مگر اب تک تو اس سے فائدہ ہی ہوا ہے۔ ایوارڈ والی تصویر آپ کے لیے اچھی ثابت ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ زینب کا تجزیہ درست ہی ہو۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اس زینب علی احمد میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے ڈسٹرب کر دیتی ہے اس کی وجہ سے میں ایک ہفتے میں دوبار میڈیا میں پریشانیوں کا شکار بنی ہوں۔ وہ واقعی مسئلہ ہے تم لکھ لو۔“

گاڑی دفتر پہنچ چکی تھی۔ شمشیر نے اتر کر میڈم کے لیے دروازہ کھولا اور بولا۔ ”تور، پریشان مت ہو۔ میں ہوں نا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں اس پر پوری نظر رکھوں گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ اوپر میڈم کے دفتر میں زینب کمرائین کے ساتھ اسٹوری بورڈ پر کام کر رہی تھی۔

”میں چاہتی ہوں کہ میڈم سب سے پہلے خالی دفتر میں داخل ہوتی نظر آئیں اور کام شروع کر دیں۔ بعد میں سفردائیں دن بھر کاشیڈول بتائیں پھر خطوط، ای میل چیک کرتے ہوئے اور ملاقاتیوں وغیرہ کو دکھائیں گے۔“

جب نور جہاں اوپر پہنچی تو زینب نے اسے سین سمجھایا۔ وہ پھر دروازے کے باہر چلی گئی۔ کمرارول ہونے پر آغاز دفتر کے لاک میں میڈم کی چابی کے گھومنے سے ہوا تھا۔ وہ نہایت پراعتماد نظر آ رہی تھی۔

”زبردست میڈم۔“ زینب نے اسے داد دی۔

بلبلہ پا

”اب.....؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زینب نے اسے بقیہ سین سمجھائے اور کام شروع ہو گیا تھا۔ زینب اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی صلاحیتوں کی مداح تھی مگر یہاں اتنا کچھ دکھاوا تھا کہ حقیقت اور شو مین شپ کا فرق کہیں کم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میڈم نور جہاں ساڑھے دس بجے تک شوٹنگ سے فارغ ہو کر دفتر سے باہر نکل آئی تھی۔

”مجھے ناشتا کرنا ہے تم میریٹ چلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ شمشیر نے جواب دیا۔ وہ جاتا تھا کہ نور جہاں خاص وہاں کیوں جا رہی ہے۔ عاصم جعفری اکثر وہاں کافی کے لیے جایا کرتا تھا۔ نور جہاں کے اندر جانے کے بعد شمشیر اخبار لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ بریکنگ نیوز کے جھماکوں اور مسلسل چلتے والے نیوز چینلز کی بھیڑ میں بھی اخبار پڑھنے کا مزہ الگ ہی ہوتا ہے۔ فوری طور پر اس کی نظر آریانہ محمود کے کالم پر پڑی۔ اس نے اس کی سرخی پڑھی پھر گویا اسے اس بات پر یقین نہیں آیا، اس نے دوبارہ اسے پڑھا۔

”سردار احمد شیرازی کا موت کا گھبراہٹ کا گھبراہٹ کا مرکز۔ اس بار میڈم نور جہاں مرکزی کردار..... تفصیلات کے مطابق زینب علی احمد جو ٹیلی وژن کی مقبول نیوز انکر ہیں وہ آج کل مسز نور جہاں کی ڈاکیومنٹری پر کام کر رہی ہیں اور اس حوالے سے مسلسل دھمکیوں کا شکار ہیں۔ زینب جس گھر میں رہ رہی ہیں وہ پچیس سال پہلے شہر کی مشہور و مقبول ترین شخصیت سردار احمد شیرازی اور ان کی بیوی کے قتل اور خودکشی کی واردات کی وجہ سے خبروں میں گرم رہا تھا۔“

اس کے بعد اس ٹریجڈی کی تفصیل تھی۔ کالم نگار نے حال ہی میں اس علاقے میں ایک سابق بیورو کریٹ کے گھر ہونے والی دعوت میں موجود لوگوں کے حوالے سے بتایا کہ شیرازی نہایت مقبول تھے۔ عورتیں ان کی پرستار تھیں اور شاید اسی وجہ سے ثنا انتہائی حسد کا شکار تھیں۔ کیا یہ سب اس حادثے کی وجہ بنا تھا۔ قتل کس کا ہوا تھا اور خودکشی کس نے کی اور نفی پٹی رباب پر اتنا شدید تشدد ان دونوں میں سے کس نے کیا یہ ایک معمہ ہے۔

اس کے آگے نور جہاں کے بارے میں تفصیلات تھیں جس کا اختتام اس طرح کیا گیا تھا۔

”نور جہاں اب اس آرگنائزیشن کی پہلی نائب سربراہ بنیں گی مگر آج کا اہم سوال یہ ہے کہ کون ان سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے پروگرام بنانے والی کو موت کی دھمکیاں

دے رہا ہے۔“

اس طویل مضمون کے ساتھ کافی تصاویر بھی تھیں جس میں میڈم نور جہاں، اس کے شوہر شہریار احمد، سردار احمد شیرازی اور ان کی اہلیہ ثنا موجود تھیں۔ شمشیر نے اخبار کو ہاتھ میں سمجھ لیا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ وہ بڑبڑایا پھر اخبار کو سیدھا کر کے رکھ لیا۔ اسے گھر جاتے ہی یہ سب نور جہاں کو دکھانا تھا۔ سامنے سے نور جہاں اور عاصم جعفری کو آتا دیکھ کر وہ الرٹ ہو گیا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ گھر کی طرف جا رہے تھے۔

”عاصم بہت خاص ہے۔“ کچھ دیر بعد نور جہاں نے سکوت توڑا تھا۔ ”پتا نہیں کیوں اسے مل کر مجھے احمد کی یاد آتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے بعد صرف عاصم اور میرے درمیان ہی کچھ ہو سکتا ہے وہ مجھے اپنا دوسرا موقع لگتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ اس کے چہرے پر خوشی دکھ رہی تھی۔

شمشیر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ اس کی یہ ساری امید اور اعتماد توڑنے والا تھا۔

☆☆☆

زینب گھر پہنچنے کے بعد سے لائبریری میں تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایک کاغذ لکھا رکھا تھا جس پر اس نے نبیلہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سارے ٹکڑوں کو ذہن میں جوڑ رہی تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے کہا تھا کہ وہ خاموش طبیعت کی لڑکی ہے۔ اسے اپنی جاب سے محبت تھی۔ پینٹنگ کلاسیز۔ ایک لڑکی جو عرصے بعد مطمئن زندگی گزار رہی تھی وہ رقم کیوں چرائے گی۔ وہ بھی وہ رقم جو اس کے پاس ہی رکھوائی گئی تھی اور جس کی چوری چھپنے والی بات نہیں تھی۔ کوئی احقر ہی اپنے ہی اسٹور میں چرائی ہوئی رقم کا کچھ حصہ بھی رکھے گا اور باقی رقم..... ہاں لاکھ روپے کہاں گئے جو آج تک نہیں ملے؟

اس نے دوسرے کاغذ پر شمشیر لکھا۔ وہ گواہ تھا جس نے نبیلہ کے بیان کو غلط ثابت کیا۔ نبیلہ نے کہا کہ اس نے اسے سیف کھولنے کو کہا تھا جبکہ وہ اور خود نور جہاں کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت اس کے ساتھ تھا۔ اسے شمشیر کے متعلق لوگوں کے بیانات یاد آئے جوئے میں ہارنا پھر نور جہاں کی ملازمت، ٹھوڑوں پر پیسا ہارنا۔ مراد شاہ کے جملے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بچاتے آئے ہیں۔

نہ جانے حقیقت کیا تھی، کون جھوٹ بول رہا تھا مگر اس کا دل اور چھٹی حس دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اگر نبیلہ کو جیل جانا پڑا تو وہ اسے ضرور بچائے گی۔

☆☆☆

ڈورنٹل مسلسل بج رہی تھی دروازے پر سارہ وسیم کو دیکھ کر زینب مسکرا دی۔
”پلیز آئیے، میں لائبریری میں تھی۔ آئیے وہیں چلتے ہیں۔“

کرسی پر بیٹھنے کے بعد سارہ نے ہاتھ میں پکڑا اخبار اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ کالم کی سرخی پڑھتے ہی زینب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”اوہ یہ کیا ہو گیا..... یہ کسی طوفان سے کم نہیں ہوگا۔ سب بے حد پریشان ہوں گے۔ پروگرام سے ایک دن پہلے اس سب کا اخبار میں آنا یوں لگتا ہے کہ غیر مرئی طاقتیں میرے پیچھے لگی ہیں۔“ وہ انتہائی پریشان ہوئی تھی۔

”میں سمجھ سکتی ہوں مگر اس کا تمہارے علم میں آنا ضروری تھا۔ یہ اس روز شام کو دعوت میں موجود تھی اور وہیں شاید اسے یہ خیال آیا ہوگا..... نہیں زینب اسے پورا پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے اخبار لیتے ہوئے بولی۔ ”اس میں اس رات کی تفصیلات بھی ہیں اور کوئی بھی خود کو تڑی مڑی گڑیا کے روپ میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔“

”تڑی مڑی گڑیا..... یہ آپ نے کیوں کہا؟“ وہ ایک لمحے کو اخبار بھی بھول گئی۔

”یہ اخبار میں لکھا ہے نا اس وقت پولیس چیف صدیقی نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی کا سب سے تکلیف دہ منظر تھا وہ چھوٹی سی پیاری سی لڑکی کسی تڑی مڑی گڑیا کی طرح زمین پر پڑی تھی، اس کے پٹے خون سے تر تھے اور اس کی ٹانگ اس کے جسم کے نیچے دبئی ہوئی تھی۔ اس تکلیف سے تو بہتر تھا کہ اسے بھی گولی مار دی جاتی۔“

”اوہ اس کا مطلب ہے کہ جو اسے یہاں چھوڑ گیا وہ مجھے جانتا ہے۔“ زینب بڑبڑائی۔

”کیا..... کون کیا چھوڑ گیا؟ زینب تم ٹھیک تو ہو، خود کو سنبھالو پلیز۔“ سارہ گھبرا گئی۔

”میں ٹھیک ہوں سارہ جی۔ اس رات جب کوئی میرے گھر میں گھسا تھا اس نے صرف خط نہیں چھوڑا تھا بلکہ ایک تڑی مڑی گڑیا بھی تھی جو میں نے پولیس کے آنے سے پہلے لائبریری میں رکھ دی تھی۔ میں آپ کو دکھاتی ہوں۔“ وہ میز کے نیچے سے کارڈ نکالتے ہوئے بولی۔ چند لمحوں بعد اس کا چہرہ فح ہو گیا تھا۔ اس نے کارڈ کا سارا سامان باہر نکال لیا تھا۔ ”اب وہ یہاں نہیں ہے، اس روز شمشیر آیا تھا کہیں وہ ہی تو نہیں مگر وہ تو ایک لمحے بھی اکیلا نہیں رہا۔“
”تمہیں یقین ہے؟“

”ہاں میں نے اسے خود یہاں رکھا تھا۔ اس کا اپن اتر گیا تھا وہ میں نے اس دراز میں ڈالا تھا۔“ وہ دوڑ کر ڈیوائس کے پاس گئی۔ گڑیا کا اپن موجود تھا۔ اس پر خون کے دھبے بھی موجود تھے۔

”ہمیں فوراً پولیس کو بلانا چاہیے۔“
”نہیں، آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ میڈم اس معاملے کو کس طرح لیں گی مگر میں کسی اور کو بتاؤں گی۔ وہ اس معاملے میں ضرور کچھ کر سکتا ہے آپ پریشان نہ ہوں۔“ وہ کافی دیر بعد مسکرائی۔ ”یہ سب اس پروگرام کو روکنے کے لیے ہے شاید مگر اب تو سب ہو چکا ہے صرف اختتامی سین باقی ہے اور پروگرام کل رات نشر ہو جائے گا۔“

”تم میرے پاس رہ سکتی ہو۔“ سارہ نے کہا۔
”نہیں مجھے اس معے کو حل کرنا ہے اور اب لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی سراں ہی جائے گا۔“

زینب کے گھر سے واپسی پر سارہ پہلے سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ صرف ایک ہی مدد کر سکتی تھی، زینب کے گھر کی نگرانی سوا اس نے کھڑکی کے سامنے اپنی کرسی رکھ لی۔

☆☆☆

صائمہ کافی دیر سے کرسی پر بیٹھی اپنی گڑیا کو دیکھ رہی تھی، اس کے ذہن میں خیالات کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ذہنی امراض کے اسپتال میں اس کی ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے بارے میں جیسا محسوس کرتی ہے ویسی تصویر بنائے مگر وہ نہیں بنائی تھی پھر اس نے اسے یہ گڑیا لا کر دی تھی۔

”اگر تم یہ گڑیا ہوتیں تو تم کیسی لگتیں.....؟“ اس نے اسے مار کر دیتے ہوئے کہا تھا۔ صائمہ نے گڑیا کے مسکراتے ہونٹوں کو نیچے کی جانب موڑ کر اسے روتا ہوا بنا دیا اور اس کی آنکھوں کے نیچے گرتے ہوئے آنسو بنا دیے تھے۔

اس دن سے یہ گڑیا اس کی دوست بن گئی تھی، مشکل حالات میں، اسپتال کے بستر پر عجیب و غریب آوازوں کے درمیان وہ اسے سینے سے لگائے بغیر سو نہیں پاتی تھی۔

”ہماری مشکلات پھر شروع ہو گئی ہیں۔“ وہ گڑیا سے سرگوشی میں بولی۔ ”مگر اس بار ہم ڈریں گے نہیں..... ہم سچ بولیں گے..... ٹھیک ہے نا۔“

نور جہاں کی ڈائیکو سنٹری نشر ہونا تھی۔ اس کے تعارفی پرومو میں نبیلہ شاہد کیس کا ذکر موجود تھا۔ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آذر اسے ایسا نہیں کرنے دے گا مگر اب وہ اس کے لیے مزید پریشانیوں کا سبب نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ پہلے ہی اس کے لیے بہت کچھ کر چکا تھا۔

وہ دونوں ان دنوں کتنے خوش تھے۔ وہ نئی نئی کراچی آئی تھی، نور جہاں کے دفتر میں اپنی ملازمت اسے پسند تھی۔ بینکنگ کی شام کی کلاسز میں داخلہ اس کے خوابوں کی تعبیر سے کم نہیں تھا۔ وہیں اس کی ملاقات آذر سے ہوئی تھی۔ یہ گویا پہلی نظر میں محبت والا معاملہ تھا خود اسے اس سب پر یقین آتے آتے بہر حال کچھ وقت لگا تھا، مگر آذر نے تو اسی وقت سے اپنی زندگی اس کے نام کر دی تھی انہوں نے تین ماہ میں منگنی بھی کر لی تھی۔ اسے صرف اپنی پرنسپل میڈم کی آمد کا انتظار تھا، ان کی ملک واپسی کے بعد وہ دونوں شادی کرنے والے تھے کہ اچانک فنڈ کی چوری کا معاملہ کھڑا ہو گیا۔ شمشیر اور نور جہاں کی گواہی اور پھر تین لاکھ روپوں کے اس کے اسٹور سے برآمد ہونے، نے اس سے اس کی زندگی چھین لی..... ایک بار پھر کچھ کیے بغیر وہ چور قرار دے دی گئی تھی۔ جیل میں شدید مایوسی اسے نروس بریک ڈاؤن تک لے گئی اور پھر وہ اسپتال..... اس نے جھرجھری سی لی۔ ایسے وقت میں بھی آذر نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور پھر ایک دن وہ اسے اسپتال سے لے آیا۔ اس وقت وہ بہت بری حالت میں تھی، ان دونوں نے کورٹ میرج کی۔ آذر نے اس کا نام بدل کر صائمہ رکھ دیا تھا تا کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ اس کی محبت ہی اسے زندگی میں واپس لائی تھی۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ اسپتال میں اسٹاف کو منہ مائی قیمت دینے کے لیے اس نے اپنا آبائی مکان فروخت کر دیا تھا۔ قانون کی نظروں میں وہ ایک مغرور مجرم تھی۔ اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے آذر نے اپنا شوق، پیشہ اور سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اسے ایک بار پھر اس امتحان سے گزرنے نہیں دے گی۔ اس نے مضبوطی سے سوچا۔

”آذر..... کاش میں اپنا وعدہ پورا کر پاتی مگر میں مجبور ہوں پلیز مجھے معاف کر دینا۔“ وہ بڑبڑائی ”میں تم سے کیا گیا وعدہ تو نہیں نبھاسکی مگر میڈم سے کیا ہوا وعدہ بہر حال پورا کر سکتی ہوں۔ انہوں نے کچھ بھی کرنے سے پہلے زینب علی احمد سے بات کرنے کو کہا تھا اور اس کا نمبر بھی دیا تھا۔“ اس نے نمبر نکالا اور زینب کو کال کر کے اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا۔ زینب نے نامحانہ تقریر کے بعد اسے قریبی ریسٹورنٹ میں بلایا تھا۔ گھر سے نکلے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سوٹ کیس تھا جس میں اس کا کچھ سامان اور گڑیا وغیرہ رکھے ہوئے تھے، وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

زینب وقت سے چند لمحے پہلے ہی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئی تھی۔ وہ مسلسل ایسا کوئی طریقہ سوچ رہی تھی جس سے وہ

نبیلہ یا صائمہ کو فوری طور پر پولیس کے پاس جانے سے روک سکے۔ عاصم جعفری سے اس کا رابطہ نہیں ہو پایا تھا اور اب وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ نہ جانے وہ اپنی تصویر سے کتنی بدل چکی ہوگی اور وہ اسے پہچانے کی کیسے مگر جب وہ اندر داخل ہوئی تو اسے اس کو پہچاننے میں بالکل مشکل نہیں ہوئی وہ زیادہ نہیں بدلی تھی۔ اس نے اٹھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو تنگ کر رہی ہوں۔“ وہ اپنی نرم و نازک آواز میں بولی۔

”بالکل نہیں نبیلہ یا صائمہ جو تم پسند کرو۔ پلیز میری بات غور سے سنو تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تم غائب ہوئیں تو ذہنی طور پر سخت پریشان تھیں۔ کوئی بھی اچھا وکیل بہ آسانی تمہاری ضمانت منظور کروالے گا مگر ہمیں اس کے لیے وقت چاہیے۔“

”ایک وقت تھا جب یہ الفاظ میرا سب سے بڑا خوف تھے مگر اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اگر ایسا نہ بھی ہوا تب بھی میں ہر چیز کا سامنا کروں گی اور ہر وقت ڈرنا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے زینب اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سزا بھگتنے کے بعد بھی مجھے ساری زندگی اپنی بے گناہی ثابت کرنی پڑے گی۔“

”کیا اس رقم کا کچھ حصہ تمہارے اسٹور روم سے نہیں ملا تھا؟“

”پورے آفس کو اسٹور روم کا پتا تھا جب میں نے فلیٹ بدلاتی میرا کچھ اضافی سامان وہاں رکھا گیا تھا اور آفس کے لوگوں نے ہی لا کر رکھا تھا۔ کچھ رقم وہاں سے ملی تھی مگر پچاس لاکھ روپے کسی اور کی جیب میں گئے تھے۔“

”تم نے کہا تھا کہ شمشیر نے تمہیں فون کیا تھا، وہ کہتا ہے نہیں کیا تھا؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی نے آواز بدل کر بات کی ہو؟“ زینب نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے..... ایک جملہ ہی کہا تھا اس نے کہ میں شمشیر بول رہا ہوں دیکھو شاید میڈم کی ہیرے کی انگوٹھی سیف میں رہ گئی ہے اگر ہو تو بتا دو۔ زینب، اصل میں میرا کیس کمزور تھا رقم نہیں ملی تھی۔ اگر میڈم بار بار سب کو یہ نہ بتاتیں کہ میں پہلے بھی ایک بار شاپ لفٹنگ کے چکر میں جیل جا چکی ہوں تو مجھے شک کا فائدہ مل جاتا مگر..... اور میری زندگی کے گیارہ سال تباہ ہو گئے۔ اس جرم کے نتیجے میں جو میں نے نہیں کیا مگر اب میں ایک دن بھی نہیں رکوں گی۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی جھک کر سوٹ کیس اٹھایا اور بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت سب سے مشکل اور تکلیف دہ بات کیا ہے..... میں اس شخص سے کیا ہوا وعدہ توڑ رہی ہوں جس نے مجھے جینے کا سہارا

دیا۔ آخری بات یہ کہ میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں۔ پتا ہے جب مجھے اس پروگرام کی خبر ملی تو میں بہت پریشان ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگر میری ایک تصویر بھی آن اڑ گئی تو اگلے چوبیس گھنٹوں میں، میں جیل میں ہوں گی مگر کیا تم مانو گی کہ اس سوچ نے ہی مجھے احساس دلایا کہ میں چھپ چھپ کر بھاگ بھاگ کر کتنا تھک گئی ہوں۔ یہ تم تھیں جس نے مجھے سچ کا سامنا کرنے کی ہمت دی ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ مجھے اپنے حوصلے ٹوٹنے سے پہلے اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

زینب بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

”نور..... نور اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شمشیر نے اتنے سالوں کے تعلق میں میڈم کو اس طرح روتے ہوئے چند ہی بار دیکھا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ زینب علی احمد اس گھر میں رہ رہی ہے؟“

”مجھے ڈرتا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی۔“

”مگر وہ وہاں کیسے رہ سکتی ہے؟“

”پچھلے پچیس برسوں میں وہ گھر بارہ لوگ کرایے پر لے چکے ہیں اب وہ رہ رہی ہے اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے؟“

”اور اخبار میں چھپی تصویریں، اس میں وہ تصویر بھی شامل ہے۔ چھوٹی ہی سہی مگر اگر کسی نے غور سے دیکھا..... وہ پھر وہاں ہی ہوگی۔“

”کوئی کیوں دیکھے گا کس کے پاس اتنا وقت ہے۔ اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے اور لوگوں کے حافظے مختصر.....“

”شمشیر دعا کرو کچھ غلط نہ ہو، کچھ بھی غلط نہ ہو۔“

”کچھ غلط نہیں ہوگا۔ میں ہونے نہیں دوں گا نور۔“

”اوکے۔“ وہ مسکرائی۔

کچھ دیر وہ دونوں باتیں کرتے رہے پھر نور جہاں سونے چلی گئی اور شمشیر ٹھٹھا ہوا کورڈور میں باہر آ گیا۔ بیرونی میز پر نور جہاں کی ڈاک رکھی تھی۔ شمشیر نے اس کی چھانی شروع کر دی۔ معمول کے خطوط، اشتہارات، میگزینز، لوگوں کی شکایات کے بنڈل۔ جب ہی اس کی نظر اس لفافے پر پڑی جس پر ہاتھ سے پتا لکھا گیا تھا۔ اس میں نور جہاں کے لیے ایک ذاتی خط تھا۔ لفافے پر بھی ذاتی تحریر تھا۔ شمشیر نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ لفافے کی پشت پر بھیجے والے کا نام دہتا تحریر تھا۔ نام دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ خط شائستہ جمال نے

میڈم کو بھیجا تھا۔

☆☆☆

عاصم جعفری اس وقت انر سٹیفٹی بورڈ کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ زینب کے جیلے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پائلٹ جمال کی بیوہ شائستہ کے مطابق نور جہاں اور شہر یار میں طلاق ہو چکی تھی۔ اگرچہ اسے ذاتی طور پر اس بات پر یقین نہیں تھا مگر اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے اس حادثے کی مکمل رپورٹ نکلوائی تھی اور اس وقت وہ ریٹائرڈ میجر انوار راشد کے پاس اس رپورٹ کو دیکھنے اور اس پر گفتگو کرنے آیا تھا۔

میجر انوار ایک بھاری بھر کم شخص تھا۔ عاصم سے بہت گرم جوشی سے ملا تھا۔

”آپ کو معلوم ہے یہاں روزانہ بہت سے پرائیویٹ جہاز آتے ہیں ان میں بھی کبھار ہی کوئی گرتا ہے اور وجوہات عموماً قدرتی ہوتی ہیں۔ ایسے میں جب کوئی جہاز جس کی حالت اے ون سے بھی بہترین ہو اور جس کا پائلٹ اپنے کام کا چیتا تصور کیا جاتا ہو وہ اچھے موسم میں اچانک کسی پہاڑ پر گر جائے تو یہ خبر سارے محکمے کا بلڈ پریش بڑھادی ہے، اسے کوئی بھول نہیں سکتا۔“

”یعنی شہر یار کے جہاز میں کوئی خرابی.....“

”ہرگز نہیں تھی۔“ وہ عاصم کے جیلے کو کاٹ کر بولا۔

”پھر کیا ہوا تھا؟“

”یہ کوئی نہیں جانتا جب پائلٹ نے کراچی چھوڑا تو سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ ایک نارمل فلائٹ تھی اور پھر پنڈی سے پندرہ میل کے فاصلے پر یہ حادثہ ہو گیا۔“

”مگر الزام تو پائلٹ پر لگایا گیا تھا۔“

”عموماً جب کچھ نہیں ملتا تو پائلٹ کی غلطی قرار دے دی جاتی ہے۔ اس کیس میں نور جہاں نے ہی سارا الزام پائلٹ کے سر پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے شوہر کو پہلے سے پائلٹ سے کئی شکایات تھیں۔ کسی نے اس وقت اس کی تردید نہیں کی تھی مگر ظاہر ہے کہ اگر شہر یار کو شکایات ہوتیں تو وہ اس پائلٹ کے ساتھ ہی کیوں جاتا؟ اور نمبر دو بات یہ کہ جمال ایک بہترین پائلٹ تھا پھر جہاز کوئی مٹی بس تو ہوتا نہیں کہ ڈرائیور چھلانگ لگا کر فرار ہو جائے، جہاز میں حادثے کا مطلب یعنی موت ہی ہوتی ہے اور یہ وہ بھی جانتا تھا۔“

”آپ کو کوئی اور گزرب نظر آتی ہے؟“ عاصم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ظاہر ہے تحقیقات تو ہوئی تھیں مگر کچھ ثابت نہیں ہوا۔ امکانات یہ ہو سکتے ہیں کہ اگر کوئی جہاز کے جزیئر میں گڑبڑ

کر دے، کوئی تار ڈھلا کر دے تو فلائٹ کے دوران بجلی مکمل طور پر بند ہو سکتی ہے یا کچھ ایریا یا کسی سیٹ کے نیچے اگر کوروسیو اینڈ کا ہلکے ہلکے اخراج والا کنٹینر رکھ دیا جائے تو وہ آدھے گھنٹے میں اپنا اثر دکھادے گا اور پھر جہاز پر کوئی بھی قابو پانے والا نہیں رہے گا۔ مسئلہ یہ تھا کہ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا اس لیے اس حوالے سے تحقیقات کا پیہ صرف امکانات پر ہی رک کر رہ گیا تھا پھر ہم نے مقصد کی جانب نظر کی کہ اگر کسی نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو کیوں؟ پائلٹ کا انشورنس بہت معمولی سا تھا اور شہر یار کا انشورنس تھا ہی نہیں۔ ویسے ان کے پاس اتنا پیسا تھا کہ انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔“

”اوکے، کیا پائلٹ جمال کم تجربے کا یا غیر محتاط شخص تھے؟“ عاصم نے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں، میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ بہترین پائلٹ تھا۔“

☆☆☆

زینب نے چار میں دس کم پر عاصم کو فون کیا۔ گزشتہ رات کے بھٹکڑے کے حوالے سے کوئی گفتگو کیے بغیر اس نے انہیں نبیلہ شاہد سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔

”میں اسے روک نہیں پائی، اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔“

”اچھا..... تم پریشان مت ہو میں ایک وکیل کو اس کے لیے بھیجتا ہوں، تم ابھی کہاں جا رہی ہو؟“

”اسٹوڈیو..... آپ نے کل کا اخبار دیکھا۔ اس میں ایک پورا صفحہ اس پروگرام، بابا، میرے اور اس گھر کے بارے میں چھپا ہے؟“ اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔

”زینب پلیز اسٹوڈیو سے فارغ ہو کر میری طرف آ جانا ہم یہ سب ڈسکس کریں گے۔“

اسٹوڈیو میں عباسی اس کا منتظر تھا۔ زینب کو یقین تھا کہ اس کا موڈ بہت خراب ہوگا مگر بظاہر وہ بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔

”میں نے ساری فونچر دیکھ لی ہیں تمہیں دفتر میں چند سین اور لینے چاہیے تھے باقی سب بہترین ہے اور زینب کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ تم نے اخبار میں یہ سب کیوں چھپوایا ہے؟“ بالآخر بی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔

”میں نے کیا اور کیوں کیا ہے؟“ اس نے عباسی کو گھورا۔

”ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے خوش فہم لوگ بھی ہوں جو ایک ہی ہفتے میں میڈم نور جہاں کے حوالے سے مسلسل آنے والی خبروں کو اتفاق سمجھتے ہوں مگر میں اتفاقات کا اتنا قائل نہیں ہوں۔“ وہ کاٹ دار لہجے میں بولا۔

”میں نور جہاں سے متفق ہوں۔“ وہ کاٹ دار لہجے میں بولا۔

ہوں تم پہلے دن سے ہمیں اس پروگرام کو اپنے انداز میں کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہو اور تم نے ذاتی شہرت کے حصول کی ہر تدبیر آزمائی ہے۔“

”اگر آپ کو اسی بات پر یقین ہے تو نکال دیجیے مجھے نوکری سے۔“ اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔

”تا کہ تم مزید خبروں میں آ جاؤ۔ میں یہ نہیں کروں گا اور ایک بات میں تم سے اور پوچھنا چاہتا ہوں، اس دفتر میں تمہاری آمد کے پہلے روز میں نے تم سے کہا تھا کہ اس پروگرام میں سردار احمد شیرازی کا ذکر یا تصویر نہیں آئے گی تب کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ تم جس گھر میں رہ رہی ہو وہ ان کی ملکیت تھا؟“

”معلوم تھا۔“

”پھر بھی تم نے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”میں نے ضروری نہیں سمجھا میں کہاں رہتی ہوں اس کا میرے کام سے کیا تعلق ہے۔ باقی میں نے کسی جگہ ان کا نام یا تصویر نہیں آنے دی اور خود آپ نے کہا تھا کہ میں نے اپنا کام بہترین انداز میں کیا ہے۔“

”اور وہ دھمکیاں..... اگر تم کرتیں یا نہ کرتیں یہ پروگرام تو چینل کا ہی ہوتا نا پھر وہ دھمکیاں تمہیں ہی کیوں مل رہی تھیں؟“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم، وہ جو کوئی بھی ہے شاید یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا پروگرام ہے اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ یہ تو صرف میڈم نور جہاں کو نائب سربراہ بننے میں مدد دینے کی مہم کا ایک حصہ ہے اور بس۔“

”کیا تم طنز کر رہی ہو مجھ پر؟“

”نہیں میں سچ بول رہی ہوں۔ اب اندازہ ہو رہا ہے مجھے کہ یہ سب کس قدر جلد اور تیز ہوا۔ مجھے نوکری کی آفر، یہاں پہنچنے کی جلدی پھر آپ کا اور نور جہاں کا مجھے ڈھیروں میٹریل بھجوانا تا کہ مجھے سب ویسا ہی نظر آئے جیسا آپ لوگ چاہتے ہیں۔ اس میں اگر کچھ حقیقت ہے تو وہ میری سخت محنت کا نتیجہ ہے۔ میری حتی الامکان کوشش یہی ہے کہ پروگرام میڈم کے لیے اچھے نتائج لائے مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس کے بارے میں، میں پروگرام کے بعد کام کروں گی۔“

”ادوہ کیا ہے؟“ عباسی نے میز پر جھک کر پوچھا۔

”نبیلہ شاہد..... میں اس سے آج ملی تھی۔ اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بے قصور ہے اور میں اس کے مقدمے پر کام کروں گی۔“

”وہ جھوٹی ہے اور اس کے علاوہ.....“

”شائستہ جمال..... پائلٹ جمال کی بیوہ۔ اگر اس نے

بیان دیا تو میڈم کا امیج بکھر جائے گا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ عباسی بولا۔ ”بہر حال میں آج شام اختتامی سین فلم بند کرنے میڈم کے گھر جاؤں گا تم فی الحال اس سے بالکل دور رہنا اور ہاں، کیا تم نے ہمارے نیٹ ورک کے ساتھ اپنا معاہدہ غور سے پڑھا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”پھر تمہیں علم ہوگا کہ۔۔۔ چند ماہ کی تنخواہ کی ایڈوانس ادا کی گئی کے عوض اسے کسی بھی وقت ختم کیا جاسکتا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے تمہاری اس دھمکیوں والی کہانی پر بالکل یقین نہیں ہے۔ ویسے اس پروگرام سے میڈم سے زیادہ تم نے نام کمالیا ہے۔“

”اور اگر آپ نے معاہدہ پڑھا ہے۔“ زینب نے ارادی طور پر دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا، وہ چاہتی تھی کہ نیوز روم میں موجود تمام افراد تک اس کی آواز پہنچے۔ اسی معاہدے کی رو سے آپ مجھے اس پروگرام کا کریڈیٹ کنٹرول دینے کے پابند تھے۔ کیا آپ نے اسے پورا کیا؟“ وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے نکلتی چلی گئی۔

میں منٹ بعد وہ عاصم جعفری کے اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ اس کا چہرہ اب بھی غصے سے سرخ ہو رہا تھا مگر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”خوش آمدید۔“ عاصم اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”کیا واقعی باہر بہت گرمی ہے؟“ وہ اس کا تہمتا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

”نہیں اس سے زیادہ عباسی کا دماغ خراب ہے۔“

”چلو اچھی خبر ہے یہ، کم از کم ہے تو اس کے پاس۔ مجھے تو اس میں بھی شک تھا۔ ویسے وہ بہت شاطر آدمی ہے۔ اپنے فائدے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے، ہوا کیا ہے؟“

”اس کا خیال ہے کہ میں اس پروگرام سے ذاتی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”نور جہاں بھی کچھ ایسا ہی سوچتی ہے۔“

”اور وہ جو سوچتی ہیں وہ سب سے پہلے آپ کو معلوم ہوتا ہے۔ کل رات کے بعد مجھے اس طرح اور اتنی جلدی آپ کو فون نہیں کرنا چاہیے تھا شاید مگر مجھے نبیلہ کے لیے تیز ترین اور بہترین مدد چاہیے تھی۔ عباسی کچھ نہیں کرتا اس لیے مجھے افسوس ہے مگر آپ اس کام کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔“

”ویسے جو تمہید آپ نے بیان کی وہ میرے مزاج پر خاصی گراں گزری ہے پھر بھی آپ نے خدمت کے لائق سمجھا، بندہ شکر گزار ہے۔“ وہ مسخرے انداز میں بولا۔ زینب اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آج وہ ایک بالکل مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔

”عاصم اس کے علاوہ بھی ایک مسئلہ ہے۔“ زینب نے اسے کپڑے والی گڑیا کی موجودگی اور پھر غائب ہوجانے کی تفصیل جس حد تک ممکن ہوا اختصار کے ساتھ سنا دی۔

”اوہ، اب تم وہاں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں جاؤ گی۔“

”بات میرے جانے کی نہیں ہے۔ اگر وہ شخص صرف مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تو پہنچا چکا ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ شخص پروگرام کے حوالے سے خوفزدہ ہے۔“ اس نے جلدی جلدی نبیلہ شاہد اور شمشیر کے حوالے سے اپنا تجربہ بیان کیا۔ ”دیکھئے کوئی ایک جھوٹ بول رہا ہے یا تو نبیلہ یا شمشیر یا پھر کسی نے شمشیر کی آواز میں نبیلہ کو فون کیا۔“

”پھر اس گڑیا اور دھمکیوں کو کہاں فٹ کرو گی؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ شخص مجھے میرے بچپن میں اور اس حادثے کے حوالے سے دیکھ چکا ہے۔ اب وہ اس طرح مجھے ڈرا کر بھگانا چاہتا ہے۔ شمشیر اس گھر اور اس بچی کے بارے میں سب جانتا ہے۔ میں شمشیر کے بارے میں سب جانتا چاہتی ہوں، کیا یہ ہو سکتا ہے؟“

”بالکل ہو سکتا ہے اور میں کروں گا۔“ وہ بولا۔ ”میں بھی تمہیں ایک بات سچ سچ بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں بہت مس کیا ہے۔“

”کل رات سے؟“ زینب نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”نہیں چار سالوں سے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ ”تم نے کل جو کہا وہ سب سچ ہو سکتا ہے سوائے ایک بات کے۔۔۔۔۔ میڈم نور جہاں اور میرے درمیان کچھ نہیں ہے اور۔۔۔۔۔ اور یہ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر مجھے کچھ وقت چاہیے۔“

”وہ مجھے بھی چاہیے۔ ابھی تو مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اس رات کے حادثے میں ماما بھی کافی ڈرے دار تھیں۔ اس پروگرام کے آن ائر جانے کے بعد میں اس حوالے سے معاملات سلجھانا چاہوں گی۔“ اس نے عاصم کی ڈنر کی دعوت کو ملتوی کر دیا۔ ”آج میں بہت تھک گئی ہوں اور کل بہت مصروفیت ہے اس لیے میں جلدی سو جاؤں گی۔“

دروازے سے نکلتے نکلتے عاصم نے مسکراہٹ دبا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یاد رکھنا جب میں ستر سال کا ہوں گا تو تم اڑتالیس سال کی ہو گی۔“

”اور جب آپ 103 سال کے ہوں گے تو میں بیاسی سال کی ہوں گی مگر اس سارے حساب کتاب سے پہلے شمشیر یا نبیلہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہو مجھے فوراً فون کر دیجیے گا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

آؤر سکتے کی سی حالت میں بیٹھا صائمہ کا خط پڑھ رہا تھا۔ اسے گھر سے گئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے یقیناً اب تک وہ پولیس کے پاس جا چکی ہوگی۔ اس نے اس کا نمبر ملایا۔۔۔۔۔ مگر فون بند آ رہا تھا۔

”اف میرے خدا۔۔۔۔۔ یہ کیا کر دیا صائمہ تم نے۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا رہا تھا۔ صائمہ کو اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ وہ صائمہ کو کیسے تلاش کرے گا۔۔۔۔۔؟ وہ کہاں ہوگی؟ اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا؟ اس سوچ نے اسے پاگل سا کر دیا تھا۔ صائمہ نے اس سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا تھا۔ ”نہیں“ اس نے سوچا، وہ مجبور ہو گئی ہوگی۔ اسے یقین تھا کہ اس پروگرام میں اس کی تصویر دکھا دی جائے گی۔۔۔۔۔ اور وہ اسے آنے والی پریشانیوں سے بچانا چاہتی تھی اسی لیے اس نے یہ فیصلہ کیا مگر۔۔۔۔۔ کیا وہ یہ سب برداشت کر پائے گی۔۔۔۔۔؟ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑا۔

”زینب۔۔۔۔۔ یہ سب زینب کا کیا دھرا ہے۔“ اس نے شروع میں ہی اسے منع کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ اسے معاف نہیں کر سکتا، اس سب کی وہ بی ذمہ دار ہے وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ یہ بی انصاف کا تقاضا ہے اسے وہ اپنے ہاتھوں سے ختم کرے گا۔۔۔۔۔ موت کے اسی گھر میں۔۔۔۔۔ ہاں زینب علی احمد کو اپنے انجام تک پہنچنا ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”جلدی کرو۔“ عباسی کیمرا میں پر غرایا۔ وہ اس وقت میڈم نور جہاں کے ڈرائنگ روم میں میڈم کی واپسی کا آخری سین فلم بند کر رہے تھے۔ شمشیر بھی وہاں موجود تھا۔

”میڈم ہم نکل رہے ہیں بس یہی ایک سین تھا۔ کل اسٹوڈیو میں ایک سین ہوگا اور کام ختم۔ صدر صاحب کل پریس کانفرنس کر رہے ہیں کیا آپ وہاں موجود ہوں گی؟“

”ہاں مجھے بلایا گیا ہے۔“ وہ تقاضے سے بولی۔

”زبردست، ہماری ٹائمنگ بہترین ہے۔ سات بجے ہمارا پروگرام شروع ہوگا اور نو بجے پریس کانفرنس ہوگی۔“

”عباسی میں بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”اوکے، سوری ہم نکل رہے ہیں صبح ملاقات ہوگی۔“

”یہ ایک منٹ اور رکنا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا۔“ ان کے جانے کے بعد وہ صوفے سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ”اب مجھے یہ سب بہت غیر ضروری لگ رہا ہے۔“

”یہ غیر ضروری نہیں ہے نور، اس سے تمہاری اہمیت میں

اضافہ ہوگا۔“ شمشیر بولا۔ ”تمہیں اب مجھ سے کوئی کام تو نہیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں آج جلدی سونا چاہتی ہوں تم کہاں جا رہے ہو؟ کوئی نئی دوست یا نیا کیسینو؟“ وہ مسکرائی۔ شمشیر جواب میں بالکل خاموش رہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس رات بابا نے اسے ہمیشہ کی طرح اوپر اپنے بیڈ روم میں جانے کو کہا تھا۔ ماما اور بابا میں روز کی طرح بحث ہوئی تھی پھر ڈور تیل بجنے کی آواز آئی۔ تیل بجے چلی جا رہی تھی۔ ہاؤس کیپر جا چکی تھی پھر اندر کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ بابا کی غصہ بھری آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ چپکے سے اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی درمیانی لینڈنگ سے نیچے جھانک رہی تھی۔ اندر آنے والا اوپر کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، وہ اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی پھر۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا؟ سوچیں اس کے ذہن پر ایک بار پھر دھند کی طرح چھا رہی تھیں۔

”اوہ میرے خدا۔“ زینب نے دونوں ہاتھ سے سر تھام لیا پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ ٹھنڈے شاور نے اسے کافی سکون بخشتا تھا۔ بالوں کو ڈرائر سے سکھا کر وہ چند لمحے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی رہی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر آپ اپنی پیشانی پر ایک تصوراتی نقطہ بنالیں اور پھر اسے گھورتے رہیں تو آپ خود کو ہٹا کر دیکھ سکتے ہیں اور اپنے ماضی میں جاسکتے ہیں۔ وہ چند لمحے تصوراتی نقطہ کو گھورتی رہی۔ اسے کسی سرنگ میں اُلٹے قدموں تیزی سے پیچھے کی طرف جانے جیسا احساس ہونے لگا تو وہ کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کیوں مگر آج اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گھر میں اکیلی نہیں ہے۔ خدا جانے یہ سارے عجیب و غریب خیالات و احساسات میرے پاس ہی کیوں آتے ہیں۔ اس نے سر جھٹکا۔

”خالی دماغ شیطان کا گھر زینب بی بی چلو کچھ کھاپی لو اور لگو اپنے کام سے۔“ اس نے خود کو گھر کا آلیٹ، نوٹ اور کافی اس کا ڈنر تھا۔ ڈنر کے بعد اسے اخبار کے اس مضمون کو غور سے پڑھنا تھا۔ شاید اس میں سردار شیرازی اور ثنا شیرازی کے بارے میں کوئی نئی بات ہو۔

اخبار لاہریری میں موجود تھا۔ زینب نے پورا مضمون پڑھا اس کے ساتھ کافی تصاویر لگائی گئی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے دو بڑی تصویروں کے درمیان موجود ایک تصویر نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ وہ ساحل سمندر پر بیٹھی گئی تصویر تھی جس میں بابا، ماما، میڈم نور جہاں اور دو اور لوگ موجود تھے۔ ماما

ایک کتاب پڑھ رہی تھیں دیگر دونوں افراد بڑی چیز پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ نور جہاں اور بابا ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے کے تاثرات ان کے جذبات کی خبر دیتے تھے۔ زینب نے میز کی دراز سے محراب عدسہ نکالا اور تصویر کو دوبارہ دیکھا۔ اب سب خاصا واضح تھا۔ نور جہاں کسی معمول کی طرح بابا کو دیکھ رہی تھی۔ بابا کی نظروں میں اس کے لیے پیار تھا۔ ان دونوں نے پتھر کی ہلکی سی آڑ میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ زینب غور سے تصویر کو دیکھتی رہی پھر اس نے اخبار کو تھک کر رکھ دیا۔

”اس تصویر کا مطلب کیا ہے؟“ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ماضی کے پنڈورا بکس سے ہر لمحہ نئی کہانی برآمد ہو رہی تھی۔ بابا..... نور جہاں..... ممما..... وہ تیزی سے لائبریری سے باہر نکل آئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کئی بھوت اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ وہ اوپر بیڈ روم کی سمت جانے کے لیے بڑھی ہی تھی کہ عاصم کی کال آگئی۔

”انہوں نے نبیلہ شاہد کو فوری ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مگر ایک دو دن میں ضمانت ہو جائے گی۔“

”اوہ..... میں اسے جیل میں نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”زینب ہم نے اس کے لیے بہترین ویل کیا ہے جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بتاؤ سب کچھ ٹھیک ہے وہاں؟“

”ہاں اور میں نے ڈبل لاک لگا دیا ہے۔“

”گڈ..... ویسے کل ہی یہ ٹینشن ختم ہو جائے گی۔ ہم دونوں اس الجھن سے باہر آئیں گے، سکون کا سانس لیں گے اور سالوں کے دکھڑے شیئ گے اور سنائیں گے..... میں نے یوں بھی بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔“

”آپ کا معافی نامہ قبول کیا جاتا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”شکریہ..... اور اب ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔“ زینب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے میٹکی ہوئی تھیں۔ عاصم کی آواز بھی آج نئی محسوس ہو رہی تھی۔ پراعتاد اور خوش۔ فون بند کرتے ہوئے اس کا ذہن اسی آواز کے خمار میں جٹا تھا۔ اچانک ایک کھٹکے نے اسے چونکا دیا۔

”یہاں کوئی ہے؟“ وہ چند لمحے کسی ہرنی کے مانند چونکنا کھڑی رہی پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ ”اب مجھے سو جانا چاہیے کل نہایت مصروف دن ہے اور اگر کچھ سوچنا ضروری بھی ہو تو بے کار سوچوں کے بجائے عاصم کے بارے میں سوچتے ہیں۔“ مگر نیند کی آغوش میں جاتے جاتے بھی اس کا ذہن الجھتا رہا تھا۔

☆☆☆

شانستہ جمال نے ایک آسودہ سانس لے کر بوتیک کے بیرونی دروازے کو بند کیا اور برابر میں بنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی۔ آج اس کی بہترین سیل ہوئی تھی۔ ہفتے میں ایک دو دن بہت اچھے گزرتے تھے اور آج اس کے لیے وہی دن تھا۔ اس کا پرانا قادیان سیکو اس کے ساتھ تھا۔ یہ ایک بھاری بھر کم جرمن شیفرڈ تھا۔ یہ اسے پچھارٹی کچن میں داخل ہوئی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ اگلے ہفتے کمال آنے والا تھا، اس کا پریموشن بھی ہوا تھا اور وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اب نور جہاں کا کوئی جھوٹا اور فضول بیان اسے شرمندہ کرے اسی لیے اس نے نور جہاں کو ایک خط لکھا تھا۔ نہ جانے اس نے اس خط کو پڑھ کر کیا سوچا ہوگا۔ اس نے وہ خط کئی بار سوچنے کے بعد لکھا تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے پروگرام میں اس بات کا اظہار کریں کہ آپ کے شوہر کے جہاز کے حادثے میں پائلٹ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ آپ پر میرا اور جمال کا قرض ہے اور آپ اس بات کو بخوبی سمجھتی ہیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گی تو میں آپ پر ہنگ عزت کا دعویٰ کروں گی اور آپ کے شوہر شہر یار کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت کو منظر عام پر لے آؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اس فلاٹ پر جانے سے پہلے آپ کو طلاق دے چکا تھا اور کاغذات اس کی واپسی پر تیار ہونے تھے۔“

دس بجے کی خبروں کے بعد سیکوا چھلنے لگا تھا یہ اس کی روز کی واک کا وقت تھا۔

”ہاں، ہاں معلوم ہے مگر میں بہت تھک گئی ہوں آج صرف ایک چکر ہی ملے گا۔“ ان کی عمارت کے دائیں جانب بنے فٹ پاتھ اور پارک تک وہ روز واک کرتے تھے۔ سیکو معمول کے مطابق فٹ پاتھ کے ساتھ بنی باڑھ اور پودوں سے کھیل رہا تھا۔ یلکھت وہ ساکت سا ہو گیا۔ اس کے جڑے تن گئے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں غرا رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی دشمن موجود ہو۔

”کیا ہوا سیکو؟“ شانستہ اس کی طرف بڑھی مگر اگلی لمحہ اس کے لیے حیرت اور خوف کا شدید دھچکا لے کر آیا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے سے ایک بڑا سا ہاتھ نمودار ہوا تھا جس نے سیکو کی گردن پکڑ لی تھی۔ چند ہی لمحوں میں تڑاک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ بے حس و حرکت ہو کر زمین پر گر پڑا۔ شانستہ صدمے کے شدید اثر کی وجہ سے ہلنے بھی نہیں پاری تھی۔ وہ چیخا چاہتی تھی مگر اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل پائی۔ وہ بڑا سا ہاتھ جس نے سیکو کو زندگی سے محروم کر دیا تھا اب اس کے سر کی طرف بڑھا اور موت سے چند لمحے قبل شانستہ

جمال بخوبی سمجھ گئی تھی کہ سالوں پہلے آخر کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

عاصم جعفری کی آنکھ معمول کے مطابق صبح سات بجے کھل گئی تھی۔ وہ رات ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ اس کا ذہن شہر یار کے طیارے کے حادثے کی رپورٹ میں الجھا ہوا تھا۔ ناشتے کی میز پر اس نے اس رپورٹ کو دوبارہ پڑھا۔ رپورٹ کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر اشفاق خان کا نام چمک رہا تھا۔ وہ ایف آئی اے کے ڈائریکٹر تھے اور عاصم کے پرانے دوست بھی۔ کل شام ہی اس نے انہیں شمشیر ملک کے بارے میں فوری اور تفصیلی رپورٹ تیار کرنے کی درخواست کی تھی۔

”ہیلو۔“

”جناب آپ کی مطلوبہ رپورٹ گیارہ بجے تک میرے پاس آجائے گی۔“

”کیا ہم مل سکتے ہیں؟ میں بھی تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں نہیں، اگر ممکن ہو تو آپ تشریف لے آئیے۔“

عاصم، اشفاق خان کو جو دکھانا چاہتا تھا وہ اس رپورٹ میں ہی موجود تھا۔ اس رپورٹ کے اختتام سے پہلے ہی وہ جملہ سے بار بار ڈسٹرب کر رہا تھا۔

”شہر یار صاحب کے شو فر شمشیر ملک نے جہاز میں سامان رکھا تھا۔“ وہ شمشیر پر مکمل رپورٹ پڑھنے کے بعد اس حوالے سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

اشفاق خان کا فون بند کرنے کے بعد عاصم نے ایڈووکیٹ تنویر اعجاز کا نمبر ملایا جسے اس نے نبیلہ شاہد کا وکیل مقرر کیا تھا۔ اس نے اسے بھی اشفاق خان کے دفتر میں اس ملاقات میں مدعو کر لیا اور اس سے نبیلہ شاہد کے کیس کے کاغذات ساتھ لانے کو کہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ٹیلی وژن آن کیا۔ صبح کی کافی کے ساتھ خبریں سننا اس کی عادت تھی۔

ہیڈ لائنز نکل چکی تھیں خبروں کی تفصیلات جاری تھیں۔ اس دوران بریکنگ نیوز کے جھماکے ہوئے اور پھر نیوز کاسٹرز نے اپنے بیجانی انداز میں خبر کو دوبارہ شروع کیا۔

”طارق روڈ کے قریبی علاقے میں ایک خاتون بیگم شانستہ جمال کی لاش دریافت ہوئی ہے وہ ایک مشہور بوتیک چلاتی تھیں۔ ان کے شوہر پائلٹ تھے جو مشہور سیاست داں شہر یار احمد کے ساتھ ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔“

”لاش.....!“ عاصم ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ وہ نور جہاں کے خلاف ایک زبردست انکیئرل شروع کرنے ہی والی تھی اور اب وہ مر چکی تھی۔ اس کا دماغ اسے اتفاق یا طبعی موت سمجھنے سے انکاری تھا۔ وہ پورا گھٹنا عجیب کشش میں گزرا تھا۔

☆☆☆

صبح ساڑھے نو بجے نبیلہ شاہد کو چیف انکیئر نے طلب کیا تھا۔ وہ رات حیران کن حد تک بھرپور نیند سوئی تھی اور اس وقت بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ میٹرن اسے چیف انکیئر کے کمرے میں لے گئی۔ وہاں دونوں انکیئر بھی موجود تھے۔ نبیلہ ان دونوں کی شکر گزار تھی۔ اس کے سب کچھ بتا کر خود کو پولیس کے حوالے کر دینے کے بعد سے کسی نے اس کے ساتھ تفصیل آمیز رویہ اختیار نہیں کیا تھا حتیٰ کہ جب اس نے ڈرتے ڈرتے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنی گڑیا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے تب بھی کسی نے اسے پاگل نہیں گردانا تھا۔ اس کے پیچھے تنویر اعجاز بھی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس مہربان وکیل کو کل بھی بتا چکی تھی کہ اس کے پاس اس کی فیس ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے مگر اس نے شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے فکر نہ کرنے کو کہا تھا۔

”دنیا یلکھت کتنی اچھی لگ رہی تھی شاید یہ سچ کی طاقت ہے۔“ اس نے سوچا۔

وہ سب کے سب ایک میز کے گرد بیٹھے تھے چیف انکیئر نے پہلے اس سے اس کی عمر، تعلیم کے بارے میں عام سوالات کیے تھے پھر آخر وہ اس سوال پر آگئے تھے جس کا اسے انتظار تھا۔

”کیا تم نے حقیقت میں کبھی چوری کی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے زور دے کر کہا۔

”وہ پر فیوم کی بوتل بھی نہیں جس کی وجہ سے تمہیں پہلی بار جیل جانا پڑا تھا؟“

”نہیں سر میں نے چوری نہیں کی تھی۔ میں بے دھیانی میں اسے اٹھا لے گئی تھی۔“

”کیا تم نے میڈم نور جہاں کے انتخابی فنڈ کے چھپن لاکھ روپے چرائے تھے؟“

”نہیں۔“

”ان میں سے چار لاکھ تم نے اپنے اسٹور میں چھپائے تھے۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“

”تم نے کہا تھا کہ شمشیر ملک کے فون کی وجہ سے تم نے

اس شام سیف کھولا تھا، کیا یہ سچ تھا؟

”جی ہاں۔“
”جہیں یقین ہے کہ وہ شمشیر ملک کی کال تھی؟“
”آواز بالکل اس جیسی ہی تھی اور اس نے کہا تھا کہ میں شمشیر بول رہا ہوں۔“

وہ ان سوالوں کی منتظر تھی مگر اس کے بعد جو سوال انکسٹر نے کیا وہ اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔
”کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چوری خود شمشیر نے کی ہو؟“

☆☆☆

زینب ساڑھے نو بجے اسٹوڈیو پہنچ گئی تھی مگر پھر اس نے کیفے ٹیریا جا کر کافی پینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس وقت خود کو اسٹوڈیو میں موجود متوقع ٹیشن کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں پارہی تھی۔ صبح صبح ٹیلی وژن پر شائستہ جمال کے قتل کی خبر نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہستی مسکراتی، عزم و حوصلے سے پُر خوب صورت عورت ایسے اچانک مر گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شائستہ کا مسکراتا چہرہ آ گیا۔ وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی اس کی کافی میز پر رکھی تھی مگر اب اس کا دل کچھ بیٹے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سیٹ پر عباسی خود موجود تھا۔ ہر چیز پر اس کی نظر تھی۔ زینب کو دیکھ کر اس نے اسے اپنے پاس بلا کر کہا۔
”شکر ہے تم پہنچ گئیں میں تمہیں ابھی کال کرنے ہی والا تھا۔ تم نے پائلٹ کی بیوی والی خبر پڑھ لی؟ کام بڑھ گیا ہے، ہمیں پائلٹ کے بارے میں میڈم کے بیان کی دوبارہ ریکارڈنگ کرنی پڑے گی۔“

زینب خاموش کھڑی اس کی بات سنتی رہی۔ شائستہ جمال ایک نفیس اور زندہ دل عورت تھی اور اس شخص کو صرف اپنے کام کے بڑھ جانے کی فکر ہے۔ اس کی موت سے اسے ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ یہ کیسی بے حس ہے۔ اس نے سوچا اور پھر ایک لفظ کہے بغیر ڈریسنگ روم کی طرف چل دی۔

ڈریسنگ روم میں میڈم نور جہاں بھی موجود تھی۔ وہ زینب کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ چھوٹے جہازوں اور ایئر سیفٹی رولز کے حوالے سے زیادہ سخت الفاظ استعمال نہیں کیے جائیں گے اور میں اپنی ماں کے بارے میں زیادہ گفتگو چاہوں گی۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے نا؟“

”جی۔“ زینب سر ہلا کر رہ گئی۔

چار گھنٹے بعد پریڈکشن روم میں کچھ لوگ پروگرام کی مکمل ٹیپ دیکھ رہے تھے۔ نور جہاں پہلی رو میں بیٹھی تھی۔ عباسی اور صفدر اس کے ساتھ تھے۔ زینب دور درجے بیٹھی تھی

جبکہ شمشیر آخری قطار میں بیٹھا تھا۔ پروگرام کا آغاز زینب کے خوش آمدید سے ہوا تھا۔ وہ میڈم نور جہاں اور عباسی ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ زینب کو اپنی آواز قدرے بھاری سی محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ یقینی طور پر ذہنی دباؤ تھا۔ عباسی بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ نور جہاں کا نیلا لباس اسکرین پر بہت فخر رہا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے نور جہاں کے کام اور قانون سازی کی کاوشوں پر بات کی پھر گفتگو کا رخ میڈم کے بچپن اور ملتان میں ان کی رہائش اور خاندان کی طرف مڑ گیا۔

”میری ماں بیوہ تھیں، انہوں نے میری پرورش کے دوران ان تمام مشکلات کا سامنا کیا جو دیگر کام کرنے والی ماؤں کو درپیش ہوتی ہیں۔ میں اپنے باپ کے انتقال کے وقت صرف چھ سال کی تھی۔ انہوں نے میری خاطر اپنے ہونٹ میجنٹ کے کیرئیر کو چھوڑ کر ہاؤس کیپر کی ملازمت کی تاکہ جب میں اسکول سے واپس آؤں تو وہ میرا خیال رکھ سکیں۔ انہیں اپنے وزن کا بہت احساس تھا مگر اس کی وجہ ان کی گلینڈز اور ہارمون کی تکلیف تھی میں اور شہر پار انہیں اپنے ساتھ کراچی لانا چاہتے تھے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ ان کے مطابق ”پہاڑ کراچی میں نہیں رہ پائے گا۔“ وہ اسی طرح ہستی رہتی تھیں، یہاں آ کر اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس موقع پر اس کی ایوارڈ والی تصویر کا شاٹ بھی دکھایا گیا اور نور جہاں نے آنسو بھری آواز میں بتایا کہ اس نے یہ ایوارڈ اپنی ماں کے لیے جیتا تھا۔ زینب خود کو نور جہاں کے طلسم میں گھرا پارہی تھی یہ درحقیقت غضب کی ادا کارہ ہے۔“ اس نے سوچا۔

اس کے بعد ان کی شادی کی کلپس اور شہر یار کے بارے میں اس کی گفتگو تھی۔ سیاست میں آمد اور شوہر کے الیکشن کے لیے سخت محنت اور پھر ہوائی حادثہ، نور جہاں نے ایئر سیفٹی رولز کے بارے میں اپنا موقف دہرایا مگر اس بار اس کے الفاظ نرم تھے اور اس نے پائلٹ کا نام نہیں لیا تھا۔ کئی سین دن کو چھو لینے والے بھی تھے جن میں ایک بوڑھی عورت کے بروقت ٹرسنگ روم میں داخلے کی کوشش، ایک جوان عورت کا بیان کہ اس کے بچوں کو نور جہاں نے اپنے خرچ پر اسکول بھیجا۔ اس سب کے بعد عباسی کے سوالات جن کے جواب میں نبیلہ شاہ کا ذکر بھی آیا تھا۔ اسکرین پر اس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ اس کی گرفتاری کے حوالے سے نور جہاں نے کہا تھا کہ اب اسے کم از کم پکی ہوئی رقم واپس کر دینی چاہیے۔ پروگرام کا اختتام نور جہاں کے شام ڈھلے گھر واپسی پر ہوا تھا۔ اختتامی کلمات زینب کی آواز میں تھے۔

”اور اب رات گئے تک میڈم قانون سازی کے

موسموں پر کام کریں گی۔ ان کی زندگی، ان کا کام اور عوام کی خدمت ہے۔۔۔۔۔ شکر یہ نور جہاں۔“

اس کے ساتھ اسکرین خالی ہو گئی تھی اور کمرے کی روشنیاں جل اٹھیں۔ نور جہاں نے پلٹ کر شمشیر کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا جس کے بعد نور جہاں نے اوکے کا سگنل دیا تھا۔
”زینب تم میرے بچپن کے حوالے سے درست تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر میں تمہارے کام سے مطمئن ہوں، عباسی تم کیا کہتے ہو؟“

”زبردست۔۔۔۔۔ زینب۔“

زینب مسکرائی۔ وہ سب مطمئن تھے۔ اختتام فنی طور پر بالکل ٹھیک تھا مگر پھر بھی وہ ایک اور سین ریکارڈ کروانا چاہتی تھی۔ احمدی ڈائرینگ والے اس خط کو وہ اس پروگرام میں شامل کرنا چاہتی تھی اور اس پر نور جہاں کا تاثر دیکھنا چاہتی تھی۔
”شکر یہ مگر میں کچھ اور کہنا چاہوں گی۔ اگر ہم اس کا اختتام کام کے حوالے سے نہ کریں تو یہ مزید بہترین ہو سکتا ہے۔“ نور جہاں نے جواب میں ابرو اٹھا کر زینب کو گھورا۔ شمشیر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ کمرے کا ماحول یکدم تناؤ کا شکار ہو گیا۔

”میڈم آپ نے میئریل کا جو باکس مجھے آخر میں شمشیر جی کے ساتھ بھجوا یا تھا اس میں مجھے ایک خط ملا تھا جو میرے حساب سے اس پروگرام کا بہترین اختتام ہو سکتا ہے۔ آپ یقینی طور پر وہ خط ریکارڈنگ سے پہلے پڑھ سکتی ہیں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے ابھی مت پڑھیں تاکہ ریکارڈنگ کے دوران آپ کے حقیقی تاثرات سامنے آئیں اور پھر اگر آپ لوگ پسند نہیں کریں گے تو ہم پہلے والے اختتام سے کام چلا لیں گے۔“

”کیا تم نے وہ خط پڑھا ہے؟“ نور جہاں نے عباسی کی طرف دیکھا۔
”ہاں اور میں زینب سے متفق ہوں مگر ہم یہ اسی صورت میں کریں گے اگر آپ نے اسے پسند کیا۔“

”جو میئریل زینب کو بھجوا یا گیا تھا وہ تم دونوں نے تیار کیا تھا؟“ اب وہ شمشیر اور صفدر کی جانب مڑی۔ ان کا جواب اثبات میں تھا جس کے بعد وہ بھی میئریل ریکارڈنگ کے لیے تیار ہو گئی مگر اس کی آنکھیں اس کی الجھن کا پتا دے رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ سب پھر سیٹ پر تھے۔ ریکارڈنگ عباسی کے جملوں سے شروع ہوئی تھی۔

”میڈم ہم آپ کے وقت کے بہت شکر گزار ہیں جب

ہم اس پروگرام کی تیاری کر رہے تھے حب ہمیں آپ کا تحریر کردہ ایک خط ملا تھا جو آپ نے اپنے شوہر مقبول رہنما شہر یار احمد شاہ کو لکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خط ایک نوجوان نور جہاں کے جذبات اور آج جو نور جہاں ہمارے سامنے ہیں ان کے حوصلے اور عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ کیا آپ پسند کریں گی کہ زینب آپ کو وہ خط پڑھ کر سنائیں؟“

نور جہاں نے جواباً۔۔۔۔۔ اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کی آنکھیں سوالیہ نشان بنی ہوئی تھیں۔ زینب نے وہ خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔
”احمدی ڈائرینگ۔۔۔۔۔ تم آج دوپہر کی میٹنگ میں بہت زبردست لگ رہے تھے۔ مجھے تم پر فخر ہے میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں احمدی اور تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کی منتظر ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا، تمہارے ساتھ کام کرنا۔۔۔۔۔ اس سے اچھی زندگی کیا ہو سکتی ہے۔ میری جان ہم اس دنیا میں بہت کچھ بدل سکتے ہیں۔۔۔۔۔ بس تمہیں تھوڑی ہمت کرنا ہوگی۔ تمہاری ہمیشہ۔۔۔۔۔ نور جہاں!“

زینب نے خط ختم کر کے عباسی کو کیو دیا تھا۔
”ناظرین یہ خط 13 مئی کو لکھا گیا تھا اور 20 مئی کو شہر یار شاہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد میڈم نور جہاں نے حالات سے ہار نہیں مانی اور اکیلے ہی دنیا بدلنے کی کوشش کا آغاز کر دیا۔۔۔۔۔ میڈم ہم آپ کو سلام کرتے ہیں۔“

”کٹ۔“ ڈائریکٹر کی آواز کے ساتھ سین اوکے ہو گیا تھا۔

”یہ بہت زبردست رہا کیوں میڈم؟“ عباسی، نور جہاں کی طرف مڑا مگر وہ یکدم خاموش ہو گیا تھا۔ نور جہاں کسی طوفان کے مانند زینب پر جھپٹی اور وہ خط اس سے چھین لیا۔
”یہ۔۔۔۔۔ یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ ”تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔؟“

زینب حیرت اور خاموشی سے نور جہاں کے چہرے کو تنک رہی تھی۔

اس دوران شمشیر تقریباً بھاگتا ہوا ان کے قریب آیا۔ اس نے نور جہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور چپٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”نور۔۔۔۔۔ خود کو سنبھالو۔۔۔۔۔ یہ سب بہت بہترین تھا۔ حقیقی معنوں میں بہترین۔ لوگوں کو اگر تمہارے شوہر کے لیے لکھے گئے آخری خط کا علم ہوتا ہے تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟“

”میرا آخری۔۔۔۔۔ خط۔۔۔۔۔؟“ نور جہاں نے ایک

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

آہلہ پا

سورۃ رحمن کی فضیلت

☆ سمندر کے کڑوے (کھارے) پانی کو اللہ پاک میٹھا کر کے اٹھاتا ہے اور بارش کی شکل میں برساتا ہے۔

☆ برف بنا کر پاک کرتا ہے، وہاں سے ندی، نالوں کی صورت میں دریا میں گرتے ہوئے زمینوں کو سیراب کرتا واپس سمندر میں جا گرتا ہے۔

☆ یہی پانی بکری سے دودھ، ہرن سے مشک، کبھی سے شہد، سانپ سے زہر، سیپ سے موتی اور انسان کے لیے زندگی بن جاتا ہے۔

☆ یہی پانی درختوں میں آم، سیب، انار، انگور، ناریل بن جاتا ہے پھر سب کا رنگ، ذائقہ، خوشبو، تاثیر الگ الگ اور جدا۔

☆ یہ سب عجائبات اللہ پاک نے ایک پانی میں رکھے ہیں۔

☆ ”اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈی، اورنگی ٹاؤن کراچی

چار خصلتیں

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ چار خصلتیں ہیں۔

ایک تیرے لیے ہے ایک میرے لیے ہے۔ ایک تیرے اور میرے درمیان ہے اور ایک تیرے اور میرے بندوں کے درمیان ہے۔ ایک جو خاص میرے لیے ہے۔ وہ یہ ہے کہ تو صرف میری عبادت کر کسی کو شریک نہ کر۔ جو تیرا حق مجھ پر ہے۔ وہ یہ کہ تیرے ہر عمل خیر کا بھرپور بدلہ تجھے دوں گا اور جو تیرے اور میرے درمیان ہے۔ وہ یہ ہے کہ تو مجھ سے دعا کر اور میں قبول کیا کروں۔ چوتھی یہ کہ تو ان کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے پسند کرے۔

مرسلہ: زاہد چودھری، چھوڑ کینٹ

”اگر جو ہم سمجھ رہے ہیں یہ سب سچ ہے تو شائستہ جمال کی موت بھی اتفاقاً نہیں ہو سکتی۔ یہ دہشت گردی کی واردات نہیں ہے۔“

”اور اگر یہ ثابت ہو گیا تو شاید میڈم..... نائب سربراہ کے لیے منتخب نہیں ہو سکیں گی۔“ اشفاق نے مزید کہا۔

”اور اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ اگر شمشیر نے یہ سب کیا ہے اور وہ ہی زینب کو حکیماں دے رہا ہے تو پھر میں اس کی طرف سے بے فکر ہو پاؤں گا۔“ عاصم مسکرایا۔

”اور اگر تحقیقات ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انتخابی فنڈ کی چوری کا ذمہ دار بھی وہ ہی ہوگا۔“ ایڈووکیٹ نے کہا۔ ”سچ پوچھیے تو نبیلہ شاہد کو صبح دوران تفتیش دیکھنا بہت افسوس ناک تھا۔ وہ جیل میں زندہ نہیں رہ سکے گی۔ نروس بریک ڈاؤن کے بعد کسی احق ڈاکٹر نے اسے ایک گڑیادی اور کہا تھا کہ جیسا وہ خود کو محسوس کرتی ہے اس پر پینٹ کرے۔ وہ اس گڑیا کو اب بھی ساتھ لیے پھر رہی ہے۔ گڑیا کا روتا ہوا چہرہ اور رنگ سے بنے آنسو دیکھ کر کسی ٹوٹے پھوٹے بچے کا خیال آتا ہے۔“ وہ افسوس سے سر ہلا کر بولا۔

”گڑیا.....؟“ عاصم یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کپڑے کی گڑیا جس پر سرخ پینٹ استعمال کیا گیا ہے؟“ ایڈووکیٹ تویر کے اثبات میں ہلے سر کو دیکھ کر عاصم نے ٹھنڈی سانس لی۔

”پلیز اور کافی منگواؤ اشفاق، زینب کو ملنے والی دھکیوں کے سلسلے میں ہم غلط درخت کھود رہے ہیں شاید۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”ہمیں دوبارہ سے شروع کرنا ہوگا۔“

☆☆☆

”شمشیر اسے وہ خط کہاں سے ملا؟ کہاں سے..... وہ اس سامان میں ہرگز نہیں ہو سکتا جو تم اسے دے کر آئے تھے۔ وہ کیا جانتی ہے؟ کیا کیا کچھ؟ اگر اس نے ثابت کر دیا کہ میں اس رات وہاں تھی..... تو..... تو؟“ وہ انتہائی پریشان تھی۔

”وہ نہیں کر سکتی، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ نور جہاں پلیز پر سکون ہو جاؤ۔ وہ کچھ نہیں جانتی۔ اس نے تو اپنے حساب سے تمہارے لیے بہترین کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خط سے تمہارے لیے عوامی ہمدردی ابھرے گی۔ میرا یقین کرو۔“

شمشیر اسے سمجھا رہا تھا۔ ”اب تم پلیز تھوڑا کچھ کھا لو، آرام کر لو چند گھنٹے بعد تمہیں پریس کانفرنس میں جانا ہے یہ تمہاری زندگی کی اہم ترین رات ہے۔“

وہ اسے پر سکون دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سخت پریشان ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ جب وہ خط

عدم ثبوت کی وجہ سے رہا۔ ملتان، جوئے کا بار چلانے کا الزام، ثبوت نہیں ملا۔ کراچی کا رکویم سے اڑانے کا الزام جس میں سوڈ پر پیسا دینے والے دو افراد ہلاک، ثبوت نہیں ملا۔ کراچی، جوئے کا شوقین، کئی بار قرض کے چکر میں جھکڑے، مشینی معاملات میں انتہائی ہوشیار، کمیکل وغیرہ سے واقفیت۔

واہ..... اس قدر صاف ریکارڈ۔“ عاصم نے طنز یہ انداز میں کہا۔

لچ کی آمد تک وہ شمشیر کے ریکارڈ، نبیلہ کے کیس کی تفصیلات، شہریار کے جہاز کے حادثے اور شائستہ جمال کی موت کے حوالے سے تجربے میں مصروف ہو چکے تھے۔

”شمشیر مشینوں کے معاملے میں غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا اور اس نے پرواز سے چند لمحے پیشتر جہاز میں ایک سوٹ کیس رکھا تھا اور وہ جہاز تباہ ہو گیا تھا۔ شمشیر ایک جواہری تھا اور عین ممکن تھا کہ جس وقت میڈم کا انتخابی فنڈ چوری ہوا وہ قرضے میں ڈوبا ہوا ہو۔“

”یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میڈم اور شمشیر میں امداد باہمی کا معاہدہ ہوا ہو۔“

”نہیں، مجھے نہیں لگتا کہ نور جہاں ایک معصوم لڑکی کو جان بوجھ کر جیل بھیج سکتی ہے یا اپنے شوہر کے قتل میں ملوث ہو سکتی ہے۔“ عاصم جعفری نے سر ہلا کر کہا۔

”عاصم، اس نوکری میں ہمیں انسانی نفسیات کے الگ الگ رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ شمشیر جیسے لوگ اپنے مالک سے انتہائی وفادار ہوتے ہیں وہ ان کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو گرا دیتے ہیں کیونکہ ان کی بھابھی اسی میں ہوتی ہے۔ ذرا سوچو کہ شمشیر کو اس بات کا پتا لگ گیا تھا کہ شہریار نے نور جہاں کو طلاق دے دی ہے اور واپسی پر وہ اسے تحریری شکل میں لے آئے گا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ نور جہاں کو سیاست یا دولت میں سے کچھ نہیں ملتا اور یہ دیکھ کر شمشیر نے یہ فیصلہ کیا ہو۔“

”اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ نور جہاں اس میں شامل تھی؟“

”نہیں، یہ ضروری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں پتا ہی نہ ہو۔ وہ کہہ چکی ہیں کہ راستے میں وہ پیٹرول کے لیے رے کے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران شمشیر نے نبیلہ کو فون کر لیا ہو۔ اس میں وقت ہی کتنا لگا ہوگا مگر اس نے نبیلہ ہی کو کیوں چنا؟“ اشفاق خان نے کہا۔

”اس کا جواب آسان ہے۔“ تویر اعجاز نے کہا۔ ”وہ اس کا ریکارڈ جانتا تھا۔ اس سب کی وجہ سے یہ اوپن اینڈر شٹ کیس بن گیا۔ شمشیر کے بارے میں کسی نے نہ تو تحقیقات کیں اور نہ ہی اس پر شبہ کیا گیا۔“

”ہاں یہ رہی شمشیر کی فیکٹ شیٹ۔“ اشفاق نے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ عاصم نے کاغذ کی طرف دیکھا اور پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

”ملتان کا رجسٹریشن میں ملوث ہونے کا شک، پولیس کے تعاقب کی وجہ سے لوگوں پر کار چڑھا دی۔ تین افراد ہلاک،

ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔ وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔ ”اوہ..... تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اور شہریار ایک دوسرے کو چھوٹے چھوٹے خط لکھتے رہتے تھے۔ زینب میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے یہ گمشدہ خط ڈھونڈ نکالا۔ شاید یہ کسی تصویر کے ساتھ چپک گیا ہوگا۔“ زینب اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

”احمدی ڈار لنگ!“ یہ لفظ کسی ہتھوڑے کے مانند اس کے دماغ پر لگ رہا تھا مگر وہ اپنی الجھن سلجھا نہیں پاری تھی۔

شمشیر کی جھجکتی ہوئی نظریں اسے دوبارہ حقیقت کی دنیا میں لے آئیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا عباسی اور صفدر نور جہاں کو باہر لے جا رہے تھے۔ شمشیر بھی ان کے پیچھے باہر نکل گیا۔ لائسنس ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں مگر زینب کے ذہن پر چھایا دھند لگا اب بھی ویسے کا ویسا ہی تھا۔

☆☆☆

”عاصم، سب سے پہلے تو مجھے یہ تفتیش کرنی ہے یا کہ تمہیں اس شمشیر ملک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا

زیریں خیال آیا کیسے؟“ اشفاق خان نے اس کے سامنے کافی کا گگ رکتے ہوئے پوچھا۔ عاصم جعفری طے شدہ وقت پر اس کے دفتر پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں برسوں پرانے دوست تھے اور ایک دوسرے کی پسند ناپسند سے واقفیت رکھتے تھے۔

”کیوں..... کیا تمہیں کچھ ملا ہے اس کے بارے میں؟“

”کہا جاسکتا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ایڈووکیٹ تویر اعجاز کی آمد کی وجہ سے ان کی گفتگو چند لمحوں کے لیے رکی تھی۔ سلام دعا کے بعد اس نے اپنے بریف کیس سے ایک بڑا سفید لفافہ نکالا۔

”یہ نبیلہ کے کیس کی پوری فائل ہے۔ اس پورے مقدمے کا دار و مدار ایک ہی سوال پر تھا۔ نور جہاں کے اسٹاف میں سے جھوٹ کون بول رہا ہے نبیلہ یا شمشیر؟ سرکاری وکیل نے نبیلہ کے پرفیوم کیس کو اتنا اچھا لایا جیسے وہ سلطانہ ڈاکوہ چکی ہو اور میڈم نور جہاں کا بیان بھی اس کے لیے مددگار نہیں ہو سکا۔

یوں اسے مجرم ٹھہرا دیا گیا۔“ اس نے وہ فائل عاصم کی طرف بڑھا دی اور پڑھنے کی عینک اتار کر سکون سے بیٹھ گیا۔

”اور تمہاری رپورٹ.....؟“ عاصم نے اشفاق کی طرف دیکھا۔

”ہاں یہ رہی شمشیر کی فیکٹ شیٹ۔“ اشفاق نے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ عاصم نے کاغذ کی طرف دیکھا اور پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

”ملتان کا رجسٹریشن میں ملوث ہونے کا شک، پولیس کے تعاقب کی وجہ سے لوگوں پر کار چڑھا دی۔ تین افراد ہلاک،

دیکھتے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔

”نور جہاں مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“
”مگر مجھے میرا پروگرام تو دیکھ لینے دو پلیز۔“ اس نے ایک ادا سے کہا۔

”نہیں! یہ اس سے ضروری ہے۔“ پس منظر میں چلتی ڈاکیومنٹری کے دوران عاصم نے اسے اپنی آمد کی وجہ سے آگاہ کیا، وہ انتہائی حیران نظر آرہی تھی۔

”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ شمشیر نے جمال کی بیوی کو قتل کیا ہے؟ تم پاگل ہو گئے ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ اس کے دو گواہ بھی موجود ہیں جنہوں نے اس کا پورا حلیہ بیان کیا ہے اور یقیناً وہ اسے شناخت بھی کریں گے وجہ وہی خط ہے جو مسز جمال نے تمہیں بھیجا تھا۔“

”کون سا خط؟“ وہ چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے، نور جہاں کا چہرہ پیلا ہو گیا تھا۔

”تمہاری ڈاک شمشیر ہی دیکھتا ہے نا۔۔۔۔۔؟ کل اس نے تمہیں کیا ڈاک دی تھی؟“

”معمول کے مطابق۔۔۔۔۔ اس میں ایسا کوئی خط نہیں تھا، جعفری تم اس پر چھوٹے الزام نہیں لگا سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ ساری پٹی زینب علی احمد نے پڑھائی ہے، وہ شروع سے ہی میرے پیچھے پڑی ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”زینب کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے نور جہاں۔“ عاصم نے جواب دیا، سامنے دیوار پر لگی بڑی ایل سی ڈی اسکرین پر نور جہاں ایئر میٹنی کے حوالے سے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

”تمہارا یہ بیان کل اس عورت کو اخبارات کے پاس بھیج سکتا تھا اور شمشیر یہ جانتا تھا۔ نور جہاں میں سچ سنا چاہتا ہوں صرف سچ۔۔۔۔۔ اور یہ بھی سن لو کہ کافی سچ میں جان چکا ہوں اب تمہارے لیے یہ ہی بہتر ہے کہ تم مکمل سچ بولو۔۔۔۔۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے جعفری، شمشیر کل رات ہمیں اس گھر میں تھا۔ تم یا تمہارے گواہ بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ کہیں اور تھا۔۔۔۔۔ سمجھے تم؟“

”کیوں۔۔۔۔۔ تم اسے کیوں بچانا چاہتی ہو۔ کیا اس لیے کہ وہ یہ سب کچھ تمہیں بچانے کے لیے کر رہا ہے۔ اگر وہ عورت زندہ رہتی تو کل یہ خبر اخباروں میں آ جاتی کہ شہر یار روانہ ہونے سے قبل تمہیں طلاق دے چکا تھا۔ اس کی اس جاند اور کسی بھی چیز پر تمہارا کوئی حق نہیں تھا اور یہ بھی کہ اس کا طیارہ کسی حادثہ کا شکار نہیں ہوا تھا۔۔۔۔۔ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

نور جہاں اپنی جگہ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”اور سنا ہے۔۔۔۔۔ تم سردار احمد شیرازی سے محبت کرتی تھیں، اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔۔۔۔۔ ہے نا؟ اور اس کے گھر میں ہونے والے خونیں حادثے کی وجہ بھی تم ہی تھیں۔۔۔۔۔ عاصم سچ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

نور جہاں اسے چند لمحے دیکھتی رہی پھر وہ تیزی سے کمرے میں موجود الماری کی جانب ہلکی، جب وہ مڑی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پستول نظر آ رہا تھا۔

”تم اپنی حد سے زیادہ جان چکے ہو جعفری۔۔۔۔۔ کیا تم نے کبھی یہ نہیں سنا کہ دوسروں کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔ مارا تھا ہم نے شہر یار کو۔۔۔۔۔ مگر میں کیا کرتی۔۔۔۔۔ خود کو بچانے کے لیے یہ ضروری تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنی ماں کے چکر میں آ گیا تھا اور اس نے مجھے طلاق دے دی تھی۔۔۔۔۔ واپسی پر وہ اس کا اعلان کرنے والا تھا جس کے بعد میرے لیے دنیا میں کچھ نہیں بچتا۔“ اس کا خوب صورت چہرہ غصے کی شدت سے سرخ سا ہو رہا تھا۔
”مگر تم نے غلط کیا نور جہاں اور اب تم پھر غلطی کرنے جا رہی ہو۔۔۔۔۔“

”مجھے افسوس ہے۔۔۔۔۔ احمدی کے بعد تم دوسرے شخص تھے جسے میں نے پسند کیا۔۔۔۔۔ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھا مگر تم بھی مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ میں تمہیں زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتی۔“ وہ غرائی۔

”اس رات سردار احمد شیرازی کے گھر کیا ہوا تھا نور جہاں مرنے سے پہلے اتنا جاننے کا حق تو ہے نا مجھے۔۔۔۔۔؟“

عاصم ہاتھ میں پکڑے موبائل پر آخری آنے والی کال کا منٹن دباتے ہوئے بولا وہ جانتا تھا کہ اشفاق اس کی کال پہلی رنگ پر اٹھا چکا ہوگا۔

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دیوانگی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”احمدی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ شاکو طلاق دے دے گا مگر شاکو نہ جانے کس طرح پہلے ہی اس بات کا علم ہو گیا۔۔۔۔۔ ان دونوں میں خوب جھگڑا ہوا پھر احمدی نے مجھے فون کر کے کہا کہ میں اسے بھول جاؤں۔۔۔۔۔ وہ شاکو اور رباب سے الگ نہیں رہ پائے گا ہم دونوں کو ہی جدا ہونا ہوگا کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو ایک موقع دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اس رات اس سے بات کرنے اس کے گھر گئی تھی۔ شاکو مجھے دیکھ کر غصے میں پھر گئی اور احمدی کا پستول نکال لیا۔ وہ مجھے مارنا چاہتی تھی احمدی اسے روک رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔۔۔۔۔ اس دوران گولی چل گئی جو احمدی کو

گولی۔۔۔۔۔ وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا۔۔۔۔۔
نور جہاں رو پڑی۔

”اور شاکو۔۔۔۔۔ پھر شاکو کس نے مارا۔۔۔۔۔؟“

”میں نے۔۔۔۔۔“ نور جہاں سخت آواز میں بولی۔ ”میں نے اسے مار ڈالا۔۔۔۔۔ احمدی کے گرتے ہی اس نے پستول پھینک دیا اور اسے جھنجھوڑنے لگی، میں نے اسی پستول سے اس کے پیٹ میں گولی اتار دی، وہ میری خوشیوں کی قاتل تھی، اس کا یہ ہی انجام ہونا چاہیے تھا۔“

”اور رباب۔۔۔۔۔ اسے کس نے مارا۔۔۔۔۔ جب احمد کو اس کی بیوی کی گولی لگی اور تم نے اسے مار دیا تو پھر اس کی بیٹی کو کس نے مارا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔“ نور جہاں پستول لہر کر بولی۔

”نور جہاں اس سوال کا جواب شاید تمہاری غلطیوں کی کچھ تلافی کر سکے۔۔۔۔۔ سوچو تمہارے بعد وہاں کون آ سکتا ہے؟“

”تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟ اسے مرے 25 برس ہو گئے، اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اسے کس نے مارا؟“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”فرق پڑتا ہے نور جہاں کیونکہ وہ زندہ ہے اور ان سوالوں کے جواب تلاش کر رہی ہے۔“

”رباب زندہ ہے۔۔۔۔۔ مگر وہ تو مر گئی تھی۔۔۔۔۔“

”نور جہاں۔۔۔۔۔ زینب علی احمد سردار احمد شیرازی کی بیٹی رباب ہے۔“

”زینب ہی رباب ہے؟“ نور جہاں کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھیل گئیں۔

”ہاں اور اسے اس رات کی باتیں اب یاد آنے لگی ہیں۔ کیا اس رات وہاں شمشیر بھی تمہارے ساتھ تھا۔“ اچانک ایک خیال، تھوڑے کی طرح عاصم کے دماغ پر لگا۔ ”جواب دو کیا وہ وہاں موجود تھا۔۔۔۔۔ کیا وہ تمہارے بعد وہاں گیا تھا؟ کیا ایسا کچھ ہوا تھا جس کا وجہ شمشیر اس کا دشمن ہو جائے؟“

نور جہاں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بولو۔۔۔۔۔ کیا وہ وہاں تھا؟“ عاصم ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”مگر اس نے شمشیر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ شاکو کو گلے والی گولی کی آواز سن کر اندر آیا تھا اور پھر مجھے باہر لے گیا تھا۔ ہاں جب وہ میرا پرس لینے اندر آیا تب۔۔۔۔۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔۔۔۔۔“ وہ یکلفت ہنس پڑی۔ ”مگر شمشیر اپنا کام کبھی ادھورا نہیں چھوڑتا میری قسمت دیکھو اس کی ماں نے مجھ سے احمدی کو چھین لیا اور اب وہ ہم دونوں کے سچ آگئی۔۔۔۔۔ اسے

اسی وقت مرجانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ ”خیر اب بہت ہو گیا۔۔۔۔۔ تمہاری موت کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔۔۔۔۔“ وہ ریو الورو والا ہاتھ سیدھا کرتے ہوئے بولی۔

”آپ کو اس بات پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی میڈم۔۔۔۔۔“ اشفاق کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ آنے والی خاتون افسر نے لمحے بھر میں نور جہاں کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔

”گڈ شو جعفری۔۔۔۔۔“ اشفاق بولا۔ ”تم نے مجھے بروقت کال کر دی۔۔۔۔۔ مگر شمشیر یہاں موجود نہیں ہے، اب میڈم ہی بتائیں گی کہ وہ کہاں ہے؟“

”وہ اپنا کام مکمل کرنے گیا ہوگا میں نے کہا تھا نا کہ شمشیر ادھورا کام نہیں کرتا۔“ نور جہاں زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”جعفری آخر تمہیں شکست ہو ہی گئی۔“

عاصم کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے آگ میں دھکا دے دیا ہو، وہ دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔۔۔۔۔ اشفاق اس کے پیچھے آرہا تھا۔

☆☆☆

ٹھیک سات بجے آذر ایک بار پھر زینب کے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا تھا مگر اس گھر میں وہ اب آخری بار آیا تھا۔ وہ آہستگی سے کمرے سے نکل کر سیزجیوں کے قریب آیا۔ نیچے لیونگ روم سے ٹیلی وژن کی آواز آرہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی اندیشہ تھا کہ کہیں زینب علی احمد نے کسی کو پروگرام دیکھنے کے لیے مدعو نہ کر رکھا ہو مگر خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ تنہا ہے یعنی قدرت بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ آذر نے سوچا۔

☆☆☆

زینب اسکرین پر خود کو وہ خط پڑھتے دیکھ رہی تھی۔
”احمدی۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”احمدی۔“

اسکرین پر نور جہاں کے چہرے پر ٹینشن کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ ایک دوسرے میں بجنے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں دکھ اور غصہ ایک ساتھ ہلکورے لے رہے تھے۔

”نہیں تم مجھ کو شاکو نہیں کہہ سکتیں رباب۔“ دھند ایک بار پھر اسے گھیرے میں لینے لگی تھی۔

”کیوں نہیں بابا بھی تو کہتے ہیں۔“ ایک کھلکھلاتی آواز گونجی۔ اس کے ذہن میں نور جہاں کا ہسٹریائی انداز گھوم گیا۔

”تمہیں یہ خط کہاں سے ملا۔۔۔۔۔ کہاں سے؟“ پھر شمشیر کی چیختی آواز جو نور جہاں کو سمجھا رہی تھی کہ یہ خط اس نے اپنے

شوہر کو لکھا ہے۔ شوہر کو..... یہی بات وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ دھند کے دوران ہی اسے نور جہاں ایک بار پھر نظر آئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی۔ اس کے بابا سامنے کھڑے تھے اور غصے میں کہہ رہے تھے۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اس رات وہ ان کے گھر آئی تھی۔

”تم ماما کو شائبہ نہیں کہہ سکتیں۔“ پھر وہی آواز گونجی۔ ”نہ ہی تم بابا کو احمدی کہہ سکتی ہو، سمجھیں۔“

”یعنی..... یعنی وہ احمدی ڈارلنگ شہر یار احمد شاہ نہیں سردار احمد شیرازی تھا۔“ وہ ایک دم جیسے ہوش میں آگئی۔ وہ خط یقیناً اس کے بابا کے سامان سے گرا تھا۔

اس رات نور جہاں یہاں آئی تھی وہ اور اس کے بابا شاید ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور شاید یہی بات اس جھگڑے کی وجہ بنی تھی۔

ایک چھوٹی بچی اپنے کمرے میں فائر کی آواز سے ڈرتی ہے۔ وہ بابا کو پکاری ہے اور پھر ایک فائر ہوتا ہے۔ میں نیچے آجاتی ہوں اور ماما کے جسم سے ٹکرا کر گرتی ہوں مگر وہاں کوئی اور موجود تھا..... کون تھا..... کیا نور جہاں؟

اسی وقت فون بجھا اور اس کے ساتھ ہی لیونگ روم کا بڑا فانوس بجھ گیا وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ٹیلی وژن کی روشنی میں اس نے ایک ہیولے کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ ایک لمبا دبلا پتلا شخص تھا جس کے سر کے سفید بال اس کے جھریوں سے پاک چہرے پر عجیب سے لگ رہے تھے۔

☆☆☆

سیاہ ٹیوٹا تیزی سے زینب کے گھر کی جانب جا رہی تھی۔ شمشیر کو معلوم تھا کہ نور جہاں اگلا ایک گھنٹا ٹیلی وژن کے سامنے گزارنے والی ہے۔ اگر پروگرام ختم ہونے تک وہ وہاں نہیں پہنچ پاتا اور اس کا فون آگیا تو وہ کہہ دے گا کہ وہ باہر کار کو چیک کر رہا ہے۔ شروع سے ہی اسے زینب علی احمد کو دیکھ کر عجیب سا جانا پہچانا احساس ہوتا تھا۔

”نور ٹھیک ہی کہتی ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”وہ ہم سب کو برباد کرنے آئی ہے مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔“

وہ زینب کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس کی کار باہر موجود تھی یعنی وہ گھر میں ہی تھی۔ اس نے ایک بلاک دور اپنی گاڑی کھڑی کی اور پچھلے حصے کی دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہو گیا۔ لکڑی کا دروازہ لاک نہیں تھا، وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ سالوں پہلے کی وہ رات اس کے تصور میں گھوم گئی۔ وہ اسی دروازے سے نور جہاں کو کھینچے ہوئے باہر لایا تھا اور اسے

گاڑی میں ٹھونس دیا تھا، وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ اچانک بولی تھی۔

”شمشیر..... میرا پرس..... وہ وہیں رہ گیا۔“ اور اسے واپس جانا پڑا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا وہاں کا منظر اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ جم گیا تھا۔

زینب علی احمد بڑے صوفے پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہر بندھے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھے گئے تھے۔ اس کے منہ پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔ ایک لمبا سا شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موم بتی، اس کا اسٹینڈ اور ماچس تھی۔

”وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔“ شمشیر نے سوچا۔ اچانک وہ شخص مڑا اور زینب کے پاس پہنچ کر دبی دبی آواز میں غرایا۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا مگر تم نے میری دھمکیوں پر کان نہیں دھرے۔ دیکھو تمہاری وجہ سے کیا ہو گیا۔ اپنی اس سزا کی تم خود ذمہ دار ہو۔“

”دھمکیاں.....“ شمشیر کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور وہ سب سمجھ رہے تھے کہ زینب کہانیاں بنا رہی ہے۔ اس شخص نے موم بتی زینب کے سامنے لہرائی۔

”اب میں اس جگہ کو آگ لگا دوں گا اور تمہیں اس میں جلنا ہوگا یہی سزا ہے تمہاری۔“

یعنی وہ سب کچھ جلا دینے والا ہے۔ شمشیر کو بس یہ کرنا تھا کہ وہ چپ چاپ واپس چلا جائے۔ وہ دیوار سے چپکا سوچ رہا تھا۔

”مگر یہ شخص بھی اسی آگ میں جل جائے تو..... سب جانتے تھے کہ زینب کو مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اب اگر یہ جگہ جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور زینب اور دھمکیاں دینے والا دونوں جل جاتے ہیں تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی کوئی تحقیقات نہیں ہوگی ورنہ ممکن تھا کہ کوئی پڑوسی ایک بلاک دور کسی سیاہ کار یا خود اس کو دیکھنے کا گواہ بن جاتا۔ یہ سب سے بہترین حل ہے۔“ اس نے فیصلہ کیا۔

وہ شخص اتنی دیر میں دروازے کے قریب آگیا تھا۔ شاید وہ پہلے اپنے فرار کا راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ شمشیر اپنی جگہ سے ہٹا اور عقب سے اس کے سر پر آپہنچا۔

☆☆☆

ڈاکیومنٹری ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ اسکرین پر ناموں کی فہرست دکھائی جا رہی تھی۔ سارہ وسیم کافی دفعہ زینب کا نمبر ملا

بچی تھی مگر فون ریسیو نہیں ہوا تھا۔ اس نے عاصم جعفری کے نمبر کو چند لمحوں کے بعد ڈائل کیا، فون ریسیو نہیں ہوا۔ وہ کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی۔

”وہ کیا کرے.....؟“ اس کا ذہن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ زینب کی کار گھر کے باہر کھڑی تھی۔ وہ یقیناً گھر میں تھی۔ اس مکان کو دیکھتے ہوئے سارہ کو پھر گہری سیاهی کا احساس ہوا مگر اس بار اس سیاهی میں سرخ شعلے بھی لہرا رہے تھے۔

”کیا اسے پولیس کو فون کرنا چاہیے مگر وہ ان سے کیا کہے گی؟ ہو سکتا ہے کہ زینب اس رات کے بارے میں یاد کر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اور جذباتی کشمکش کی نشانی ہو؟ آخر اسے کیا کرنا چاہیے؟“ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی زینب کے گھر کو بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اس رات..... اس رات وہ سیزھیوں سے نیچے آئی اور ماما کے جسم سے ٹکرا کر گر پڑی۔ وہاں کوئی نظر نہیں آیا پھر اچانک وہ اندر آیا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی وہ اس کا دوست شمشیر تھا جو اکثر اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس رات بھی اس نے اسے گود میں اٹھالیا تھا اور پھر اس نے اس کے سر پر ایک زوردار مار مار کر اسے ہوا میں اچھال دیا تھا۔

”شمشیر..... ہاں وہ شمشیر ہی تھا۔“ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

اور اب وہ اسے شمس الدین کے پیچھے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ شمس الدین کو بھی اسی لمحے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ مڑا مگر اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ شمشیر کے نیچے اس کے گلے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ پھل رہا تھا مگر شمشیر کی گرفت بہت مضبوط تھی اور آخر وہ زمین پر گر پڑا۔ شمشیر چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر وہ زینب کی جانب بڑھا۔ زینب صوفے پر سکر گئی۔

”تو..... تم رباب ہو..... رباب میں سچ کہہ رہا ہوں کہ اس رات جو ہوا مجھے اس پر افسوس ہے مگر مجھے نور جہاں کو محفوظ کرنا تھا۔ میں کیا کرتا وہ تمہارے باپ سے شدید محبت کرتی تھی اور تمہاری ماں اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ دوسری طرف تمہارا باپ کسی فیصلے پر پہنچ نہیں پارہا تھا۔ اس رات اس جھگڑے میں تمہاری ماں نور جہاں کو مارنا چاہتی تھی۔ گولی تمہارے باپ کو لگی۔ نور جہاں پاگل ہوگئی تھی۔ اس نے تمہاری ماں کو گولی مار دی۔ میں اسے یہ مشکل

باہر لایا۔ اگر وہ اپنا پرس اندر نہیں بھول جاتی اور مجھے اسے لینے واپس نہ آتا پڑتا تو میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا تا مگر تم نے ہمیں پہچان لیا تھا اس لیے..... مگر اب تم واپس آگئی ہو اور نور جہاں کو برباد کرنا چاہتی ہو اور ایسا میں ہونے نہیں دوں گا..... تم سمجھ رہی ہونا، یہ بھی مجبوری ہے۔“ اس نے پردوں اور دیگر اشیا کو آگ لگانا شروع کر دی، کمرے کا فرش ویسے بھی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

”رباب تم زیادہ پریشان مت ہو صرف چند لمحوں کی بات ہے میں جا رہا ہوں۔“ وہ اپنے پیچھے پوریج کا بیرونی دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ پردے اور لکڑی کے سامان نے پل بھر میں آگ پکڑ لی تھی۔ زینب جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا تھا اس کمرے کو جلنے میں بہت دیر نہیں لگتی تھی۔

”تو یہ تھا انجام..... اس تمہا کمرے میں آگ کے شعلوں میں محسوس ہو جانا..... عاصم سے دور۔“

خبریں بنانے والی خود خبر بننے والی تھی۔ دھویں کے بادل چھت کو چھو رہے تھے۔ زینب نے سانس روکنے کی کوشش کی۔ دھویں کی وجہ سے آنکھیں کھولنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنا شروع ہو گیا۔ اس نے صوفے سے کھسکا شروع کیا اور اس کے نتیجے میں نیچے گر پڑی۔ اس کی پیشانی سامنے رکھی کافی ٹھیل کے پائے سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ہاتھ پیٹھ پر بندھے تھے وہ یہ مشکل کھینچتی ہوئی دروازے کی جانب جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیونگ روم کے دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے کوشش کی کہ وہ دروازہ بند کر سکے۔ اس طرح آگ کے پھیلنے کی رفتار کم ہو سکتی تھی مگر کوریڈر اور باہر ہال میں بھی بے انتہاد دھواں بھرا ہوا تھا۔ زینب کے لیے آنکھ کھولنا اور سانس لینا دونوں دو بھر ہو رہے تھے۔ وہ اندازے کے مطابق ہال کے بیرونی دروازے کی جانب کھسک رہی تھی اور ساتھ ہی دعا کر رہی تھی کہ اس کا اندازہ درست ہو۔ اس کی رفتار بہت کم تھی۔ اچانچ کھینچتی وہ آگے بڑھ رہی تھی جبکہ آگ کی تیز لپٹیں تیزی سے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیتی آگے بڑھ رہی تھیں۔

☆☆☆

سارہ نے ایک بار پھر زینب کا نمبر ملایا۔ کال ریسیو نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے پولیس کو فون کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے طے کیا وہ ان سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے کسی کو گھر میں گھستے دیکھا ہے۔ سارہ نے پولیس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوری جواب آنے کے باوجود وہ چند لمحوں

کے ساتھ وہ بہ مشکل بول پایا۔ ”تور.....“ مگر وہ جانتا تھا کہ اب وہ بھی اسے نہیں بچا سکے گی۔

☆☆☆

ایک ایک انج کھسکا، ایک ایک لمحہ موت سے زندگی مانگتا اسے ایک ایک سیکنڈ گھنٹے کے برابر لگ رہا تھا۔ سختی سے بندھی رسی کی وجہ سے اس کی سیدھی ٹانگ بے حس و حرکت ہو گئی تھی۔ اسے اب زمین بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سانس لینا دو بھر ہو رہا تھا۔ اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

پھر اسی لمحے اسے کسی کی آواز سنائی دی، کوئی مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ یہ سارہ کی آواز تھی۔ اس نے آواز کی سمت کھسکا شروع کیا پھر اچانک پچھلے حصے سے دھماکے کی آواز آئی۔ شاید مکان گرنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب نہیں بچ سکتی تھی۔

حواس کے رخصت ہوتے ہوتے جو آخری آواز اس نے سنی وہ دروازے کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ تازہ ہوا کے ساتھ آوازوں کا اڑدھام اندر داخل ہوا تھا۔

”کہاں ہو زینب؟“ سارہ کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

”زینب۔“ عاصم کی آواز میں بے انتہا درد تھا۔ زینب دروازے سے قدرے پیچھے دھویں کے بادل میں چھپی ہوئی تھی۔ اس میں آواز نکالنے کی سکت بھی نہیں بچی تھی۔ ہوش بے ہوشی کی سرحد پر اس نے بہ مشکل اپنے پیروں کو اٹھا کر ساتھ بے دروازے پر مارا اور چند لمحوں میں تمام ٹارچز کا رخ اس کی طرف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سڑک فائر انجنز، ایمبولینس اور پولیس کاروں سے بھری ہوئی تھی۔ زینب اسٹریچر پر لیٹی تھی، عاصم اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے اسٹریچر پر آذر موجود تھا۔ اسے بھی بچا لیا گیا تھا۔

”ان کی نبض ٹھیک ہوتی جا رہی ہے۔“ ڈاکٹر نے عاصم کو بتایا۔ چند لمحے بعد زینب نے آکسیجن ماسک اتار کر عاصم کو دیکھا اور مسکرائی۔

”سب ٹھیک ہے اب زینب۔“ وہ اس کے قریب آ گیا۔ ”ہاں۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”اور مجھے سب یاد بھی آ گیا۔ وہ بابا یا ماما نہیں تھے، وہ شمشیر تھا جس نے مجھے مارا، شکر ہے میرے بابا مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے۔“ اس کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

تک کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کا گلا ایک دم بند ہو گیا تھا جیسے اس کی سانس رک رہی ہو۔ آنکھوں میں دھواں بھرنا شروع ہو گیا تھا اور اس کی نظروں کے سامنے تاریکی شعلے رقصاں تھیں بالآخر وہ بہ مشکل بولی۔

”این سیون اسٹریٹ پلیز مدد کرو، زینب علی احمد مر رہی ہے۔ زینب علی احمد مر رہی ہے۔“

☆☆☆

عاصم انتہائی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے جڑے سختی سے جھے ہوئے تھے۔ اشفاق اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔

وہ اب زینب کے گھر کی سڑک پر مڑ گئے تھے۔

”اوہ خدایا.....!“ اشفاق کے منہ سے چیخ سی نکلی۔

عاصم گویا سکتے میں آ گیا تھا۔ سڑک کے پیچوں بیچ ایک عورت مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ایک پولیس کار وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کا سائرن بج رہا تھا۔ زینب کا گھر شعلوں کی زد میں تھا اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

☆☆☆

شمشیر لیونگ روم کا دروازہ بند کر کے باہر نکلا اب وہ اطمینان کی سانس لے سکتا تھا اب کوئی مسئلہ نہیں بچا تھا نہ وہ شائستہ جمال جو نور جہاں کو دم کی دے سکے اور نہ ہی کوئی زینب علی احمد جو پچھلی باتیں یاد کر کے مسائل پیدا کر سکے۔

وہ پچھلے کمرے تک پہنچا ہی تھا کہ اسے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی پھر سائرن کی آواز اور پھر گاڑیوں کے ٹائروں کی تیز آواز آئی، کوئی تیزی سے گاڑی سے اتر رہا تھا۔

”زینب..... زینب“ آنے والا مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔ شمشیر نے اس کی آواز پہچان لی وہ عاصم جعفری تھا۔ شمشیر اب اس طرف سے باہر نہیں نکل سکتا تھا آگ لہجہ بہ لہجہ پھیلتی جا رہی تھی وہ فوراً وہاں سے نکلنا چاہتا تھا مکان کسی وقت بھی گر سکتا تھا۔ وہ مڑ کر دوسری جانب بڑھا آگ کچن اور سیڑھیوں والے حصے کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ ٹیرس سے درخت کے ذریعے باہر نکل سکتا تھا۔ اس نے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے۔ شعلوں کی گرمی اور دھویں نے سانس لینا محال کر دیا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھ تو گیا تھا مگر چاروں جانب سے شعلوں میں گھر سا گیا۔ اسے پھر نیچے اترنا ہوگا۔ وہ مڑا مگر اسی وقت چھت سے ایک بڑا ٹکڑا اس پر گرا۔ وہ اس کے نیچے دب گیا مگر پھر یہ مشکل کھڑا ہوا وہ پورا لرز رہا تھا ساتھ ہی دیواریں اور چھت ٹوڑ رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے ایک اور بہت بڑا ٹکڑا، اس کے سر پر گرا۔ اپنی آخری سانس